خیر البشر ﷺ کے
چالیس جاں نِثار رضی اللہ عنہم

طالب الہاشمی

ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

خالقِ کائنات نے جب اس ارضِ خاک پر پہلا آدمی نازل کیا، تو اُسے یعنی ہمارے جدِ اوّل حضرت آدمؑ — کو اس خاک دانِ تیرہ میں بہتر زندگی گزارنے کے لیے نورِ ہدایت بھی ساتھ ہی عطا فرمایا، آدمیّت جب تک طفلگی کے عالم میں رہی اس کی ضروریات اور اس کے وسائل محدود تھے، اسی نسبت سے ہدایت ربّانی کی روشنی کا دائرہ بھی محدود رہا، پھر آدمیت کی عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ یہ دائرہ بھی پھیلتا چلا گیا، بالآخر اَن گِنت قرن گزرنے کے بعد آج سے چودہ سو سال پہلے جب آدمیت اپنے شباب کو پہنچی تو اس کے ساتھ ہی جہل کے اندھیروں میں پنہاں، صراط مستقیم پر بھرپور چھوٹ ڈالنے کی خاطر نورِ حق کا پورا قرص، ماہِ کامل کی صورت میں فاران کی وادیوں سے طلوع ہوگیا، ہدایت ربانی کے اِس ظہور قدسی نے محمد ﷺ نام پایا۔

اس ظہور قدسی کے منصّۂ شہود پر آتے ہی مطلعِ عالم پر پھیلے ہوئے اندھیاروں کے اندر بھگدڑ مچ گئی، چمنِ کائنات کا ورق ورق اس چشمۂ آفتاب کی تابشوں سے چمک اُٹھا، ہاں شپّرہ چشموں پر یہ نورِ معرفت آشکارنہ ہوسکا، یہ کم نصیب اپنی بے بصر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر پھیلاتے، اور پھر اپنی بینائی کے فقدان کو ظلماتِ عالم کا نام دے کر مہر عالم تاب کے وجود ہی سے انکار کردیتے — اُن کے لاکھوں کروڑوں پیش رو بھی دنیا میں نورِ حق کی ہر جلوہ نمائی کے صرف اس لیے منکر ہوجاتے تھے کہ ان کی اپنی آنکھوں کے چراغ بجھ چکے تھے — اپنے پیش رواہی شپّرہ چشموں کی مانند وہ اپنی بے بصیرتی کو اُلٹے اعتراضات کے پردوں میں چھپانے کی کوشش کرتے، اپنی اندھی آنکھوں کو وہ بار بار ملتے۔ اور پھر کہتے کہ اگر یہ شخص واقعی نورِ نبوّت کا امانت دار ہے۔ واقعی خدا کا پیغمبر ہے، تو اس کی نبوّت اور پیغمبری کے ثبوت میں آسمان سے فرشتوں کے دوش پر کوئی تخت کیوں نہیں اتارا گیا، اسے پہاڑوں اور سنگ پاروں کو اپنے اشارۂ ابرو سے بکھیر ڈالنے

اور تپتے صحراؤں کو اپنے حکم پر ناگہانی بارش سے شاد کام کرنے کی قوت کیوں نہیں بخشی گئی —— گویا وہ معجزوں کے طلب گار تھے! لیکن وہ شپرّہ چشم اس درخشاں حقیقت کے ادراک سے یکسر قاصر تھے، کہ خاتم النبیین ﷺ کی بعثتِ باسعادت کے بعد خود انہی کے آس پاس حضور پُرنورؐ کے دم قدم سے ایک ایسا عظیم الشان معجزہ رفتہ رفتہ نشو ونما پا رہا تھا کہ جو حضورؐ ہی کی نبوّت کی مانند بے مثال بھی تھا اور لازوال بھی —— نبوتِ محمدیؐ کا یہ انوکھا اور یگانۂ روزگار معجزہ دیگر تمام خارق عادت معجزوں پر بھاری تھا، یہ وہ معجزہ تھا کہ جو عناصرِ فطرت کی تسخیر سے کہیں زیادہ عظیم اعجاز روبہ عمل لا رہا تھا —— انسانی قلوب واذہان کی تسخیر کا اعجاز!

حضرتِ انسان کا وہ دل جو سمندروں سے زیادہ عمیق، پہاڑوں سے زیادہ سنگلاخ، جنگلوں اور صحراؤں سے زیادہ دشوار گزار، اور کائنات کے تمام حیرت انگیز طبعی مظاہر سے زیادہ پُر اسرار اور پیچیدہ واقع ہوا ہے —— نبوّتِ محمدیؐ کے اصل معجزہ کا براہِ راست ہدف بنا اور پھر خاتم المرسلینؐ کی اعجاز فرمائی نے دیکھتے ہی دیکھتے دلوں کی ماہیت ہی تبدیل کر دی، انسانی دل کا سمندروں جیسا عُمق، ایمان کی بالائی کشش سے پایاب ہوگیا، اس کی سنگلاخی خشیتِ الٰہی سے پگھل کر پانی بن گئی، اس کا بہارنا آشنا دشتِ ویراں، قربانی وایثار کے صدا بہار پھولوں سے مہک اٹھا، اس میں موجود کفر ونفاق کی تہہ در تہہ پیچیدگیاں، صدق وخلوص کے آبدار موتیوں کی کانیں اور حرص وہوس کی تاریک کمین گاہیں فقر وغنا کے اجالوں کی آرام گاہیں بن گئیں۔ خونریزی و سفاکی کے بھڑکتے ہوئے الاؤ، اخوت ومحبت کے نخلستانوں میں تبدیل ہوگئے، اور دنیا کی آسائشوں کی خواہشات پر مر مٹنے کی جگہ آخرت کی راحتوں کے لیے شجاعانہ جاں نثاری کے ولولے جنم لینے لگے۔

وہ مبارک ہستیاں، جن کے دل نبوّتِ محمدیؐ کی اس معجزانہ قلبِ ماہیت کے آستانے بنے، شریعتِ محمدیؐ کی زبان میں صحابہ کہلائے۔

آں حضور ﷺ کی شمعِ رسالت روشن ہوتے ہی تہہ در تہہ تاریکیوں میں سرگشتہ وحیراں، سعید فطرت روشنی کے دیوانے، پروانوں کی صورت میں اس محبوب ومقدس شمع کے گرد جمع ہوگئے، ان میں سے بہتوں نے شمع کو کفر وجہل کی پھونکوں سے بچانے کی خاطر اپنی سوختہ جانوں کی فصیل اُبھار دی، اور یوں اس شمعِ یقین کی حرمت پر مر مٹے، کچھ دوسرے اس شمعِ ربّانی کی لازوال ضیاؤں سے مستنیر ہو کر اطراف واکناف میں ستارے بن کر چمکے، اور پھر انھوں نے رذائلِ اخلاق کی

ظلمات میں صداقتِ فکر و عمل، حق گوئی و حق پژوہی، عفت و پاک بازی، دیانت داری و امانت، عدل و انصاف، فیاضی و سخاوت، توکل و استغنا، شجاعت و استقامت، قربانی و ایثار اور اثباتِ حق کے لیے جان فروشی و جاں نثاری کے نئے چراغ روشن کیے۔ نورِ حق اور شمعِ رسالتؐ کے ساتھ ساتھ صحابۂ کرام (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کی سیرت کے یہی روشن چراغ بعد میں آنے والے قافلۂ انسانیت کے لیے چراغ راہ بنے، رہ منزل کے ان روشن چراغوں، اور آسمانِ ہدایت کے ان درخشاں ستاروں، یعنی صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی منور سیرتوں کو ظلمات کے ڈسے ہوئے قلب و ذہن میں اجاگر کرنے کا مبارک فریضہ قرنِ اوّل ہی سے اُمتِ محمدیہؐ کے اہلِ علم اور اہلِ قلم نے سنبھال رکھا ہے، مجھے جنابِ طالب ہاشمی کے بختِ تاباں پر رشک آرہا ہے کہ، اردو زبان میں اس مبارک فریضہ کا تسلسل برقرار رکھنے کی سعادت دورِ جدید میں ان کے حصہ میں آئی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ ع

این سعادت بہ زورِ ''دعویٰ'' نیست!

اردو داں طبقہ کے لیے جناب طالب ہاشمی کا نام نیا نہیں ہے، وہ ایک مدّت سے تصنیف و تالیف کے میدان میں سرگرمِ عمل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں حقیقی علم اور سائنٹفک تحقیق سے وافر شغف، اور اس باب میں زبردست جذبۂ ریاضت عطا کرنے کے ساتھ ساتھ ایک گل پاش قلم اور ایک شاداب و دلآویز اسلوبِ بیان سے بھی نوازا ہے، اور یہ حقیقت بھی لائقِ رشک ہے کہ جناب طالب ہاشمی نے اپنی ان خداداد صلاحیتوں کا صحیح شکر ادا کرنے کی خاطر، شروع ہی سے انہیں خدا کے پسندیدہ دینِ اسلام کی علم بردار اُمت —— امتِ مرحومہ، کی تاریخ کی عظیم صداقتوں کے ابلاغ کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ چناں چہ سالہا سال سے موصوف تاریخِ اسلام کے مختلف واقعات اور نامور شخصیات کے تذکروں کو جدید اسلوب میں مرتب کر رہے ہیں، اور اس ضمن میں اب تک اُن کی متعدد کتابیں منظرِ عام پر آکر قبولِ عام حاصل کر چکی ہیں۔

تاریخ نگاری ادب کی شاید سب سے زیادہ مشکل صنف ہے۔ دوسری ہر صنف میں قلم کار کو اپنے تخیل کی جولانیاں دکھلانے کے لیے ایک وسیع و لامحدود میدان میسّر ہوتا ہے، لیکن ایک مؤرّخ —— بشرطے کہ وہ ایک صداقت شعار مورّخ ہو —— اپنے اشہب قلم کو صرف سند اور صحت کی حدود ہی میں ترکتازیاں کرنے کی اجازت دے سکتا ہے، اس طرح ظاہر ہے، کہ ایک محدود اور

پابند فضا میں مورّخ کو زیادہ تر زمینی حقائق سے پابہ گِل رہنا پڑتا ہے اور وہ قارئین کی نگاہِ تحسین کی خاطر اپنے تخیل کی آسمان پر دازی کا کوئی مظاہرہ نہیں کرسکتا، چناں چہ ایک مورّخ کے لیے کسی دلکش داستان کے انداز میں تاریخی حقائق کا ابلاغ خاصا کٹھن ثابت ہوتا ہے، تاہم جناب طالب ہاشمی نے اس باب میں صحتِ بیان اور حسنِ بیان کا جو دلکش امتزاج پیش کیا ہے، وہ حیرت انگیز بھی ہے، اور فنِ تاریخ نویسی کے ساتھ ساتھ ادب وانشاء پر اُن کی زبردست دست گاہ کا ایک ثبوت بھی —— اُن کے پیرایۂ اظہار میں مورّخانہ پیوست اور محققانہ خشکی نام کو بھی نظر نہیں آتی، بلکہ تاریخی واقعات وحقائق کو ادب کی رنگین زبان اور سلاست وفصاحت کے شیریں پیرائے میں وہ اس نفاست کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ قاری کے ذہن کو بصیرت کی روشنی کے ساتھ ساتھ کیف و سرشاری کا ایک خاص عالم بھی میسر آجاتا ہے۔

پھر ایسا بھی نہیں ہے، کہ محض حسنِ بیان اور عبارت آرائی کی خاطر وہ تاریخ اور تحقیق کے فنّی تقاضوں کو نظر انداز کردیتے ہوں، بلکہ ان تقاضوں کو تمام تر پیشِ نظر رکھتے ہوئے، وہ زیرِ تذکرہ واقعات کی صحت کو بھی کامل احتیاط کے ساتھ ملحوظ رکھتے ہیں، اور جو کچھ حوالۂ قلم کرتے ہیں، اس میں سند وتحقیق سے کہیں روگردانی نہیں فرماتے۔

صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مبارک تذکروں اور سوانح پر مشتمل جناب طالب ہاشمی کے متعدد مضامین ملک کے وقیع جرائد میں شامل ہوکر اہلِ نظر سے تحسین پاچکے ہیں۔ چند ماہ پیش تر موصوف کے ان مضامین کا ایک مجموعہ بعنوان ''تیس پروانے شمع رسالتؐ کے'' شائع ہوا تھا، جسے اللہ کے فضل سے ملک بھر میں وسیع پذیرائی میسّر آئی، مقامِ مسرت ہے کہ اس کے بعد بھی جناب طالب ہاشمی کا قلم بہ دستور علم وتحقیق کے موتی بکھیر رہا ہے۔ موصوف کے یہ تابدار رشحاتِ قلم اب مزید چالیس صحابۂ کرام کے تذکروں کی صورت میں اس کتاب کے سلکِ مروارید میں ہدیۂ قارئین ہیں!

ان تذکروں میں جناب طالب ہاشمی نے ایک خاص پہلو یہ بھی مدِنظر رکھا ہے کہ ہر صحابیؓ کے بارے میں حضور ﷺ کی خصوصی محبت اور شفقت ورافت کے واقعات اور اس سے متعلق روایات کو بھی حسنِ ترتیب کے ساتھ جمع کردیا جائے۔ اس طرح اس صحابیؓ اور حضور ﷺ کے مابین رشتۂ محبت ورفاقت کے دونوں مقابل نقطے واضح ہوکر سامنے آجاتے ہیں۔ یعنی انھوں نے پروانے کے سوزِ محبت کے ساتھ ساتھ خود شمع کے جذبۂ تپش آموز کو بھی اجاگر کردیا ہے اور

حسن کے اُس التفاتِ خاص کو بھی بے نقاب کر دیا ہے، کہ جس کی جھلک دیکھ کر عشق نے اپنی جان بے دریغ محبوب کے قدموں پر نثار کر دی! میرے ناچیز علم کے مطابق صحابۂ کرام کی سیرت نگاری کے دوران اس پہلو کو کسی اور تذکرہ نویس نے کم ہی ملحوظ رکھا ہے۔ اور اس اعتبار سے جناب طالب ہاشمی نے اپنے قارئین کو یقیناً صحابۂ کرام کی شخصیت کی ایک نئی جہت سے آشنا کیا ہے۔

صحابہ کرامؓ کے ان تذکروں میں جناب طالب ہاشمی نے ہر صحابیؓ کے قبیلہ اور اجداد نیز ان کے قبولِ اسلام کے واقعہ کے معاملہ میں خاصی تحقیق سے کام لیا ہے، اور اس سلسلہ میں موجود مختلف روایات کا بے لاگ جائزہ لیا ہے، اس کے بعد ایسے لطیف اور موثر پیرائے میں ان صحابیؓ کی استقامت وعزیمت اور راہِ حق میں اور حضور ﷺ کی محبت میں ان کے جذبۂ فداکاری وجاں نثاری کی داستان رقم کی ہے، کہ اسے پڑھ کر بے اختیار قاری کے دل میں دینِ حق سے شیفتگی کا جذبہ ابھرتا ہے۔ اور شاید یہی فاضل مصنف کا مقصود بھی ہے۔

صحابۂ کرامؓ کے ان تذکروں کو مرتب کرتے وقت فاضل مؤلف نے جس زبردست ریاضت اور جگر کاوی سے کام لیا ہے، وہ اس حقیقت سے بھی عیاں ہے، کہ اس موضوع پر اردو میں موجود دوسری کتب کے اندر جن صحابیوں کا تذکرہ مجمل طور پر محض دو تین صفحات پر مشتمل ملتا ہے، جناب طالب ہاشمی نے تحقیق وجستجو میں نئی کاوشوں سے کام لے کر اُن کی سوانح زیادہ تفصیل کے ساتھ کئی صفحات میں بیان کی ہے، یقیناً موصوف کی یہ کوشش علم وتحقیق کے میدان میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔

یہ حیرت انگیز حقیقت بھی لائق توجہ ہے، کہ قبل ازیں اردو زبان میں صحابۂ کرامؓ کی سیرت وسوانح کے موضوع پر جو وقیع کتب موجود ہیں، وہ اکثر وبیشتر کئی اہلِ علم پر مشتمل کسی نہ کسی ادارہ کی مشترکہ کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔ لیکن جناب طالب ہاشمی سراسر درویشی وبے سروسامانی کے عالم میں، کسی شخص یا ادارہ کی مالی یا افرادی اعانت حاصل کیے بغیر، محض اپنے بے پناہ جذبۂ شوق کی بہ دولت، تاریخِ اسلام کے موضوع پر سالہا سال سے دادِ تحقیق دے رہے ہیں، اور کسی ستائش کی تمنا یا صلہ کی پروا کیے بغیر تسلسل کے ساتھ مستند، وقیع اور ضخیم کتابیں اہل ذوق کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ بدیں وجہ یہ بات بلا مبالغہ کہی جا سکتی ہے، کہ جناب طالب ہاشمی، درحقیقت اپنی ذات میں ایک مکمل ادارہ ہیں، اور وہ تاریخِ اسلام کے موضوع پر تنِ تنہا ایک پوری اکادمی کا کام کر رہے ہیں۔ درآں حالے کہ دنیاوی دولت کا ایک شمّہ بھی اُن کے پاس نہیں ہے،

البتہ اپنے مقصد کی صداقت پر پختہ ایمان اور اپنے مقصد کے ساتھ بے پناہ عشق کے عظیم سرمائے سے وہ یقیناً مالا مال ہیں اور اس میں شک نہیں کہ رہتی دنیا تک یادگار رہنے والے کارنامے عشقِ مقصد کے اسی لازوال سرمائے کی بہ دولت وجود میں آیا کرتے ہیں، اور اس معاملے میں دنیاوی دولت ہمیشہ زرِ کم عیار ثابت ہوتی ہے!

فاضل مصنّف کا خلوصِ مقصد کتاب کی سطر سطر سے عیاں ہے، وہ اپنے اس جذبۂ صادق کو قاری کے دل و دماغ میں منتقل کرنے کے لیے بہت بے تاب نظر آتے ہیں۔ جو اقامتِ دین کے لیے ان کے قلب میں شدّت سے موجزن ہے، چناں چہ صحابۂ کرام کے ان ولولہ انگیز تذکروں کے مطالعہ سے ہماری جدید نسل کو بہ خوبی یہ اندازہ ہو جائے گا کہ علم نما جہالت کے جدید علم برداروں نے کھو کھلے پروپیگنڈہ کے ذریعہ آج جن ہستیوں کو عظمتوں اور رفعتوں پر فائز قرار دے رکھا ہے وہ محض ٹین کے بے جان پتلے ہیں جنہیں ہوشیاری کے ساتھ ریت کی بلند دیواروں پر کھڑا کر دیا گیا ہے، اس کے برعکس ہمارے اسلاف میں بحمد للہ ایسی بے شمار ہستیاں موجود ہیں، جن کی عظمت، پختگیِ کردار کی بلند اور ناقابلِ شکست چٹانوں پر استوار ہے، اور جنہوں نے کلمۂ حق اور رسولِ برحق ﷺ کے ذکر کی سربلندی کی خاطر شجاعت و بسالت اور جاں سپاری و جان فروشی کی ایسی مثالیں قائم کیں، کہ تاریخ انسانی آج تک ان کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔

صحابۂ کرام کے ان تذکروں کے مطالعہ سے آپ سے آپ اس ہستیِ والا تبار —— کہ جو غایتِ کائنات بھی ہے اور سرورِ کائنات بھی —— امام الانبیاء بھی ہے —— اور خیر البشر ﷺ بھی —— کا نقشِ جمیل بھی ذہن میں اُبھر آتا ہے، کہ جس کی مصاحبت سے مشرّف ہو کر اور جس کے عظیم و بے مثال معجزہ کی کرشمہ کاری سے ایسی نادرہ کار سیرتیں وجود میں آئیں یعنی صحابۂ کرام کی اخلاقِ فاضلہ سے مشک بار سیرتوں سے اصل میں اسوۂ حسنہ کی خوش بوئیں ہی پھوٹ رہی ہیں۔ بہ مصداق ع

غالب، ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست

دُعا ہے کہ ربّ اکرم جناب طالب ہاشمی کے قلم کو تادیر شاداب و رواں رکھے، کہ جو ہماری قدیم گل فشاں تاریخ کی خوش بوؤں کا پیام بر ہے۔ نیز دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس عطر پاشی کے صلے میں فاضل مصنّف کو روزِ قیامت جنت کے باغوں میں ایک مہکتا ہوا گھر عطا فرما دے۔ (آمین)

لالۂ صحرائی

جہانیاں

۲۰ر جولائی ۱۹۷۹ء

دیباچہ

جس طرح سرورِ کونین رحمتِ عالم فخرِ موجودات خیر الخلائق ختمی مرتبت جناب محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذاتِ گرامی تمام کمالات وصفات کی جامع اور انسانیت کی معراج ہے اسی طرح حضور ﷺ کے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سیرت وکردار کے اعتبار سے اتنے ارفع واعلیٰ مقام پر فائز ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کو چھوڑ کر آج تک ان سے بہتر کسی انسان پر آفتاب طلوع نہیں ہوا۔ یہ وہ نفوس قدسیہ تھے جنھوں نے "سراج منیر" کے جمالِ جہاں آرا سے اپنی آنکھیں روشن کیں، صاحبِ خلقِ عظیمؐ پر صدقِ دل سے ایمان لائے اور آپؐ کے اسوۂ حسنہ کو اپنی زندگی کا شعار بنایا۔ یہ آسمانِ ہدایت کے وہ روشن ستارے تھے جو آفتاب رسالت سے کسبِ فیض کر کے اَلصَّحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ بِاَیِّہِمُ اقْتَدَیْتُمْ اِھْتَدَیْتُمْ کے مقام بلند پر فائز ہوئے۔ ان کے صدق و اخلاص، دیانت وامانت، خیر وایثار اور زہد وارتقا کی قسم کھائی جاسکتی ہے۔ ان کے نفس گرم سے آج تک فوز وسعادت کے چراغ روشن ہیں۔ تہذیب وتمدّن کی زلفوں کو انھوں نے سنوارا، سیاست و معیشت کے چہرے کو انھوں نے نکھارا۔ جہالت کے اندھیروں اور کفر وشرک کی ظلمتوں میں انھوں نے ہدایت کی شمعیں روشن کیں۔ اللہ کا نام بلند کرنے کے لیے جان، مال، اولاد جس شے کی ضرورت پڑی انھوں نے حاضر کر دی۔

سرورِ کونین ﷺ نے ایک مرتبہ لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ "کوئی شخص تم میں سے مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک کہ اسے میرے ساتھ ماں باپ اولاد اور باقی سب لوگوں سے بڑھ کر محبت نہ ہو۔"

حضورؐ کے اس ارشاد کی تصدیق آپؐ کے جاں نثاروں نے اپنے عمل سے جس طرح کی، تاریخ عالم میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ شمعِ رسالتؐ کے ان پروانوں نے راہِ حق میں جو مصائب وآلام برداشت کیے ان کا حال پڑھ کر جسم پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ ان پروانوں کی

دل سوزی اور جان گدازی کی عجیب شان تھی۔ دینِ حق کی سر بلندی کے لیے انھوں نے ماں باپ کو چھوڑا، اہل و عیال سے جدائی اختیار کی، قبیلے اور وطنِ عزیز کو خیر باد کہا، گھر بار لٹایا، فاقے سہے ہر طرح کی جسمانی اذیتیں برداشت کیں۔ یہاں تک کہ راہِ حق میں اپنی جانوں تک کا نذرانہ پیش کر دیا۔ اللہ کے ان پاک باز اور برگزیدہ بندوں کا جذبۂ ایثار و فدویت بارگاہِ خداوندی میں اتنا پسند آیا کہ قرآن پاک میں جگہ جگہ ان کی تعریف و تحسین کی گئی اور کھلے لفظوں میں ان کو جنت کی بشارت دی گئی۔ مثلاً سورۃ الانفال میں ارشاد ہوا ہے:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّ نَصَرُوْآ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا مَعَكُمْ فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ ؕ (الانفال: ۷۴، ۷۵)

''جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی اور جدو جہد کی اور جنھوں نے پناہ دی اور مدد کی وہی سچے مومن ہیں، ان کے لیے مغفرت ہے اور بہترین رزق ہے۔ اور جو لوگ بعد میں ایمان لائے اور ہجرت کر کے آ گئے اور تمہارے ساتھ مل کر جدو جہد کرنے لگے وہ بھی تم ہی میں شامل ہیں۔''

سورۂ توبہ میں فرمایا گیا ہے:

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ وَ اَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ (التوبہ: ۱۰۰)

''وہ مہاجرین اور انصار جنھوں نے سب سے پہلے دعوت ایمان پر لبیک کہنے میں سبقت کی نیز وہ جو بعد میں راست بازی کے ساتھ ان کے پیچھے آئے۔ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ اللہ نے ان کے لیے ایسے باغ مہیا کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے یہی وہ عظیم الشان کام یابی ہے۔''

سورۂ فتح میں ان نفوسِ قدسیہ کے اوصاف و محاسن اس طرح بیان کیے گئے ہیں:

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ؕ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَہُمْ تَرٰىہُمْ رُکَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰہِ وَ رِضْوَانًا ۫ سِیْمَاہُمْ فِیْ وُجُوْہِہِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ ذٰلِکَ مَثَلُہُمْ فِی التَّوْرٰىۃِ ۚۖۛ وَ مَثَلُہُمْ فِی الْاِنْجِیْلِ ۚ۟ کَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـَٔہٗ فَاٰزَرَہٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰی عَلٰی سُوْقِہٖ یُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِیَغِیْظَ بِہِمُ الْکُفَّارَ ؕ وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْہُمْ مَّغْفِرَۃً وَّ اَجْرًا عَظِیْمًا ۪ (الفتح:۲۹)

''محمدؐ اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں۔ تم جب دیکھو گے انھیں رکوع و سجود اور اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کی طلب میں مشغول پاؤ گے۔ سجود کے اثرات ان کے چہروں پر موجود ہیں جن سے وہ الگ پہچانے جاتے ہیں۔ یہ ہے ان کی صفت توراۃ میں اور انجیل میں ان کی مثال یوں دی گئی ہے کہ گویا ایک کھیتی ہے، جس نے پہلے کونپل نکالی پھر اس کو تقویت دی، پھر وہ گدرائی، پھر اپنے تنے پر کھڑی ہوگئی۔ کاشت کرنے والوں کو وہ خوش کرتی ہے۔ تاکہ کفار اُن کے پھلنے پھولنے پر جلیں۔ اس گروہ کے جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جنھوں نے نیک عمل کیے ہیں، اللہ نے ان سے مغفرت اور اجرِ عظیم کا وعدہ فرمایا ہے۔''

اسی طرح قرآنِ کریم میں اور بہت سے مقامات پر بھی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی استقامت، صداقت، دیانت، خداترسی، حبِ رسول، سبقت علی الخیر، ان کے جذبۂ فدویت، شوق جہاد، پاس عہد، انفاق فی سبیل اللہ، استغنا، زہد و تقویٰ، اخلاصِ ایمان و نیت اور حسنِ اخلاق کی تعریف کی گئی ہے۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ''حیاۃ الصحابہ'' جلد اوّل کے مقدمہ میں نہایت صحیح لکھا ہے کہ ''نبی اکرم ﷺ اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی سیرت اور ان کے تاریخی کارنامے، دینی جذبات اور قوتِ ایمانی کے ایسے قوی سرچشمے ہیں جن کی بہ دولت یہ اُمت اور دعوت دین کے مرکز ان سے نورِ ایمانی حاصل کرسکتے ہیں۔''

فی الحقیقت رحمت دوعالم ﷺ نے اپنے فیضِ تربیت سے صحابہ کرامؓ کو حسنِ سیرت و کردار کا ایک مکمل نمونہ بنا دیا تھا۔ ان نفوسِ قدسیہ کی مثالی زندگیوں کے حالات پڑھ کر کون سعید الفطرت مسلمان ایسا ہوگا، جس کا دل ان کی محبت سے لبریز نہ ہو جائے اور اس میں

سبقت علی الخیر کی تڑپ نہ پیدا ہوئے۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ ہر شخص کا حشر اس کے ساتھ ہوگا جس سے وہ محبت کرتا ہے گویا صحابہ کرامؓ سے محبت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آخرت میں بھی ان کی معیت نصیب ہوگی اور یہ معیت جس کو نصیب ہو جائے اس کی خوش بختی کا کیا ٹھکانا ہے۔
اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے مجھ جیسے ناکارہ اور ہیچ مداں کو عظمت کے اُن مناروں کے تذکارِ جمیل عام فہم انداز میں قلم بند کرنے کی توفیق اور سعادت بخشی۔ اس سلسلے کی پہلی کتاب ''تیس پروانے شمع رسالت کے'' دسمبر ۱۹۷۸ میں شائع ہوئی۔ دینی اور علمی حلقوں میں اسے جو پذیرائی نصیب ہوئی وہ میری توقع سے کہیں بڑھ کر تھی۔ ہوا و ہوس اور اخلاقی بے رہ روی کے اس دور میں سیرتِ صحابہؓ کے موضوع پر کسی کتاب کا ہاتھوں ہاتھ لیا جانا یہ ثابت کرتا ہے کہ ع

ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

اس حقیقت نے مجھے ولولۂ تازہ عطا کیا، جس کی بہ دولت خیر البشر ﷺ کے چالیس جاں نثاروں کے تذکارِ جمیل پر مشتمل یہ کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اگر اس کو پڑھ کر کوئی ایک زندگی بھی سنور گئی تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت ٹھکانے لگی۔ میں الحاج حکیم چودھری محمد صادق صاحب (لالہ صحرائی) کا صمیمِ قلب سے سپاس گزار ہوں کہ انھوں نے اس کتاب کا پیش لفظ لکھنے کی زحمت گوارا فرمائی۔ سوزِ دروں، ایثار و خلوص اور قلبِ تپاں جیسی نعمتوں سے بہرہ منداس مرد قلندر نے اپنے پیش لفظ میں مؤلف کے بارے میں جن جذبات اور خیالات کا اظہار فرمایا ہے، یہ ان کا حسنِ ظن اور ذرّہ نوازی ہے ورنہ مؤلف بے چارہ کسی درجے میں بھی ان کا مستحق نہیں ہے۔ اُمید ہے کہ ایک مسلمان بھائی کے بارے میں اس حسنِ ظن کے لیے اللہ تعالیٰ انہیں اجرِ جزیل عطا فرمائے گا۔

آخر میں قارئین کرام سے گزارش ہے کہ اس کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے اگر انھیں کوئی لسانی یا واقعاتی غلطی نظر آئے تو وہ اسے ناشر کی وساطت سے میرے علم میں ضرور لائیں، یہ ان کا مجھ پر کرم اور احسان ہوگا اور وہ عنداللہ ماجور ہوں گے۔ آئندہ ایڈیشن میں یہ غلطی دور کر دی جائے گی۔ ان شاء اللہ۔

عفو و مغفرت کا طالب

طالب ہاشمی

سیّد الشہداء حضرت حمزہ بن عبد المطّلبؓ

اسد اللہ و اسد الرسولؐ

(۱)

معرکۂ اُحد (۷ رشوال ۳ ہجری) ختم ہوا تو میدانِ جنگ ایک دل دوز منظر پیش کر رہا تھا۔ رحمتِ عالم ﷺ کے ستر جاں نثاروں کی خون آغشتہ لاشیں دور دور تک بکھری پڑی تھیں۔ مشرکین نے اپنے خبثِ باطن اور جوشِ انتقام کا مظاہرہ یوں کیا تھا کہ تقریباً سبھی شہیدانِ حق کی لاشوں کا مثلہ کر ڈالا تھا، ان کے کان، ناک اور ہونٹ کاٹ کر پھینک دیے تھے یا ہار بنا کر گلے میں ڈال لیے تھے۔ سرورِ عالم ﷺ خود بھی لڑائی میں سخت زخمی ہو گئے تھے لیکن آپؐ کو اپنے زخموں کا کوئی خیال نہیں تھا۔ البتہ اپنے اس قدر جاں نثاروں کے بچھڑنے کا شدید صدمہ تھا۔ لڑائی کے بعد حضورؐ میدانِ جنگ کے جائزے کے لیے نکلے تو چشم ہائے مبارک سے سیلِ اشک رواں تھا اور روئے انور پر شدید حزن و ملال کے آثار نمایاں تھے۔ گشت کرتے ہوئے آپؐ ایک لاش کے قریب آ کر رُک گئے۔ مشرکین نے اس شہید راہِ خدا کی لاش کے ساتھ جو سلوک کیا تھا وہ انتہا درجے کی بہیمیت اور قساوتِ قلبی کا آئینہ دار تھا۔ بدبختوں نے اس مقدس لاش کے نہ صرف ہونٹ ناک، اور کان کاٹ لیے تھے بلکہ شکم کو بھی جگہ جگہ سے پھاڑ ڈالا تھا۔ سید المرسلین ﷺ نے اس لاش کو دیکھا تو آپؐ کا دل بھر آیا اور لسان رسالت پر یہ الفاظ جاری ہو گئے:

> ''تم پر خدا کی رحمت ہو کیوں کہ جہاں تک مجھے معلوم ہے تم قرابت داروں کا سب سے زیادہ خیال رکھتے تھے۔ اور نیک کاموں میں پیش پیش رہتے تھے۔''

یہ شہید راہِ حق جن کے لیے خیر الخلائق فخرِ موجودات سید الانام رحمتِ دو عالم ﷺ نے دعائے رحمت کی اور جن کے محاسنِ اخلاق کی برملا تحسین فرمائی، عمِ رسولؐ حضرت حمزہؓ بن عبد المطلب الہاشمی تھے۔

(۲)

سیدنا حضرت حمزہؓ کا شمار راہِ حق میں اپنی جانوں کو بیچ دینے والے اُن صحابہ کرام میں ہوتا ہے جن کی جلالت ِقدر پر مسلمانوں کے سبھی مکاتبِ فکر کا کامل اتفاق ہے۔ ان کے حسب و نسب کے لیے اتنا ہی لکھنا کافی ہے کہ وہ سرورِ عالم ﷺ کے چچا تھے۔ (حضورؐ کے والد حضرت عبداللہ، حضرت حمزہؓ کے علاّتی بھائی تھے) اس کے علاوہ ان کو حضورؐ سے دو نسبتیں اور بھی تھیں۔ ایک یہ کہ حضورؐ کی والدہ حضرت آمنہ بنت وہب زہری، حضرت حمزہؓ کی والدہ ہالہ بنت اہیب (یا وہیب) زہری کی چچا زاد بہن تھیں۔ اس نسبت سے حضرت حمزہؓ حضورؐ کے خالہ زاد بھائی بھی ہوتے تھے۔ دوسری یہ کہ ابولہب کی لونڈی ثوبیہؓ نے حضرت حمزہؓ اور سرورِ عالم ﷺ دونوں کو دودھ پلایا تھا۔ اس لحاظ سے حضرت حمزہؓ حضورؐ کے رضاعی بھائی بھی تھے۔ حضرت حمزہؓ کے سال ولادت کے بارے میں مختلف روایتیں ہیں۔ بعض اربابِ سِیَر نے لکھا ہے کہ وہ حضورؐ سے دو سال قبل پیدا ہوئے اور بعض نے چار سال کا فرق بیان کیا ہے۔ دونوں قسم کی روایتیں برابر کا درجہ رکھتی ہیں۔ یہ تفاوت دو سال کا ہو یا چار سال کا اس سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ ثوبیہؓ نے حضرت حمزہؓ اور حضور پُر نور کو علیحدہ علیحدہ وقت میں دودھ پلایا ہوگا۔ حافظ ابن عبد البرؒ نے الاستیعاب میں یہی رائے ظاہر کی ہے۔

حضرت حمزہؓ کی کنیت ابو عمارہ بھی تھی اور ابو یعلیٰ بھی۔ سید الشہداء، اسد اللہ اور اسد الرسول مشہور القاب ہیں۔

حضرت حمزہؓ کے بچپن کے حالات پردۂ اخفا میں ہیں، زیادہ سے زیادہ یہ پتا چلتا ہے کہ انھیں بچپن ہی سے شمشیر زنی، تیر اندازی اور پہلوانی سے گہرا لگاؤ تھا اور سیر و شکار کا بھی بے انتہا شوق تھا۔ جوان ہوئے تو قریش کے نامور بہادروں کی صف میں جگہ پائی لیکن وہ قبائل کے باہمی جھگڑوں میں شاذ ہی کبھی حصہ لیتے تھے اور اپنے وقت کا بیشتر حصہ سیر و شکار میں گزارتے تھے۔

بعثت کے بعد رحمتِ عالم ﷺ کو دعوت توحید دیتے چھ سال ہونے کو آئے تھے۔ لیکن حضرت حمزہؓ نے حضورؐ سے بے انتہا محبت رکھنے کے باوجود کبھی دعوتِ اسلامی کی طرف توجہ نہ کی۔ شاید اس زمانے میں ان کے نزدیک زندگی کا مقصد ہی تازہ شکار مارنا اور کھانا تھا، اسی مذاقِ طبیعت

نے انھیں دعوتِ حق پر غور کرنے کی کبھی مہلت ہی نہ دی۔ ان کے یہی لیل و نہار تھے کہ ایک دن ایک ایسا واقعہ پیش آ گیا، جس نے ان کے قلب ونظر کی دنیا بدل دی اور وہ دینِ حق کے ایک جانباز سپاہی بن گئے۔ ہوا یوں کہ (٦ بعد بعثت میں) ایک روز رحمتِ عالم ﷺ دارِارقم سے نکل کر صفا (یا بروایت دیگر حجون) کے پاس سے گزر رہے تھے (یا بعض روایتوں کے مطابق اسی جگہ کے قریب لوگوں کو دعوتِ توحید دے رہے تھے) کہ ابوجہل کا گزر اس طرف ہوا، اس کے ساتھ عدی بن حمراء اور ابن الاصداء بھی تھے۔ ابوجہل نے حضورؐ کو دیکھا تو اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور آپ کو بے تحاشا گالیاں دینے لگا اور ساتھ ہی دینِ حق کے بارے میں بھی نہایت رکیک الفاظ استعمال کیے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ اس نے حضورؐ پر مٹی اور گوبر پھینکا اور آپؐ پر ہاتھ بھی اٹھایا۔ رحمتِ عالم ﷺ نے اپنے خُلقِ عظیم کے اقتضا سے نہایت صبر وتحمل سے کام لیا اور ابوجہل کی کسی بات کا کوئی جواب نہ دیا یہاں تک کہ وہ تھک ہار کر بکتا جھکتا چلا گیا اور حضورؐ بھی تشریف لے گئے۔ اتفاق سے بنوتیم کے رئیس عبداللہ بن جُدعان کی (آزاد کردہ) لونڈی کوہِ صفا پر اپنے گھر میں بیٹھی یہ سارا واقعہ دیکھ رہی تھی۔ حضرت حمزہؓ شکار سے واپس آتے ہوئے اس کے گھر کی طرف سے گزرے تو اس نے ان سے مخاطب ہو کر کہا:

> ''ابوعمارہ! کاش تھوڑی دیر پہلے تم یہاں موجود ہوتے تو دیکھتے کہ عمرو بن ہشام (ابوجہل) نے تمہارے بھتیجے کے ساتھ کیسا ناروا سلوک کیا، نہایت سخت گالیاں بھی دیں اور بری طرح ستایا بھی لیکن ابن عبداللہ نے کچھ جواب نہیں دیا اور بے بسی کے ساتھ واپس چلے گئے۔(۱) ''

یہ سننا تھا کہ حضرت حمزہؓ کی رگِ حمیت پھڑک اٹھی۔ غصہ سے بے قابو ہو کر سیدھا خانۂ کعبہ کا رُخ کیا، جہاں ابوجہل مشرکینِ قریش کی مجلس میں بیٹھ کر لاف زنی کر رہا تھا۔ حضرت حمزہؓ نے وہاں پہنچ کر اپنی کمان اس زور سے ابوجہل کے سر پر ماری کہ خون نکل آیا اور ایک بڑا زخم ہو گیا۔ پھر کڑک کر کہا ''تو محمدؐ کو گالیاں دیتا ہے۔ میں بھی انھی کے دین پر ہوں، جو کچھ وہ کہتے ہیں میں بھی وہی کہتا ہوں۔ اگر تجھ میں ہمت ہے تو ذرا مجھے بھی گالیاں دے کر دیکھ۔''

---

(۱) بعض روایتوں میں ہے کہ اس واقعہ کی اطلاع حضورؐ کی پھوپھی حضرت صفیہؓ بنت عبدالمطلب نے اپنے بھائی حضرت حمزہؓ کو دی۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ دو عورتوں نے حضرت حمزہؓ کو اس واقعہ سے آگاہ کیا۔ بہر صورت حضرت حمزہؓ جونہی شکار سے واپس آئے ان کو کسی نہ کسی ذریعہ سے اس واقعہ کی اطلاع مل گئی۔

ابو جہل کو لہولہان دیکھ کر اس کے قبیلہ بنو مخزوم کے کچھ لوگ اس کی حمایت میں کھڑے ہو گئے اور حضرت حمزہؓ پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا لیکن ابو جہل نے انھیں یہ کہہ کر روک دیا کہ ابو عمارہ کو چھوڑ دو۔ میں نے اس کے بھتیجے کو گالیاں دی تھیں جن کی وجہ سے اس کو غصّہ آ گیا ہے۔

بعض روایتوں میں ہے کہ ابو جہل کے حامی مخزومیوں نے حضرت حمزہؓ سے کہا:

''حمزہ شاید تم بھی صابی (بے دین) ہو گئے ہو۔''

حضرت حمزہؓ نے بے باکانہ جواب دیا۔ ''میرا دین بھی وہی ہے جو محمدؐ کا ہے، جب مجھ پر حق واضح ہو چکا ہے تو مجھے قبولِ اسلام سے کون باز رکھ سکتا ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اللہ کے رسول ہیں اور جو کچھ وہ کہتے ہیں وہ سراسر حق ہے۔ خدا کی قسم میں اب اس بات سے ہرگز نہیں پھر سکتا تم سچے ہو تو مجھے روک کر دیکھ لو۔''

حضرت حمزہؓ کا جواب سن کر مخزومیوں نے ان سے لڑنا چاہا تو ابو جہل کو خدشہ پیدا ہوا کہ اس طرح بنو مخزوم اور بنو ہاشم کے درمیان رزم و پیکار کی ایسی آگ بھڑک اٹھے گی جو کسی کے بجھائے سے نہ بجھے گی۔ چناں چہ اس نے مخزومیوں سے کہہ دیا کہ وہ حضرت حمزہؓ سے کچھ تعرّض نہ کریں۔

حضرت حمزہؓ نے جوشِ حمیت میں اپنے اسلام کا اعلان تو کر دیا لیکن جب گھر پہنچے تو دل میں وسوسہ پیدا ہوا کہ ''میں نے قریش کا سردار ہوتے ہوئے محمدؐ کا نیا دین قبول کر لیا اور اپنے آبائی دین سے پھر گیا۔ یہ بڑی شرم کی بات ہے اس سے تو مر جانا اچھا ہے۔'' اسی وسوسے اور تردّد کے عالم میں انھوں نے اللہ سے دعا کی۔

> ''اے اللہ! یہ راستہ جو میں نے اختیار کیا ہے اگر اس میں کوئی بھلائی ہے تو میرے دل کو اس کی تصدیق سے سکون و تسلّی بخش ورنہ، جس چیز کے اندر میں مبتلا ہوں میرے لیے اس سے نکلنے کی کوئی صورت پیدا کر دے۔''

ایک روایت میں ہے کہ ابو جہل کو زخمی کرنے کے بعد حضرت حمزہؓ سرورِ عالمؐ کے پاس گئے اور کہنے لگے: ''برادرزادے! تمھیں خوش ہونا چاہیے کہ میں نے ابو جہل سے تمہارا بدلہ لے لیا ہے۔''

> حضورؐ نے فرمایا ''چچا جان! میں ایسی باتوں سے خوش نہیں ہوتا، میری خوشی تو اس میں ہے کہ آپ غیر اللہ سے منقطع ہو کر دینِ حق کی پیروی کریں۔''

حضورؐ کی اس دعوتِ حق کے بعد وہ سخت ذہنی الجھن میں مبتلا ہو گئے اور اسی حالت میں انھوں نے اس الجھن سے نجات پانے کی دعا کی۔ رات اسی شش و پنج میں گزر گئی۔ صبح ہوئی تو وہ رحمتِ عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی ذہنی الجھن کا حال بیان کیا۔ حضورؐ نے ان کو نہایت بلیغ پیرائے میں اسلام کی حقانیت سمجھائی، اللہ کا خوف دلایا اور قبولِ حق کے صلے میں جنت کی بشارت دی۔ حضورؐ کے ارشادات سن کر حضرت حمزہؓ کا دل یقین اور ایمان کے نور سے معمور ہو گیا اور وہ پکار اٹھے:

''میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ آپ صادق ہیں، آپ اپنے دین کا خوب اظہار کیجیے۔ واللہ! مجھے یہ بات بالکل پسند نہیں کہ میرے اوپر آسمان سایہ فگن ہو اور میں اپنے پہلے دین پر قائم رہوں۔''

قبولِ اسلام کے بعد حضرت حمزہؓ کا بیشتر وقت دارِ ارقم میں سرورِ عالم ﷺ کی خدمت میں گزرنے لگا۔ ایک دن چند دوسرے صحابہ کرامؓ کے ساتھ وہیں بارگاہِ نبوی میں حاضر تھے کہ قریش کے مردِ آہن حضرت عمرؓ بن خطاب نے دارِ ارقم کا دروازہ آ کھٹکھٹایا۔ ایک صاحب نے دروازے کی جھری میں سے جھانکا تو حضرت عمرؓ کو شمشیر بکف کھڑے پایا۔ (بعض روایتوں کے مطابق وہ تلوار کمر سے باندھے ہوئے تھے) انھوں نے حضورؐ کو بتایا تو صحابہ کو تردّد ہوا کہ معاملہ خون خرابے تک نہ پہنچے۔ اس وقت حضرت حمزہؓ اٹھ کھڑے ہوئے اور بڑے جوش سے کہا، اسے آنے دو اگر نیک ارادے سے آیا ہے تو خیر ورنہ اسی کی تلوار ہو گی اور اسی کا سر۔

حضرت عمرؓ اندر آئے تو حضورؐ نے ان کی چادر کو مٹھی میں دبا کر زور سے کھینچا اور فرمایا: ''عمر! کہو کس ارادہ سے آئے ہو؟'' نبوّت کی پُر جلال آواز نے حضرت عمرؓ کے جسم پر کپکپی طاری کر دی اور انھوں نے بڑے عجز کے ساتھ کہا۔ ''یا رسول اللہ میں اللہ اور اللہ کے رسول پر ایمان لانے کی غرض سے حاضر ہوا ہوں۔''

اس پر حضورؐ نے زور سے اللہ اکبر فرمایا، ساتھ ہی صحابہ کرامؓ نے اس زور سے نعرۂ تکبیر بلند کیا کہ دشت و جبل گونج اٹھے۔ اب حضرت حمزہؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کی صورت میں اسلام کو دو قوی دست و بازو مل گئے۔ ۷ بعدِ بعثت میں مشرکینِ مکہ نے بنو ہاشم اور بنی المطلب کو شعبِ ابی طالب

میں محصور کیا تو حضرت حمزہؓ بھی تین سال تک محصوری کے زہرہ گداز مصائب و آلام جھیلتے رہے۔ علامہ ابنِ سعدؒ کا بیان ہے کہ رحمتِ عالم ﷺ نے مکہ میں اپنے محبوب جاں نثار (آزاد کردہ غلام) حضرت زیدؓ بن حارثہ کو حضرت حمزہؓ کا اسلامی بھائی بنا دیا تھا۔ ۱۳ بعد بعثت میں حضوؐر نے صحابہ کرامؓ کو مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت دی تو حضرت حمزہؓ بھی اکثر دوسرے صحابہ کے ساتھ (حضوؐر کی ہجرت سے کچھ عرصے پہلے) ہجرت کر کے مدینہ منوّرہ تشریف لے گئے۔

عاصم بن عمر بن قتادہؒ کا بیان ہے کہ مدینہ پہنچ کر حضرت حمزہؓ نے حضرت سعدؓ بن خیثمہ کے مکان میں قیام فرمایا لیکن واقدی نے لکھا ہے کہ وہ صاحبِ رَحل رسول اللہ حضرت کلثومؓ بن الہدم کے مہمان بنے تھے۔ کچھ عرصے بعد سرورِ کونین ﷺ بھی مدینہ منوّرہ تشریف لے آئے اور اسلام کے مدنی دَور کا آغاز ہو گیا۔

(۳)

علامہ ابنِ سعد نے واقدی کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ اسلام میں سب سے پہلا عَلَم حضرت حمزہؓ کو عطا ہوا۔ رمضان ۱ ہجری میں سرورِ عالم ﷺ نے تیس سوار حضرت حمزہؓ کی امارت میں ساحلی علاقہ کی طرف اس غرض سے روانہ کیے کہ وہ قریش کے اس قافلے کی مزاحمت کریں جو اس زمانے میں شام سے مکہ آ رہا تھا۔ اس قافلے میں تین سو آدمی تھے جن میں ابو جہل بھی تھا۔ فریقین آمنے سامنے ہوئے تو مجدی بن عمرو الجہنی نے بیچ بچاؤ کر کے لڑائی تک نوبت نہ پہنچنے دی اور حضرت حمزہؓ کسی کشت و خون کے بغیر مدینہ منورہ واپس آ گئے۔

ابنِ سعدؒ نے اس مہم کا نام ''سریہ سیف البحر'' لکھا ہے لیکن فی الحقیقت صحیح بخاری کے مطابق ''سریہ سیف البحر'' ۸ ہجری میں پیش آیا۔ اس وقت اسلامی لشکر کے امیر حضرت ابو عبیدہؓ بن الجراح تھے۔ بعض روایتوں میں اس مہم کو سریۂ حمزہ کا نام دیا گیا ہے۔ اور یہی صحیح ہے۔

ایک روایت کے مطابق یہ مہم کسی خاص قافلے کی مزاحمت کے لیے نہیں بھیجی گئی تھی بلکہ عمومی طور پر قریش کے قافلوں کے تجسس کے لیے روانہ کی گئی تھی اور محض اتفاق سے اس کی مڈبھیڑ ابو جہل کے قافلے سے ہو گئی تھی۔

صفر ۲ ہجری میں سرورِ عالم ﷺ ساٹھ یا ستر صحابہ کرامؓ کے ہمراہ غزوۂ ودّان یا غزوۂ ابواء کے لیے تشریف لے گئے۔ اس غزوہ میں بھی حضوؐر نے حضرت حمزہؓ کو فوج کا قائد اور علم بردار

بنایا۔ اسلامی فوج کے ابواء پہنچنے سے پہلے ہی قریش کا قافلہ وہاں سے آگے بڑھ چکا تھا۔ اس لیے جنگ وجدال کا موقعہ پیش نہ آیا تاہم بنوضمرہ سے ایک دوستانہ معاہدہ طے پا گیا، جس کی رُو سے وہ اس بات کے پابند ہو گئے کہ نہ قریش کی مدد کریں گے اور نہ مسلمانوں کی بلکہ ہر حال میں غیر جانب دار رہیں گے۔

اسی سال جمادی الاخریٰ میں غزوۂ ذوالعشیرہ پیش آیا، جس میں رحمتِ عالم ﷺ ایک سو پچاس صحابہ کرامؓ کی معیت میں قریشِ مکہ کی گوشمالی کے لیے مقام ذوالعشیرہ تشریف لے گئے۔ اس غزوہ میں بھی حضورؐ نے مجاہدین کی علم برداری کا شرف حضرت حمزہؓ کو بخشا لیکن اس بار بھی کشت و خون تک نوبت نہ پہنچی کیوں کہ قریش کا قافلہ چند دن پہلے ہی ذوالعشیرہ سے کوچ کر چکا تھا البتہ بنومدلج سے باہمی امداد کا ایک عہد نامہ طے پا گیا۔

رمضان ۲ ہجری میں حق و باطل کا معرکۂ اول ''غزوۂ بدر الکبریٰ'' پیش آیا تو حضرت حمزہؓ اس میں بڑے جوش اور جذبے کے ساتھ شریک ہوئے۔ عام لڑائی شروع ہونے سے پہلے مشرکین کی صفوں سے عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ اور ولید بن عتبہ تلواریں ہلاتے ہوئے نکلے اور مسلمانوں کو دعوتِ مبارزت دی، لشکرِ اسلام سے تین انصار جان باز (عوفؓ، معاذؓ اور معوذؓ پسرانِ عفراء یا بروایتِ دیگر عوفؓ، معاذؓ اور عبداللہ بن رواحہ) ان کے مقابل ہوئے۔ قریشی جنگجوؤں کو جب معلوم ہوا کہ ان کے مقابل ہونے والے تینوں جان باز مدینہ کے باشندے ہیں تو انھوں نے ان سے نبرد آزما ہونے سے انکار کر دیا اور عتبہ نے پکار کر کہا۔ ''محمدؐ یہ لوگ ہمارے جوڑ کے نہیں ہیں، ہماری قوم اور کفو کے لوگوں کو ہمارے مقابلے پر بھیجو۔''

اس پر حضورؐ نے حضرت حمزہؓ، حضرت علیؓ اور حضرت عبیدہؓ بن حارث المطلبی کو حکم دیا کہ ''جاؤ ان لوگوں کا مقابلہ کرو۔'' یہ تینوں بہادر حضورؐ کا حکم سنتے ہی نیزے ہلاتے ہوئے اپنے حریف کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ حضرت حمزہؓ کا مقابلہ شیبہ سے، حضرت علیؓ کا ولید سے اور حضرت عبیدہؓ کا مقابلہ عتبہ سے ہوا۔ حضرت حمزہؓ اور حضرت علیؓ نے تو پہلے ہی وار میں اپنے اپنے حریف کو جہنم رسید کر دیا لیکن عتبہ اور عبیدہؓ دونوں دیر تک لڑتے رہے یہاں تک کہ دونوں زخمی ہو گئے۔ حضرت عبیدہؓ کا زخم نہایت شدید تھا۔ حضرت حمزہؓ اور حضرت علیؓ نے یہ صورتِ حال دیکھی تو دونوں نے ایک ساتھ حملہ کر کے عتبہ کو بھی ڈھیر کر دیا۔

بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت حمزہؓ کا مقابلہ عتبہ سے ہوا تھا۔ حضرت علیؓ کا شیبہ سے اور حضرت عبیدہؓ کا ولید سے۔ حضرت حمزہؓ اور حضرت علیؓ تو عتبہ اور شیبہ پر بہت جلد غالب آ گئے لیکن نوجوان ولید نے بوڑھے عبیدہؓ کو سخت زخمی کر دیا۔ اس پر حضرت حمزہؓ اور حضرت علیؓ آگے بڑھے اور آناً فاناً ولید کو خاک وخون میں لٹا دیا۔

عتبہ، شیبہ اور ولید کو ہلاک ہوتے دیکھ کر قریش کے ایک نامور جنگجو طعیمہ بن عدی کو سخت جوش آیا اور وہ بنکارتا ہوا میدانِ جنگ میں اترا، حضرت حمزہؓ فوراً اس کی طرف بڑھے اور ایک ہی وار میں اس کو جہنم واصل کر دیا۔ اب مشرکین نے مشتعل ہو کر عام ہلّہ بول دیا۔ مسلمانوں کی تعداد کفّار کی تعداد کی ایک تہائی سے بھی کم تھی لیکن انھوں نے اس پامردی اور شجاعت کے ساتھ مقابلہ کیا کہ کفار کا منھ پھر گیا۔ حضرت حمزہؓ اس شان سے لڑ رہے تھے کہ دستار پر شتر مرغ کی کلغی تھی اور دونوں ہاتھوں سے تلوار چلا رہے تھے۔ جدھر جھک پڑتے تھے کفار کی صفیں الٹ جاتی تھیں۔ اس دن ان کے ہاتھ سے بہت سے مشرکین ہلاک یا زخمی ہوئے ان میں سے بنومخزوم کا ایک جنگجو اسود بن عبدالاسد بن ہلال بھی تھا۔ یہ شخص نہایت کریہہ المنظر تھا۔ وہ میدانِ جنگ میں آیا تو بآوازِ بلند قسم کھا کر کہا کہ آج میں مسلمانوں کے حوض کا پانی ضرور پیوں گا اور اسے خراب کر ڈالوں گا۔ حضرت حمزہؓ اس کی ڈینگ سن کر غصّہ سے بے تاب ہو گئے۔ اور شیر کی طرح اس پر جھپٹے۔ ان کے پہلے ہی وار سے اسود کی ایک ٹانگ کٹ گئی اور وہ زمین پر گر پڑا لیکن ہمّت کر کے پھر اُٹھا اور گھسٹتا ہوا مسلمانوں کے حوض تک جا پہنچا۔ حضرت حمزہؓ بھی اس کے پیچھے پیچھے تھے۔ اسود نے حوض میں چھلانگ لگا دی لیکن حضرت حمزہؓ نے اس کو حوض میں ہی قتل کر دیا۔

مسلمانوں نے چند ساعت کی لڑائی کے بعد کفّار کو شکست فاش دی، ستر مشرکین میدانِ جنگ میں کام آئے۔ ان میں عتبہ، شیبہ، ولید، ابوجہل، نصر بن الحارث اور کئی دوسرے رؤسائے قریش بھی شامل تھے۔ تقریباً اتنے ہی مشرکین کو مسلمانوں نے قیدی بنالیا۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت حمزہؓ نے اسود بن عامر کو قیدی بنایا اسے بعد میں طلحہ بن ابی طلحہ نے دو ہزار دینار بہ طورِ فدیہ ادا کر کے رہا کرایا۔

طبرانی نے حضرت حارث تیمی سے روایت کی ہے کہ حضرت حمزہؓ یومِ بدر میں شتر مرغ کے پر کا نشان لگائے ہوئے تھے (جنگ کے بعد) مشرکین میں سے ایک شخص نے پوچھا کہ یہ کون

شخص ہے، جس نے شتر مرغ کے پَر کی کلغی لگا رکھی ہے۔ اسے بتایا گیا کہ یہ حمزہؓ بن عبد المطلب ہیں، اس نے کہا کہ اس شخص نے آج ہم کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ یہ استفسار اسیران بدر میں سے بعض نے کیا تھا۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ یہ حمزہؓ تھے تو انھوں نے کہا کہ حمزہؓ نے آج لڑائی میں ہم پر بڑے ستم ڈھائے ہیں۔

(۴)

شوال ۲ ہجری میں غزوۂ بنو قینقاع پیش آیا۔ یہودیانِ بنی قینقاع بڑے متموّل، طاقت ور اور جنگجو لوگ تھے۔ آہن گری اور زرگری ان کا خاص پیشہ تھا اور انھوں نے اپنی حفاظت کے لیے کئی قلعے بنا رکھے تھے۔ سرورِ کائنات ﷺ نے ہجرت کے بعد مدینہ منوّرہ میں نزولِ اجلال فرمایا تو اہلِ حق اور بنو قینقاع کے درمیان یہ دوستانہ معاہدہ طے پا گیا کہ وہ مسلمانوں کے خلاف دشمن کو مدد نہ دیں گے اور اگر باہر سے کسی نے مدینہ پر حملہ کیا تو وہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر دشمن کا مقابلہ کریں گے۔ لیکن یہ لوگ جلد ہی اپنے معاہدہ سے منحرف ہو گئے۔ غزوۂ بدر میں مسلمانوں کی کام یابی ان کو ایک آنکھ نہ بھائی اور وہ مسلمانوں کے خلاف طرح طرح کی یاوہ گوئیاں کر کے اپنے دل کے جلے پھپھولے پھوڑنے لگے۔ مسلمانوں کی فتح کی اہمیت وہ یہ کہہ کر گھٹاتے تھے کہ قریشِ مکہ فنِ حرب میں مہارت نہیں رکھتے تھے، مسلمانوں کا مقابلہ ہمارے ساتھ ہوتا تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ جواں مرد کیسے لڑتے ہیں۔

شوال ۲ ہجری میں ایک اتفاقی واقعہ نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ ایک مسلمان خاتون بنو قینقاع کے محلے میں کسی کام سے گئی۔ ایک یہودی نے اس کو چھیڑ کر بے حرمت کیا، یہ دیکھ کر ایک مسلمان غصہ سے بے قابو ہو گیا اور اس یہودی کو قتل کر ڈالا۔ یہودیوں نے اس غیرت مند مسلمان کو شہید کر ڈالا اور علانیہ سرکشی اور عہد شکنی پر آمادہ ہو گئے۔ مسلمانوں نے ان کو بہت سمجھایا لیکن ان کو اپنے ہتھیاروں اور قلعوں پر اتنا ناز تھا کہ کسی طرح اپنے مفسدانہ ارادوں سے باز نہ آئے۔ بالآخر نبی اکرم ﷺ نے ان کے خلاف لڑائی کا اعلان کر دیا اور ان کے محلے کا محاصرہ کر لیا۔ بنی قینقاع نے پندرہ دن تک قلعہ بند ہو کر مقابلہ کیا۔ اس کے بعد ان کی ہمت جواب دے گئی اور انھوں نے اس بات پر رضا مندی ظاہر کی کہ رسولِ کریم ﷺ جو فیصلہ کریں گے وہ

اس کی پابندی کریں گے۔ حضورؐ نے خزرج کے بعض اکابر سے مشورہ کر کے حکم دیا کہ بنوقینقاع مدینہ کی سکونت ترک کر کے باہر چلے جائیں۔ چناں چہ یہ لوگ مدینہ سے نکل کر ملک شام کے ایک ضلع ازرعات میں چلے گئے۔ ابنِ سعدؒ اور ابنِ ہشامؒ کا بیان ہے کہ غزوۂ بنوقینقاع میں بھی سرورِ عالم ﷺ نے حضرت حمزہؓ کو اسلامی فوج کا علَم مرحمت فرمایا۔ چناں چہ وہ شروع سے اخیر تک نہایت شجاعت اور استقلال کے ساتھ علم برداری کے فرائض انجام دیتے رہے۔

۳ ہجری میں مشرکینِ مکہ بدر کا انتقام لینے کے لیے بڑے جوش وخروش سے مدینہ منوّرہ پر چڑھائی کی۔ علم بردارانِ حق اور کفار ۷ رشوال کو کوہِ احد کے دامن میں ایک دوسرے کے مقابل ہوئے۔ اس وقت رحمتِ عالم ﷺ کے ساتھ کل سات سو جانباز تھے۔ جن میں سو زرہ پوش اور چند سوار تھے۔ ادھر مشرکین کی تعداد تین ہزار تھی جن میں دو سو سوار اور سات سو زرہ پوش تھے۔ مسلمانوں نے اُحد کا پہاڑ پیٹھ کے پیچھے رکھ کر اپنی صفیں درست کیں، حضورؐ نے پچاس تیراندازوں کا دستہ اس دَرّہ پر بٹھا دیا جدھر سے اندیشہ تھا کہ دشمن اس سے گزر کر عقب سے حملہ نہ کر دے۔ اس موقع پر حضرت حمزہؓ فوج کے ایک دستے کے افسر مقرر ہوئے، جس کا کوئی مجاہد زرہ پوش نہیں تھا۔ طبلِ جنگ بجا تو قریش کی عورتیں دَف پر یہ رجزیہ اشعار پڑھ کر اپنے مردوں کو لڑائی پر ابھارنے لگیں:

نَحنُ بَناتُ الطَّارِقِ	ہم نجمِ سحر کی بیٹیاں ہیں
نَمْشِیْ عَلَی النمارِقِ	ہم زین پوش کے منقش اور خوب صورت کپڑوں پر چلتی ہیں
مَشیَ القَطا البُوارِقِ	ہنس کی چال سے جس کو دیکھ کر آنکھیں خیرہ ہوتی ہیں
المِسکُ فِی المَفارِقِ	ہمارے سر مشک آلود ہیں
وَالدُّرُّ فِی المَخالِقِ	اور گردن کے ہاروں میں موتی پروئے ہوئے ہیں
اِنْ تَقبلُوا الغَانِقِ	اگر تم میدان جنگ میں آگے بڑھے تو ہم تم سے ہم آغوش ہوں گی
وَ نفرُشُ النَّمارِقِ	اور زین پوش کے منقش اور خوب صورت کپڑے تمہارے واسطے بچھائیں گی

اَوْ تُدْبِرُوا نُفَارِقِ — اور اگر تم نے پشت پھیری تو ہمارا تمہارا فراق ہے۔
فِرَاقَ غَيْرَ وَامِقِ — ایسا فراق کہ جیسے ہم تم کبھی دوست ہی نہ تھے۔

سب سے پہلے قریش کا علم بردار طلحہ بن ابی طلحہ صف سے نکلا اور مسلمانوں سے مخاطب ہو کر للکارا: ''تم میں کوئی ہے جو میرے سامنے آئے۔'' حضرت علی المرتضیٰؓ اس کے مقابلے کے لیے بڑھے اور ایک ہی وار میں اس کو واصل جہنم کر دیا۔ اس کے بعد عثمان بن ابی طلحہ رجز پڑھتے ہوئے آگے بڑھا، حضرت حمزہؓ اس پر جھپٹے اور شانہ پر اس زور سے تلوار ماری کہ کمر تک اتر آئی، اس کے ساتھ ہی انھوں نے نعرہ مارا ''یہ لے، میں ساقیِ حجاج (عبدالمطلب) کا بیٹا ہوں۔''

علامہ شبلی نعمانیؒ نے ''سیرۃ النبیؐ'' میں عثمان کو طلحہ کا بیٹا بیان کیا ہے۔ لیکن بعض دوسرے اہل سِیَر (ابنِ اثیرؒ، حاکمؒ اور حافظ ابنِ عبد البرؒ وغیرہ) نے عثمانؓ بن طلحہ کو صحابہ کرامؓ میں شمار کیا ہے۔ وہ فتح مکہ سے کچھ عرصے پہلے مشرف بہ اسلام ہوئے اور حضورؐ نے انھیں کعبہ کی کلید برداری کے خاندانی منصب پر بحال رکھا۔ ہمارا قیاس یہ ہے کہ غزوۂ احد میں حضرت حمزہؓ کے ہاتھ سے جو عثمان مارا گیا وہ ابی طلحہ کا بیٹا اور طلحہ کا بھائی تھا۔

قریش کا علَم اٹھا کر نکلنے والے جب کچھ اور آدمی بھی مسلمانوں کے ہاتھ سے یکے بعد دیگرے مارے گئے تو مشرکین نے عام ہلّہ بول دیا۔ حضرت حمزہؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابو دجانہؓ، حضرت سعدؓ بن ابی وقاص، حضرت طلحہؓ، حضرت سعدؓ بن معاذ، حضرت اسیدؓ بن حضیر اور بہت سے دوسرے سرفروش فوجوں کے دَل میں گھس گئے اور دشمن کی صفوں کی صفیں الٹ کر رکھ دیں۔ حضرت حمزہؓ اس شان سے لڑ رہے تھے کہ دو دستی (دونوں ہاتھوں سے) تلوار چلاتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے، میں اللہ اور اس کے رسول کا شیر ہوں۔ اسی حالت میں مکہ کا ایک سر برآوردہ مشرک سباع بن عبد العزیٰ ان کے سامنے آ گیا۔ حضرت حمزہؓ نے اس سے مخاطب ہو کر غضب آلود لہجے میں فرمایا اَوْ خَتَّانَةُ النِّسَاء ''عورتوں کا ختنہ کرنے والی'' اُمِ انمار کے بچے کیا تو خدا اور خدا کے رسولؐ سے لڑنے آیا ہے؟ یہ کہہ کر اس پر تلوار کا ایسا بھرپور وار کیا کہ وہ کٹ کر وہیں گر پڑا۔ اِدھر حضرت حمزہؓ اسی طرح لاشوں پر لاشیں گراتے جا رہے تھے اُدھر جبیر بن مطعم کا حبشی غلام وحشی ایک چٹان کے پیچھے گھات لگائے یہ انتظار کر رہا تھا کہ کب حضرت حمزہؓ اس کی زد میں آئیں اور وہ

اپنا ہتھیار ان پر پھینکے۔ وحشی کو جبیر بن مطعم نے اپنے چچا طعیمہ بن عدی (مقتولِ بدر) کا انتقام لینے کے لیے حضرت حمزہؓ کے قتل پر مامور کیا تھا اور اس کام کے عوض اس کو آزاد کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ اتفاق سے وحشی کو جلد ہی وار کرنے کا موقع مل گیا۔ حضرت حمزہؓ درانہ آگے بڑھ رہے تھے کہ یکایک ان کا پاؤں پھسل گیا اور وہ پیٹھ کے بل زمین پر گر پڑے۔ اسی وقت وحشی نے تاک کر اپنا چھوٹا سا بھالا ان پر پھینکا جو ناف میں لگا اور پار ہو گیا۔ حضرت حمزہؓ نے اس قدر شدید زخمی ہونے کے باوجود اٹھ کر اس پر حملہ کرنا چاہا مگر لڑکھڑا کر گر پڑے اور ان کی روحِ مطہر عالم بالا کو پرواز کر گئی۔ حضرت حمزہؓ کی شہادت پر مشرکین کو کمال درجے کی مسرت ہوئی اور ان کی عورتوں نے خوشی کے ترانے گائے۔ ہندہ بنتِ عتبہ (زوجۂ ابوسفیان) نے اپنے دل کی بھڑاس یوں نکالی کہ حضرت حمزہؓ کی نعش مبارک سے کان ناک ہونٹ (اور بہ روایتِ دیگر پوشیدہ اعضاء بھی) کاٹ لیے۔ اس کے بعد شکم چاک کر کے جگر نکالا اور اسے چبا چبا کر نگلنے کی کوشش کی مگر نگل نہ سکی اور تھوک دیا۔ پھر ایک بلندی پر چڑھ کر بلند آواز سے چند فخریہ اشعار پڑھے جن کا مفہوم یہ تھا کہ ''آج ہم نے بدر کی لڑائی کا بدلہ لے لیا اور وحشی نے میرا سینہ ٹھنڈا کر دیا۔ جب تک میں زندہ رہوں گی اس کا شکریہ ادا کرتی رہوں گی۔''

علامہ ابن سعدؒ کا بیان ہے کہ حضورؐ کو ہندہ کی مذموم حرکت کا علم ہوا تو آپؐ نے پوچھا کیا اس نے حمزہؓ کے جگر میں سے کچھ کھایا بھی ہے۔ لوگوں نے عرض کیا نہیں، آپؐ نے فرمایا:

''الٰہی حمزہؓ کے کسی حصۂ جسم کو جہنم میں داخل نہ ہونے دیجیو۔''

جنگ ختم ہوئی تو سرورِ کونین ﷺ اپنے محبوب چچا کی مثلہ کی ہوئی لاش پر تشریف لائے۔ اس وقت آپؐ سخت غم زدہ تھے۔ لاش کی حالت دیکھ کر آپ فرطِ الم سے بے قرار ہو گئے اور مخاطب ہو کر فرمایا۔ ''تم پر خدا کی رحمت ہو کیوں کہ تم اعزہ و اقربا کا سب سے زیادہ خیال رکھتے تھے اور نیک کاموں میں پیش پیش رہتے تھے اگر مجھے صفیہؓ (حضورؐ کی پھوپھی اور حمزہؓ کی بہن) کے رنج و غم کا خیال نہ ہوتا تو میں تمہاری لاش اسی طرح چھوڑ دیتا تا کہ اسے درندے اور پرندے کھا جائیں اور تم قیامت کے دن انھی کے پیٹ سے اٹھائے جاؤ۔''

ایک اور روایت میں ہے کہ اسی موقع پر حضورؐ نے فرمایا کہ مجھے جبریلِ امین نے بشارت دی ہے کہ حمزہؓ بن عبدالمطلب ساتوں آسمانوں پر اسد اللہ و اسد الرسول لکھے گئے ہیں۔

بعض روایتوں میں ہے کہ حضورؐ نے حضرت حمزہؓ کو اسد اللہ اور سید الشہداء کے القاب مرحمت فرمائے۔

ابنِ سعد نے ''طبقات الکبیر'' میں لکھا ہے کہ حضورؐ نے حضرت حمزہؓ کی نعش کی دردناک حالت دیکھ کر فرمایا: خدا کی قسم میں تمہارے بدلہ میں کفار کے ستر آدمیوں کا مثلہ کروں گا۔'' لیکن اسی وقت بارگاہِ خداوندی سے حکم نازل ہوا:

> ''اور اگر تم سزا دو تو ویسی ہی سزا دو جیسی تمہیں تکلیف پہنچائی گئی اور اگر صبر کرو تو بے شک صبر کرنے والوں کے لیے صبر سب سے اچھا ہے اور تم صبر کرو اور تمہارا صبر کرنا خاص اللہ ہی کی توفیق سے ہے۔'' (النحل: ۱۲۶، ۱۲۷)

یہ حکم نازل ہونے پر حضورؐ نے فرمایا کہ میں صبر کرتا ہوں اور انتقام نہ لوں گا۔ چناں چہ آپؐ نے صبر اختیار کیا اور اپنی قسم کا کفارہ ادا کر دیا۔

اسی اثنا میں حضرت حمزہؓ کی حقیقی بہن حضرت صفیہؓ بنت عبد المطلب لڑائی کا حال معلوم کرنے مدینہ سے نکلیں۔ حضورؐ نے ان کے صاحب زادے حضرت زبیرؓ کو بلا کر فرمایا کہ صفیہؓ، حمزہؓ کی لاش نہ دیکھنے پائیں۔ حضرت زبیرؓ نے ان کو لاش پر آنے سے منع کیا تو بولیں ''میں نے اپنے بھائی کا ماجرا سن لیا ہے لیکن اللہ کی راہ میں یہ کوئی بڑی قربانی نہیں۔'' حضورؐ نے اجازت دی تو لاش پر گئیں، عزیز بھائی کو ٹکڑے ٹکڑے دیکھ کر آنکھوں سے سیلِ اشک بہہ نکلا۔ لیکن انا للہ وانا الیہ راجعون کے سوا زبان سے اور کچھ نہ نکلا۔ واپس جاتے وقت حضرت زبیرؓ کو دو چادریں دے گئیں کہ ان میں ماموں کو مکفون کر کے دفن کرنا۔ لیکن قریب ہی ایک انصاری کی لاش پڑی تھی۔ حضرت زبیرؓ نے دونوں چادروں کو دونوں شہیدوں میں ایک ایک چادر تقسیم کر دی۔ اس ایک چادر سے حضرت حمزہؓ کا سر چھپایا جاتا تو پیر کھل جاتے اور پاؤں چھپائے جاتے تو سر برہنہ ہو جاتا آخر حضورؐ نے فرمایا کہ چہرہ اور سر کو چادر سے ڈھانپ دو اور پاؤں پر گھاس ڈال دو۔ اس طرح عمِ رسولؐ کا جنازہ تیار ہوا تو صحابہ کرامؓ رونے لگے۔ حضورؐ نے پوچھا کہ تم کیوں رو رہے ہو۔ عرض کیا، ''یا رسول اللہ ہمارے ماں باپ آپ پر قربان، آج ہم کو یہ توفیق بھی نہیں کہ آپؐ کے چچا کا سارا بدن کپڑے سے ڈھانک سکیں۔'' حضورؐ نے فرمایا، وہ زمانہ آنے والا ہے کہ لوگ (مسلمان) ایسے مقامات پر متصرف ہوں گے جہاں کھانے پینے پہننے اوڑھنے کی چیزوں اور سواریوں کی بہتات ہوگی اور وہاں سے وہ اپنے اہل وعیال کو مدینہ سے اپنے پاس آنے کو لکھیں گے۔

اس کے بعد رحمتِ عالم ﷺ نے سب سے پہلے حضرت حمزہؓ کی نمازِ جنازہ پڑھی پھر ایک ایک کر کے شہداء اُحد کے جنازے حضرت حمزہؓ کے پہلو میں رکھے گئے اور حضورؐ نے ہر ایک پر الگ الگ نماز پڑھائی۔ اس طرح اس دن حضرت حمزہؓ پر ستر مرتبہ نماز جنازہ پڑھی گئی۔ اس فضیلت میں کوئی اور حضرت حمزہؓ کا شریک وسہیم نہیں ہے۔ نمازِ جنازہ کے بعد حضرت حمزہؓ کو ان کے بھانجے حضرت عبداللہ بن جحش (المجدع فی اللہ) کے ساتھ ایک ہی قبر میں احد کے گنجِ شہیداں میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔

حافظ ابنِ حجر عسقلانیؒ نے اصابہ میں لکھا ہے کہ سینتیس سال بعد ۴۰ ہجری میں حضرت امیر معاویہؓ کے حکم سے اُحد کی طرف سے نہر نکالی گئی تو کھدائی کے دوران میں کئی شہداء کی لاشیں بالکل تر وتازہ حالت میں ملیں۔ اسی سلسلے میں اتفاق سے حضرت حمزہؓ کے پاؤں میں بیلچہ لگ گیا تو ان کے پاؤں سے خون کی چھینٹیں اس طرح اڑیں جیسے زندہ آدمی کو زخم لگنے سے خون نکلتا ہے۔

(۵)

ابنِ سعدؒ اور ابنِ ہشامؒ نے لکھا ہے کہ سرورِ عالم ﷺ کو اپنے محبوب چچا کی جدائی سے شدید صدمہ پہنچا تھا، جب آپؐ میدانِ اُحد سے واپس مدینہ منورہ تشریف لائے تو بنو عبدالاشہل اور بنو ظفر کے گھروں سے عورتوں کے رونے کی آواز آئی جو اپنے اپنے شہیدوں پر گریہ کناں تھیں، حضورؐ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے جو چہرۂ اقدس پر گرے۔ آپؐ نے فرمایا: ''افسوس آج حمزہؓ پر رونے والا کوئی نہیں۔'' جب حضرت سعدؓ بن معاذؓ اور اسیدؓ بن حضیر نے یہ بات سنی تو انھوں نے اپنی عورتوں کو ہدایت کی کہ ہر انصاری عورت اپنے متوفی پر رونے سے پہلے رسول اللہؐ کے ہاں جا کر حضرت حمزہؓ پر روئے۔ چناں چہ سب انصاری خواتین نے آستانۂ نبوی پر پہنچ کر بڑے درد کے ساتھ حضرت حمزہؓ پر رونا شروع کر دیا۔ اسی حالت میں حضورؐ کی آنکھ لگ گئی۔ تھوڑی دیر بعد بیدار ہوئے تو دیکھا کہ انصاری خواتین بہ دستور گریہ وزاری میں مشغول ہیں۔ آپؐ نے انھیں حکم دیا کہ اب واپس جاؤ اور آج کے بعد کسی مرنے والے پر رونے کی بہ جائے صبر سے کام لیا کرو۔

علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں کہ جب آں حضرت ﷺ میدان جنگ سے واپس آئے تو گھر کے دروازہ پر پردہ نشینانِ انصار کی بھیڑ تھی اور حضرت حمزہؓ کا ماتم ہو رہا تھا۔ آپؐ نے ان کے حق میں دعائے خیر کی اور فرمایا کہ میں تمہاری ہمدردی کا شکر گزار ہوں لیکن مردوں پر نوحہ کرنا جائز

نہیں۔ حضرت حمزہؓ سے رحمتِ عالم ﷺ کی بے پناہ محبت کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ چند سال بعد حضرت حمزہؓ کے قاتل وحشی بن حرب اسلام قبول کر کے حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؐ نے ان سے فرمایا: ''تم اپنا چہرہ مجھ سے چھپا سکتے ہو تو چھپالو (کیوں کہ تمھیں دیکھ کر حمزہؓ کا غم تازہ ہو جاتا ہے)۔ چناں چہ وہ پھر ساری عمر حضور پُرنور کی خدمت میں نہ جا سکے۔

صحیح بخاری میں خود حضرت وحشیؓ سے روایت ہے کہ ''جب اُحد سے لوگ واپس آئے تو میں چلا آیا اور مکہ میں اسلام کا چرچا ہونے تک مقیم رہا، پھر وہاں سے طائف چلا گیا۔ اہلِ طائف نے حضورؐ کے پاس کچھ قاصد بھیجے اور مجھ سے کہا کہ رسول اللہ ﷺ قاصدوں کو کچھ نہیں کہتے۔ چناں چہ میں بھی ان کے ہمراہ ہولیا۔ جب رسول اللہ ﷺ کے سامنے پہنچا اور آپؐ کی نظر مجھ پر پڑی تو فرمایا، کیا حمزہؓ کو تو نے شہید کیا تھا اور تیرا ہی نام وحشی ہے۔ میں نے (محجوب ہو کر) عرض کیا۔ جی ہاں یا رسول اللہ جو کچھ آپؐ کو معلوم ہے صحیح ہے۔ حضورؐ نے فرمایا، اگر تو میرے سامنے سے ہٹ سکتا ہے تو ہٹ جا۔ میں اسی وقت وہاں سے نکل گیا۔ جب رسول اللہ ﷺ نے وفات پائی اور مسیلمہ کذّاب نے خروج کیا تو میں نے اپنے دل میں کہا کہ مسیلمہ کے مقابلہ میں چلنا چاہیے اور اس کو قتل کرنا چاہیے شاید حضرت حمزہؓ کا بدلہ پورا ہو جائے۔ لہٰذا میں لوگوں کے ساتھ روانہ ہوا (اس کے بعد جو کچھ ہوا سو ہوا، جب میں یمامہ پہنچا تو) وہاں میں نے گندمی رنگ کے ایک ژولیدہ مو آدمی کو دیکھا جو ایک شکستہ دیوار کے پاس کھڑا تھا (یہ مسیلمہ کذّاب تھا) میں نے اپنا نیزہ اس کے سینے پر مارا اور دونوں ہاتھوں سے اس کے دونوں مونڈھوں کے درمیان پار کر دیا، اتنے میں ایک انصاری لپکا اور اس نے تلوار سے اُس کا سر جدا کر دیا۔''

اس طرح حضرت وحشیؓ بن حرب کی ذات سے اسلام کو جس قدر نقصان پہنچا تھا، اسی قدر اس سے فائدہ بھی پہنچا۔

(۶)

حضرت حمزہؓ نے اپنی زندگی میں کئی شادیاں کیں۔ بیویوں کے نام یہ ہیں، بنتِ لِمتہ بن مالک، ان سے یعلٰی اور عامر دو لڑکے پیدا ہوئے، خولہ بنتِ قیس، ان سے عمارہ پیدا ہوئے۔ سلمٰی بنت عمیس، ان سے ایک لڑکی اُمامہؓ پیدا ہوئیں۔ عمارہ اور عامر دونوں لاولد فوت ہو گئے۔

یعلیٰ سے چند اولادیں ہوئیں لیکن وہ سب بچپن ہی میں فوت ہوگئیں۔ اُمامہؓ حضورؐ کے ربیب حضرت عمرؓ بن ابی سلمہ مخزومیؓ سے بیاہی گئیں لیکن ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ اس طرح حضرت حمزہؓ کا سلسلۂ نسل نہ بیٹوں سے اور نہ بیٹی سے چلا۔ بعض بلوچ قبائل اپنے آپ کو حضرت حمزہؓ کی اولاد بتاتے ہیں لیکن ان کا دعویٰ قوی ثبوت کا محتاج ہے۔

علاّمہ ابنِ سعد کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علی کرم اللہ وجہ نے حضورؐ کو حضرت امامہؓ بنتِ حمزہؓ سے شادی کرنے کی ترغیب دی تو آپؐ نے فرمایا۔ ''وہ میرے دودھ شریک بھائی کی بیٹی ہے میرا نکاح اس سے کیسے ہوسکتا ہے؟''

ذی قعدہ ۷ھ میں رحمتِ عالمؐ عمرہ کے لیے مکہ معظّمہ تشریف لے گئے۔ صلح نامۂ حدیبیہ کی شرط کے مطابق تین دن کے قیام کے بعد آپ مکہ سے چلنے لگے تو حضرت حمزہؓ کی کمسن یتیم بچی اُمامہؓ یاعم یاعم کہتی ہوئی حضور کی طرف دوڑیں۔ حضرت علیؓ نے ان کو گود میں اٹھالیا اور اپنے ساتھ لے جاکر حضرت فاطمۃ الزہراؓ کے سپرد کردیا کہ یہ تمہاری بنتِ عم ہے۔ میں اس کو اٹھالایا ہوں۔ حضرت علیؓ کے بھائی حضرت جعفرؓ بن ابی طالب اور حضرت زیدؓ بن حارثہ نے حضرت امامہؓ کو اپنی آغوش تربیت میں لینے کے لیے حضورؐ کی خدمت میں الگ الگ دعوے پیش کیے۔ حضرت علیؓ کہتے تھے کہ امامہؓ میرے چچا کی لڑکی ہے اس لیے میں حق دار ہوں۔ حضرت جعفرؓ یہ کہہ کر اپنا استحقاق ظاہر کرتے تھے کہ وہ میری بنتِ عم ہے اور میری زوجہ (اسماءؓ بنت عمیس) کی بھانجی ہے۔ حضرت زیدؓ بن حارثہ کہتے تھے کہ وہ میرے (دینی) بھائی کی لڑکی ہے۔ اللہ اللہ یہ ناز اور محبت کی لڑائی ایک کمسن بچی کو پالنے کے حق پر ہو رہی تھی حالاں کہ اسلام سے پہلے یہی معصوم بچیاں زندہ زمین میں گاڑ دی جاتی تھیں۔

سرورِ عالم ﷺ نے اس منازعت کا فیصلہ حضرت جعفرؓ کے حق میں صادر فرمایا کیوں کہ ان کی زوجہ اسماءؓ بنت عمیس حضرت امامہؓ کی حقیقی خالہ تھیں اور خالہ بہ منزلہ ماں کے ہوتی ہے۔

(۷)

سیدنا حضرت حمزہؓ کے صحیفۂ اخلاق میں غیرت مندی، شجاعت، جانبازی، بے خوفی، صلۂ رحمی، حبِ رسول اور شوقِ جہاد سب سے نمایاں ابواب ہیں۔ خود لسانِ رسالت نے ان کے

محاسنِ اخلاق کی تحسین ان الفاظ میں فرمائی کہ ’’ وہ قرابت داروں کا سب سے زیادہ خیال رکھتے تھے اور نیک کاموں میں آگے آگے رہتے تھے۔‘‘

مبداء فیض نے انھیں سپاہیانہ اوصاف وخصائل سے نوازا تھا، سیر وشکار سے اس قدر لگاؤ تھا کہ حضورؐ کی بعثت کے پانچ سال بعد تک انھوں نے دعوتِ حق کی طرف توجہ ہی نہ کی لیکن جب ابوجہل کی کمینہ حرکت کی وجہ سے ان کی غیرت جوش میں آئی تو دفعتاً اسلام کے قوی دست و بازو بن گئے۔ قریش کے نامور پہلوان حضرت عمرؓ نے جب دارِارقم کے دروازے پر دستک دی تو قدرتاً صحابہ کے دل میں تردّد پیدا ہوا لیکن یہ حضرت حمزہؓ ہی تھے جنھوں نے کڑک کر کہا کہ عمرؓ کو آنے دو اگر اس کی نیت نیک نہ ہوئی تو اسی کی تلوار ہوگی اور اسی کا سر۔ ہجرت کے بعد اپنی شہادت تک انھوں نے بیش تر معرکوں میں جس شجاعت اور سرفروشی کا مظاہرہ کیا وہ انھی کا حصہ تھا۔

مولانا رومؒ نے مثنوی میں لکھا ہے کہ حضرت حمزہؓ جوانی میں ہمیشہ زرہ پہن کر لڑا کرتے تھے لیکن بعدِ شباب سعادت اندوز اسلام ہوئے تو زرہ پہننا بالکل ترک کر دیا اور لڑائیوں میں اس طرح شریک ہونے لگے کہ سینہ سامنے سے کھلا ہوتا اور دونوں ہاتھوں سے تلوار چلا رہے ہوتے۔ لوگوں نے پوچھا کہ اے عمِ رسول، اے صف شکن مجاہد، اے جواں مردوں کے سردار کیا آپ نے اللہ کا حکم نہیں سنا کہ جان بوجھ کر ہلاکت میں نہ پڑو۔ پھر آپ احتیاط سے کیوں کام نہیں لیتے۔ جب آپ جوان تھے اور مضبوط وطاقت ور، اس زمانے میں آپ کبھی زرہ کے بغیر لڑائی میں شامل نہیں ہوتے تھے، اب جب کہ آپ بوڑھے ہوگئے ہیں تو آپ اپنی جان کی حفاظت اور احتیاط کے تقاضوں سے کیوں بے پروا ہوگئے ہیں۔ بھلا تلوار کس کا لحاظ کرتی ہے اور تیر کس کی رعایت کرتا ہے ہم کو تو یہ پسند نہیں کہ آپ جیسا شیر بیشۂ شجاعت اپنی بے احتیاطی کی بہ دولت دشمن کے ہاتھوں قتل ہو جائے۔

حضرت حمزہؓ نے ان کی باتیں سن کر فرمایا کہ جب میں جوان تھا تو سمجھتا تھا کہ موت انسان کو اس دنیا کے عیش وآرام سے محروم کر دیتی ہے اس لیے کیوں خواہ مخواہ موت کی جانب رغبت کروں اور اژدہے کے منہ میں جاؤں یہی وجہ تھی کہ میں اپنی جان کی حفاظت کے لیے زرہ پہنتا تھا لیکن اسلام قبول کرنے کے بعد رسول اکرم ﷺ کے فیضان سے میرے خیالات بدل گئے۔ اب مجھ کو اس دنیائے فانی سے مطلق کوئی لگاؤ نہیں رہا اور موت مجھ کو جنت کی کنجی معلوم ہوتی

ہے۔ زرہ تو وہ پہنے جس کے لیے موت کوئی دہشت ناک چیز ہو۔ جس کو تم موت کہتے ہو وہ میرے لیے ابدی زندگی ہے۔

حضرت حمزہؓ ایک مردِ سپاہی تھے اس لیے مزاج قدرتاً تند و تیز تھا۔ صحیحین کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شراب کی حرمت کا حکم نازل ہونے سے پہلے اس کے عادی تھے۔ ایک مرتبہ انصار کی ایک محفل ناؤ نوش میں شریک تھے جس میں ایک خوش الحان مغنّیہ گا رہی تھی، قریب ہی ایک کے حجرہ کے صحن میں دو فربہ اونٹنیاں بندھی ہوئی تھیں، اس مغنیہ نے اونٹنیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ اشعار پڑھے:

اَلَا یَا حَمْزَۃُ لِلْشُرُفِ اللِّوَاءِ — وَ ھُنَّ مُعَقَّلَاتٌ بِالْغِنَاءِ
ضَعِ السِّکِّیْنَ فِی اللَّبَّاتِ مِنھا — وَ خَرِّجْھُنَّ حَمْزَۃُ بِالدِّمَاءِ
وَ عَجِّلْ مِنْ اَطَائِبِھَا لِشُرْبٍ — قَدِیْراً مِنْ طَبِیْخٍ اَوْ شِوَاءِ

(’’آگاہ ہو جاؤ اے حمزہ فربہ اونٹنیوں کے لیے اور وہ اونٹنیاں صحن میں بندھی ہوئی ہیں ان اونٹنیوں کی کلیجیوں کو ان کے خون کے ساتھ نکال لو اور جلدی کر وان کے جوہر کو پینے کے لیے خواہ ہانڈی کے اندر پکا کر یا بھون کر۔‘‘

یہ سن کر حضرت حمزہؓ نشہ کی حالت میں بے اختیار کودے اور اونٹنیوں کی کوہانیں کاٹ ڈالیں اور پہلو چیر کر کلیجہ نکال لائے۔ یہ اونٹنیاں حضرت علی کرم اللہ وجہ، کی تھیں۔ انھیں اپنی اونٹنیوں کے اس طرح مارے جانے پر سخت صدمہ ہوا۔ آبدیدہ ہو کر بارگاہِ رسالت میں شکایت کی۔ حضورؐ حضرت زیدؓ بن حارثہ کو ساتھ لے کر اسی وقت اس محفلِ طرب میں تشریف لے گئے۔ اور حضرت حمزہؓ کو اس حرکتِ بے جا پر ملامت فرمانے لگے۔ وہ اس وقت ہوش میں نہیں تھے، گھور کر حضورؐ کو دیکھا اور کہا۔ ’’تم سب ہمارے باپ کے غلام ہو۔‘‘

حضورؐ کو معلوم ہو گیا کہ اس وقت وہ اپنے آپے میں نہیں ہیں چناں چہ آپ واپس تشریف لے آئے۔ یہ ایک افسوس ناک واقعہ تھا، جس پر حضرت حمزہؓ کو یقیناً تاسّف ہوا ہوگا اور انھوں نے اس کی تلافی بھی کی ہوگی کیوں کہ وہ قرابت داروں کا بہت خیال رکھتے تھے۔ طبقات ابنِ سعد میں روایت ہے کہ ایک دفعہ حضرت حمزہؓ نے حضورؐ سے درخواست کی کہ آپؐ مجھے جبریلِ امینؑ کو ان کی اصلی صورت میں دکھا دیجیے۔ حضورؐ نے فرمایا۔ چچا آپ میں اتنی طاقت نہیں کہ

جبریلؑ کو اصلی صورت میں دیکھ سکیں۔'' لیکن حضرت حمزہؓ نے انھیں دیکھنے پر اصرار کیا۔ ایک دن جبریلؑ نازل ہوئے تو حضورؐ نے حضرت حمزہؓ سے فرمایا اپنی نگاہ اوپر اٹھایئے اور دیکھیے حضرت جبریلؑ اپنی اصلی صورت میں نازل ہوئے ہیں۔ حضرت حمزہؓ نے نگاہ اٹھائی تو حضرت جبریلؑ کے پاؤں دیکھ کر ہی غش آ گیا۔

امام حاکمؒ نے مستدرک میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں گزشتہ رات جنت میں داخل ہوا تو دیکھا کہ جعفرؓ ملائکہ کے ساتھ اڑ رہے ہیں اور حمزہؓ ایک تخت کے اوپر تکیہ لگائے بیٹھے ہیں۔

ابن اثیرؒ نے ''اُسدُ الغابہ'' میں حضرت حمزہؓ سے ایک حدیث بھی روایت کی ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ہر دعا میں یہ کلمہ ضرور کہا کرو۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّیۡ اَسۡئَلُکَ بِاسۡمِکَ الۡاَعۡظَمِ وَ رِضۡوَانِکَ الۡاَکۡبَرۡ۔

سیّدنا حضرت حمزہؓ کی بے مثل شجاعت اور جانبازی کو پیشِ نظر رکھ کر بعض لوگوں نے عجیب وغریب من گھڑت قصّے ان سے منسوب کر دیے ہیں اور انھیں داستانِ امیر حمزہؓ کا نام دے کر بڑے مزے لے لے کر بیان کیا ہے۔ فی الحقیقت ایسی تمام داستانیں لغویات کا پلندہ اور خرافاتِ محض ہیں۔ ایک جلیل القدر صحابی سے غلط باتیں منسوب کرنا یا انھیں پڑھنا اور سُننا نہ صرف وقت ضائع کرنے بلکہ خواہ مخواہ گناہ کمانے کا باعث ہے۔ حضرت حمزہؓ کی عظمت اور جلالت قدر ایسی وضعی داستانوں کی ہرگز محتاج نہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ سیّدنا حمزہؓ کی زندگی کے حقیقی واقعات ہی اتنے ولولہ انگیز ہیں کہ فرزندانِ اسلام کے خون کو تاابد گرماتے رہیں گے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت بِلال بن رباح حبشیؓ

(۱)

ہجرتِ نبوی کے کچھ عرصہ بعد کا ذکر ہے کہ رحمتِ عالم ﷺ کے ایک نا کت خدا جاں نثار نے اپنا گھر بسانا چاہا لیکن ان کی حالت یہ تھی کہ شادی کی مطلق استطاعت نہ تھی، زمین، مکان، مال، کوئی شے بھی تو ان کے پاس نہ تھی اور پھر وہ حسن ظاہری سے بھی محروم تھے، سیاہ رنگت، موٹے موٹے ہونٹ اور لاغر جسم —— سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک غریب الدیار شخص تھے۔ ان کا حبشی نژاد باپ مکہ کے خاندان بنوجمح کا غلام تھا اور غلام باپ کی طرح بیٹے نے بھی ہجرت سے پہلے سالہا سال مشرکینِ قریش کی غلامی میں گزارے تھے۔ مہاجرین اور انصار میں کسی سے اُن کا دُور پار کا رشتہ بھی نہ تھا۔ اگر ان میں کوئی خوبی تھی تو وہ صرف یہ تھی کہ شمع رسالت کے پروانوں میں شامل تھے اور سفر ہو یا حضر ہمیشہ خیر البشر ﷺ کی خدمت میں رہتے تھے۔ ان کو توقع نہیں تھی کہ ان جیسے مفلس اور غریب الوطن حبشی زادہ کو شرفائے عرب میں سے کوئی اپنی لڑکی کا رشتہ دینے پر آمادہ ہوگا۔ لیکن ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ جونہی انھوں نے شادی کی خواہش کا اظہار کیا تمام مہاجرین اور انصار نے جو شرفائے عرب کا خلاصہ تھے ان کے سامنے دیدہ و دل فرش راہ کر دیئے۔ ہر ایک نے بصد خلوص آگے بڑھ کر کہا کہ آپ کو اپنا خویش بنانے سے بڑھ کر ہمارے لیے کون سی عزت ہو سکتی ہے —— یہاں تک کہ ان صاحبِ رسولؐ کو رشتہ کا انتخاب مشکل ہو گیا۔

یہ حبشی نژاد صاحبِؓ رسولؐ کہ جن سے رشتۂ قرابت قائم کرنے میں مہاجرینؓ اور انصارؓ کے اکابر بھی مسرت اور فخر محسوس کرتے تھے سیّدنا بلالؓ بن رباح حبشی تھے۔

علامہ شبلی نعمانیؒ نے اس واقعہ کو ان الفاظ میں نظم کیا ہے:

بارگاہِ نبوی کے جو مؤذن تھے بلالؓ
کر چکے تھے جو غلامی میں کئی سال بسر
جب یہ چاہا کہ کریں عقد مدینہ میں کہیں
جا کے انصار و مہاجر سے کہا یہ کھل کر
ہوں غلام ابنِ غلام اور حبشی زادہ
یہ بھی سُن لو کہ مرے پاس نہیں دولت وزر
ان فضائل پہ مجھے خواہشِ تزویج بھی ہے
ہے کوئی جس کو نہ ہو میری قرابت سے عذر
گردنیں جھک کے یہ کہتی تھیں کہ دل سے منظور
جس طرف اس حبشی زادہ کی اٹھتی تھی نظر
عہدِ فاروقؓ میں جس دن کہ ہوئی ان کی وفات
یہ کہا حضرتِ فاروقؓ نے با دیدۂ تر
اٹھ گیا آج زمانہ سے ہمارا آقا
اُٹھ گیا آج نقیبِ حشمِ پیغمبر

اس مساوات پہ ہے معشرِ اسلام کو ناز
نہ کہ یورپ کی مساوات کہ ظلمِ اکبر

(۲)

حضرت ابوعبداللہ بلالؓ بن رباح کا شمار دربارِ رسالت کے اُن عظیم المرتبت اراکین میں ہوتا ہے کہ جن کا اسم گرامی سن کر ہر مسلمان کی گردن فرطِ احترام وعقیدت سے جھک جاتی ہے۔ طبرانیؒ اور بعض دوسرے اہل سِیَر نے لکھا ہے کہ رباح اصل کے اعتبار سے حبشی تھے وہ اپنی اہلیہ حمامہ کے ہمراہ مستقلاً مکہ میں آ بسے تھے اور قریش کے خاندان بنوجمح کی غلامی اختیار کی تھی۔ (یا انھیں غلام بنالیا گیا تھا) اسی غلامی کی حالت میں بعثتِ نبویؐ سے تقریباً اٹھائیس برس پہلے رباح اور حمامہ کے فرزند بلالؓ پیدا ہوئے۔ بلالؓ نے ہوش کی آنکھیں کھولیں تو چاروں طرف کفروشرک کی ضلالت کو محیط پایا۔ ان کا آقا اُمیّہ بن خلف جمحی بھی سخت مشرک تھا اسی کی غلامی میں انھوں نے زندگی کے اٹھائیس برس گزار دیے، اسی اثنا میں ان کے کانوں میں دعوتِ توحید کی صدا پہنچی۔ یہ بعثت کا بالکل ابتدائی زمانہ تھا اور سرورِ عالم ﷺ نے بڑی راز داری کے ساتھ تبلیغ حق کا آغاز فرمایا تھا۔ حضرت بلالؓ طبعاً نہایت نیک نفس اور پاک باز تھے اور غالباً بعثت سے پہلے بھی وہ حضورؐ کے اخلاق عالیہ سے متاثر ہو چکے تھے۔ چناں چہ صدائے توحید سنتے ہی انھوں نے بلا تامل اس پر لبیک کہا اور اپنا دل وجان رسول عربی ﷺ پر نثار کر بیٹھے۔ اربابِ سِیَر کا بیان ہے کہ وہ ان سات سعید الفطرت ہستیوں میں سے تھے جنھوں نے سب سے پہلے لوائے توحید کو تھاما۔ اس طرح ان

کو ''السابقون الاولون'' کی مقبولِ الٰہی جماعت میں بھی امتیازی درجہ حاصل ہوگیا۔

اُمیہ بن خلف کے کانوں میں حضرت بلالؓ کے قبولِ اسلام کی بھنک پڑی تو وہ آگ بگولا ہوگیا۔ اس نے حضرت بلالؓ کو بلا کر پوچھا:

''میں نے سنا ہے کہ تم نے کوئی اور معبود ڈھونڈ لیا ہے۔ سچ سچ بتاؤ تم کس معبود کی پرستش کرتے ہو؟''

حضرت بلالؓ نے بے دھڑک جواب دیا:

''محمد ﷺ کے خدا کی۔''

اُمیہ نے آنکھیں لال پیلی کر کے کہا:

''محمدؐ کے خدا کی پرستش کرنے کا یہ مطلب ہے کہ تو مقدس لات وعزیٰ کا دشمن ہوگیا ہے۔ سیدھی طرح راہِ راست پر آجاؤ ورنہ ذلت کے ساتھ مارے جاؤ گے۔ میں یہ ہرگز برداشت نہیں کر سکتا کہ تم لات وہبل کے نام لیوا کے غلام ہوکر محمدؐ کے خدا کی پرستش کرو۔''

حضرت بلالؓ صہبائے توحید کے نشہ میں مست ہو چکے تھے نتائج وعواقب سے بے پروا ہوکر جواب دیا۔

''میرے جسم پر تمھارا زور چل سکتا ہے لیکن میں اپنا دل اور اپنی جان محمدؐ اور محمدؐ کے خدا کے پاس رہن رکھ چکا ہوں۔ اب ذاتِ واحد کی عبادت ہی میری زندگی کا منتہائے مقصود ہے، تمہارے خودساختہ معبودوں کو پوجنا میرے بس کی بات نہیں۔''

امیہ بن خلف غیظ وغضب سے دیوانہ ہوگیا۔ ایک بے کس غلام اور یوں اس کے منہ آئے؟ اس نے کڑک کر کہا:

''اچھا تو پھر اپنی بے دینی کا مزہ چکھ۔ دیکھوں گا کہ محمدؐ اور محمدؐ کا خدا تمہیں کیسے چھڑاتے ہیں۔

یہ کہہ کر اس ظالم نے حضرت بلالؓ پر جور وستم کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع کر دیا۔ مکہ میں حرّہ کی زمین گرمی کے سبب سے مشہور ہے یہ دھوپ میں تانبے کی طرح گرم ہوجاتی ہے۔ اُمیہ دوپہر کے وقت حضرت بلالؓ کو گھر سے نکال کر لے جاتا اور حرّہ کی جلتی ہوئی بالو پر لٹا کر ایک بھاری پتھر ان کے سینے پر رکھ دیتا تاکہ جنبش نہ کر سکیں۔ پھر کہتا کہ محمدؐ کی پیروی سے باز آجا، اور

لات و عزیٰ کے معبودِ برحق ہونے کا اقرار کر لے ورنہ اسی طرح پڑا رہے گا۔ اس کے جواب میں شیدائے حق حضرت بلالؓ کی زبان سے اَحَدٌ اَحَدٌ کی آواز نکلتی تھی۔ امیہ غضب ناک ہو کر اس کو زدوکوب کرنا شروع کر دیتا لیکن وہ اَحَدٌ اَحَدٌ ہی کہے چلے جاتے۔ ایک دن تو اس ظالم نے شقاوت کی انتہا کر دی اس نے پوری ایک رات اور ایک دن حضرت بلالؓ کو بھوکا پیاسا رکھا اور تپتی ہوئی ریت پر ان کے رقصِ بسمل کا تماشا دیکھتا رہا۔

مشہور صحابی حضرت عمروؓ بن العاص سے روایت ہے کہ میں نے بلالؓ کو اس حالت میں دیکھا کہ اُمیّہ نے ان کو ایسی سخت تپتی ہوئی زمین پر لٹا رکھا تھا کہ جس پر گوشت رکھ دیا جاتا تو وہ گل جاتا مگر وہ اس حالت میں بھی کہہ رہے تھے کہ میں لات و عزّیٰ کا انکار کرتا ہوں۔ اُمیّہ نے دیکھا کہ اتنی سختیوں کے باوجود اس عاشق ذوالجلال کی جبینِ ہمت پر شکن تک نہیں پڑی تو اُس کی آتشِ غضب بھڑک اُٹھی اور اس نے اپنے دوسرے غلاموں اور بنو جمح کے لونڈوں کو ہشکار دیا کہ لات و ہبل کے اس باغی کو اتنی اذیتیں دو کہ وہ محمدؐ اور محمدؐ کے خدا کا نام لینا چھوڑ دے۔ یہ بد بخت اُمیّہ کی خوش نودی حاصل کرنے کے لیے حضرت بلالؓ کو بری طرح مارتے پیٹتے، دن کے وقت ان کے کپڑے اتروا کر لوہے کی زرہ پہناتے اور دھوپ میں ڈال دیتے، شام کو ہاتھ پاؤں باندھ کر ایک کوٹھڑی میں پھینک دیتے اور رات کو انھیں تازیانے رسید کرتے رہتے لیکن حضرت بلالؓ کی زبان سے اَحَدٌ اَحَدٌ کے سوا کچھ نہ نکلتا۔

علاّمہ ابنِ سعدؒ کا بیان ہے کہ امیّہ حضرت بلالؓ کے گلے میں رسی باندھ کر انھیں لونڈوں کے حوالے کر دیتا اور وہ انھیں مکے کی گھاٹیوں میں گھسیٹتے پھرتے، پھر جلتی ہوئی ریت پر لا کر اوندھے منھ لٹا دیتے اور ان پر پتھروں کا ڈھیر لگا دیتے لیکن حصرت بلالؓ، اَحَدٌ اَحَدٌ ہی کہے جاتے۔ شاعرِ دربارِ رسالت حضرت حسانؓ بن ثابت سے روایت ہے کہ میں زمانۂ جاہلیت میں حج (یا عمرے) کے لیے مکے گیا تو دیکھا کہ لڑکوں نے بلالؓ کو ایک رسی سے باندھ رکھا ہے اور اِدھر اُدھر گھسیٹ رہے ہیں لیکن وہ کہے جا رہے ہیں کہ میں لات و عزّیٰ اور ہبل اور اِساف اور نائلہ اور بوانہ سب کا انکار کرتا ہوں۔

غرض حضرت بلالؓ مدتِ مدید تک ایسے ایسے زہرہ گداز مظالم کی چکی میں پِستے رہے کہ ان کا حال پڑھ کر جسم پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے لیکن ان کی قوّتِ ایمان کا یہ عالم تھا کہ ع

بڑھتا تھا اور شوقِ ''گنہ'' ہر سزا کے بعد

ان کے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جو شدید زخمی نہ ہو چکا ہو لیکن کوئی بھی مصیبت، سختی اور اذیّت اُن کے قصرِ ایمان کے کنگوروں کو ذرّہ برابر جنبش نہ دے سکی۔

اتفاق سے سیّدنا ابوبکر صدیقؓ کا گھر بنوجمح کے محلے ہی میں تھا وہ آتے جاتے حضرت بلالؓ کو نِت نئے مظالم و شدائد کا نشانہ بنتے دیکھتے تو بے تاب ہو جاتے اور سوچنے لگتے کہ اس مظلوم کو مشرکین کے پنجۂ ستم سے کیسے چھڑایا جائے۔ ایک دن ان کا پیمانۂ صبر بالکل لبریز ہو گیا، اُمیّہ کے گھر تشریف لے گئے اور اس سے کہا:

''اے امیّہ اس بے گناہ اور بے کس غلام پر اتنا ظلم نہ کر وتمہارا اس میں کیا نقصان ہے کہ وہ خدائے واحد کی عبادت کرتا ہے اگر تو اس پر احسان کرے تو یہ احسان آخرت کے دن تیرے کام آئے گا۔''

اُمیّہ نے نہایت حقارت سے جواب دیا:

''میں تمہارے خیالی یومِ آخرت کا قائل نہیں۔ جو میرے جی میں آئے گا کروں گا۔''

صدیقِ اکبرؓ اس کے جواب سے دل برداشتہ نہ ہوئے اور بڑی نرمی سے سمجھایا کہ تم صاحبِ قوت ہو۔ اس بے کس غلام پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑنا تمہارے شایانِ شان نہیں۔ اس طرح عربوں کی قومی روایات کو بٹہ نہ لگاؤ۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کی گفتگو سے تنگ آ کر امیّہ نے کہا:

''ابن ابی قحافہ تم اس غلام کے اتنے ہمدرد ہو تو اسے خرید کیوں نہیں لیتے؟''

صدیق اکبرؓ نے جھٹ فرمایا۔ ''بولو کیا لو گے۔''

اُمیّہ نے کہا۔ ''تم اپنا غلام فسطاس رومی مجھے دے دو اور اسے لے جاؤ۔''

فسطاس بڑا کارگزار غلام تھا اور اہل مکہ کے نزدیک اس کی بہت زیادہ قیمت تھی۔ امیّہ کا خیال تھا کہ ابوبکرؓ اس کو دینے پر کبھی رضامند نہ ہوں گے۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ فوراً بولے: ''مجھے منظور ہے۔''

اُمیّہ حیران رہ گیا، ڈھٹائی سے بولا:

''فسطاس کے ساتھ چالیس اوقیہ چاندی بھی لوں گا۔''

حضرت ابوبکر صدیقؓ اس پر بھی رضامند ہو گئے۔
اُمیّہ نے بزعمِ خود بڑے نفع کا سودا کیا۔ جب صدیقِ اکبرؓ بلالؓ کو ساتھ لے کر چلنے لگے تو ہنس کر کہنے لگا:
''ابنِ ابی قحافہ تمہاری جگہ میں ہوتا تو اس غلام کو درم کے چھٹے حصے کے عوض بھی نہ خریدتا۔''
حضرت صدیقِ اکبرؓ نے فرمایا:
''اُمیہ تو اس غلام کی قدر و قیمت سے واقف نہیں مجھ سے پوچھو تو یمن کی بادشاہی بھی اس کی قیمت میں ہیچ ہے۔''
یہ کہہ کر حضرت بلالؓ کو آزاد کر دیا اور ساتھ لے کر بارگاہِ رسالتؐ میں پہنچے سارا واقعہ حضورؐ کو سنایا تو آپؐ بہت خوش ہوئے اور فرمایا:
''ابوبکرؓ اس کارِ خیر میں مجھے بھی شریک کر لو۔''
صدیقِ اکبرؓ نے عرض کیا۔ ''یارسول اللہؐ میں نے اسے آزاد کر دیا ہے۔''
بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے بھاری رقم دے کر حضرت بلالؓ کو خریدا اور پھر اللہ کی رضا جوئی کے لیے آزاد کر دیا۔ رحمتِ عالمؐ نے خوش ہو کر حضرت ابوبکر صدیقؓ کے حق میں دعائے خیر کی۔
مشرکین کے پنجۂ ستم سے رہائی پانے کے بعد حضرت بلالؓ نے اپنے آپ کو ہمہ تن رحمت عالم ﷺ کی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔ دُکھ ہو یا سُکھ، سفر ہو یا حضر، وعظ و تبلیغ کی مجالس ہوں یا جنگ کا میدان، وہ ہمیشہ حضورؐ کی خدمت میں حاضر رہتے تھے۔ سرورِ کونین ﷺ سے ان کی عقیدت اور محبت بلکہ عشق کی یہ کیفیت تھی کہ ؎

کسی کو دیکھتے رہنا نماز تھی تیری — ادائے دید سراپا نیاز تھی تیری

(۳)

۱۳ بعثت میں رحمتِ عالم ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو مدینہ منوّرہ کی طرف ہجرت کرنے کی ہدایت فرمائی تو حضرت بلالؓ بھی حضورؐ کے ارشاد کی تعمیل میں ہجرت کر کے مدینہ پہنچے اور حضرت سعدؓ بن خیثمہ انصاری کے مہمان ہوئے۔ سرور عالم ﷺ نے مدینہ منوّرہ میں نزولِ اجلال

فرمانے کے چند ماہ بعد جب مہاجرین اور انصار میں مواخاۃ کرائی تو حضرت بلالؓ کو حضرت ابورویحہؓ عبداللہ بن عبدالرحمٰن خثعمی انصاری کا اسلامی بھائی بنایا۔ان دونوں بھائیوں میں اس قدر محبت تھی کہ حضرت بلالؓ کو کہیں باہر جانا پڑتا تو اپنے تمام امور کی ذمہ داری حضرت ابورویحہؓ کو سونپ جاتے۔

علامہ ابن سعدؒ کا بیان ہے کہ حضرت بلالؓ شام کے جہاد میں شریک ہونے کے لیے مدینہ سے چلنے لگے تو امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ نے ان سے پوچھا کہ بلالؓ تمھارا وظیفہ کون وصول کرے گا۔انھوں نے جواب دیا:

''ابورویحہ، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے میرے ساتھ ان کا جو رشتۂ اخوت قائم فرمایا ہے وہ کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔''

غزوات کا سلسلہ شروع ہوا تو حضرت بلالؓ کو بدر سے لے کر تبوک تک تمام غزوات میں رحمتِ عالم ﷺ کی ہم رکابی کا شرف حاصل ہوا۔غزوۂ بدر میں وہ آٹا گوندھ رہے تھے کہ اُن کی نظر اُمیّہ بن خلف پر پڑی جسے حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف گرفتار کر کے لے جا رہے تھے۔ حضرت بلالؓ کو امیّہ کی اسلام دشمنی یاد آگئی اور وہ پکارنے لگے ـــــ ''اے انصار اللہ و انصار الرسول یہ اُمیّہ بن خلف مشرکوں کا سرغنہ ہے دیکھنا بچ کے نہ جانے پائے۔'' ان کی آواز سنتے ہی چند صحابہ کرامؓ اُدھر دوڑے اور آناً فاناً اُمیّہ کو جہنم واصل کر دیا۔

ایک روایت میں ہے کہ اُمیّہ کے ساتھ اس کا بیٹا علی بن امیّہ بھی مارا گیا۔ یہ دونوں اسلام کے بدترین دشمن تھے۔ بعض اہلِ سِیَر نے لکھا ہے کہ غزوۂ بدر میں حضرت بلالؓ نے ایک اور مشرک اُمیّہ بن ابی حذیفہ مخزومی کو گرفتار کر لیا۔ اسے بعد میں عبداللہ بن ربیعہ مخزومی نے چار ہزار دینار فدیہ دے کر رہا کرایا۔

ہجرت کے بعد مسجدِ نبوی کی تعمیر ہوئی اور اذان کی ابتدا ہوئی تو رحمتِ عالم ﷺ نے اذان دینے کی خدمت حضرت بلالؓ کے سپرد فرمائی۔ ابن سعدؒ نے قاسم بن عبدالرحمٰنؒ سے روایت کی ہے کہ ''بلالؓ اسلام کے سب سے پہلے مؤذّن ہیں۔''

حضرت بلالؓ کی آواز نہایت بلند اور دلکش تھی۔ حسنِ صوت کے ساتھ اس میں ایسی تاثیر تھی کہ جو سنتا سب کام چھوڑ چھاڑ والہانہ نماز کے لیے مسجد کی طرف لپکتا تھا۔

۸ ھ میں مکہ فتح ہوا تو حضرت بلالؓ حسبِ معمول سرورِ عالم ﷺ کے ہمرکاب تھے۔ تطہیر کعبہ کے بعد آپؐ نے حضرت بلالؓ سے فرمایا:

''اے بلالؓ کعبہ کی چھت پر کھڑے ہو کر توحید کی صدائے تکبیر بلند کرو۔''

حضرت بلالؓ نے حکم کی تعمیل کی۔ جب وہ اپنی دلکش آواز سے اَشْهَدُ اَنْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اور اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ پکار رہے تھے تو زمین و آسمان پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔

حضرت مولانا عبدالحق محدّث دہلویؒ اس وقت اور اس اذان کے بارے میں فرماتے ہیں:

''یہ وقت بھی اپنے اندر نہایت نعمت و بزرگی رکھتا تھا جس کے دامن جلال تک دستِ ادراک کی رسائی ناممکن ہے، اس وقت کی عظمت کو حاملانِ عرش سے پوچھنا چاہیے کہ حضرت بلالؓ کی اس اذان کی آواز وہاں تک پہنچتی تھی بلکہ اس سے بھی گزر گئی تھی۔ خداوندا اس وقت کے طفیل ہمیں دینِ اسلام پر ثابت قدم رکھ اور کلمۂ اسلام کو اور بلند فرما۔''

(۴)

۱۱ھ میں سرورِ کائنات ﷺ نے سفرِ آخرت اختیار فرمایا تو حضرت بلالؓ پر غم و اندوہ کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اپنے مخدوم و مطاع اور محبوب آقا کی جدائی نے ان کے دل کی دنیا اُجاڑ دی۔ طبرانی نے عبداللہؓ بن محمد، عمرؓ اور عمارؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد حضرت بلالؓ نے خلیفۃ الرسولؐ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا:

''اے خلیفۂ رسول میں نے آقا کو یہ فرماتے سنا کہ مومنین کے لیے سب سے افضل عمل جہاد فی سبیل اللہ ہے، میرا ارادہ ہے کہ اب میں تادمِ مرگ جہاد فی سبیل اللہ میں مشغول رہوں۔''

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا:

''اے بلال میں تمہیں خدا کا واسطہ دیتا ہوں اور اپنی حرمت اور اپنے حقوق کی قسم دے کر کہتا ہوں کہ میری عمر زیادہ ہو چکی ہے، میرے قواء کمزور ہو گئے ہیں اور میری وفات قریب ہے اس وقت تم مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ۔''

حضرت بلالؓ نے صدیق اکبرؓ کی بات مان لی اور مدینہ منورہ میں ہی ٹھہر گئے۔ صحیح بخاری اور طبقات ابنِ سعد کی روایتوں کے مطابق حضورؐ کی وفات کے بعد حضرت بلالؓ صدیقِ اکبرؓ کے

پاس گئے اور ان سے سوال کیا:

''اے خلیفۂ رسول کیا آپ نے مجھے خدا کے لیے آزاد کیا تھا یا اس لیے کہ میں آپ کے ساتھ رہوں۔''

حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا:

''میں نے تمھیں محض اللہ کے لیے آزاد کیا تھا۔'' اس پر حضرت بلالؓ نے درخواست کی کہ ''مجھے جہاد پر جانے دیجیے کیوں کہ میں اپنی بقایا زندگی اسی کام میں گزارنا چاہتا ہوں، جسے میرے آقاؐ نے مومن کا سب سے بہتر کام قرار دیا ہے۔'' لیکن حضرت ابو بکر صدیقؓ نے خدا کا واسطہ دے کر ان سے کہا کہ مجھے اس عالمِ پیری میں اپنی رفاقت سے محروم نہ کرو۔ حضرت بلالؓ ان کی بات مان تو گئے لیکن ساتھ ہی یہ شرط رکھی کہ میں اب رسول اللہ ﷺ کے بعد کسی کے لیے اذان نہ دوں گا۔

صدیقِ اکبرؓ نے فرمایا: ''تمھیں اس بات کا اختیار ہے۔''

ان روایات کے برعکس ابو نعیمؒ نے ''حلیہ'' میں حضرت سعید بن مسیّبؒ سے روایت کی ہے کہ جب حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا کہ میں نے تمھیں اللہ کے لیے آزاد کیا تھا تو انھوں نے کہا کہ پھر مجھے اللہ کے راستے میں جہاد کرنے کی اجازت دے دیجیے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے انھیں اجازت دے دی اور وہ شام جانے والے لشکر میں شامل ہو گئے لیکن بخاری اور ابنِ سعد کی روایات کے مقابلے میں حلیہ کی روایت کی سندی حیثیت کمزور ہے اس لیے اربابِ سِیَر میں سے اکثر کی یہی رائے ہے کہ حضرتِ بلالؓ حضرت عمر فاروقؓ کے عہدِ خلافت کی ابتدا میں جہاد کے لیے شام گئے اور رومیوں کے خلاف کئی معرکوں میں دادِ شجاعت دی۔

بیت المقدس کی تسخیر کے سلسلے میں حضرت عمر فاروقؓ کو بہ نفسِ نفیس شام جانا پڑا۔ ان کے بیت المقدس پہنچنے پر عیسائیوں نے شہر کے دروازے کھول دیے اور خلیفۃ المسلمین نے عیسائیوں سے معاہدۂ صلح مرتب کیا۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد انھوں نے مسلمانوں کے سامنے ایک فصیح و بلیغ خطبہ دیا۔ سامعین میں حضرت بلالؓ بھی موجود تھے۔ ان سے مخاطب ہو کر فرمایا:

"اے ہمارے سردار بلال آج اسلام کے قبلۂ اوّل پر پرچم توحید لہرایا ہے اس باعظمت موقع پر آپ اذان دیں تو ہم آپ کے شکر گزار ہوں گے۔"

حضرت بلالؓ نے عرض کیا:

"امیر المومنین میں عہد کر چکا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد کسی کے لیے اذان نہ دوں گا لیکن آج آپ کے ارشاد کی تعمیل میں اذان دیتا ہوں۔"

یہ کہہ کر اذان کے لیے کھڑے ہو گئے۔ جب ان کے منہ سے اللہ اکبر اللہ اکبر کے الفاظ نکلے تو صحابہ کرامؓ کے قلب و جگر کے ٹکڑے ٹکرے اڑ گئے۔ انھیں رحمتِ عالم ﷺ کے عہد مبارک کا سماں یاد آ گیا۔ جب وہ اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ پر پہنچے تو صحابہ کرامؓ روتے روتے نڈھال ہو گئے۔ فاروقِ اعظمؓ کو فراقِ رسولؐ نے تڑپا دیا اور روتے روتے ان کی ہچکی بندھ گئی۔ حضرت ابو عبیدہؓ اور حضرت معاذؓ بن جبل کا بھی یہی حال تھا۔ حضرت بلالؓ اذان سے فارغ ہوئے تو بڑی مشکل سے ان عاشقانِ رسولؐ کو قرار آیا۔

مؤرّخ یعقوبی کا بیان ہے کہ اپنے قیامِ شام کے زمانے میں ایک مرتبہ حضرت بلالؓ نے حضرت عمرؓ سے شکایت کی کہ امرائے شام پرند کے گوشت اور میدے کی روٹی کے سوا کچھ کھانا جانتے ہی نہیں۔ حضرت عمرؓ نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ یہ چیزیں وہاں بہت سستی ہیں۔ تاہم آپ نے تمام امراء سے اقرار لیا کہ وہ روزانہ فی کس دو روٹی، زیتون کا تیل اور سرکہ عام لوگوں میں تقسیم کریں گے اور مالِ غنیمت کی تقسیم بھی مساویانہ کریں گے۔

(۵)

شام کے معرکوں سے فارغ ہونے کے بعد حضرت بلالؓ نے وہیں کے ایک گاؤں "خولان" میں مستقل سکونت اختیار کر لی، ایک رات کو خواب میں دیکھا کہ حضورؐ پُر نور ﷺ تشریف لائے ہیں اور فرما رہے ہیں "اے بلالؓ کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ تم ہماری زیارت کے لیے آؤ۔" اس خواب نے اس عاشقِ صادق کا دل و دماغ جھنجھوڑ ڈالا۔ آتش فراق بھڑک اٹھی اور بے تابانہ مدینہ منوّرہ کا رُخ کیا۔ روضۂ اقدس پر حاضر ہوئے تو صبر و قرار کا یارانہ رہا اور فراقِ حبیبؐ میں اس درد سے روئے کہ دیکھنے والوں کی آنکھوں سے بھی سیلِ اشک رواں ہو گیا۔ اس موقع پر حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ بھی موجود تھے۔ اپنے محبوبؐ کے جگر گوشوں کو سینے سے لگا کر بار بار

ان کا منہ اور سر چومتے تھے۔ انھوں نے خواہش کی کہ ”بابا بلالؓ کل فجر کی اذان روضۂ رسولؐ پر آپ دیں۔“ بلالؓ اپنے آقا و مولاؐ کے جگر گوشوں کی خواہش کو کیسے ٹال سکتے تھے۔ فجر ہوئی تو روضۂ رسولؐ کے قریب (یا بہ روایتِ دیگر مسجدِ نبوی کی چھت پر) اذان کے لیے کھڑے ہو گئے۔ سارا مدینہ ان کی اذان سننے کے لیے اُمڈ آیا۔ جونہی انھوں نے اذان دینی شروع کی مدینہ منورہ کی پوری فضا حشر ساماں ہو گئی۔ رسول اکرم ﷺ کا عہدِ مبارک لوگوں کی آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ جب حضرت بلالؓ نے روضۂ اقدس کی طرف انگلی کا اشارہ کر کے اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہ کہا تو پردہ نشین خواتین بھی بے تاب ہو کر گھروں سے باہر نکل آئیں، روتے روتے لوگوں کی ہچکیاں بندھ گئیں ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ہادیِ برحق سید کونینؐ نے آج ہی وصال فرمایا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ کی رحلت کے بعد مدینہ منورہ میں ایسا دل دوز اور پُر اثر منظر آج تک کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔

علامہ ابن اثیر نے اسدُ الغابہ میں لکھا ہے کہ حضرت بلالؓ نے ۲۰ھ میں سفرِ آخرت اختیار کیا۔ اس وقت ان کی عمر ساٹھ برس کے لگ بھگ تھی۔ دمشق میں باب الصغیر کے قریب تدفین ہوئی ان کا مزار آج بھی مرجع خلائق ہے۔ اہل سِیَر نے لکھا ہے کہ امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ کو بلالؓ کی وفات کی خبر پہنچی تو وہ روتے روتے نڈھال ہو گئے۔ بار بار فرماتے تھے:

”آہ ہمارا سردار بلالؓ بھی ہمیں داغِ جدائی دے گیا۔“

علامہ ابنِ سعدؒ اور ابنِ عساکرؒ کا بیان ہے کہ حضرت بلالؓ نے اپنی زندگی میں متعدد نکاح کیے لیکن کسی بیوی سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ ان کی بیویاں عرب کے نہایت شریف اور معزز خاندانوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ ایک روایت کے مطابق ان کی ایک بیوی حضرت ابو بکرؓ کی صاحب زادی تھیں۔ ایک بیوی کا نام ہند الخولانیہ تھا۔ جو قبیلہ بنو زہرہ سے تھیں۔ ایک بیوی کا تعلق انصار کے قبیلہ خزرج کے خاندان عدی بن کعب سے تھا۔

(۶)

حضرت بلالؓ کے گلشنِ اخلاق میں سبقت فی الاسلام، تحمل شدائد، عشقِ رسولؐ، شوقِ جہاد، شغفِ عبادت اور جوشِ ایمان سب سے خوش رنگ پھول ہیں۔ سفر ہو یا حضر وہ ہمیشہ رحمتِ عالمؐ کی خدمت میں حاضر رہتے تھے۔ عیدین اور استسقا کے موقعوں پر برچھا لے کر حضورؐ کے آگے

آگے چلتے۔ حضورؐ کسی کام کا حکم دیتے تو اس کو انجام دینے میں اپنی جان لڑا دیتے۔ ان کی اسی وفا شعاری اور اخلاص نے ان کو حضورؐ کا خاص معتمد بنا دیا تھا، اور آپؐ نے اپنے بیش تر خانگی امور ان کے سپرد کر دیے تھے۔ وہ حضورؐ کے مؤذن ہی نہ تھے بلکہ ایک عابدِ شب زندہ دار بھی تھے اور فکرِ آخرت سے ہر وقت لرزہ براندام رہتے تھے۔ ان کی بیوی ہند کا بیان ہے کہ حضرت بلالؓ اپنے بستر پر لیٹتے تو فرماتے:

''الٰہی میرے گناہوں سے درگزر فرما اور میری بیماریوں میں مجھے معذور سمجھ۔''

صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک دن فجر کی نماز کے وقت حضورؐ نے حضرت بلالؓ کو بلا کر پوچھا:

''اے بلالؓ مجھے تم اپنا کوئی ایسا عمل بتاؤ، جس پر سب سے زیادہ اجر و ثواب کی امید ہو کیوں کہ میں نے اپنے آگے جنت میں تمہارے جوتوں کی چاپ سنی ہے۔''

عرض کیا: ''یا رسول اللہ میں نے ایسا عمل تو کوئی نہیں کیا البتہ رات دن میں میرا کوئی وضو ایسا نہیں ہے جس کے بعد میں نے نماز نہ پڑھی ہو۔''

حضرت بلالؓ کو بارگاہِ رسالت میں جو قرب حاصل تھا اس کی بنا پر تمام صحابہ کرامؓ ان کو نہایت محبوب و محترم جانتے تھے۔ صحیح بخاری میں حضرت جابرؓ بن عبد اللہ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے:

ابو بکر سیّدنا و اعتق سیّدنا یعنی بلالاً

''ابو بکر ہمارے سردار ہیں اور انھوں نے ہمارے سردار یعنی بلال کو آزاد کر دیا۔''

ایک مرتبہ حضرت بلالؓ کے ایک بھائی نے جو اپنے آپ کو عربی النسل ظاہر کرتے تھے، کسی عرب خاندان میں نکاح کا پیام بھیجا، ان لوگوں نے جواب میں کہلا بھیجا کہ ہم آپ کو نہیں جانتے ہاں اگر بلالؓ آکر تصدیق کریں کہ آپ واقعی ان کے بھائی ہیں تو ہمیں آپ کو رشتہ دینے میں کوئی عذر نہیں۔

حضرت بلالؓ نے تشریف لا کر کہا۔ ''صاحبو میں بلال بن رباح ہوں اور یہ میرا بھائی ہے، اس کی مذہبی اور اخلاقی حالت چنداں اچھی نہیں، تمہارا جی چاہے تو اپنی لڑکی اس سے بیاہ دو ورنہ انکار کر دو۔''

انھوں نے کہا۔ ''بلال جس کے آپ بھائی ہیں اس سے رشتۂ مناکحت قائم کرنا ہمارے لیے باعث صد افتخار ہے۔''

عہدِ فاروقی میں ایک مرتبہ قریش کے چند رؤسا حضرت عمر فاروقؓ سے ملاقات کے لیے گئے۔ اسی اثنا میں حضرت بلالؓ بھی وہاں آ پہنچے، حضرت عمرؓ نے سب سے پہلے حضرت بلالؓ کو اندر بلایا۔ اکابرِ قریش میں سے بعض پر یہ بات گراں گزری اور ان کے منہ سے نکل گیا کہ شرفاء قریش تو انتظار کر رہے ہیں اور بلال حبشی کو ان پر ترجیح دے کر شرفِ باریابی بخشا جا رہا ہے۔ اس موقع پر حضرت عکرمہؓ بن ابی جہل (اور بہ روایت دیگر حضرت سہیلؓ بن عمرو) نے کہا:

''داعیِ حقؐ نے ہم سب کو بیک وقت حق کی طرف بلایا لیکن ہم نے اس کے قبول کرنے میں تاخیر کی اور بلالؓ جیسے لوگ ہم پر سبقت لے گئے لہٰذا اب بھی وہی شرف اوّلیت رکھتے ہیں اور ہمیں شکایت کا کوئی حق حاصل نہیں۔''

حضرت بلالؓ کے جوشِ ایمان کی یہ کیفیت تھی کہ ایمان کو تمام اعمالِ حسنہ کی بنیاد سمجھتے تھے، ایک دفعہ کسی نے پوچھا کہ سب سے بہتر عمل کون سا ہے؟ فرمایا، اللہ اور اس کے رسولؐ پر صدق دل سے ایمان لاؤ، پھر جہاد فی سبیل اللہ کا فریضہ ادا کرو اور پھر حج بیت اللہ کا فرض ادا کرو۔

قبولِ اسلام کے بعد حضرت بلالؓ زہد و فقر میں ہمیشہ اپنے آقا و مولاؐ کے شریک رہے۔ اگر حضورؐ کو فاقہ ہوتا تو وہ بھی فاقہ سے ہوتے۔ اگر حضورؐ کو کوئی دُکھ پہنچتا تو وہ بھی سخت دکھی ہو جاتے۔ ترمذی شریف میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، ''اللہ کے راستے میں مجھے اتنا ڈرایا دھمکایا گیا کہ کسی اور کو اتنا نہیں ڈرایا گیا اور اللہ کی راہ میں مجھے اتنا ستایا گیا کہ کسی اور کو نہیں ستایا گیا اور ایک دفعہ تیس رات دن مجھ پر اس حال میں گزرے کہ میرے اور بلال کے لیے کھانے کی کوئی چیز ایسی نہ تھی کہ جس کو کوئی جان دار کھا سکے سوائے اس کے جو بلال نے اپنی بغل کے نیچے چھپا رکھا تھا۔

بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت بلالؓ چوں کہ عربی نژاد نہیں تھے۔ اس لیے اذان میں حائے حطی کے بہ جائے ہوزّ کا تلفظ ادا کرتے تھے۔ مکہ کے کچھ نو مسلم حضرات نے حضورِ پُر نور کی توجہ اس طرف دلائی تو آپؐ نے حضرت بلالؓ کے صِدق و نیاز اور اخلاص کی تحسین فرمائی اور ان کا اعتراض یہ فرما کر رَدّ کر دیا کہ:

''اللہ تعالیٰ کے نزدیک بلالؓ کی ہائے ہوز تمہاری حائے حطی سے بہتر ہے۔''

لیکن بعض اربابِ علم نے ان روایتوں پر تنقید کی ہے اور لکھا ہے کہ حضرت بلالؓ تمام حروف کے مخارج بالکل صحیح ادا کرتے تھے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

سیدنا حضرت بلالؓ نے صبر و استقامت اور صدق و اخلاص کے جو نقوش صفحۂ تاریخ پر ثبت کیے وہ ہر مسلمان کے لیے تا ابد مشعل راہ بنے رہیں گے۔ ان کا اسم گرامی سن کر ہر مسلمان کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی ہیں اور وہ تمنا کرتا ہے کہ کاش اس کو حضرت بلالؓ کے عشق رسول کا ہزارواں لاکھواں حصہ ہی نصیب ہو جائے اور یوں اس کی آخرت سنور جائے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت سعید بن زیدؓ

(۱)

رحمتِ عالم ﷺ کی بعثت سے پہلے سارا جزیرہ نمائے عرب کفر و شرک کا ظلمت کدہ تھا لیکن بعض قبائل میں خال خال ایسے افراد بھی مل جاتے تھے جو شرک اور جاہلی رسوم سے سخت متنفر تھے، وہ صدقِ دل سے توحید کے قائل تھے۔ اور دینِ ابراہیمی کی پیروی کرنا چاہتے تھے۔ ایسے ہی سعید الفطرت لوگوں میں ایک صاحب زید تھے۔ ان کا تعلق قریش کے نامور قبیلہ بنو عدی سے تھا وہ عمرو بن نفیل (بن عبد العزیٰ بن رباح بن عبد اللہ بن قرط زراح بن عدی بن کعب بن لوّی قرشی) کے فرزند اور حضرت عمر فاروقؓ کے چچازاد بھائی تھے۔ (کعب بن لوّی پر ان کا نسب رسولِ اکرم ﷺ سے مل جاتا ہے) زید عقیدۂ توحید میں بہت سخت تھے ان کو نہ صرف بُت پرستی اور شرک سے اجتناب تھا بلکہ وہ بتوں پر کی ہوئی قربانی، مردار اور خون کو بھی حرام سمجھتے تھے۔ بعض اربابِ سیَر نے لکھا ہے کہ زید شعر و شاعری میں بھی درک رکھتے تھے اور اپنے اشعار میں کفر و شرک کی علانیہ مذمّت کرتے تھے۔ بُت پرستی کی مذمت میں یہ شعر انھی سے منسوب ہیں۔

فلا العُزیٰ أدین ولاَ ابنتَیھَا ۔۔۔ وَلا صَمَی بنی طَسْمٍ ادیرُ
أربًّا واحدًا أمر ألف رَبٍّ ۔۔۔ أدینُ اذا تقسمّت الاموُرُ

''میں نہ عزیٰ پر ایمان رکھتا ہوں نہ اُس کی بیٹیوں پر اور نہ بنی طسم کے بتوں پر جب خدائی کے کام تقسیم ہو گئے تو میں ایک اللہ پر ایمان لاؤں یا ہزار خداؤں پر۔''

اسی طرح اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور کبریائی کے بارے میں بھی انھوں نے بہت سے شعر کہے جن میں سے کچھ یہ ہیں۔

اسلمت وجهی لمن اسلمت له المزن تحمل عذبا زلالا
واسلمت وجهی لمن اسلمت له الارض تحمل صخراً ثقالا
وحاها فلما استوت شدها سواء و أرسى عليها الجبالا

''میں نے اس ذات کے آگے اپنا سر جھکایا، جس کے آگے صاف اور شیریں پانی والے بادلوں نے اپنی گردن جھکادی۔ اور میں نے اپنا سر اُس کے آگے جھکا دیا، جس کے آگے بھاری چٹانوں کو ابھارنے والی زمین نے سر جھکایا۔ اس نے اس زمین کو بچھا دیا اور جب دیکھا کہ وہ پانی پر مضبوطی سے جم گئی ہے تو اس نے اس پر پہاڑوں کے لنگر ڈال دیے۔''

ایک شعر میں لات وعزّیٰ سے اپنی بریّت کا اظہار یوں کرتے ہیں ۔

ترکت اللات والعزیٰ جمیعاً کذٰلک یفعل الرجل البصیر

''میں نے لات وعزّیٰ سب کو چھوڑ دیا اور عقل مند آدمی ایسا ہی کرتا ہے۔''

بت پرستی اور رسومِ جاہلیت کی علانیہ مذمّت کرنا اور لوگوں کو دینِ ابراہیمی کی طرف بلانا ایسے کام نہ تھے کہ قریش انھیں ٹھنڈے پیٹوں برداشت کر لیتے۔ وہ زید کے سخت دشمن ہو گئے اور ان کی ایذا رسانی پر کمر باندھ لی، اس معاملے میں ان کے چچا خطاب (حضرت عمرؓ کے والد) سب سے زیادہ سرگرم تھے۔ انھوں نے زید کو اس قدر ستایا کہ وہ تنگ آ کر مکّہ سے نکل گئے اور حرار میں مقیم ہو گئے تاہم کبھی کبھی چھپ چھپا کر کعبہ کی زیارت کے لیے مکّہ آ جاتے تھے۔ نزولِ وحی سے چند سال پیش تر ایک مرتبہ رحمتِ عالم ﷺ اور زید کی وادیِ بلدح میں ملاقات ہوئی تھی۔ اس موقع پر حضورؐ کی طرح زید نے بھی بتوں پر چڑھایا ہوا ذبیحہ کھانے سے انکار کر دیا تھا۔ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے:

''رسول اللہ ﷺ بلدح کے نیچے زید بن عمرو بن نفیل سے ملے، یہ وہ زمانہ تھا جب آپؐ پر وحی نہیں آتی تھی۔ آپؐ کے سامنے دسترخوان بچھایا گیا، آپؐ نے کھانے سے انکار فرمایا، پھر زید نے کہا، تمھارے استھانوں پر ذبح ہوتا ہے میں اس کو نہیں کھاتا، میں وہی کھاتا ہوں جس پر اللہ کا نام لیا جائے۔ زید بن عمرو قریش کے ذبیحوں کو بُرا جانتے تھے اور کہتے تھے، بکری کو خدا نے پیدا کیا اور اسی نے اس کے لیے آسمان سے

پانی برسایا اور زمین سے اس کے لیے سبزہ اُگایا، پھر تم اس کا انکار کر کے اس کو غیر اللہ کے نام پر ذبح کرتے ہو اور اس (غیر اللہ) کی تعظیم کرتے ہو۔"

زمانۂ جاہلیت میں عرب میں دختر کُشی کا عام رواج تھا، ظالم باپ اپنی ننھی بچیوں کو زندہ دفنا دیا کرتے تھے۔ زید کو اس لرزہ خیز ظلم سے شدید نفرت تھی، ان کو جب کسی شقی القلب باپ کے ارادہ کا علم ہوتا تو وہ فوراً اس کے پاس جاتے اور لڑکی کو اپنی سرپرستی میں لے لیتے اس طرح انھوں نے بیسیوں معصوم بچیوں کی جانیں بچائیں اور ان کے جوان ہونے تک کفالت کی۔ حضرت اسماءؓ بنت ابی بکر صدیقؓ سے روایت ہے کہ "میں نے زید بن عمرو کو ان کے بڑھاپے میں دیکھا تھا، وہ کعبہ کی دیوار سے سہارا لگائے کھڑے تھے اور کہہ رہے تھے کہ اے گروہِ قریش واللہ میرے سوا تم میں سے کوئی دینِ ابراہیمؑ پر نہیں ہے۔ وہ موؤدہ کو جلا لیتے تھے (زندہ رکھتے تھے) جب کوئی شخص اپنی لڑکی کو قتل کرنا چاہتا تھا، وہ کہتے تھے، قتل مت کرو، میں اس کا بار اٹھاؤں گا۔ یہ کہہ کر لے جاتے تھے۔ جب جوان ہو جاتی تھی تو اس کے باپ سے کہتے تھے کہ اگر تم چاہو تو اس کو لے جا سکتے ہو ورنہ میرے پاس ہی رہنے دو، میں اس کے اخراجات برداشت کروں گا۔"

زید نے دینِ ابراہیمی کی تلاش میں شام موصل اور جزیرہ تک کا سفر کیا اور وہاں کے یہودی اور نصرانی علماء سے ملاقاتیں بھی کیں لیکن گوہر مقصود ہاتھ نہ آیا کیوں کہ ان لوگوں کے خیالات بھی مشرکین مکہ کے عقائد سے مشابہت رکھتے تھے اس پر انھوں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"الٰہی تو گواہ رہیو کہ میں دینِ ابراہیمؑ پر ہوں۔"

وہ یہ بھی کہا کرتے تھے کہ:

"اے اللہ اگر میں یہ جانتا کہ تیری عبادت کا کون سا طریقہ تجھے پسند ہے تو میں اسی طریقہ سے عبادت کرتا" —— پھر وہ اپنی ہتھیلی پر سر رکھ کر سجدہ کرتے۔

سرورِ عالم ﷺ کی بعثت سے پانچ سال قبل کسی نے بلادِ لخم میں زید کو قتل کر ڈالا۔ ابن ہشام کا بیان ہے کہ ورقہ بن نوفل نے ان کے واقعۂ قتل پر ایک دردناک مرثیہ کہا۔

مشہور تابعی حضرت سعید بن مسیّبؒ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ زید کے فرزند کے ساتھ بارگاہِ نبوّت میں حاضر ہوئے اور حضورؐ سے عرض کیا:

''یارسول اللہ زید کے خیالات کا آپؐ کو علم ہے کیا ہم ان کے لیے دُعائے مغفرت کریں۔''

آپؐ نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ زید بن عمرو کی مغفرت فرمائے اور ان پر رحم کرے ان کی وفات دینِ ابراہیمؑ پر ہوئی۔''

ایک اور روایت میں زید کے بارے میں حضورؐ کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ وہ قیامت کے دن تنہا ایک امت کی حیثیت سے اٹھیں گے۔

(۲)

زید بن عمرو نے بنوخزاعہ کی ایک خاتون فاطمہ بنت بعجہ سے شادی کی تھی انھیں کے بطن سے اس مردِ حق آگاہ کو اللہ تعالیٰ نے ایک ایسا سعید الفطرت فرزند عطا کیا کہ جس کی جلالتِ قدر پر اوجِ ثریا نے رشک کیا اور جس کے فضائل و محاسن تاریخِ اسلام کا ایک تاب ناک باب بنے۔ پاک نفس باپ نے اس فرزندِ گرامی کا نام سعید رکھا اور سعید واقعی اسم بامسمّٰی ثابت ہوئے۔ ابوالاعور سعیدؓ بن زید نے جب ہوش کی آنکھیں کھولیں تو اپنے گھر میں ہمیشہ خدائے واحد اور دینِ ابراہیمی کا چرچا سُنا۔ قیامت کے دن تنہا ایک اُمت کی حیثیت سے اٹھنے والے موحِّد باپ کی تربیت نے ان کے دل میں توحید سے گہرا لگاؤ پیدا کر دیا۔ چناں چہ سرورِ کائنات ﷺ نے بعثت کے بعد جونہی دعوتِ حق کا آغاز فرمایا، سعیدؓ لپک کر آگے بڑھے اور دینِ حنیف کے حلقہ بگوش بن گئے، ان سے پہلے صرف گنتی کے چند سلیم الفطرت اصحاب سعادت اندوزِ اسلام ہوئے تھے۔ حضرت سعیدؓ کی زوجہ فاطمہ بنت خطاب تھیں جو حضرت عمر فاروقؓ کی ہمشیرہ تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں بھی فطرتِ صالح سے نوازا تھا اپنے شوہر کے ساتھ ہی مشرّف بہ اسلام ہو گئیں اور یوں دونوں میاں بیوی اللہ کے ان پاک باز بندوں میں شامل ہو گئے جنھیں حق تعالیٰ نے سابقون الاولون کا خطاب دے کر کھلے لفظوں میں جنت کی بشارت دی ہے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت سعیدؓ اور حضرت فاطمہؓ بنت خطّاب سے پہلے صرف چھبیس آدمی ایمان لائے تھے۔ حضرت فاطمہؓ ستائیسویں مسلمان تھیں اور حضرت سعیدؓ اٹھائیسویں۔

حضرت سعیدؓ اور فاطمہؓ دونوں میاں بیوی کو قرآن حکیم سے عشق تھا۔ وہ کلام الٰہی کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے حضرت خبابؓ بن الارت کو وقتاً فوقتاً اپنے گھر بلاتے رہتے۔ حق کے نام لیواؤں کے لیے یہ سخت ابتلا کا دور تھا۔ مشرکین قریش اہلِ حق پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑنے میں شرافت اور انسانیت کی حدیں پھلانگ گئے تھے یہاں تک کہ رحمتِ عالم ﷺ ان کی شرانگیزی اور ایذا رسانی سے بچنے کے لیے اپنے چند جاں نثاروں کے ہم راہ حضرت ارقمؓ بن ابی الارقم کے گھر پناہ گزیں ہو گئے تھے جو کوہِ صفا کے دامن میں ایک وسیع اور محفوظ احاطہ تھا۔ اس زمانے میں حضرت فاطمہؓ کے شجاع بھائی حضرت عمرؓ بن خطاب بھی کفر وشرک کی ظلمتوں میں بھٹک رہے تھے اور سرور عالمؐ کے محبوب چچا حضرت حمزہؓ بن عبد المطلب کا بھی یہی حال تھا ان کو دعوتِ حق پر غور وفکر کرنے کے بہ جائے سیر وشکار سے زیادہ لگاؤ تھا۔ ایک دن حسبِ معمول شکار سے واپس آ رہے تھے کہ عبد اللہ بن جدعان کی ایک لونڈی ان کے راستے میں کھڑی ہو گئی اور طعن آمیز لہجے میں بولی:

''ابو عمارہ کاش تم تھوڑی دیر پہلے آتے تو دیکھتے کہ ابو جہل نے تمہارے بھتیجے محمدؐ کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے، وہ کعبہ میں اپنے مذہب کا وعظ کہہ رہا تھا کہ ابو جہل نے اس پر سبّ وشتم کی بوچھاڑ کر دی۔ مٹی اور گوبر پھینکا اور جسمانی ایذا بھی پہنچائی، افسوس کہ بنو ہاشم کے یتیم کی حمایت میں کوئی ہاتھ بلند نہیں ہوا ——''

حضرت حمزہؓ سرورِ عالمؐ کے چچا بھی تھے اور رضاعی بھائی بھی، خون اور دودھ کے جوش نے انھیں بے قرار کر دیا۔ سخت غیظ وغضب کے عالم میں اپنی کمان کھینچ کر خانۂ کعبہ کی طرف دوڑے، ابو جہل ابھی تک وہیں تھا اور قریش کے ایک مجمع میں بیٹھا لاف زنی کر رہا تھا۔ حضرت حمزہؓ جوش اور غصّہ میں بھرے ہوئے اس پر لپکے اور اپنی کمان اس کے سر پر اس زور سے ماری کہ لہولہان کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی اسے للکار کر کہا:

''تو محمدؐ کو گالیاں دیتا ہے حالاں کہ میرا دین بھی محمدؐ کا دین ہے اور جو کچھ وہ کہتے ہیں میں بھی وہی کہتا ہوں، تجھ میں ہمت ہے تو مجھے اس سے روک کر دیکھ۔''

اس پر بنو مخزوم کے کچھ لوگ ابو جہل کی حمایت کے لیے کھڑے ہو گئے لیکن اس نے کہا:

"ابو عمارہ کو چھوڑ دو میں نے واقعی آج اس کے بھتیجے کو بہت گالیاں دی تھیں، اس لیے اُس کو غصہ آ گیا ہے۔"

اس کے بعد حضرت حمزہؓ رحمتِ عالمؐ کی خدمت میں پہنچے اور کہا:

"برادر زادے خوش ہو جاؤ میں نے عمرو بن ہشام (ابوجہل) سے تمہارا بدلہ لے لیا ہے۔"

حضورؐ نے فرمایا:

"چچا جان میری خوشی تو اس میں ہے کہ آپ بت پرستی ترک کر کے دینِ حق کی پیروی کریں۔"

حضرت حمزہؓ یہ سن کر خاموش ہو گئے اور شش و پنج کی حالت میں گھر واپس آئے۔ ساری رات ہجومِ افکار میں گزری۔ صبح تک ان کے باطن کا دغدغہ دُور ہو گیا اور رحمتِ عالم کی خدمت میں پہنچ کر سعادت اندوزِ اسلام ہو گئے۔

(۳)

حضرتِ حمزہؓ کے قبولِ اسلام کی خبر مشرکینِ مکہ پر بجلی بن کر گری لیکن پرستارانِ حق بے حد مسرور ہوئے۔ اہلِ سِیَر کا بیان ہے کہ اسی زمانے میں حضورؐ نے ایک دن دعا مانگی:

"الٰہی قریش کے دوستونوں عمر بن خطّاب اور عمرو بن ہشام (ابوجہل) میں سے جس کو تو چاہے، ہدایت کا راستہ دکھا تاکہ تیرے دین کو تقویت پہنچے۔"

یہ دُعا اللہ تعالیٰ نے عجیب رنگ میں قبول فرمائی۔ حضرت حمزہؓ کے مشرف بہ اسلام ہونے کے بعد ابوجہل کی حالت مار دم بریدہ کی سی ہو گئی اس نے طیش میں آ کر اعلان کیا کہ جو شخص محمدؐ کو قتل کر کے اس کا سر میرے پاس لائے گا اس کو سو سرخ اونٹ یا ہزار اوقیہ چاندی انعام دوں گا۔ حضرت عمر بن خطّاب رشتہ میں ابوجہل کے بھانجے ہوتے تھے۔ (ان کی والدہ ابوجہل کی چچازاد بہن تھیں) اور شجاعانِ قریش میں شمار ہوتے تھے۔ ابوجہل نے انھیں سخت اشتعال دلایا یہاں تک کہ وہ تلوار کھینچ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور کہا، اس کام کو میں انجام دوں گا۔

یہ کہہ کر شمشیر بہ دست حضرت ارقمؓ کے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ اتفاق سے راستے میں ان کے قبیلہ کے ایک صاحب نعیمؓ بن عبداللہ النحام مل گئے، وہ دولتِ ایمان سے بہرہ یاب ہو چکے تھے۔ حضرت عمرؓ کے تیور دیکھ کر ان کا ماتھا ٹھنکا۔ انھوں نے پوچھا:

''عمر کدھر کا قصد ہے؟''

حضرت عمرؓ: بس آج اس شخص کا خاتمہ کرنے جاتا ہوں جس نے قریش میں تفرقہ ڈال رکھا ہے۔ ہمارے معبودوں کو بُرا کہتا ہے اور ہمارے دین میں کیڑے ڈالتا ہے۔

حضرت نعیمؓ: عمر، خدا کی قسم تمہارے نفس نے تم کو دھوکے میں ڈال دیا ہے، تم محمدؐ کو قتل کرنے میں کام یاب ہو گئے تو کیا بنو عبد مناف تمھیں زندہ چھوڑیں گے۔

حضرت عمرؓ: مجھے کسی کا خوف نہیں ہے معلوم ہوتا ہے کہ تم بھی صابی ہو گئے ہو۔ کیوں نہ پہلے تمہارا ہی سر اڑا دوں؟

حضرت نعیمؓ: تم مجھ کو بعد میں قتل کرنا پہلے اپنے گھر والوں کی تو خبر لو۔

حضرت عمرؓ: میرے کون سے گھر والے؟

حضرت نعیمؓ: تمہاری بہن فاطمہؓ اور بہنوئی سعیدؓ بن زید جو دونوں مسلمان ہو چکے ہیں۔(۱)

حضرت عمرؓ کو نعیمؓ کی باتیں سن کر سخت تاؤ آیا۔ سیدھے سعیدؓ بن زید کے گھر پہنچے۔ اس وقت سادس الاسلام حضرت خبابؓ بن الارت بھی حضرت سعیدؓ کے گھر موجود تھے اور دروازہ اندر سے بند کر کے حضرت سعیدؓ اور فاطمہؓ کو قرآن کی تعلیم دے رہے تھے۔ حضرت عمرؓ نے تلاوتِ قرآن کی آواز سنی تو ان کا غصّہ اور بھڑک اٹھا، دروازے پر زور سے دستک دی۔ تینوں پرستارانِ حق سمجھ گئے کہ یہ عمر ہیں۔ حضرت خبابؓ تو گھر کے پچھلے حصے میں روپوش ہو گئے اور حضرت فاطمہؓ نے کلامِ پاک کے اجزا جلدی سے کہیں چھپا کر دروازہ کھولا۔

حضرت عمرؓ نے گھر میں داخل ہوتے ہی پوچھا۔ ''یہ کیسی گنگناہٹ تھی جو ابھی میں نے سنی ہے؟''

حضرت سعیدؓ اور فاطمہؓ نے کہا۔ ''تم نے کچھ نہیں سنا۔''

حضرت عمرؓ سخت غضب ناک ہو کر بولے: ''نہیں میں نے سنا ہے، خدا کی قسم مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ تم دونوں بے دین ہو چکے ہو، میں تمھیں اس حرکت کا مزہ چکھاتا ہوں۔''

---

(۱) اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کو پہلی مرتبہ حضرت نعیمؓ کی زبانی اپنی بہن اور بہنوئی کے مسلمان ہونے کا علم ہوا لیکن صحیح بخاری کی ایک روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ ان کے اسلام سے پہلے ہی آگاہ تھے اور اسلام لانے کے جرم میں ان کو باندھ دیا کرتے تھے۔ (اس کی تفصیل آگے آئے گی)

یہ کہہ کر وہ حضرت سعیدؓ سے لپٹ گئے، ان کے لمبے بال پکڑ کر زمین پر دے مارا اور پھر بے تحاشا پیٹنا شروع کر دیا۔ حضرت فاطمہؓ شوہر کو پٹتے دیکھ کر بے تاب ہو گئیں اور بھائی کے ہاتھ سے انھیں چھڑانے کے لیے آگے بڑھیں۔ حضرت عمرؓ نے جوشِ غضب میں ایک لکڑی حضرت فاطمہؓ کے چہرے پر دے ماری جس سے وہ لہولہان ہو گئیں لیکن استقلال کا یہ عالم تھا کہ اسی حالت میں بولیں:

قد اسلمنا و تابعنا محمدًا فعل ما بدالک....

''ہاں ہم نے اسلام قبول کر لیا ہے اور محمد ﷺ کی متابعت اختیار کر لی ہے تو جو کچھ کر سکتا ہے کر لے۔ اسلام کا نقشِ ہدایت ہمارے سینے سے کبھی نہیں مٹ سکتا...''

خون میں نہائی ہوئی بہن کے منہ سے یہ الفاظ سن کر حضرت عمرؓ مبہوت ہو گئے ان کا غصّہ ندامت میں تبدیل ہو گیا اور بولے:

''اچھا تو جو کچھ تم پڑھ رہے تھے مجھے بھی دکھاؤ۔''

حضرت فاطمہؓ نے کہا۔ ''ہمیں ڈر ہے کہ تم اس کو ضائع کر دو گے۔''

حضرت عمرؓ نے اپنے معبودوں کی قسم کھا کر کہا کہ ''میں اسے پڑھ کر واپس کر دوں گا۔''

حضرت فاطمہؓ کو اب کچھ امید بندھی کہ شاید ان پر کلامِ الٰہی کا اثر ہو جائے۔

انھوں نے کہا:

''ہم خدا کا کلام پڑھ رہے تھے، جب تک تم غسل کر کے بدن پاک نہ کرو اس کلامِ پاک کو نہیں چھو سکتے۔''

حضرت عمرؓ نے اٹھ کر غسل کیا اور حضرت فاطمہؓ نے قرآن کے اجزا لا کر سامنے رکھ دیے۔ اس وقت سورۂ طٰہٰ ان کے سامنے آئی اسے ہی پڑھنا شروع کیا۔ ابھی بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم ہی پڑھی تھی کہ جسم پر لرزہ طاری ہو گیا، دل سے کفر و شرک کی ظلمت چھٹنے لگی۔ جوں جوں تلاوت کرتے جاتے تھے قرآن کریم کی شوکتِ الفاظ، قُدرتِ بیان اور فصاحتِ زبان انھیں مسحور کرتی جاتی تھی۔ جب اس آیت پر پہنچے:

اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰـهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ ۙ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِیْ ۝ (طٰہٰ: ۱۴)

”میں ہی اللہ ہوں۔ میرے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں تو میری ہی عبادت کیا کر اور میری یاد کے لیے نماز پڑھا کر(۱)۔“

تو ان پر رقت طاری ہوگئی اور بے اختیار پکار اٹھے۔

اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔

حضرت خبابؓ بن ارتؓ جو اندر چھپے ہوئے تھے اب باہر نکلے اور مسرّت بھرے لہجے میں کہا۔ ”اے عمر! مبارک ہو کہ رسول اللہ ﷺ کی دعا تیرے حق میں قبول ہوگئی۔ حضورؐ نے کل ہی دعا مانگی تھی کہ الٰہی عمرو بن ہشام (ابو جہل) یا عمرؓ بن خطاب میں سے جس کو تو چاہتا ہے اسلام میں داخل کر۔“

حضرت عمرؓ نے نہایت انکسار کے ساتھ حضرت خبّابؓ سے درخواست کی کہ مجھے جلد رسول اللہؐ کی خدمت میں لے چلو۔

حضرت خبابؓ، حضرت عمرؓ کو ساتھ لے کر حضرت ارقمؓ کے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ وہاں پہنچ کر دروازے پر دستک دی تو صحابہ کرامؓ نے دروازہ کھولنے میں تامّل کیا، شیرِ خدا حضرت حمزہؓ کو جوش آگیا، انھوں نے تلوار سونت لی اور کڑک کر کہا: ”عمر آتا ہے تو آئے اگر اس کی نیت نیک نہیں ہے تو خدا کی قسم اس تلوار سے اس کا سر اڑا دوں گا۔“

اس پر رحمتِ عالمؐ نے فرمایا، ”دروازہ کھول دو۔“

دروازہ کھلنے پر حضرت عمرؓ بے تابانہ اندر داخل ہوئے، حضرت خبابؓ پیچھے رہ گئے تھے۔ حضورؐ نے پوچھا، عمر کس نیّت سے آئے ہو؟

حضرت عمرؓ جلال نبوّت سے کپکپا اٹھے، سر جھکا کر نہایت دھیمے لہجہ میں کہا:

”اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے کے لیے۔“

یہ الفاظ سن کر صحابہ کرامؓ فرطِ مسرت سے بے خود ہوگئے، انھوں نے اس زور سے نعرۂ تکبیر بلند کیا کہ مکہ کی پہاڑیاں گونج اٹھیں۔

---

(۱) اس سلسلے کی روایات میں کچھ اختلاف ہے۔ بعض نے اسے سورۃ الحدید کا کوئی مقام بتایا ہے۔ بعض نے سورۂ طٰہٰ کی دوسری آیات نقل کی ہیں۔ بہ ہر صورت اس موقع پر حضرت عمرؓ کا قرآنِ حکیم کی کچھ آیات سننا ضرور ثابت ہے۔

حضرت عمرؓ کا قبولِ اسلام تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے۔ وہ اپنی جرأت، دلاوری، بے خوفی، فراست اور تدبّر کی بہ دولت اسلام کا ایک عظیم ستون ثابت ہوئے اور جریدۂ عالم پر ایسے نقوش ثبت کیے جو ابد الآباد تک ملتِ اسلامیہ کے لیے سرمایۂ افتخار اور مشعلِ راہ بنے رہیں گے۔ فاروقِ اعظمؓ کو حق کا حلقہ بگوش بنانے میں حضرت سعیدؓ بن زید اور فاطمہؓ بنت خطّاب کا بہت حصہ ہے۔ یہ ان کی استقامت اور اخلاص ہی کا نتیجہ تھا کہ بنوعدی کے مردِ آہن کا دل بھی پگھل گیا اور وہ آناً فاناً دشمنانِ حق کی صف سے نکل کر جاں نثارانِ اسلام کی صف میں آ گئے۔

(۴)

رحمتِ عالم ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو مدینہ منوّرہ کی طرف ہجرت کرنے کا حکم دیا تو حضرت سعیدؓ مہاجرین اوّلین کے ساتھ مدینہ پہنچے اور حضرت ابولبابہ انصاریؓ کے گھر قیام کیا۔ حافظ ابنِ حجرؒ نے تہذیب میں لکھا ہے کہ ہجرت میں ان کی اہلیہ بھی ساتھ تھیں۔ کچھ عرصے بعد جب حضورؐ نے مہاجرین اور انصار کے مابین مواخاۃ قائم کرائی تو حضرت سعیدؓ کو حضرت رافعؓ بن مالک زرقی انصاری کا اسلامی بھائی بنایا۔ (یہ ابنِ سعدؒ کا بیان ہے۔ ابن ہشامؒ اور ابنِ اثیر نے لکھا ہے کہ حضورؐ نے انھیں حضرت ابیؓ بن کعب کا اسلامی بھائی بنایا)

۲ھ میں بدر کے میدان میں حق و باطل کا معرکۂ اوّل پیش آیا تو حضرت سعیدؓ بن زید ان تین سو تیرہ نفوسِ قدسی میں سے ایک تھے جو اپنی بے سروسامانی کے باوجود کفر کی مہیب طاغوتی قوت سے محض اللہ کے بھروسے پر بھڑ گئے۔ واقدی، ابنِ سعد اور کچھ دوسرے اہلِ سِیَر نے لکھا ہے کہ غزوۂ بدر کے موقع پر سرورِ کائناتؐ نے حضرت سعیدؓ کو ایک خاص کام کے لیے حضرت طلحہؓ کے ساتھ شام کی طرف بھیجا تھا۔ وہ غزوہ ختم ہونے کے بعد مدینہ واپس آئے تاہم حضورؐ نے بدر کے مالِ غنیمت میں ان کا حصہ لگایا اور جہاد کے ثواب سے بہرہ ور ہونے کی بشارت بھی دی۔ لیکن صحیح بخاری میں واضح طور پر ان کا نام اصحابِ بدر کی فہرست میں درج ہے اور ایک دوسری روایت میں بھی ان کے نام کے ساتھ بدری کا لقب مذکور ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سعیدؓ نے عملی طور پر غزوۂ بدر میں شرکت کی تھی۔ بدر کے بعد دوسرے تمام غزواتِ نبویؐ میں بھی سرورِ عالم ﷺ کے ہمرکاب تھے۔ اُحد، خندق، خیبر، حنین اور طائف ہر معرکے میں انھوں نے کمال درجے کی

سرفروشی اور استقامت کا مظاہرہ کیا۔ ۶ ھ میں بیعتِ رضوان کا شرف حاصل کیا، فتح مکہ کے موقع پر ایک دستۂ فوج کے افسر تھے۔ غزوۂ عسرت (تبوک) میں طویل پُر صعوبت سفر کی تمام سختیاں ہنسی خوشی برداشت کیں۔ غرض قبول اسلام کے بعد کوئی شرف ایسا نہیں تھا جو انہیں حاصل نہ ہوا ہو۔

رسولِ اکرم ﷺ کے وصال کے کچھ عرصے بعد جب ایران اور روم سے کش مکش کا آغاز ہوا تو حضرت سعیدؓ شام جانے والے لشکر میں ایک سرفروش مجاہد کی حیثیت سے شریک ہو گئے۔ ۱۳ ھ (عہدِ صدیقی) میں اَجنادِین کا ہول ناک معرکہ پیش آیا، اس لڑائی میں نوّے ہزار رومی جنگ جو ایک نامور سردار وردان کی قیادت میں مسلمانوں کے مقابل ہوئے جن کی تعداد صرف بیس ہزار کے لگ بھگ تھی، مسلمان جان باز جن میں حضرت سعیدؓ بھی شامل تھے سر سے کفن باندھ کر لڑے اور اپنی قوتِ ایمانی کے بل پر کثیر التعداد رومی لشکر کو عبرت ناک شکست دی۔ اس کے بعد مسلمانوں نے دمشق کا رُخ کیا۔ اسی زمانے میں حضرت ابوبکر صدیقؓ نے وفات پائی اور خلافتِ فاروقی کا آغاز ہوا۔ اس وقت دمشق کا محاصرہ جاری تھا۔ اثنائے محاصرہ میں ہرقل نے ایک بڑی فوج اہلِ دمشق کی مدد کے لیے روانہ کی۔ سپہ سالارِ اسلام حضرت خالدؓ بن ولید کو اس فوج کی نقل و حرکت کی اطلاع ملی تو انھوں نے اپنی فوج کے ایک حصے کو محاصرے پر چھوڑا اور باقی فوج کے ساتھ دمشق سے ایک منزل دُور رومیوں کی امدادی فوج کے مقابل ہوئے۔ اسلامی لشکر کی صف بندی کرتے وقت انھوں نے حضرت سعیدؓ بن زید کو رسالہ کا افسر مقرر کیا، رومی لشکر نے حملہ کیا تو سب سے پہلے مسلمانوں کا رسالہ اس کی زد میں آیا۔ حضرت سعید نے بڑی جرأت اور استقامت کے ساتھ رومیوں کے پُر خروش حملے کو روکا، اس اثنا میں حضرت خالدؓ نے رومیوں کے میسرہ پر اور حضرت معاذؓ بن جبل نے میمنہ پر اس زور کا حملہ کیا کہ دشمن کے قدم اکھڑ گئے اور اسلامی رسالہ ان کے دباؤ سے آزاد ہو گیا۔ اس وقت حضرت سعیدؓ رومیوں پر اس طرح ٹوٹ کر گرے کہ ان کی تمام صفیں درہم برہم ہو گئیں اور وہ اپنے سینکڑوں آدمی کٹوا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ یہ لڑائی ''یوم مرج الصفر'' کے نام سے مشہور ہے۔ اسلامی لشکر مظفر و منصور واپس دمشق آ گیا اور تھوڑی ہی مدت کے بعد اس پر بہ زورِ شمشیر قبضہ کر لیا۔ دمشق کے بعد مسلمان قِنّسرین اور بعل بک کو مفتوح کر کے، حمص کی طرف بڑھے جو شام کا ایک اہم شہر تھا اور جہاں رومیوں نے

ایک زبردست لشکر جمع کر رکھا تھا۔ اس وقت شام کا ایک نامی جنگجو مریس، حمص کا حاکم تھا۔ اس نے پہلے تو شہر سے باہر نکل کر مسلمانوں کا مقابلہ کیا۔ لیکن جب ایک خون ریز لڑائی کے بعد مسلمانوں نے اسے شکست دی تو وہ قلعہ بند ہونے پر مجبور ہو گیا۔ مسلمانوں نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا اور اس کو فتح کرنے کے لیے بار بار حملے کیے لیکن اہل حمص نے سخت مزاحمت کی اور مسلمانوں کو پیچھے ہٹا دیا۔ بالآخر مسلمانوں نے ایک جنگی منصوبہ بنایا اور اس کے مطابق تھوڑے سے سوار اور معمولی سامان پیچھے چھوڑ کر سارا لشکر دمشق کا محاصرہ اٹھا کر ایک منزل دور چلا گیا۔ حاکم حمص مریس نے سمجھا کہ مسلمان بددل اور مایوس ہو کر پسپا ہو گئے ہیں۔ چناں چہ وہ اپنی فوج ساتھ لے کر قلعہ سے باہر نکلا اور مسلمانوں کی لشکر گاہ پر ہلہ بول دیا۔ مسلمان سواروں نے معمولی مقابلہ کیا اور پھر پیچھے ہٹنا شروع کر دیا۔ رومیوں کے دل بڑھ گئے اور انھوں نے تیزی سے مسلمانوں کا پیچھا کیا۔ اس طرح مسلمانوں کی چال کام یاب ہو گئی، بڑی اسلامی فوج نے دمشق سے کافی دور خفیہ مورچے قائم کر لیے تھے، جونہی رومی لشکر اس کی زد میں آیا، مجاہدین اسلام اس پر برق بے اماں کی طرح ٹوٹ پڑے۔ رومی جان توڑ کر لڑے لیکن جب حضرت سعیدؓ نے ان کے سردار مریس کا کام تمام کر دیا تو وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ نکلے۔ مسلمان اب طوفان کی طرح حمص کی طرف بڑھے، اہلِ حمص کو اپنا انجام صاف نظر آ رہا تھا۔ انھوں نے فوراً مسلمانوں کی اطاعت کا اعلان کر دیا اور شہر کے دروازے کھول دیے۔

حمص کی فتح کے بعد رجب ۵ھ ۶۳۶ء میں یرموک کی خون ریز جنگ پیش آئی، جس نے شام کی قسمت کا بڑی حد تک فیصلہ کر دیا، اس لڑائی میں حضرت سعیدؓ پیدل فوج کے افسر تھے، وہ ایسی شجاعت اور پامردی سے لڑے کہ جہاد کا حق ادا کر دیا۔

علامہ شبلیؒ نے الفاروق میں لکھا ہے کہ اثنائے جنگ میں رومیوں نے مسلمانوں کے میسرہ پر حملہ کیا۔ چوں کہ اس حصے میں اکثر لخم اور غسان کے قبائل تھے جن کے دلوں میں رومیوں کا رعب سمایا ہوا تھا اس لیے پہلے ہی حملے میں مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ گئے، لیکن افسر جمے رہے، انھیں میں حضرت سعیدؓ غصّے میں گھٹنے ٹیکے کھڑے تھے، رومی ان کی طرف بڑھے تو وہ شیر کی طرح جھپٹے اور مقدمہ کے افسر کو مار کر گرا دیا۔ حضرت سعیدؓ اور ان جیسے دوسرے مجاہدوں کی جان بازی کا

یہ نتیجہ ہوا کہ رومیوں کے ٹڈی دل کو عبرت ناک شکست ہوئی۔ اسی زمانے میں سپہ سالارِ اسلام حضرت ابو عبیدہؓ بن الجراح نے حضرت سعیدؓ کو دمشق کا حاکم مقرر کیا لیکن ان کے دل میں شوق جہاد کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ انھوں نے حضرت ابو عبیدہؓ کو لکھا کہ میں ایسا ایثار نہیں کرسکتا کہ آپ لوگ تو جہاد کریں اور میں اس سے محروم رہوں لہٰذا یہ خط پہنچتے ہی میری جگہ کسی اور کو بھیج دیجیے۔ پھر دمشق کی امارت سے استعفادے کر میدان جہاد میں پہنچ گئے۔ جب تک شام مکمل طور پر فتح نہ ہوگیا وہ برابر جہاد فی سبیل اللہ میں مشغول رہے ـــــ فتح شام کے بعد حضرت سعیدؓ مدینہ منورہ آکر گوشہ نشین ہوگئے۔

۲۳ھ میں امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ زخمی ہوئے تو حضرت سعیدؓ ان کے گھر میں تھے اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ بھی وہیں بیٹھے تھے، حضرت عمرؓ نے جو حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ سے ٹیک لگائے ہوئے تھے، فرمایا:

> ''دیکھو میں نے کلالہ کے متعلق کچھ نہیں کہا اور کسی کو اپنا جانشین نہیں بنایا، جو عرب اس وقت قید میں ہیں وہ سب آزاد ہیں۔''

حضرت سعیدؓ بولے: ''اگر آپ کسی مسلمان کو خلیفہ نامزد کردیں تو مسلمان آپ پر اعتماد کریں گے۔''

حضرت عمرؓ نے فرمایا: ''میں تو صرف ان چھ شخصوں کے اندر خلافت کو رکھوں گا جن سے رسول اللہ ﷺ وفات کے وقت تک راضی رہے اور جن میں بارِ خلافت اٹھانے کی صلاحیت بھی ہے۔''

پھر فرمایا:

> ''اگر سالمؓ مولیٰ ابی حذیفہؓ یا ابو عبیدہؓ بن الجراح میں سے اس وقت کوئی ہوتا تو میں اسے خلیفہ بنا کر مطمئن ہوجاتا۔''

جن چھ اصحاب کو حضرت عمرؓ نے خلافت کے قابل سمجھا ان کے نام یہ ہیں:

حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت سعدؓ بن ابی وقاص اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف۔

یہ سب عشرۂ مبشرہ میں سے تھے۔ اس لحاظ سے حضرت سعیدؓ بن زید بھی ان کے ہم مرتبہ تھے لیکن حضرت عمرؓ نے انھیں محض اس لیے خلافت کے لیے نامزد نہیں کیا کہ وہ ان کے اپنے خاندان (بنوعدی) سے تعلق رکھتے تھے۔ دوسرے کسی صاحب کا تعلق بنوعدی سے نہیں تھا۔

اس واقعہ کے بعد انھوں نے باقی تمام زندگی نہایت سکون اور خاموشی کے ساتھ گزاری۔ اس دوران میں ملکی سیاست میں کئی اتار چڑھاؤ آئے لیکن وہ ہر قسم کے ہنگاموں سے کنارہ کش رہے۔ تاہم ۳۵ھ میں امیر المومنین حضرت عثمان غنیؓ مظلومانہ شہید ہوئے تو وہ خاموش نہ رہ سکے اور ظالموں کی برملا مذمّت کی۔ اس زمانے میں وہ کوفہ میں مقیم تھے اس واقعہ کی خبر ہوئی تو انھوں نے کوفہ کی مسجد میں لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

> ''لوگو! خدا کی قسم میں نے اپنے آپ کو اس حال میں دیکھا ہے کہ اسلام لانے کے جرم میں عمرؓ مجھے اور اپنی بہن کو باندھ دیا کرتے تھے جب کہ وہ مسلمان نہیں ہوئے تھے اور تم نے عثمانؓ کے ساتھ جو بدسلوکیاں اور زیادتیاں کی ہیں، اگر ان کی وجہ سے کوہِ اُحد پھٹ جائے تو اس کا پھٹ جانا بجا ہے۔'' (صحیح بخاری کتاب المناقب)

حضرت سعیدؓ نے نواحِ مدینہ میں عقیق کے مقام پر مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ اسی جگہ انھوں نے باختلافِ روایت ۵۰ھ، ۵۱ھ یا ۵۲ھ میں جمعہ کے دن وفات پائی۔ جنازہ عقیق سے مدینہ لایا گیا، حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے غسل دیا اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے حنوط ملا اور نمازِ جنازہ پڑھائی۔ پھر حضرت سعدؓ اور ابنِ عمرؓ قبر میں اترے اور اسلام کے اس مہر درخشاں کو سپردِ خاک کر دیا۔

ایک دوسری روایت کے مطابق حضرت سعیدؓ نے کوفہ میں (بہ عہدِ حکومت حضرت امیر معاویہؓ) وفات پائی اور والیِ کوفہ حضرت مغیرہؓ بن شعبہ نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔ لیکن ابنِ سعدؒ اور کئی دوسرے اہلِ سِیَر نے پہلی روایت کو ترجیح دی ہے۔

عام طور پر بیان کیا جاتا ہے کہ وفات کے وقت حضرت سعیدؓ کی عمر ۷۰ یا ۷۳ برس کی تھی لیکن درایت کی رُو سے ان کی عمر اسی برس کے لگ بھگ ٹھہرتی ہے کیوں کہ ۶ نبوّت میں حضرت عمر فاروقؓ اسلام لائے تو حضرت سعیدؓ کی بھرپور جوانی تھی اور ان کی شادی بھی ہو چکی تھی۔ انھوں نے اپنے والد زیدؒ کو بھی اچھی طرح دیکھا تھا جو بعثت نبوی سے پانچ سال قبل قتل ہوئے تھے۔

قیاس یہ ہے کہ اس وقت ان کی عمر دس گیارہ برس سے کم نہیں ہوگی اور ۶ نبوّت میں وہ بیس بائیس برس کے لپیٹے میں ہوں گے اس حساب سے وفات کے وقت ان کی عمر اسی برس سے کچھ کم یا زیادہ تو ہو سکتی ہے ستر برس کسی صورت میں نہیں ہو سکتی۔

(۵)

حضرت سعیدؓ بن زید کا شمار ان دس عظیم المرتبت صحابہ میں ہوتا ہے جن کو رحمتِ عالم ﷺ نے خاص طور پر نام لے کر جنت کی بشارت دی تھی، یہ اصحاب ''عشرۂ مبشرہ'' کے عظیم الشان لقب سے مشہور ہیں۔ مشہور تابعی حضرت سعید بن مسیبؒ سے روایت ہے کہ حضرت سعیدؓ بن زید ان صحابہ میں سے تھے جو صفِ قتال میں نبی ﷺ کے آگے اور صفِ نماز میں حضورؐ کے پیچھے (قریب تر) رہا کرتے تھے۔

اپنے زہد و تقویٰ اور کثرتِ عبادت کی بہ دولت حضرت سعیدؓ کو ''مستجاب الدعوات'' کا درجہ حاصل ہو گیا تھا۔ امام مسلمؒ، حافظ ابن حجرؒ اور حافظ ابن عبد البرؒ نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ اروٰی بنت اویس نامی ایک عورت نے والیِ مدینہ مروان بن الحکم کے پاس شکایت کی کہ سعیدؓ بن زید نے اس کی زمین کا کچھ حصہ دبا لیا ہے۔ مروان نے ان کو طلب کر کے حقیقتِ حال دریافت کی تو فرمایا:

''تم میری نسبت گمان کرتے ہو کہ میں نے اس کی زمین کا کچھ حصہ غصب کر لیا ہے حالاں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ جو شخص ایک بالشت بھر زمین پر ظلم سے قبضہ کرے گا۔ قیامت کے دن اس کو (ویسی) سات زمینوں کا طوق پہنایا جائے گا۔''

مروان نے اس سے قسم کھانے کو کہا تو وہ اس زمین سے دست بردار ہو گئے لیکن دل گرفتگی کے عالم میں منہ سے یہ الفاظ نکل گئے:

''الٰہی اگر یہ عورت جھوٹی ہے تو اسے اندھا کر دے اور اس کو اسی کی زمین میں موت دے (یا اسے اس کے گھر کے کنوئیں میں گرا دے) اور مسلمانوں پر میرے حق کو بہ خوبی واضح کر دے۔''

خدا کی قدرت کچھ عرصے بعد اروٰی کی بینائی زائل ہو گئی اور پھر ایک دن وہ اسی حالت میں اپنے گھر کے کنوئیں میں گر کر مر گئی۔ اس کے بعد اہل مدینہ میں یہ ضرب المثل بن گئی۔

"اعماک اللہ کما اعمی الاروی"

"خدا تجھے اندھا کرے جیسا کہ اروٰی کو اندھا کیا۔"

حضرت سعیدؓ کا ایک خاص وصف حق گوئی تھا۔ ایک مرتبہ وہ جامع کوفہ میں والیِ کوفہ حضرت مغیرہؓ بن شعبہ کے پاس بیٹھے تھے کہ ایک شخص نے آکر علی کرم اللہ وجہٗ کی شان میں کچھ نامناسب الفاظ کہے۔ حضرت سعیدؓ تڑپ اٹھے اور فرمایا:

"مغیرہ، لوگ تمہارے سامنے اصحابِ رسولؐ کو برا بھلا کہتے ہیں اور تم ان کو نہیں روکتے۔ علیؓ ان لوگوں میں ہیں جن کو خود رسول اللہ ﷺ نے جنت کی بشارت دی ہے۔"

حبِ رسولؐ شوقِ جہاد، زہد و تقویٰ، ایثار و اخلاص اور خشیتِ الٰہی حضرت سعیدؓ بن زید کے چمنِ اخلاق کے سب سے خوش رنگ پھول تھے ــــ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ فرماتے ہیں کہ "سعیدؓ بن زید کا دامنِ عمل کبھی معصیت کی آلودگیوں سے داغ دار نہیں ہوا اور وہ ہمیشہ اتباعِ رسول میں کوشاں رہتے تھے۔"

حضرت سعیدؓ نے مختلف اوقات میں متعدد شادیاں کیں جن سے کثیر اولاد ہوئی۔ اہلِ سیَر نے ان کے چودہ لڑکوں اور بیس لڑکیوں کے نام صراحت سے لکھے ہیں۔ واقدی نے لکھا ہے کہ سعیدؓ بن زید طویل القامت گندم گوں تھے اور ان کے سر پر لمبے اور گھنے بال تھے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت شرحبیل بن حسنہؓ

(۱)

غزوۂ خیبر ۷ھ کے کچھ عرصے بعد کا ذکر ہے ایک دن مشہور صحابیہ حضرت شفاءؓ بنتِ عبداللہ رحمتِ عالم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئیں اور اپنی ضروریات بیان کر کے آپؐ سے کچھ مانگا۔ حضورؐ کا سحابِ جودوسخا ہر حاجت مند پر جھوم جھوم کر برستا رہتا تھا، لیکن اتفاق سے اس وقت آپؐ کے پاس حضرت شفاءؓ کو دینے کے لیے کوئی چیز نہیں تھی۔ آپؐ نے معذرت فرمائی، لیکن حضرت شفاءؓ برابر اصرار کرتی رہیں۔ اتنے میں نماز کا وقت آگیا اور حضورؐ مسجد کی طرف روانہ ہوئے۔ حضرت شفاءؓ بارگاہِ نبوی سے اٹھ کر اپنی بیٹی کے گھر چلی گئیں جو قریب ہی تھا۔ وہاں دیکھا کہ اُن کے داماد گھر میں بیٹھے ہیں اور نماز کے لیے مسجد نہیں گئے۔ کسی صاحب رسول کا اذان کی آواز سن کر نماز کے لیے مسجد نہ جانا بڑی عجیب، بلکہ انہونی بات تھی۔ حضرت شفاءؓ نے داماد کو ملامت کی کہ نماز کا وقت ہو گیا اور تو گھر میں بیٹھا ہے۔ انھوں نے عرض کیا:

''خالہ جان، مجھے ملامت نہ کیجیے، میرے پاس ایک ہی پرانی قمیص تھی جسے میں نے پیوند لگا رکھا تھا، رسول اللہ ﷺ نے وہ مجھ سے عاریتاً لے لی، کیوں کہ آپؐ کے پاس پہننے کے لائق کوئی کپڑا نہ تھا۔ اب مجھے شرم محسوس ہوتی ہے کہ ننگے بدن (صرف تہد کے ساتھ) مسجد جاؤں اور لوگوں کو بتاتا پھروں کہ حضورؐ نے میری قمیص عاریتاً لے لی ہے۔''

داماد کا جواب سن کر حضرت شفاءؓ بہت پشیمان ہوئیں اور بولیں:

''میرے ماں باپ رسول اللہؐ پر قربان جائیں، مجھے کیا معلوم تھا کہ حضورؐ کا یہ حال ہے، میں تو صبح سے آپؐ سے کسی چیز کے لیے اصرار کر رہی تھی اور آپؐ عذر فرما رہے تھے۔''

حضرت شفاءؓ بنتِ عبداللہ کے یہ سعادت مند داماد، جو رحمتِ عالم علیہ پر دل و جان سے فدا تھے، حضرت شرحبیل بن حسنہؓ تھے۔

(۲)

حضرت ابوعبداللہ شرحبیل بن حسنہؓ کا شمار رحمتِ عالم علیہ کے ان جاں نثاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنی زندگیاں دینِ حق کو سربلند کرنے کی جہدِ مسلسل میں گزار دیں اور اس راہ میں کسی بڑی سے بڑی مصیبت کو خاطر میں نہ لائے۔ علاّمہ ابنِ اثیر نے اسد الغابہ میں لکھا ہے کہ حضرت شرحبیلؓ کے والد کا نام عبداللہ بن مطاع بن عبداللہ لکھا ہے۔ لیکن ابنِ حزم کے بیان کے مطابق ان کا نام عبداللہ بن عمرو بن مطاع تھا (جمہرۃ انساب العرب)۔ بعض روایات میں ہے کہ حضرت شرحبیل کا تعلق بنوتمیم سے تھا، لیکن جمہور اہل سِیَر نے انھیں کِندی بتایا ہے۔ شرحبیلؓ ابھی کم سن ہی تھے کہ سایۂ پدری سے محروم ہوگئے۔ ان کی والدہ حسنہؓ نے مکہ کے ایک صاحب سفیانؓ بن معمر سے شادی کرلی۔ قیاس یہ ہے کہ حسنہ اسی زمانے میں اپنے کم سن فرزند شرحبیل کے ہمراہ وطن سے مکہ آئیں اور یہیں مستقل اقامت اختیار کرلی (یہ بعثتِ نبوی سے پچیس تیس سال پہلے کا واقعہ ہے)۔ چوں کہ اہلِ مکہ کو حضرت شرحبیل کے آباء و اجداد سے چنداں واقفیت نہ تھی، اس لیے وہ انھیں ماں کی نسبت سے شرحبیلؓ بن حسنہ پکارنے لگے اور اسی نام سے انھوں نے تاریخ میں شہرت پائی۔

اکثر اربابِ سِیَر نے لکھا ہے کہ حضرت شرحبیلؓ قریش کے خاندان بنوزہرہ کے حلیف تھے، لیکن انھوں نے یہ تصریح نہیں کی کہ ان کو بنوزہرہ سے حلیفانہ تعلق پیدا کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی جب کہ ان کے سوتیلے والد سفیانؓ بن معمر کا تعلق قریش کی شاخ بنوجمح سے تھا۔ بہ ہر صورت اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ حضرت شرحبیلؓ، ان کی والدہ حسنہؓ، ان کے سوتیلے والد سفیانؓ بن معمر، اخیافی بھائی جابرؓ بن سفیانؓ اور جُنادہؓ بن سفیانؓ سبھی نہایت سعید الفطرت لوگ تھے۔ یہ سب بعثتِ نبوی کے بالکل ابتدائی زمانے میں شرفِ اسلام سے بہرہ یاب ہوگئے۔ یوں اس گھرانے کو السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ کی مقدس جماعت میں ایسا امتیازی درجہ حاصل ہوگیا، جس میں بہت کم خاندان ان کے شریک و سہیم ہیں۔ مختلف روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شرحبیلؓ اور ان کے اہلِ خاندان نے ۱ھ بعدِ بعثت کے درمیان کسی وقت اسلام قبول کیا۔ یہ وہ

دَور تھا جب سرورِ عالم ﷺ نے علانیہ تبلیغ حق کا آغاز نہیں کیا تھا اور نہایت رازداری کے ساتھ فریضہ تبلیغ ادا فرماتے تھے۔ جب نماز کا وقت آتا تو مسلمان اپنی قوم اور قبیلے سے مخفی مکہ کی سنسان گھاٹیوں میں جا کر نماز پڑھا کرتے تھے تاکہ مشرکین کو ان کے تبدیلیِ دین کا علم نہ ہو سکے۔ چھپ چھپ کر عبادت کرنے والے ان سابقین اسلام میں حضرت شرحبیل بن حسنہؓ بھی شامل تھے۔

۳ ؁ بعد بعثت میں ایک مرتبہ مسلمان مکہ کی ایک گھاٹی میں مصروفِ نماز تھے کہ مشرکین کی ایک ٹولی وہاں پہنچ گئی۔ یہ لوگ مسلمانوں کو ایک نئے طریقے سے عبادت کرتے دیکھ کر بھڑک اٹھے اور یکبارگی نمازیوں پر ٹوٹ پڑے۔ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص بھی نماز پڑھ رہے تھے۔ انھیں جوش آ گیا اور پاس پڑی ہوئی اونٹ کی ایک ہڈی اٹھا کر ایک مشرک کو دے ماری جس سے اس کا سر پھٹ گیا۔ دوسرے مسلمان بھی مقابلے کے لیے تیار ہو گئے۔ مشرکین نے ان کے تیور دیکھے تو ٹھنڈے پڑ گئے اور اپنے زخمی ساتھی کو ہمراہ لے کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ حضورؐ کو اس واقعے کا علم ہوا، تو آپؐ نے حضرت ارقمؓ بن ابی الارقم مخزومی کے مکان کو جو صفا کے قریب واقع تھا، مسلمانوں کے اجتماع اور دعوت و تبلیغ کا مرکز بنا دیا۔ حضورؐ خود بھی وہاں تشریف فرما رہتے اور اہل حق بھی (بہ شمول حضرت شرحبیل بن حسنہؓ) آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر دارِ ارقم ہی میں نماز ادا کرتے۔

۴ ؁ بعد بعثت کے اوائل میں سرورِ عالم ﷺ نے علانیہ دعوتِ حق کا آغاز فرمایا، تو مشرکین کے قہر و غضب کا آتش فشاں پوری قوت سے پھٹ پڑا اور مسلمانوں پر ظلم و ستم کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ حضرت شرحبیل بن حسنہؓ اور ان کے اہل خاندان بھی مشرکین قریش کے جور و تعدی کا ہدف بن گئے، لیکن وہ بڑے صبر اور استقامت کے ساتھ ہر قسم کی مصیبتیں جھیلتے رہے۔ جب کفار کے مظالم شدید تر ہو گئے، تو ۵ ؁ بعدِ بعثت میں سرورِ عالم ﷺ نے مسلمانوں کو ہدایت فرمائی کہ وہ حبش چلے جائیں جہاں کا بادشاہ ایک نیک دل شخص ہے اور کسی پر ظلم نہیں ہونے دیتا، چناں چہ گیارہ مردوں اور چار عورتوں پر مشتمل ایک قافلہ حبش کو ہجرت کر گیا۔ یہ پہلی ہجرت حبشہ تھی۔ اگلے سال (٦ بعد بعثت کے آغاز میں) اسی سے کچھ اوپر مردوں اور اٹھارہ یا انیس خواتین نے حبش کی راہ لی۔ ان میں حضرت شرحبیل بن حسنہؓ اور ان کے اہل خاندان بھی شامل تھے۔ تمام اہل سِیَر نے دوسری ہجرت حبشہ کے شرکا میں حضرت شرحبیلؓ، ان کی والدہ حضرت حسنہؓ، سوتیلے والد حضرت سفیانؓ بن معمر، اخیافی بھائیوں حضرت جابرؓ اور حضرت جنادہؓ پسران سفیانؓ کا نام

خصوصیت سے لیا ہے، گویا پورے گھرانے نے اللہ کی راہ میں اپنا گھر بار چھوڑ دیا اور حبش کی غریب الوطنی اختیار کر لی۔

علامہ بلاذریؒ اور بعض دوسرے اہلِ سِیَر نے لکھا ہے کہ جن صحابۂ کرامؓ کو کتابتِ وحی کا شرف حاصل ہوا، شرحبیل بن حسنہؓ بھی ان میں شامل ہیں۔ چناں چہ بہت سی روایتوں میں اُن کے نام کے ساتھ ''کاتبِ رسول اللہ'' کے الفاظ ملتے ہیں۔ ان روایات سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شرحبیل بن حسنہؓ پڑھے لکھے آدمی تھے اور بچپن میں ان کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دی گئی تھی، وہاں یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ وہ ان مخصوص صحابہ میں سے تھے جن کو سرورِ عالم ﷺ کا پورا اعتماد حاصل تھا، یہاں تک کہ آپ نے کتابتِ وحی جیسی عظیم ذمّہ داری ان کے سپرد کی تھی۔ اگر چہ اہلِ سِیَر نے اس بات کی وضاحت نہیں کی کہ حضرت شرحبیلؓ نے کب اور کن موقعوں پر کتابتِ وحی کی خدمت انجام دی، لیکن قرینے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں ہجرت حبشہ سے پہلے بھی گاہے بگاہے یہ شرف حاصل ہوا اور حبشہ سے واپسی کے بعد بھی۔

(۳)

حضرت شرحبیل بن حسنہؓ اپنے اہلِ خاندان کے ہمراہ حبش میں مسلسل تیرہ برس تک غریب الوطنی کی زندگی گزارتے رہے۔ مہاجرینِ حبشہ میں حضرت امّ حبیبہؓ بنت ابوسفیانؓ بھی تھیں۔ وہ دوسری ہجرت حبشہ میں اپنے خاوند عبید اللہ بن جحش کے ہمراہ اسی قافلے میں حبش پہنچی تھیں جس میں حضرت شرحبیل بن حسنہؓ اور ان کے اہل خاندان بھی شامل تھے۔ بدقسمتی سے عبید اللہ بن جحش نے حبش پہنچ کر عیسائی مذہب اختیار کر لیا اور بے تحاشا شراب پینی شروع کر دی۔ حضرت امِ حبیبہؓ نے شوہر کو بہت سمجھایا کہ کیوں اپنی عاقبت خراب کرتے ہو، لیکن خدا نے عبید اللہ کے دل پر مہر لگا دی تھی۔ اس پر کوئی اثر نہ ہوا اور عیسائیت کی حالت ہی میں رندانہ زندگی بسر کرتے ہوئے وفات پائی۔ سرورِ عالم ﷺ کو جب حضرت اُم حبیبہؓ کے (عالمِ غربت میں) بیوہ ہونے کی اطلاع ملی، تو آپؐ نے ان کو اپنے دامنِ رحمت میں ڈھانپنے کا قصد فرمایا، چناں چہ جب ان کے ایّامِ عدّت پورے ہو گئے، تو حضورؐ نے حضرت عمرو بن امیۃ الضمری کے ہاتھ نجاشی (شاہ حبشہ) کے نام ایک دعوتی مکتوب روانہ فرمایا جس میں حضرت امِ حبیبہؓ کو پیامِ نکاح بھی دیا گیا تھا۔ نجاشی نے حضورؐ کا پیغام حضرت امِ حبیبہؓ کو دیا، تو انھوں نے بلا تأمل قبول کر لیا، چناں چہ نجاشی نے ایک مجلس

میں حضرت اُمِ حبیبہؓ کا (غائبانہ) نکاح حضورؐ سے کردیا اور حضورؐ کی طرف سے حق مہر بھی ادا کردیا۔ یہ واقعہ ۶ ھ کا ہے۔ اس مبارک نکاح کے چند دن بعد نجاشی نے تمام مہاجرین حبشہ کو دو کشتیوں میں سوار کر کے مدینہ منورہ روانہ کردیا۔ ابنِ سعدؒ کا بیان ہے کہ یہ سب ساٹھ مرد وزن تھے۔ ان میں اُمّ المومنین حضرت اُمِ حبیبہؓ کے علاوہ حضرت شرحبیل اور ان کے اہل خاندان بھی شامل تھے۔

ابوداؤد اور نسائی نے روایت کی کہ نجاشی نے حضرت اُمِ حبیبہؓ کو حضرت شرحبیل بن حسنہؓ کے ہمراہ وزیرنگرانی مدینہ منوّرہ روانہ کیا تھا۔ یہ مقدس قافلہ جس دن مدینہ منوّرہ پہنچا، سرورِ عالم ﷺ خیبر میں تشریف فرما تھے اور اسی روز فتح خیبر سے فارغ ہوئے تھے۔ حضورؐ کے ابھی مدینہ واپس آنے میں کچھ دیر تھی، لیکن حبش سے آنے والے اصحاب کو اپنے محبوب آقاؐ سے ملے بغیر کہاں چین تھا۔ تمام مرد آپؐ کے شوقِ لقا میں خیبر پہنچے اور سید المرسلینؐ کے جمالِ جہاں آرا سے اپنی آنکھیں روشن کیں۔

رحمتِ عالم ﷺ نے تیرہ سال کے بچھڑے ہوئے ان جاں نثاروں کو دیکھا، تو آپؐ کو کمال درجے کی مسرّت ہوئی۔ آپؐ نے ہر ایک سے معانقہ فرمایا اور پیشانی پر بوسہ دیا۔ پھر آپؐ نے ازراہِ کرم ان کو بھی خیبر کے مالِ غنیمت میں سے حصہ دیا۔ حبش سے واپس آنے والے تمام صحابہؓ اور صحابیاتؓ کو ''ذوالہجرتین'' کا عظیم لقب مرحمت ہوا کیوں کہ انھوں نے دو ہجرتیں کی تھیں۔ ایک مکّہ سے حبش کو اور دوسری حبش سے مدینہ منوّرہ کو۔ حضرت شرحبیل بن حسنہؓ کو بھی اسی مقدس جماعت کا ایک رُکن ہونے کا شرف حاصل ہے۔ علاّمہ ابن سعدؒ کا بیان ہے کہ مدینہ منوّرہ میں حضرت شرحبیل، بنوزریق کے محلّے میں قیام پذیر ہوئے۔ یہیں ان کا نکاح مشہور صحابیہ حضرت شفاءؓ بنت عبداللہ (عدویہ) کی صاحب زادی سے ہوا۔ علاّمہ بلاذریؒ نے ''انساب الاشراف'' میں لکھا ہے کہ حضرت شرحبیل بن حسنہؓ نبی کریم ﷺ کے ساتھ غزوات میں شریک ہوتے رہے۔ علاّمہ موصوف نے ان غزوات کی تفصیل نہیں لکھی جن میں حضرت شُرحبیل نے حضورؐ کی ہم رکابی کا شرف حاصل کیا، لیکن یہ وہی غزوات ہوں گے جو جنگِ خیبر کے بعد پیش آئے، کیوں کہ ان سے پہلے کا زمانہ حبش کے قیام میں صرف ہو چکا تھا۔ دوسرے اہلِ سِیَر میں سے اکثر نے حضرت شرحبیلؓ کے غزواتِ نبوی میں شریک ہونے کا حال نہیں لکھا، لیکن حضرت شرحبیلؓ کی

زندگی پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک مرد سپاہی تھے، اس لیے یہ باور نہیں کیا جاسکتا کہ حبش سے مراجعت کے بعد وہ گھر میں بیٹھ رہے ہوں گے۔ یہ بھی روایت ہے کہ اواخرِ عہدِ رسالت میں حضورؐ نے سفیر بنا کر مصر بھیج دیا۔ مصر ہی میں تھے کہ سرورِ عالم ﷺ کا وصال ہو گیا۔ یہ المناک خبر سنتے ہی وہ مدینہ منورہ واپس آگئے۔ اس وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ مسند خلافت پر بیٹھ چکے تھے۔ حضرت شرحبیلؓ نے مدینہ منورہ پہنچتے ہی ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

(۴)

۱۱ھ میں خلافتِ صدیقی کا آغاز ہوتے ہی سارے عرب میں دفعتاً فتنۂ ارتداد کی آگ بھڑک اٹھی۔ مرتدین میں تین قسم کے لوگ شامل تھے۔ ایک گروہ سرے سے ہی اسلام سے منحرف ہو گیا۔ دوسرا گروہ مسیلمہ کذاب طلیحہ بن خویلد اور اسود عنسی جیسے جھوٹے مدعیان نبوت کے دام تزویر میں پھنس گیا۔ تیسرے گروہ نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا۔ ان لوگوں نے اتنا زور باندھا کہ خلافتِ اسلامیہ خطرے میں پڑ گئی، لیکن حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس نازک موقع پر ایسے جوشِ ایمان اور جرأت و استقامات کا مظاہرہ کیا کہ تاریخ میں اس کی مثال ناپید ہے۔ انھوں نے تہیا کر لیا کہ ان تمام فتنوں کا قلع قمع کر کے رہیں گے اور مرتدین کے کسی مطالبے کے سامنے ہرگز نہیں جھکیں گے، چناں چہ آپؓ نے مجاہدینِ اسلام کے گیارہ لشکر مرتب کیے اور انھیں مختلف اطراف میں مرتدین اور جھوٹے مدعیان نبوّت کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا۔ ان میں سے ایک لشکر کے سپہ سالار حضرت شرحبیلؓ بن حسنہ تھے۔ انھیں یہ ذمے داری سونپی گئی کہ مسیلمہ کذّاب کی سرکوبی کے لیے حضرت عکرمہؓ بن ابی جہل کی مدد کریں اور اس کے بعد کندہ اور حضرِ موت وغیرہ کے مرتدین کی شورش رفع کریں۔ حضرت عکرمہؓ سوئے اتفاق سے اپنے طاقت ور حریف مسیلمہ کذّاب کی قوت کا صحیح اندازہ نہ کر سکے اور حضرت شرحبیلؓ کے پہنچنے سے پہلے ہی مسیلمہ سے لڑائی چھیڑ دی۔ اس کا نتیجہ ان کی پسپائی کی صورت میں نکلا۔ حضرت شرحبیلؓ وہاں پہنچے، تو ان کے ساتھ بھی یہی صورت پیش آئی، لیکن انھوں نے پیچھے ہٹ کر مسیلمہ کے ساتھ چھیڑ چھاڑ جاری رکھی۔ (بعض روایات میں ہے کہ حضرت شرحبیلؓ نے لڑائی چھیڑنے سے پہلے ہی حضرت ابوبکر صدیقؓ کو مسیلمہ کی جنگی قوت اور تیاریوں سے آگاہ کر دیا تھا)۔ اس اثنا میں حضرت خالدؓ بن ولید، طلیحہ بن خویلد اور عینیہ بن حصین کی سرکوبی سے فارغ ہو چکے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے انھیں حضرت

شرحبیلؓ کی مدد کے لیے روانہ کردیا۔ یمامہ کے میدان میں اہل حق اور مسیلمہ کذّاب کے زبردست لشکر کے درمیان اس دَور کی خون ریز ترین لڑائی ہوئی۔ اس میں حضرت شرحبیلؓ شروع سے اخیر تک سر سے کفن باندھ کر لڑتے رہے۔ یہاں تک کہ مرتدین کو شکستِ فاش ہوئی اور ان کے لشکر کے پرخچے اڑ گئے۔ خود مسیلمہ بھی اس لڑائی میں مارا گیا۔ جنگِ یمامہ کے بعد حضرت شرحبیلؓ نے فتنۂ ارتداد کے کئی دوسرے محاذوں پر بھی دادِ شجاعت دی۔ اہلِ حق کی سرفروشی اور استقامت کا نتیجہ یہ نکلا کہ چند ماہ کے اندر اندر مرتدین اور جھوٹے مدعیان نبوت کا یکسر خاتمہ ہوگیا اور سارے عرب نے خلافتِ صدیقی کے سامنے سرِ اطاعت خم کردیا۔

۱۳ھ میں شام کی رومی سلطنت کے خلاف جنگ کا آغاز ہوا، تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس مہم کے لیے چار سپہ سالار مقرر کیے۔ متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیفۃ الرسولؐ نے حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراح کو حمص پر، یزیدؓ بن ابوسفیان کو بلقاء اور دمشق پر، حضرت عمروؓ بن العاص کو فلسطین پر اور حضرت شرحبیل بن حسنہؓ کو اردن پر مامور فرمایا تھا۔ (یہ سب علاقے اُس زمانے میں شام ہی میں تھے) اور عملی قیادت کے سلسلے میں یہ حکم دیا تھا کہ جس امیر کی حدودِ قیادت میں جنگ ہو، وہی امیر لشکر کی قیادت کرے گا۔ اگر میدان کارزار میں سب یکجا ہوجائیں، تو تمام لشکر کے سپہ سالار حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراح ہوں گے۔

عرب کی سرحد سے نکل کر مجاہدین اسلام کو جگہ جگہ کیل کانٹے سے لیس رومیوں کے بڑے بڑے جتھے ملے۔ انھوں نے مسلمانوں کی زبردست مزاحمت کی، لیکن اہلِ حق کے سیلِ بے پناہ کے سامنے ان کی کچھ پیش نہ چلی۔ حضرت یزیدؓ بن ابی سفیانؓ سب سے پہلے مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے تھے۔ تبوک کے مقام پر ان کی مڈبھیڑ رومیوں کی ایک زبردست فوج سے ہوگئی۔ اس فوج کی قیادت ہرقل کے چار آزمودہ کار افسر باطلیق، جرجیس، لوقا اور صلیبا کر رہے تھے۔ اس فوج کے مقابلے میں حضرت یزید بن ابی سفیانؓ کے لشکر کی تعداد بہت کم تھی، لیکن وہ اللہ کے بھروسے پر اس سے بھڑ گئے۔ پہلے دن کی لڑائی میں ہار جیت کا کوئی فیصلہ نہ ہوسکا۔ دوسرے دن پھر معرکۂ کارزار گرم ہوا، تو فریقین خوب جم کر لڑے۔ عین اُس وقت جب کہ لڑائی زوروں پر تھی، حضرت شرحبیل بن حسنہؓ اپنے لشکر کے ساتھ وہاں پہنچ گئے۔ وہ حضرت یزید بن ابی سفیانؓ کی روانگی کے بعد بُصریٰ کا عزم کرکے مدینہ سے چلے تھے۔ اب جو انھوں نے رومیوں کو مسلمانوں

سے نبرد آزما دیکھا، تو بغیر دم لیے تکبر کے نعرے لگاتے اپنے بھائیوں کی مدد کے لیے میدان میں اتر آئے۔ یزید بن ابوسفیانؓ کے لشکر کے لیے حضرت شرحبیلؓ کی آمد تائیدِ غیبی سے کم نہ تھی۔ سب نے مل کر تازہ جوش اور ولولے کے ساتھ رومیوں پر اس زور کا حملہ کیا کہ ان کی صفیں الٹ کر رکھ دیں۔ تمام بڑے بڑے رومی افسر میدانِ جنگ میں کام آئے، یہاں تک کہ رومی فوج اپنے ہزاروں آدمی کٹوا کر بھاگ کھڑی ہوئی۔

لڑائی کے بعد حضرت یزید بن ابوسفیانؓ، حضرت شرحبیل سے بغل گیر ہوئے اور دونوں نے ایک دوسرے کو فتح کی مبارک باد دی۔ اس کے بعد دونوں سپہ سالار اپنی اپنی منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہو گئے۔ حضرت یزید بن ابوسفیانؓ کا رُخ بلقاء کی جانب تھا اور حضرت شرحبیلؓ کا بصرہ کی طرف۔

(۵)

بصرہ، شام کے صوبے حوران کا صدر مقام تھا اور جنگی لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ اس کا حاکم ایک رومی جرنیل روباس (یا رومانوس) تھا۔ حضرت شرحبیلؓ چار ہزار سرفروشوں کے ہمراہ یلغار کرتے ہوئے بصرہ کے قریب پہنچے، تو روباس نے مسلمانوں سے لڑنے کی بہ جائے صلح کر لینا مناسب سمجھا، چناں چہ اس نے حضرت شرحبیلؓ سے صلح کی گفت و شنید شروع کر دی۔ اہلِ بصرہ کو اپنے حاکم کا صلح جویانہ رویہ پسند نہ آیا اور انھوں نے اسے مجبور کیا کہ وہ پوری قوت سے مسلمانوں کا مقابلہ کرے۔ روباس نے طوعاً و کرہاً لڑائی کی تیاری شروع کر دی اور مسلمان بھی لڑائی کے لیے کمربستہ ہو گئے۔ اس اثنا میں حضرت خالدؓ بن ولیدؓ بھی اپنی فوج کے ساتھ عراقِ عرب سے بصرہ پہنچ گئے۔ انھوں نے حضرت شرحبیلؓ کے ساتھ مل کر بصرہ کے جنگجو رومیوں پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ وہ الامان والحفیظ پکار اُٹھے اور قلعے کا دروازہ کھول کر امان کے طالب ہوئے۔ حضرت خالدؓ نے ان کو جزیے کی شرط پر امان دے دی۔ اس کے بعد وہ حضرت شُرحبیلؓ کو بصرہ میں چھوڑ کر دمشق کی طرف بڑھے اور حضرت ابوعبیدہؓ کے ساتھ مل کر شہر کا محاصرہ کر لیا۔ دوسری طرف ہرقل کو بصرہ پر مسلمانوں کے قبضے کی اطلاع ملی، تو اس نے ایک بہت بڑی فوج (جو بعض روایتوں کے مطابق نوے ہزار جوانوں پر مشتمل تھی) مسلمانوں کے مقابلے کے لیے روانہ کی۔ اس فوج نے اجنادَین پہنچ کر جنگ کی تیاریاں شروع کیں۔ حمص کا رومی حاکم وردان بھی ایک

زبردست فوج کے ساتھ اس ارادے سے روانہ ہوا کہ حضرت شرحبیلؓ کا رابطہ دمشق، بلقاء اور فلسطین میں مقیم اسلامی فوجوں سے منقطع کردے۔ حضرت ابوعبیدہؓ اور خالدؓ بن ولید کو رومیوں کے اجتماع اور نقل وحرکت کی خبریں ملیں، تو انھوں نے یہی مناسب سمجھا کہ تمام اسلامی فوجیں ایک جگہ جمع ہوکر اس طوفان کا مقابلہ کریں۔ چناں چہ وہ دمشق سے محاصرہ اٹھا کر اجنادَین کی طرف بڑھے اور دوسرے افسروں کو لکھا کہ وہیں آکر مل جائیں۔

حضرت ابوعبیدہؓ اور خالدؓ کا خط ملتے ہی حضرت شرحبیلؓ بصرہ سے اِجنادین کی طرف چل پڑے، وردان نے ان کا راستہ کاٹنے کی بہت کوشش کی، لیکن وہ بہ خیریت اِجنادَین پہنچ گئے۔ ان کے بعد حضرت یزید بن ابوسفیانؓ اور حضرت عمروؓ بن العاص بھی اپنی اپنی فوجیں لے کر اجنادَین آکر بڑے اسلامی لشکر کے ساتھ مل گئے۔ دوسری طرف وردان بھی اس بڑی رومی فوج میں جا شامل ہوا، جس نے اِجنادَین میں پڑاؤ ڈال رکھا تھا۔ شنبہ ۲۸ جمادی الاولیٰ ۱۳ھ کو اِجنادَین کے میدان میں مسلمانوں اور رومیوں کے مابین نہایت خون ریز جنگ ہوئی، رومیوں نے دادِشجاعت دینے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، لیکن مسلمانوں کے جوش اور جذبے کے سامنے ان کی کچھ پیش نہ چلی۔ جب تذارق، قبقلار، وردان اور کئی دوسرے بڑے بڑے رومی افسر ایک ایک کرکے مارے گئے، تو رومیوں کی قوّتِ مقاومت جواب دے گئی اور وہ سخت ابتری کے عالم میں ایلیا، قیساریہ اور حمص وغیرہ کی طرف بھاگ گئے۔ اس لڑائی میں تین ہزار کے قریب مسلمان شہید ہوئے اور اس سے کہیں زیادہ تعداد میں رومی مارے گئے۔ موّرخ ابنِ ہشام کا بیان ہے کہ شہدائے اجنادین میں حضرت عمروؓ بن العاص کے چھوٹے بھائی حضرت ہشامؓ بن العاص بھی تھے، وہ سابقون الاولون میں سے تھے اور دو ہجرتوں سے ممتاز تھے، مسلمانوں نے رومیوں کا تعاقب کیا، تو راستے میں انھیں ایک تنگ گھاٹی ملی جس میں سے ایک وقت میں صرف ایک آدمی گزر سکتا تھا۔ جو مسلمان اس مقام سے پار ہوگئے، ان سے رومی لڑنے لگے، حضرت ہشامؓ شہید ہوکر اس تنگ مقام میں گر پڑے۔ اب جو مسلمان وہاں پہنچتا، وہیں رُک جاتا تھا، کیوں کہ آگے بڑھنے سے حضرت ہشامؓ کی لاش گھوڑوں کے سموں کے نیچے کچل جاتی تھی۔ حضرت عمروؓ بن العاص نے یہ کیفیت دیکھی تو مسلمانوں سے مخاطب ہوکر فرمایا:

"مسلمانو! اللہ تعالیٰ نے میرے بھائی کو رُتبۂ شہادت پر فائز کیا اور اس کی روح کو

اٹھالیا۔ یہاں تو صرف اس کا جسم ہے، اس لیے تم لوگ اس کی لاش پر سے گھوڑے لے جاؤ اور اللہ کے دشمنوں کا مقابلہ کرو۔"

یہ کہہ کر انھوں نے گھوڑا بڑھایا۔ دوسرے لوگوں نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ اس طرح شہیدِ راہ حق کی لاش کے ٹکڑے اڑ گئے۔ جنگ ختم ہوئی، تو حضرت عمروؓ بن العاص نے بھائی کی لاش کے ٹکڑوں کو بورے میں بھر کر سپردِ خاک کیا۔

اِجنادین کی فتح کے بعد متحدہ اسلامی لشکر دمشق کی طرف بڑھا اور ایک بار پھر اس کا نہایت سختی سے محاصرہ کرلیا۔ اس محاصرے میں حضرت شرحبیلؓ باب الفرادیس پر متعین تھے اور دمشق کی پیدل فوج کے سردار تھے۔ یہ محاصرہ کئی ماہ تک جاری رہا۔ اسی دوران میں حضرت ابوبکر صدیقؓ نے وفات پائی اور حضرت عمر فاروقؓ سریر آرائے خلافت ہوئے۔ اہلِ دمشق کو میدان میں آکر مقابلہ کرنے کی ہمت نہ تھی۔ اس لیے وہ فصیل شہر ہی سے مسلمانوں پر تیر اور پتھر برساتے رہتے تھے، البتہ دوچار موقعے ایسے ضرور پیش آئے کہ بعض من چلے دستوں نے شہر سے باہر نکل کر مسلمانوں پر حملہ کیا، لیکن منہ کی کھا کر پسپا ہوگئے۔ ایک دن حضرت شرحبیل بن حسنہؓ نے بڑے جوش وخروش سے قلعے پر حملہ کیا، دمشقیوں نے ان پر تیروں اور پتھروں کا مینہ برسا دیا۔ حضرت شرحبیلؓ کے کئی ساتھی شہید اور زخمی ہوگئے۔ ایک روایت میں ہے کہ شہدا میں مشہور صحابی حضرت ابانؓ بن سعید بھی تھے۔ بعض دوسری روایتوں کے مطابق حضرت ابانؓ معرکہِ اجنادین میں شہید ہوچکے تھے اور ان کی بیوی ام ابانؓ حضرت شرحبیلؓ کے لشکر میں شامل ہوگئی تھیں۔ وہ تیراندازی میں کمال درجے کی مہارت رکھتی تھیں۔ دمشقیوں نے مسلمانوں پر تیر اور پتھروں کی بوچھاڑ کی، تو وہ تاک تاک کر رومیوں کو تیر مارنے لگیں۔ ایک تیر اس پادری کو لگا جو صلیب ہاتھ میں لیے رومیوں کو جوش دلا رہا تھا۔ صلیب اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر شہر پناہ کے نیچے گر پڑی۔ اس پر رومیوں میں سخت اشتعال پیدا ہوا اور اپنے سردار توما کی سرکردگی میں دروازہ کھول کر حضرت شرحبیلؓ کے لشکر پر حملہ آور ہوئے۔ حضرت شرحبیلؓ اس طوفانی حملے سے مطلق ہراساں نہ ہوئے اور رومیوں کو منہ توڑ جواب دیا۔ اس موقع پر اُمِ ابانؓ یہ رجز پڑھتے ہوئے رومیوں پر تیر برسا رہی تھیں۔

ام ابان فاطلبی، بثارکِ صولی علیهم صولت المتدٰرکِ
قد ضج جمع القوم من نبالکِ

''اُمِ ابان، تو اپنا انتقام لے اور ان پر پے در پے حملے کیے جا۔ رومی تیرے تیروں سے چیخ اُٹھے۔''

حضرت اُمِ ابانؓ کی کمان سے نکلا ہوا ایک تیر توما کی آنکھ میں لگا، تو وہ چیخ مار کر پیچھے کی طرف بھاگا۔ اس کے لشکر نے بھی اس کا ساتھ دیا اور سب قلعے میں گھس گئے۔ محاصرۂ دمشق کے دوران میں کئی اور موقعوں پر بھی حضرت شرحبیلؓ نے کمال درجے کی شجاعت اور جانبازی کا مظاہرہ کیا، یہاں تک کہ خود حضرت خالدؓ بن ولید نے ان کی سرفروشی اور استقامت کا اعتراف کیا۔ کئی ماہ کے طویل محاصرے کے بعد بالآخر مسلمانوں نے دمشق پر پرچم اسلام لہرا دیا۔ حضرت ابوعبیدہؓ نے تمام اہلِ شہر کو امان دے دی اور مسلمانوں کو منع کر دیا کہ وہ نہ مالِ غنیمت لوٹیں اور نہ کسی کو قیدی بنائیں۔ یہ واقعہ رجب ۱۴ھ کا ہے۔ ذوقعدہ ۱۴ھ میں مسلمانوں نے اردن کا رُخ کیا جہاں رومی زور شور سے جنگی تیاریوں میں مشغول تھے۔

(۶)

دمشق کے سقوط نے رومیوں کو سخت مشتعل کر دیا تھا اور انھوں نے اردن کے شہر بیسان میں فوجیں جمع کرنی شروع کر دی تھیں۔ تھوڑے ہی عرصے میں وہاں چالیس اور اسّی ہزار کے درمیان جنگجو رومی جمع ہو گئے۔ مسلمانوں نے بیسان کے سامنے چند میل کے فاصلے پر فحل کے مقام پر پڑاؤ ڈالا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اُردن کی تسخیر اور امارت کے لیے حضرت شرحبیلؓ کو نامزد فرمایا تھا اور حضرت عمرؓ نے بھی اس فیصلے کو برقرار رکھا تھا، اس لیے فحل کی اسلامی فوجوں کی کمان حضرت شرحبیلؓ کے سپرد ہوئی۔ انھوں نے ابوالاعور سلمیؓ کو کچھ فوج دے کر طبریّہ کی طرف بھیج دیا اور خود رومیوں پر حملہ کرنے کے لیے مناسب وقت کا انتظار کرنے لگے۔ کیوں کہ بیسان میں مقیم رومیوں نے دریا کا بند توڑ دیا تھا اور فحل کے اردگرد تمام علاقہ زیرِ آب آ گیا تھا۔ جب فحل میں مسلمانوں کا قیام طویل ہو گیا، تو رومی جرنیل سقلاء بن مخراق نے کثرتِ افواج کے زعم میں خود مسلمانوں پر حملہ آور ہونے کا منصوبہ بنایا اور ایک مقررہ رات کو ایک خاص جگہ سے دلدل اور پانی عبور کر کے مسلمانوں پر آ پڑا۔ دوسری طرف حضرت شرحبیلؓ کو اپنی ذمے داریوں کا سخت احساس تھا۔

وہ کسی ناگہانی افتاد سے نبٹنے کے لیے دن رات اپنے لشکر کی نگرانی کرتے رہتے تھے۔ رومی رات کی تاریکی میں فحل پہنچے، تو انھوں نے خلافِ توقع مسلمانوں کو مقابلے کے لیے تیار پایا۔ فریقین میں گھمسان کا رَن پڑا اور لڑائی رات سے گزر کر دوسرے دن بھی جاری رہی، حضرت خالدؓ بن ولید، ضرارؓ بن ازور اور شرحبیلؓ بن حسنہؓ نے سرفروشی اور جانبازی کے وہ جوہر دکھائے کہ دشمن کی کمر ٹوٹ گئی۔ سقّلاء اور اس کے ساتھ کئی رومی جرنیل مارے گئے اور رومی فوج بددل ہو کر بھاگ کھڑی ہوئی۔

بعض مؤرخین نے اس واقعے کو دوسرے انداز میں لکھا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ مسلمان خود فحل سے پیش قدمی کر کے رومیوں سے نبرد آزما ہوئے اور انھیں شکست دی۔ بہر صورت حضرت شرحبیلؓ نے جنگِ فحل میں نمایاں کارنامے انجام دیے۔

فحل کی جنگ سے فارغ ہو کر حضرت شرحبیلؓ، حضرت عمروؓ بن العاص کو ساتھ لے کر بیسان پہنچے اور اس کا محاصرہ کر لیا۔ محصورین زیادہ عرصے تک مسلمانوں کے مقابلے پر نہ ٹھہر سکے اور دمشق کی شرائط پر مسلمانوں سے صلح کر لی۔ اہلِ طبریّہ کو جب اہلِ بیسان کا حال معلوم ہوا، تو انھوں نے بھی حضرت ابو الاعورؓ کے ذریعے حضرت شرحبیلؓ کو صلح کا پیغام بھیجا۔ انھوں نے یہ درخواست قبول کر لی اور اہلِ طبریّہ سے بھی صلح نامۂ دمشق کی شرائط کے مطابق صلح کر لی۔ اس کے بعد حضرت شرحبیلؓ نے اردن کے دوسرے تمام شہر اور مقامات اذرعات، عمّان، جرش، مآب وغیرہ نہایت آسانی سے فتح کر لیے۔ فی الحقیقت وہاں کے باشندوں کو جم کر مقابلہ کرنے کی ہمت ہی نہ پڑی اور سب نے صلح نامۂ دمشق کی شرائط پر مسلمانوں کی اطاعت قبول کر لی۔ اس طرح تمام اُردن، حوران و صحرا تک مسلمانوں کا مطیع و منقاد ہو گیا اور حضرت شرحبیلؓ اس کی امارت کے فرائض انجام دینے لگے۔ دوسری طرف ابو عبیدہؓ نے حمص پر یلغار کر کے اس کو فتح کر لیا اور وہیں مقیم ہو گئے۔

(۷)

ہرقل شاہِ روم کو جو انطاکیہ میں مقیم تھا، جب اُردن اور حمص وغیرہ پر مسلمانوں کے استیلا کی خبریں پہنچیں، تو وہ غم و غصّے سے دیوانہ ہو گیا۔ اس نے مسلمانوں سے ایک فیصلہ کُن جنگ کے لیے اپنے تمام مقبوضات میں جبری بھرتی کا حکم بھیج دیا اور ساتھ ہی رومیوں کو غیرت دلائی کہ اگر تم

نے متحد ہو کر عربوں کو شام سے نہ نکالا، تو تمہاری عزت و ناموس خطرے میں پڑ جائے گی۔ جہاں جہاں ہرقل کا فرمان پہنچا، وہاں کے باشندوں میں عزم و حوصلہ اور جوش و ولولے کی لہر دوڑ گئی۔ اور ہر طرف سے جنگجو رومیوں کے جتھے انطاکیہ پہنچنے لگے۔ اس طرح تھوڑی ہی مدّت میں کئی لاکھ رومی ہرقل کے جھنڈے تلے مسلمانوں سے لڑنے مرنے کے لیے جمع ہو گئے۔ ہرقل نے اپنے نامور جرنیل باہان کو ایک جرّار لشکر دے کر حکم دیا کہ وہ حملہ آور مسلمانوں کو نیست و نابود کر دے۔
اُدھر حضرت ابو عبیدہؓ کو رومیوں کی زبردست جنگی تیاریوں کی اطلاع ملی، تو انھوں نے قریبی علاقوں کے امراء اور افسرانِ فوج کو مشورے کے لیے اپنے پاس (حمص) بُلا بھیجا۔ جب سب جمع ہو گئے، تو حضرت ابو عبیدہؓ نے ساری صورتِ حال ان کے سامنے بیان کی اور پوچھا کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ حضرت یزید بن ابو سفیان نے رائے دی ہے کہ عورتوں اور بچوں کو شہر میں رہنے دیا جائے اور ہم خود باہر جا کر رومیوں سے نبرد آزما ہوں، ساتھ ہی خالدؓ بن ولید اور عمروؓ بن العاص کو دمشق اور فلسطین سے بلا لیا جائے۔

حضرت شرحبیلؓ بن حسنہؓ بھی اس موقع پر موجود تھے، انھوں نے کہا مجھے یزید بن ابو سفیانؓ کی رائے سے اتفاق نہیں ہے، کیوں کہ اہلِ شہر عیسائی ہیں، ممکن ہے وہ مذہبی جنون میں مبتلا ہو کر ہماری غیر حاضری میں ہمارے اہل و عیال کو ہرقل کے حوالے کر دیں یا انہیں مار ڈالیں۔

حضرت ابو عبیدہؓ نے فرمایا: ''تو پھر کیوں نہ عیسائیوں کو شہر سے نکال دیا جائے؟''

حضرت شرحبیل نے فوراً کہا: ''اے امیر! ہمیں یہ حق ہرگز حاصل نہیں کہ باشندوں کو شہر سے نکال دیں، کیوں کہ ہم نے اس شرط پر عیسائیوں کو امان دی ہے کہ ان کے گھر اور جان و مال کی حفاظت کریں گے اور ان کو شہر سے نہیں نکالیں گے۔ اب ہم اپنے عہد سے کیسے پھر سکتے ہیں؟''

حضرت ابو عبیدہؓ نے یہ اعتراض قبول کیا اور دوسرے لوگوں کی رائے دریافت کی۔ بعض اصحاب نے رائے دی کہ حمص ہی میں رہ کر دربارِ خلافت سے مدد طلب کی جائے اور دمشق اور فلسطین کی امدادی فوجوں کا انتظار کیا جائے۔

حضرت ابو عبیدہؓ نے فرمایا کہ اب اتنا وقت نہیں ہے، کیوں کہ عیسائیوں کا ٹڈی دَل ہم پر کسی وقت بھی دھاوا بول سکتا ہے۔

آخر یہ رائے ٹھہری کہ حمص چھوڑ دمشق روانہ ہوں، وہاں خالدؓ بن ولید سے مشورے

ے بعد آئندہ لائحہ عمل تجویز کیا جائے۔ حمص سے روانہ ہوتے وقت حضرت ابو عبیدہؓ نے کئی لاکھ کی رقم جو بہ طورِ جزیہ وصول کی گئی تھی، اہلِ حمص کو یہ کہہ کر واپس کر دی کہ اب ہم تمہاری حفاظت کا ذمہ نہیں اٹھا سکتے۔ اس کا اثر اہلِ شہر پر یہ ہوا کہ وہ رو رو کر دعائیں مانگتے تھے کہ خدا مسلمانوں کو جلد واپس لائے اور ساتھ ہی قسمیں کھاتے تھے کہ جب تک ہم زندہ ہیں، قیصر اس شہر پر قبضہ نہیں کر سکتا۔

حضرت ابو عبیدہؓ حمص سے کوچ کر کے دمشق پہنچے اور حضرت خالدؓ سمیت تمام افسرانِ فوج کو جمع کر کے ان سے مشورہ کیا، سب نے مختلف رائیں دیں۔ اسی اثنا میں حضرت عمروؓ بن العاص کا خط فلسطین سے پہنچا کہ ''رومی فوج اردن میں داخل ہو گئی ہے اور اُس نے ہر طرف تہلکہ ڈال دیا ہے۔'' اب سب کی رائے یہ ٹھہری کہ اردن پہنچ کر تمام اسلامی فوجیں متحد ہو کر رومیوں کا مقابلہ کریں اور دربارِ خلافت سے بھی کمک طلب کر لی جائے۔ چناں چہ حضرت ابو عبیدہؓ، خالدؓ بن ولید، شرحبیلؓ بن حسنہؓ اور یزید بن ابو سفیانؓ نے دمشق سے فوراً کوچ کیا اور تیز رفتاری سے چلتے ہوئے حدودِ اُردن میں یرموک (وقوصہ) کے میدان میں پہنچ کر خیمہ زن ہوئے۔ حضرت عمرو بن العاص بھی یہیں آ کر ان سے مل گئے۔

ادھر رومی فوجیں بھی طوفان برق و باد کی طرح آ پہنچیں اور یرموک کے بالمقابل دیر الجبل میں پڑاؤ ڈالا۔ مختلف روایات کے مطابق رومی لشکر کی تعداد دو اور پانچ لاکھ کے درمیان تھی۔ ان کے مقابلے میں تمام اسلامی فوجوں کی تعداد صرف پینتیس ہزار کے لگ بھگ تھی، تاہم ان کے حوصلے بہت بلند تھے۔ یرموک کے میدان میں کئی دن تک رومیوں اور مسلمانوں کے درمیان گھمسان کی لڑائی ہوتی رہی، فریقین میں سے کسی نے بھی دادِ شجاعت دینے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ ابنِ جریر طبریؒ کا بیان ہے کہ اس لڑائی میں حضرت شرحبیلؓ بن حسنہؓ میسرہ کے سپہ سالار تھے بعض دوسرے مورخین نے انھیں کوئی تخصیص کیے بغیر ایک حصہ فوج کا سالار لکھا ہے۔ بہر صورت وہ جنگِ یرموک کے ابطالِ خاص میں شمار ہوتے ہیں۔ انھوں نے شروع سے اخیر تک ایسی جانبازی اور استقامت کا مظاہرہ کیا کہ ہر ایک نے ان کے جوشِ ایمان اور جذبۂ جہاد کا کھلے دل سے اعتراف کیا۔ مورخین نے جنگِ یرموک میں ان کی بہادری کے کئی واقعات بیان کیے ہیں۔ یہاں ان میں سے دو تین کا ذکر کرنا بے محل نہ ہوگا۔

ایک دن تیس ہزار رومیوں کے جتھے نے حضرت شرحبیلؓ کے دستے پر اس زور کا حملہ کیا کہ بیشتر مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے، لیکن حضرت شرحبیلؓ صرف پانچ سو آدمیوں کے ساتھ کوہِ استقامت بن کر میدانِ جنگ میں ڈٹے رہے اور رومیوں کو آگے نہ بڑھنے دیا۔ اپنے سردار کو برابر لڑتے دیکھ کر پسپا ہونے والے مسلمان غیرت کھا کر پھر واپس آگئے۔ حضرت شرحبیلؓ نے انہیں سرزنش کی کہ یہ تم نے کیا حرکت کی۔ یہ تو بہشت کو چھوڑ کر دوزخ میں گرنے والی بات تھی۔ انھوں نے سخت ندامت کا اظہار کیا اور پھر رومیوں پر ایسا زبردست حملہ کیا کہ ان کی صفیں درہم برہم ہوگئیں اور وہ پسپا ہونے پر مجبور ہوگئے۔

ایک اور موقع پر دشمن کے ایک لاکھ تیر اندازوں نے مل کر مسلمانوں پر اس شدّت سے تیر برسائے کہ سینکڑوں مجاہدین شہید یا زخمی ہوگئے۔ مورّخین نے لکھا ہے کہ یہ مسلمانوں پر سخت مصیبت کا دن تھا۔ شہداء اور دوسرے زخمیوں کے علاوہ سات سو مسلمان آنکھوں میں تیر لگنے کی وجہ سے یک چشم ہوگئے۔ چناں چہ مسلمانوں میں یہ دن یوم التعویر (یک چشم ہونے کا دن) مشہور ہوگیا۔ اس نازک موقعے پر حضرت خالدؓ بن ولید نے چند چیدہ چیدہ جانبازوں کو اپنے ساتھ لیا اور تیروں کی بارش میں سرپٹ گھوڑے دوڑاتے ہوئے تیر اندازوں پر جا پڑے اور اپنے تابڑ توڑ حملوں سے ان میں بھگدڑ مچا دی۔ حضرت خالدؓ کے ان جانباز ساتھیوں میں ایک حضرت شرحبیلؓ تھے۔

علّامہ شبلیؒ نے الفاروق میں جنگِ یرموک کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک دن (رومی جرنیل) ابنِ قناطیر نے میسرہ پر (بڑے زور کا) حملہ کیا۔ بدقسمتی سے اس حصے میں اکثر لخم وغسان کے قبیلے کے آدمی تھے جو شام کے اطراف میں بود و باش رکھتے تھے اور ایک مدّت سے روم کے باج گزار رہتے آئے تھے، رومیوں کا رعب جو دلوں میں سمایا ہوا تھا اس کا اثر یہ ہوا کہ پہلے ہی حملے میں ان کے پاؤں اکھڑ گئے۔ اگر افسروں نے بے ہمتی کی ہوتی، تو لڑائی کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ رومی بھاگتوں کا پیچھا کرتے ہوئے خیموں تک پہنچ گئے۔ عورتیں یہ حالت دیکھ کر بے اختیار نکل پڑیں اور ان کی پامردی نے عیسائیوں کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ فوج اگرچہ ابتر ہو چکی تھی۔ لیکن افسروں میں سے قباثؓ بن اشیم، سعیدؓ بن زیدؓ بن ابی سفیانؓ، عمروؓ بن العاص اور شرحبیلؓ بن حسنہؓ دادِ شجاعت دے رہے تھے۔ حضرت شرحبیلؓ کا یہ حال تھا کہ رومیوں کا چاروں

طرف سے نرغہ تھا اور بیچ میں پہاڑ کی طرح ڈٹے کھڑے تھے، قرآن کی یہ آیت:

إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ أَنْفُسَهُمْ وَ أَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ط يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَ يُقْتَلُوْنَ قف (التوبہ:۱۱۱)

''اللہ نے جنت کے بدلے مسلمانوں کی جان و مال کو خرید لیا ہے۔ وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں، پھر مارتے ہیں اور مارے جاتے ہیں۔''

پڑھتے تھے اور نعرے مارتے تھے کہ خدا کے ساتھ سودا کرنے والے اور خدا کے ہمسائے بننے والے کہاں ہیں؟ یہ آواز جس کے کان میں پڑی، بے اختیار لوٹ پڑا۔ یہاں تک کہ اکھڑی ہوئی فوج سنبھل گئی اور شرحبیلؓ نے ان کو ساتھ لے کر اس بہادری سے جنگ کی کہ رومی جو ٹوٹے چلے آتے تھے، بڑھنے سے رُک گئے۔

حضرت شرحبیلؓ اور دوسرے جانبازانِ اسلام کی ثابت قدمی اور شجاعت کا نتیجہ یہ ہوا کہ رومیوں کو عبرت ناک شکست ہوئی، ان کے ستّر ہزار سے ایک لاکھ کے درمیان آدمی میدانِ جنگ میں کھیت رہے اور ہرقل، انطاکیہ سے قسطنطنیہ جانے پر مجبور ہو گیا۔ انطاکیہ سے چلتے وقت اس کی زبان پر یہ الفاظ تھے: ''الوداع اے سرزمینِ شام۔''

(۸)

یرموک کی فتح کے بعد مسلمانوں نے قنسرین، حلب، انطاکیہ، منبج، مرعش، حصنِ حرث، بوقا، جرمہ اور کئی دوسرے مقامات بھی تھوڑی ہی مدّت میں فتح کر لیے اور پھر فلسطین کے مرکزی شہر بیت المقدس کا محاصرہ کر لیا۔ محاصرہ کرنے والی فوج میں حضرت شرحبیلؓ بھی شامل تھے۔ عیسائی چند ماہ تک قلعہ بند ہو کر لڑتے رہے، لیکن بالآخر ہمت ہار بیٹھے اور اس شرط پر صلح کی درخواست کی خلیفۃ المسلمین حضرت عمرؓ خود بیت المقدس تشریف لائیں اور اپنے ہاتھ سے معاہدۂ صلح لکھیں۔ حضرت ابوعبیدہؓ نے حضرت عمرؓ کو خط لکھا کہ بیت المقدس کی فتح آپ کی تشریف آوری پر موقوف ہے۔ حضرت عمرؓ کو یہ خط ملا، تو انھوں نے اکابر صحابہ سے مشورے کے بعد حضرت علیؓ کو نائب مقرر کر کے کاروبارِ خلافت ان کے سپرد کیا اور خود رجب ۱۳ھ میں مدینہ سے بیت المقدس کے لیے چل پڑے۔ فاروق اعظمؓ کے سفر بیت المقدس کی یہ شان تھی کہ بہ قول علامہ شبلیؒ نقارہ نوبت، خدم وحشم، لاؤ لشکر ایک طرف، معمولی ڈیرہ اور خیمہ تک نہ تھا۔ سواری میں گھوڑا تھا اور چند

مہاجرین وانصار ساتھ تھے، تاہم جہاں یہ آواز پہنچتی تھی کہ فاروقِ اعظم نے مدینہ سے شام کا ارادہ کیا ہے، زمین دہل جاتی تھی۔'' غرض امیر المومنین اسی شان سے جابیہ پہنچے۔ بیت المقدس کے عیسائی اکابر وہیں ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور معاہدۂ صلح کی تکمیل کی۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ بیت المقدس تشریف لے گئے۔ شہر میں داخل ہوئے، تو دوسرے صحابہ کے علاوہ حضرت شرحبیلؓ بھی ان کے جلو میں تھے۔

علامہ ذہبیؒ اور بہت سے دوسرے مورخین نے لکھا ہے کہ حضرت عمرِؓ فاروق نے حضرت شرحبیلؓ بن حسنہؓ کو اردن کا والی مقرر کر دیا تھا۔ یہ تقرر کب اور کس سال میں ہوا، اس کے بارے میں مختلف روایتیں ہیں، لیکن جب ہم حضرت شرحبیلؓ کو شام کے اکثر معرکوں میں ایک سرفروش مجاہد کی حیثیت سے حصہ لیتے دیکھتے ہیں، تو لامحالہ یہی نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ انھیں فرائضِ امارت ادا کرنے کا موقع بہت کم ملا۔ علّامہ ابنِ عبد البرؒ نے ''استیعاب'' میں لکھا ہے کہ جب ۱۸ھ میں طاعون عمواس کی ہولناک وبا شام میں پھیلی، تو حضرت عمروؓ بن العاص نے مشورہ دیا کہ اسلامی فوجیں وبازدہ علاقوں سے ہٹ کر محفوظ مقامات پر چلی جائیں، لیکن حضرت شرحبیلؓ نے یہ مشورہ قبول نہ کیا اور فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ طاعون خدا کی رحمت اور انبیاء کی دُعا ہے۔ پہلے بھی بہت سے نیک اور صالح لوگ اس مرض میں مبتلا ہو کر مر چکے ہیں، اس لیے موجودہ قیام گاہ سے ہرگز نہ ہٹنا چاہیے۔ چناں چہ وہ اپنی جگہ مقیم رہے اور اسی نامراد وبا میں وفات پائی۔

محمد حسین ہیکل نے اپنی کتاب ''عمر فاروقِ اعظمؓ'' میں لکھا ہے کہ جب حضرت عمرؓ کو طاعونِ عمواس میں حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراح اور یزید بن ابی سفیانؓ کے انتقال کی خبر ملی، تو آپ نے ان کی جگہ بالترتیب حضرت شرحبیلؓ بن حسنہؓ اور معاویہ بن ابوسفیانؓ کو مقرر فرمایا۔ اس کے بعد امیر المومنین وبا کے اثرات کا جائزہ لینے اور نظم ونسق بحال کرنے کے لیے دوبارہ شام تشریف لے گئے اور ایلہ سے ہوتے ہوئے جابیہ پہنچ کر چند دن قیام فرمایا۔ جابیہ کے زمانۂ قیام میں انھوں نے حضرت شرحبیلؓ کو ان کی خدمات سے سبک دوش کر دیا۔ حضرت شرحبیلؓ نے پوچھا:

''کیا آپ نے مجھے کسی ناراضی کی بنا پر سبک دوش کیا ہے؟''

حضرت عمرؓ نے جواب دیا: ''نہیں، تم مجھے بہت عزیز ہو، لیکن میں ایک ایسے شخص کو سارے شام کا امیر بنانا چاہتا ہوں جو تم سے زیادہ قوی ہو۔''

حضرت شرحبیلؓ نے عرض کیا: ''تو پھر مجمعِ عام میں اس کا اعلان کر دیجیے تا کہ مجھے لوگوں کے سامنے ندامت نہ اٹھانی پڑے۔''

حضرت عمرؓ نے لوگوں کو جمع کر کے اعلان فرمایا: ''لوگو! خدا کی قسم میں نے شرحبیل کو کسی ناراضی یا کوتاہی کے سبب امارت سے سبک دوش نہیں کیا، بلکہ ان کی جگہ ایک ایسے شخص کو امیر بنانا چاہتا ہوں جو ان سے زیادہ قوت کے ساتھ حکومت کرے۔ میرے نزدیک اس کام کے لیے معاویہ بن ابی سفیانؓ موزوں ترین آدمی ہیں۔''

وبا ابھی پوری طرح ختم نہیں ہوئی تھی۔ اس واقعے کے چند دن بعد حضرت شرحبیلؓ اسی وبا میں مبتلا ہو کر خالقِ حقیقی کے حضور پہنچ گئے۔ اس وقت ان کی عمر ۶۷ یا ۶۹ برس کی تھی۔ اگرچہ حضرت شرحبیلؓ کی ساری زندگی میدانِ جہاد میں گزری اور حدیث بیان کرنے کا موقع نہیں ملا، پھر بھی ان سے دو حدیثیں مروی ہیں جو ابن ماجہؒ نے اپنی سنن میں نقل کی ہیں۔ حضرت شرحبیلؓ بن حسنہؓ کے صحیفۂ حیات میں سبقت فی الاسلام، راہِ حق میں بلاکشی، شوقِ جہاد اور شغفِ عبادت میں سب سے نمایاں ابواب ہیں۔ انھوں نے اس وقت اسلام قبول کیا جب خدائے واحد کا نام لینا مشرکین کے نزدیک ایک ناقابلِ معافی جرم تھا۔ رضائے الٰہی کی خاطر تیرہ سال تک غریب الوطنی کی مصیبتیں جھیلیں، دو ہجرتوں کی سعادت حاصل کی اور پھر ساری زندگی جہاد فی سبیل اللہ میں گزار دی۔ عبادتِ الٰہی سے شغف کا یہ عالم تھا کہ کثرت سے روزے رکھتے اور ساری رات ذکرِ الٰہی میں گزار دیتے تھے۔ کثرتِ عبادت نے انھیں لاغر اور نحیف کر دیا تھا، لیکن جب میدانِ جہاد میں اترتے تھے تو حریف پر شیر کی طرح حملہ آور ہوتے تھے۔ تمام اہلِ سِیَر اس بات پر متفق ہیں کہ وہ ایک نہایت بہادر سپاہی اور نامور سپہ سالار تھے اور ملتِ اسلامیہ بجا طور پر ان پر فخر کر سکتی ہے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت عبداللہ بن جحشؓ

المجدع فی اللہ

(۱)

جنگِ اُحد (۷ رشوال ۳ھ) سے ایک دن قبل سرورِ کائنات ﷺ کے دو جاں نثار مدینہ منورہ میں کسی جگہ بیٹھے تھے اور دوسرے دن پیش آنے والے معرکہ کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ یکا یک ان میں سے ایک صاحب نے دُعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور بارگاہِ خداوندی میں یوں عرض پیرا ہوئے:

"الٰہی کل جب دشمن سے میری مڈبھیڑ ہو تو ایسا آدمی میرے مقابلے پر لا جو سخت جنگجو اور غضب ناک ہو، وہ مجھ سے لڑے اور میں اُس سے لڑوں، پھر مجھے اس پر غالب فرما تا کہ میں تیری راہ میں اس کو قتل کر دوں۔"

دوسرے صاحب نے ان کی دعا پر آمین کہا اور پھر خود ہاتھ اٹھا کر یوں دُعا مانگی۔

"اے میرے اللہ، میرے مقابلے میں ایسا آدمی لانا جو بڑا بہادر اور تند ہو میں اس سے لڑوں اور وہ مجھ سے لڑے یہاں تک کہ لڑتے لڑتے میں تیری راہ میں اس کے ہاتھ سے قتل ہو جاؤں، پھر وہ میری ناک اور کان کاٹ ڈالے، جب میں تجھ سے ملوں اور تو مجھ سے پوچھے کہ تیرے کان ناک کیوں کاٹے گئے، تو میں عرض کروں کہ اے اللہ! تیرے لیے اور تیرے رسولؐ کے لیے! میرے جواب پر تو فرمائے کہ ہاں تو سچ کہتا ہے۔"

اللہ اور اللہ کے رسولؐ کے یہ عاشقِ زار جن کو راہِ حق میں شہید ہونے کی اس قدر تمنّا تھی۔ سیّدنا حضرت عبداللہؓ بن جحش اسدی تھے جو تاریخ میں المجدع فی اللہ (گوش بریدۂ راہِ خدا)

کے لقب سے مشہور ہیں۔معرکہٴ اُحد سے پہلے اس موقع پر دعا مانگنے والے ان کے ساتھی حضرت سعدؓ بن ابی وقاص تھے۔

(۲)

سیدنا ابو محمد عبد اللہؓ بن جحش (بن ریاب بن یعمر بن صبرہ بن مرہ بن کثیر بن غنم بن دودان بن اسد خزیمہ) کا شمار صحابہ کرام کے افضل ترین طبقے میں ہوتا ہے۔ان کا تعلق قبیلہ بنو اسد بن خزیمہ سے تھا جو مشہور عدنانی قبیلہ بنو مضر کی ایک شاخ تھا اور ایامِ جاہلیت میں بنو عبد شمس (قریش) کا حلیف تھا۔ابنِ کثیرؒ نے مزید تصریح کی ہے کہ عبد اللہؓ کے والد جحش بن رئاب کا حلیفانہ تعلق حرب بن امیہ (ابوسفیان کے والد) سے تھا یعنی وہ بنو امیہ کے حلیف تھے۔لیکن بنو امیہ بھی بنو عبد شمس ہی کی شاخ تھے اس لیے ان دونوں روایتوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ حضرت عبد اللہؓ کے خاندان کو بنی غنم بن دودان بھی کہا جاتا تھا۔

حضرت عبد اللہؓ بن جحش کو سرورِ عالم ﷺ سے دو خصوصی نسبتیں حاصل تھیں:

(۱) وہ حضورؐ کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ان کی والدہ امیمہ بنت عبد المطلب حضورؐ کے والد عبد اللہ بن عبد المطلب کی حقیقی بہن تھیں۔

(۲) وہ اُمّ المومنین حضرت زینبؓ بنت جحش کے حقیقی بھائی تھے اس لحاظ سے حضورؐ کے برادرِ نسبتی تھے۔

عبد اللہؓ بن جحش ابھی چوبیس پچیس برس کے لپیٹے میں تھے کہ ہادیِ اکرمؐ نے دعوتِ حق کا آغاز فرمایا مبدأ فیض نے عبد اللہ کو فطرتِ سلیم سے نوازا تھا۔صدائے حق کانوں میں پڑتے ہی انھوں نے اس کو دل و جان سے قبول کرلیا اور رحمتِ عالمؐ کے دستِ حق پرست پر بیعت کر کے سابقون الاولون کی مقدس جماعت میں شامل ہوگئے۔یہ بعثت کا بالکل ابتدائی دَور تھا اور حضورؐ ابھی ارقمؓ بن ابی الارقم کے مکان میں فروکش نہیں ہوئے تھے۔

حضرت عبد اللہؓ کو اکیلے ہی سبقت فی الاسلام کا شرف حاصل نہیں ہوا بلکہ اُسی رَو میں ان کے ساتھ ان کی تین بہنیں حضرت زینبؓ، ام حبیبہؓ اور حمنہؓ اور دو بھائی ابو احمد عبدؓ اور عبید اللہ بھی حلقہ بگوشِ اسلام ہوگئے۔قبولِ اسلام کے بعد دوسرے مسلمانوں کی طرح یہ خاندان بھی قریش مکہ کے ظلم وستم کا نشانہ بن گیا۔جب قریش کے مظالم انتہا کو پہنچ گئے تو حضورؐ کے ایما پر حضرت عبد اللہؓ

اپنے اہل خاندان کے ہمراہ حبش کو ہجرت کر گئے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ انھوں نے دو بار حبش کو ہجرت کی اور بعض روایتوں کے مطابق وہ دوسری ہجرت حبشہ میں حبش گئے۔ بد قسمتی سے وہاں ان کا بھائی عبید اللہ بری صحبت میں پڑ کر اسلام سے منحرف ہو گیا اور عیسائیت قبول کر کے بادہ خواری میں مبتلا ہو گیا۔ اسی حالت میں پیغام اجل آ پہنچا۔ رسول اللہ ﷺ کو ان حالات کی خبر ملی تو آپؐ نے عبید اللہ کی بیوہ ام حبیبہؓ بنت ابو سفیان کو نکاح کا پیغام بھیجا جو انھوں نے قبول کر لیا۔ اور نجاشی شاہِ حبشہ نے شرعی طریق پر ان کا غائبانہ نکاح حضورؐ سے کر دیا۔ حضرت عبد اللہؓ اور ان کے دوسرے اہل خاندان بڑے خلوص اور استقامت کے ساتھ اسلام سے وابستہ رہے اور حضورؐ کی ہجرتِ مدینہ سے کچھ عرصہ پہلے حبش سے مکّہ واپس آئے۔ طبرانی نے حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اکرمؐ اور دوسرے صحابہؓ کی ہجرتِ مدینہ کے بعد جو چند مسلمان مکّہ میں رہ گئے تھے ان میں سے سب سے آخر میں حضرت عبد اللہؓ اور ان کے بھائی ابو احمد عبدؓ بن جحش نے ہجرت کی تیاری کی اور ایک دن اپنے قبیلہ بنی غنم بن وودان کے سارے ارا کین کو ساتھ لے کر مکّہ سے عازمِ مدینہ ہو گئے۔ اس طرح مکّہ میں بنی غنم بن وودان کا محلّہ بالکل ویران ہو گیا اور اکثر مکانوں میں تالے پڑ گئے۔ مدینہ منورہ میں حضرت عبد اللہؓ اور ان کے خاندان کو انصار کے مشہور بہادر حضرت عاصمؓ بن ثابت بن ابی اقلح (فلح) نے اپنا مہمان بنایا۔ علّامہ ابنِ سعد نے طبقات میں لکھا ہے کہ حضورؐ نے حضرت عاصمؓ بن ثابت کو حضرت عبد اللہ بن جحش کا دینی بھائی بنا دیا تھا (ان کے مابین رشتۂ مواخاۃ قائم کرا دیا تھا۔) دو ہجرتیں کرنے کی بنا پر حضرت عبد اللہؓ بن جحش صحابۂ ذو ہجرتین میں شامل ہیں۔

(۳)

رجب ۲ ھ میں سرورِ عالم ﷺ نے حضرت عبد اللہؓ بن جحش کو دس بارہ صحابہ کرام کے ایک جَیش کا امیر مقرر فرمایا اور ایک سر بہ مہر خط دے کر انھیں حکم دیا کہ دو دن کے سفر کے بعد اس خط کو کھول کر پڑھیں اور اس میں درج ہدایت کے مطابق عمل کریں۔ اس جیش میں حضرت سعدؓ بن ابی وقاص، عتبہؓ بن غزوان، عکاشہؓ بن محصن اور واقدؓ بن عبد اللہ تمیمی وغیرہم جیسے جلیل القدر صحابہ شامل تھے۔ چناں چہ حضورؐ نے اس جیش کی روانگی سے قبل ان اصحاب سے مخاطب ہو کر فرمایا:

''گو عبداللہ بن جحش تم لوگوں میں سب سے افضل نہیں ہے تاہم وہ بھوک پیاس کی سختیوں کو زیادہ برداشت کر سکتا ہے۔ (یہی سبب ہے کہ میں نے اس کو تم پر امیر بنایا ہے)۔''

بعض ارباب سِیَر نے لکھا ہے کہ اس سریّہ میں (جو سریّہ عبداللہؓ بن جحش کے نام سے مشہور ہے) حضرت عبداللہؓ کو ''امیر المومنین'' کہہ کر پکارا گیا۔ اگر چہ عام روایتوں کے مطابق حضرت عمر فاروقؓ مسلمانوں کے سب سے پہلے سردار ہیں، جو امیر المومنین کے لقب سے ممتاز ہوئے لیکن وہ اس معنی میں ہے کہ خلفائے راشدین میں سب سے پہلے حضرت عمر فاروقؓ کو امیر المومنین کے لقب سے مخاطب کیا گیا۔

دو دن کے سفر کے بعد حضرت عبداللہؓ نے حضورؐ کے نامۂ مبارک کو کھول کر پڑھا تو اس میں لکھا تھا کہ تم سیدھے مکّہ اور طائف کے درمیان نخلہ جا کر ٹھہرو اور وہاں سے قریش کی نقل و حرکت کا پتہ چلاؤ، کسی شخص کو اس کی مرضی کے خلاف اپنی معیت پر مجبور نہ کرو۔ جو تمہارا ساتھ دینا چاہے، دے اور جو واپس آنا چاہے واپس آجائے۔

خط کے مضمون سے مطلع ہو کر حضرت عبداللہؓ نے اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر فرمایا:

''بھائیو مجھے رسول اللہ ﷺ نے قریش کی نقل و حرکت کا پتہ چلانے کا حکم دیا ہے لیکن اس کام میں مدد لینے کے لیے کسی پر جبر کرنے سے منع فرمایا ہے۔ بلا شبہ یہ جان جوکھوں کا کام ہے، تم میں سے جس کسی کو شہادت فی سبیل اللہ کی آرزو ہو، وہ میرے ساتھ چلے اور جو واپس جانا چاہے اس کو اختیار ہے۔ میری طرف سے کسی پر کوئی پابندی نہیں ہے۔''

جیش کے سب آدمیوں نے بیک زبان کہا۔ ''ہم آپ کا ساتھ دیں گے اور رسول اللہ ﷺ کے فرمان کو ضرور پورا کریں گے خواہ اس میں ہماری جانیں چلی جائیں۔''

چناں چہ حضرت عبداللہؓ نے سارے جیش کے ساتھ نخلہ کا رُخ کیا اور بطن نخلہ میں پہنچ کر قریش کے حالات کی ٹوہ لینے میں مشغول ہو گئے۔ اتفاق سے قریش کا ایک قافلہ جو طائف (یا بہ روایتِ دیگر شام) سے کچا چمڑا، منقّہ، اور دوسرا تجارتی سامان بار کر کے لایا تھا، اس طرف سے گزرا۔ اس قافلے میں عمرو بن حضرمی، حکم بن کیسان، عثمان بن عبداللہ، اس کا بھائی نوفل بن عبداللہ مخزومی اور قریش کے کئی دوسرے سر برآوردہ لوگ شامل تھے۔ مسلمانوں نے اس قافلے کے

بارے میں آپس میں مشورہ کیا، اس دن ماہِ رجب کی پہلی تاریخ تھی لیکن مسلمانوں کا گمان تھا وہ جمادی الاخریٰ کا آخری دن ہے، انھوں نے طے کیا کہ آج ہی اس قافلے سے دو دو ہاتھ کر لیے جائیں اگر اس وقت انھیں چھوڑ دیا تو کل سے رجب کا آغاز ہو جائے گا جو حرمت والے مہینوں میں ہے اور پھر ہم ان کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔ چناں چہ مسلمان قافلہ کی طرف بڑھے، حضرت واقدؓ بن عبداللہ تمیمی نے امیر قافلہ عمرو بن حضرمی کو تیر مار کر ہلاک کر دیا۔ اور حکم بن کیسان اور عثمان بن عبد اللہ مسلمانوں کے ہاتھ قید ہو گئے۔ نوفل بن عبداللہ اور قافلہ کے دوسرے آدمی بھاگ گئے اور کاروانِ تجارت کے سارے مال و اسباب پر مسلمانوں نے قبضہ کر لیا۔ اہلِ سیَر کا بیان ہے کہ یہ اسلام میں سب سے پہلا مالِ غنیمت تھا اور عثمان بن عبداللہ اور حکم بن کیسان مسلمانوں کے سب سے پہلے قیدی تھے۔ مالِ غنیمت کی تقسیم کے بارے میں ابھی تک کوئی حکم نازل نہیں ہوا تھا اس لیے حضرت عبداللہؓ بن جحش نے اجتہاد سے کام لیا اور مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ (خمس) الگ کر کے باقی چار حصے اپنے ساتھیوں میں برابر برابر تقسیم کر دیے۔ حضرت عبداللہؓ کے اجتہاد کو بارگاہِ خداوندی میں شرفِ قبول حاصل ہوا اور بعد میں اسی کے مطابق خمس کا حکم نازل ہوا۔

حضرت عبداللہؓ بن جحش مالِ غنیمت لے کر بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے تو حضورؐ اس کے قبول کرنے میں متامل ہوئے اور فرمایا کہ میں نے تمھیں حرمت والے مہینے میں جدال وقتال کا حکم نہیں دیا تھا۔ دوسرے صحابہ کرامؓ نے بھی اہلِ سَریّہ کے اس فعل پر ناپسندیدگی اور ناگواری کا اظہار کیا —— مشرکینِ قریش اور یہود مدینہ نے بھی اس واقعہ کو بڑی شہرت دی اور مسلمانوں پر زبانِ طعن دراز کر کے یہ کہنا شروع کر دیا کہ محمد (ﷺ) اور ان کے ساتھیوں نے ماہِ حرام کو حلال کر لیا ہے۔ انھوں نے رجب (حرمت والے مہینے) میں خون ریزی کی، مال لوٹا اور قیدی پکڑ لیے۔ اس طرح وہ ماہِ حرام کی ہتک کے مرتکب ہوئے۔

حضرت عبداللہؓ اور ان کے ساتھیوں نے قسم کھا کر سرورِ عالم ﷺ اور دوسرے مسلمانوں کو یقین دلایا کہ جو کچھ ہوا غلط فہمی کی بنا پر ہوا اور ہم نے دانستہ ماہِ حرام میں خون ریزی نہیں کی —— حقیقت بھی یہی تھی کہ ان سے یہ کام ظن و اشتباہ اور التباس کی بنا پر سرزد ہوا تھا تاہم وہ اس پر سخت ملول اور پشیمان تھے —— اس پر رحمتِ خداوندی جوش میں آگئی اور یہ آیت نازل ہوئی:

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ط قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ط وَ صَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ كُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ق وَ اِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ج وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ط

(البقرہ:۲۱۷)

"(اے نبیؐ) لوگ آپ سے ماہِ حرام کی نسبت پوچھتے ہیں کہ اس میں لڑنا (جائز) ہے؟ کہہ دیں کہ اس میں لڑنا بڑا گناہ ہے اور اللہ کی راہ سے روکنا اور اس کا نہ ماننا اور مسجدِ حرام میں نہ جانے دینا اور اس کے اہل (مسلمانوں) کو اس سے نکالنا اللہ کے نزدیک اس سے بھی بڑھ کر (گناہ) ہے اور فساد انگیزی کشت و خون سے بھی بڑا جرم ہے۔"

اس طرح ذاتِ خداوندی نے خود حضرت عبداللہؓ بن جحش اور ان کے ساتھیوں کی بریّت کردی۔ حق تعالیٰ کے اس ارشاد میں مسلمانوں کی طرف سے ایک طرح کا ایک اعتذار ہے (اہلِ سریّہ سے جو خطا ماہِ حرام میں ہوئی وہ محض اندازے کی غلطی پر ہوئی ورنہ اصولاً ماہِ حرام میں لڑنا فی الواقع بڑا گناہ کا کام ہے) لیکن شرک اور کفر کرنا، مسلمانوں کو مسجدِ حرام میں جانے سے روکنا بلکہ اس سے نکال دینا، ابنِ حضرمی کے قتل اور دو آدمیوں کی اسیری سے کہیں بڑھ کر جرم ہے اس لیے اے کافرو! تم کس منہ سے ان پر زبانِ طعن دراز کر سکتے ہو۔

اس آیت کے نزول نے مسلمانوں کو خوش کر دیا اور نبی کریم ﷺ نے بھی مالِ غنیمت کا خمس قبول فرمالیا۔

(۴)

حق و باطل کے معرکہ اوّل میں حضرت عبداللہؓ بن جحش کو ان تین سو تیرہ سرفروشوں میں شامل ہونے کا شرفِ عظیم حاصل ہوا جو میدانِ بدر میں محض رضائے الٰہی کے حصول کی خاطر اپنی بے سروسامانی کے باوجود کفر کی مہیب طاغوتی قوت سے بھڑ گئے۔ اس معرکے میں انھوں نے شجاعت اور جانبازی کا حق ادا کر دیا اور قریش کے نامور بہادر ولید بن مغیرہ مخزومی (خالدؓ بن ولید کے حقیقی بھائی) کو گرفتار کر لیا۔ جنگ کے بعد ان کے دونوں بھائی خالد بن ولید اور ہشام بن ولید ان کو رہا کرانے کے لیے آئے تو حضرت عبداللہؓ نے چار ہزار زرِ فدیہ طلب کیا۔ ان کو اتنی رقم دینے میں تامل ہوا لیکن بعد میں خالد نے ہشام کو (یا بہ روایتِ دیگر ہشام نے خالد کو) غیرت

دلائی کہ کیا ولید ہمارا بھائی نہیں ہے اگر عبداللہ چار ہزار سے بھی زیادہ طلب کریں تو بھی اس رقم کو ادا کر کے ولید کو چھڑانا چاہیے۔ چناں چہ انھوں نے چار ہزار زرِ فدیہ ادا کر کے ولید کو چھڑا لیا اور اپنے ساتھ مکّہ لے چلے۔ ذوالحلیفہ کے مقام پر پہنچے تو ولید بھاگ کر پھر مدینہ آ گئے اور بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر مشرف بہ اسلام ہو گئے۔ اصل میں وہ اپنے ایّامِ اسیری کے دوران میں عبداللہؓ بن جحش کے حسنِ سلوک اور مسلمانوں کی بلندیِ کردار سے متاثر ہو کر اسلام کی صداقت کے قائل ہو گئے تھے جب ان سے پوچھا گیا کہ تم فدیہ کی ادائے گی سے قبل کیوں مسلمان نہ ہوئے تو جواب دیا، میں نہیں چاہتا تھا کہ لوگ مجھے فدیہ کے ڈر سے اسلام لانے والا کہیں اسی لیے میری خواہش تھی کہ پہلے اپنی قوم کے لوگوں کے ساتھ فدیہ دے کر آزادی حاصل کروں اور پھر بہ رضا و رغبت کسی خوف یا لالچ کے بغیر اسلام قبول کروں ـــــ حضرت عبداللہؓ بن جحش کو راہِ حق میں شہید ہونے کی بڑی تمنا تھی۔ چناں چہ غزوۂ احد کے موقع پر ان کا سوز دروں اس دعا کی صورت میں ان کی زبان پر آ گیا جس کا ذکر اوپر آ گیا ہے۔

مستدرک حاکم میں حضرت سعید بن میسبؒ سے روایت ہے کہ لڑائی سے ایک دن قبل حضرت عبداللہؓ نے یہ دعا مانگی تھی۔

> ''الٰہی میں تجھے قسم دیتا ہوں کہ کل صبح دشمن سے میرا مقابلہ ہو، وہ میرا پیٹ چاک کر ڈالے اور میری ناک اور کان کاٹ لے پھر تو مجھ سے سوال کرے کہ تو کس لیے شہید کیا گیا تو میں کہوں کہ تیرے لیے۔''

سعیدؒ کہتے ہیں کہ ''مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح ان کی قسم کے ابتدائی حصے کو پورا کیا اسی طرح اس کے آخری حصے کو بھی پورا کرے گا۔''

دوسرے دن معرکۂ رزم برپا ہوا تو حضرت عبداللہؓ اس والہانہ انداز سے لڑے کہ سر پیر کا ہوش نہیں تھا، لڑتے لڑتے ان کی تلوار ٹوٹ گئی تو سرورِ عالم ﷺ نے ان کو کھجور کی ایک مضبوط چھڑی عطا فرمائی جس سے انھوں نے تلوار کا کام لیا اور دیر تک دادِ شجاعت دیتے رہے۔ اسی حالت میں ابوالحکم بن اخنس ثقفی نے ان پر تلوار کا ایک بھرپور وار کیا جس سے شہید ہو کر گر پڑے۔ مشرکین نے لاش کا مُثلہ کیا اور ناک اور کان کاٹ لیے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کی دُعا قبول کر لی۔

علامہ ابنِ اثیرؒ نے لکھا ہے کہ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کا گزر ان کی لاش پر ہوا تو بے ساختہ ان کی زبان سے نکلا۔ ''خدا کی قسم عبداللہ کی دُعا میری دعا سے بہتر تھی۔'' لڑائی سے پہلے خود اس شہید راہِ حق کو اپنی شہادت اور لاش کے مُثلہ ہونے کا اس قدر یقین تھا کہ لوگوں سے قسم کھا کھا کر کہتے تھے ''الٰہی میں تیری قسم کھاتا ہوں کہ میں تیری راہ میں دشمن سے لڑوں گا یہاں تک کہ قتل ہو جاؤں گا اور دشمن میری لاش کو مثلہ کرے گا'' ـــــ اللہ تعالیٰ نے ان کی قسم کو بعینہٖ ان کی آرزو کے مطابق پورا کر دیا۔

شہادت کے وقت چالیس برس سے کچھ اوپر عمر تھی۔ میانہ قد تھا اور خوب صورت آدمی تھے۔ سر پر گھنے بال تھے۔ رحمتِ عالم ﷺ کو اُن سے اس قدر محبت تھی کہ اُنھیں اپنے محبوب چچا سیّد الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ، کے ساتھ ایک ہی قبر میں اُحد کے گنجِ شہیداں میں دفن کیا۔ حضرت عبداللہؓ بن جحش کی اولاد میں صرف ایک لڑکا تھا جنھیں شہادت کے بعد رسولِ اکرم ﷺ نے خود اپنی سرپرستی میں لے لیا اور خیبر میں ان کے لیے جائداد بھی خرید فرمائی۔

سیدنا حضرت عبداللہؓ بن جحش کے کردار کا نمایاں وصف اللہ اور اللہ کے رسول کی محبت میں ان کا دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہونا ہے۔ ان کے دل میں شہادت کی آرزو ہر وقت مچلتی رہتی تھی۔ صرف شہادت ہی کی نہیں بلکہ اس بات کی بھی کہ دشمن اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی محبت کے جرم میں ان کی لاش کو بگاڑ ڈالے اور وہ اسی صورت میں حق تعالیٰ کے سامنے پیش ہوں۔ غزوۂ اُحد میں اللہ تعالیٰ نے اُن کی یہ آرزو پوری کر دی اور انھوں نے اپنے عمل سے اُمتِ مسلمہ کے لیے یہ سبق چھوڑا۔ ؏

کس طرح جیتے ہیں، یہ مر کر دکھانا چاہیے

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت ابو سلمہ عبد اللہ مخزومیؓ

(۱)

جمادی الاخریٰ ۴ھ کے اوائل کا ذکر ہے کہ ایک دن رحمتِ عالم ﷺ کو اپنے ایک جاں نثار کی شدید علالت کی خبر ملی جو مدینہ منوّرہ کے قریب عالیہ نامی بستی میں موت وحیات کی کش مکش میں مبتلا تھے۔ حضورؐ یہ خبر سُن کر بے چین ہو گئے اور اسی وقت عیادت کے لیے ان صاحب کے گھر تشریف لے گئے۔ بیمار شیدائی رسولؐ پر اس وقت نزع کا عالم طاری تھا جونہی سرور کونینؐ نے ان کے گھر میں قدم رکھا انھوں نے حضورؐ پر ایک حسرت بھری نظر ڈالی اور ساتھ ہی ان کی روحِ مطہرّ عالم بالا کو پرواز کر گئی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ ان کی آنکھیں بس جنابِ رسالت مآبؐ کے دیدار کی منتظر تھیں۔ حضورؐ نے اپنے دستِ مبارک سے ان کی آنکھیں بند کیں۔ اہلِ خانہ کو جزع فزع سے منع کیا اور پھر میت کے قریب کھڑے ہو کر یوں دُعا مانگی:

''الٰہی اس کی قبر کو وسیع اور روشن کر، اس کو نور سے بھر دے۔ اپنے اس بندے کی مغفرت فرما اور ہدایت یافتہ لوگوں میں اس کا درجہ بلند فرما۔''

اور جب ان صاحب کی نمازِ جنازہ پڑھی گئی تو رحمتِ عالم ﷺ نے معمول کے خلاف نو تکبیریں کہیں، لوگوں نے پوچھا، یا رسول اللہؐ آپ نے نو تکبیریں کیسے کہیں کیا سہو تو نہیں ہوا؟ فرمایا نہیں، بلکہ یہ تو ہزار تکبیروں کے مستحق تھے۔

یہ صحابیؓ جن کے لیے سیّد المرسلین فخرِ موجودات شافع محشر ﷺ نے اس قدر پُرسوز دعا مانگی اور جن کی نمازِ جنازہ غیر معمولی اہتمام کے ساتھ پڑھی، سیّدنا ابو سلمہ عبد اللہؓ بن عبد الاسد مخزومی تھے۔

(۲)

حضرت ابو سلمہ عبد اللہؓ کا شمار ان عظیم المرتبت صحابہ میں ہوتا ہے جو دربارِ رسالتؐ کے خاص الخاص اراکین میں تھے۔ اُن کا خاندان بنو مخزوم زمانۂ جاہلیت میں مخصوص عزت و اقتدار کا مالک تھا۔ سلسلۂ نسب یہ ہے۔

ابو سلمہ عبد اللہؓ بن عبد الاسد بن ہلال بن عبد اللہ بن عمر بن مخزوم۔

حضرت ابو سلمہؓ کو رحمتِ عالم ﷺ سے بھی قرابتِ قریبہ کا شرف حاصل تھا۔ ان کی والدہ برّہ بنت عبد المطلب حضورؐ کی پھوپھی تھیں۔ اس نسبت سے وہ حضورؐ کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے لکھا ہے کہ حضرت ابو سلمہؓ حضورؐ کے رضاعی بھائی بھی تھے۔ گویا سرورِ کائناتؐ کا اپنے چچا حضرت حمزہؓ اور پھوپھی زاد بھائی حضرت ابو سلمہؓ دونوں کے ساتھ دودھ شریک بھائی کا رشتہ بھی تھا۔

حضرت ابو سلمہؓ طبعاً نہایت نیک نفس اور پاک باز تھے۔ یہی حال ان کی اہلیہ امّ سلمہ ہندؓ بنت ابی امیّہ سہیل کا تھا۔ دونوں میاں بیوی کو یہ شرف حاصل ہوا کہ ہر قسم کے مصائب اور خطرات کے علی الرغم ابتدائے دعوت میں ہی دولتِ اسلام سے بہرہ یاب ہو گئے۔ سرورِ عالم ﷺ اس وقت تک حضرت ارقمؓ بن ابی الارقمؓ کے مکان میں پناہ گزین نہیں ہوئے تھے۔ بعض اہل سِیَر نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ حضرت ابو سلمہؓ کے سعادت اندوزِ اسلام ہونے سے پہلے صرف دس آدمی دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے تھے گویا وہ سابقون الاولون میں بھی امتیازی حیثیت کے مالک ہیں۔ قبولِ اسلام کے بعد حضرت ابو سلمہؓ بھی دوسرے مسلمانوں کی طرح مشرکین قریش کے ظلم و ستم کا نشانہ بن گئے۔ جب کفار کے مظالم انتہا کو پہنچ گئے تو ۵ بعد بعثت (رجب ۴۵ عام الفیل) میں سرورِ عالم ﷺ نے مسلمانوں کو حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت دے دی۔ چناں چہ سب سے پہلے گیارہ مردوں اور چار عورتوں پر مشتمل ایک قافلہ روانہ ہوا۔ راہِ حق کے ان مسافروں میں حضرت ابو سلمہؓ اور ان کی اہلیہ امِ سلمہؓ بھی شامل تھیں۔ کفارِ قریش کو ان مظلوموں کے ارادے کا علم ہوا تو ان کے ایک گروہ نے ساحلِ سمندر تک مسلمانوں کا تعاقب کیا لیکن اسے ناکام واپس آنا پڑا کیوں کہ اس کے بندرگاہِ شعیبہ پر پہنچنے سے پہلے ہی مسلمانوں کا جہاز وہاں سے روانہ ہو چکا تھا۔ اہلِ حق کو ابھی حبش میں تین ہی ماہ گزرے تھے کہ انھوں نے اہلِ مکہ کے مسلمان

ہونے کی خبر سُنی (یا یہ کہ رسولِ اکرمؐ اور کفارِ مکہ کے درمیان صلح ہوگئی ہے) یہ خبر سنتے ہی مہاجرین نے حبش سے مکہ کا رخ کیا۔ بعض مورخین نے لکھا ہے کہ سارے مہاجرین مکہ واپس آ گئے اور ان میں سے ایک جماعت وہاں ٹھہری رہی۔ حضرت ابوسلمہؓ اور ام سلمہؓ ان مسلمانوں میں شامل تھے جنھوں نے مکہ کو مراجعت کی۔ مکہ کے قریب پہنچ کر انھیں معلوم ہوا کہ جو خبر انھوں نے سنی تھی وہ بالکل غلط تھی تاہم انھوں نے اسی وقت حبش واپس جانا مناسب نہ سمجھا اور کسی نہ کسی کی پناہ لے کر شہر میں داخل ہو گئے۔

ابن ہشامؒ نے ابنِ اسحاقؒ کے حوالے سے لکھا ہے کہ حضرت ابوسلمہؓ نے حضرت ابوطالب کی پناہ لی جو اُن کے ماموں تھے۔ بنومخزوم اس پر بگڑ بیٹھے۔ انھوں نے ابوطالب سے احتجاج کیا کہ اپنے بھتیجے (محمد ﷺ) کو آپ نے پہلے ہی اپنی پناہ میں لے رکھا ہے اب آپ ہمارے آدمی کو بھی اپنی پناہ میں لے رہے ہیں آخر کیوں؟

ابوطالب نے جواب دیا: ''محمد (ﷺ) میرا بھتیجا ہے تو ابوسلمہ میرا بھانجا ــــ اگر میں اپنے بھتیجے کو اپنی پناہ میں لے سکتا ہوں تو بھانجے کو بھی لے سکتا ہوں۔'' بنومخزوم نے ابوطالب کی بات کو تسلیم نہ کیا اور اپنے اس مطالبے پر اڑے رہے کہ ابوسلمہؓ کو ان کی تحویل میں دیا جائے۔

اس موقع پر ابولہب کو اپنے بھائی کی حمایت میں جوش آ گیا، وہ اٹھ کھڑا ہوا اور بنومخزوم سے مخاطب ہو کر کہا:

> ''مخزومی بھائیو! تم نے ابوطالب کو بہت کچھ کہہ سن لیا اب میری بھی سن لو، ابوطالب تمہارے دبیل نہیں ہیں، وہ جس کو چاہیں اپنی پناہ میں لے سکتے ہیں۔ تم کو یہ حق نہیں کہ ان پر اپنا عہد توڑنے کے لیے دباؤ ڈالو۔ اگر تم انھیں تنگ کرنے سے باز نہ آئے تو میں ان کے ساتھ مل کر تمہارا مقابلہ کروں گا۔''

ابولہب مشرکین کا دست و بازو تھا اس کے تیور دیکھ کر بنومخزوم نے اپنا مطالبہ فوراً ترک کر دیا اور کہا۔ ''اے ابوعتبہ ہم آپ کو ہرگز ناراض نہیں کریں گے۔''

اس واقعہ کے بعد مسلمانوں پر قریش کے مظالم میں اور شدّت پیدا ہو گئی۔

چناں چہ حضورؐ نے مسلمانوں کو پھر ہدایت فرمائی کہ وہ حبش کے دار الامن کو چلے جائیں۔ چناں چہ ۶ بعثت میں حبشہ کی دوسری ہجرت ہوئی جس میں ۸۳ مردوں اور ۲۰ خواتین کا

ایک قافلہ کفار کی سخت مزاحمت کے باوجود کسی نہ کسی طرح حبش پہنچنے میں کام یاب ہوگیا۔ اس قافلے میں حضرت ابوسلمہؓ اور اُمّ سلمہؓ دونوں شامل تھے۔ گویا یہ ان کی دوسری ہجرت تھی۔

کئی سال حبشہ میں غریب الوطنی کی زندگی گزارنے کے بعد حضرت ابوسلمہؓ اور اُمِ سلمہؓ متعدد دوسرے مہاجرین حبشہ کے ہمراہ مکہ معظّمہ واپس آگئے۔ یہ حضورؐ کی ہجرت الی المدینہ سے کچھ عرصے پہلے کا واقعہ ہے یہاں پہنچ کر وہ پھر اپنے قبیلے اور دوسرے کفّار کی ستم رانیوں کا ہدف بن گئے۔

(۳)

ہجرتِ نبویؐ سے سال سوا سال پہلے (۱۲ بعد بعثت) میں حضرت ابوسلمہؓ نے کفّار کے مظالم سے تنگ آکر مدینہ کی طرف ہجرت کا قصد کیا اس وقت ان کے پاس صرف ایک ہی اونٹ تھا، اس پر انھوں نے حضرت اُمِ سلمہؓ اور اپنے ننھے بچے سلمہ کو سوار کرایا۔ اُمّ سلمہ کے خاندان والوں نے اونٹ کو روک لیا اور کہا تم جاسکتے ہو لیکن ہماری لڑکی تمہارے ساتھ نہیں جاسکتی۔ یہ کہہ کر انھوں نے اونٹ کی نکیل ابوسلمہؓ کے ہاتھ سے چھین لی اور اُمِ سلمہؓ کو زبردستی اپنے ساتھ لے چلے۔ اتنے میں ابوسلمہؓ کے خاندان کے لوگ (بنوعبدالاسد) آپہنچے۔ انھوں نے اُمِ سلمہؓ سے ان کا بچہ چھین لیا اور بنومغیرہ سے کہا، تم نے اپنی لڑکی کو ہمارے آدمی سے چھین لیا تو ہم اپنے لڑکے سلمہ کو تمہارے پاس کیوں چھوڑیں —— اس چھینا جھپٹی میں ننّھے سلمہ کا ہاتھ اتر گیا۔ (علامہ بلاذری کا بیان ہے کہ سلمہؓ کا یہ ہاتھ مرتے دم تک ٹھیک نہ ہوا)

یہ ایک دردناک منظر تھا لیکن ابوسلمہؓ دل پر پتھر رکھ کر بیوی بچے کے بغیر تن تنہا مدینے کی طرف روانہ ہوگئے۔ ان کی اہلیہ اُمّ سلمہؓ بنومغیرہ کے پاس اور بچہ بنوعبدالاسد کے پاس تھے۔ گویا دینِ حق کی خاطر تینوں باپ بیٹا اور بیوی جدائی کی مصیبتیں برداشت کر رہے تھے۔ حضرت اُمِ سلمہؓ کو شوہر اور بچے کی جدائی کا فطری طور پر بہت صدمہ تھا۔ وہ روزانہ صبح کے وقت گھر سے نکلتیں اور سارا دن ایک ٹیلے پر (ابطح میں) بیٹھ کر گریہ وزاری کرتی رہتیں۔ پورا ایک سال اسی طرح گزر گیا۔ ایک دن بنومغیرہ کے ایک رحم دل اور صاحبِ اثر آدمی نے انھیں اس حال میں دیکھا تو اس کا دل پسیج گیا اس نے اپنے قبیلے کو جمع کیا اور ان سے کہا:

''یہ لڑکی ہمارا ہی خون ہے ہم کب تک اس مسکین کو اس کے شوہر اور بچے سے جدا رکھیں گے۔اے بنی مغیرہ ہمارا قبیلہ بڑا شریف اور شجاع ہے اور ظلم کو دوست نہیں رکھتا۔''

اس نیک دل آدمی کی تقریر سُن کر دوسرے لوگوں کو بھی رحم آ گیا اور انھوں نے امّ سلمہؓ کو اجازت دے دی کہ وہ اپنے شوہر کے پاس مدینہ جا سکتی ہیں۔ جب بنو عبدالاسد نے یہ واقعہ سُنا تو انھیں بھی ترس آ گیا اور انھوں نے سلمہؓ کو اپنی ماں کے پاس بھیج دیا۔حضرت امّ سلمہؓ نے بچے کو گود میں لیا اور اونٹ پر سوار ہو کر مدینہ کی طرف روانہ ہوئیں۔ راستے میں تنعیم کے مقام پر انھیں ایک شریف النفس آدمی عثمان بن طلحہ ملے انھوں نے جب اُمِ سلمہؓ کو ننھے بچے کے ہمراہ تن تنہا سفر کرتے دیکھا تو دل میں آیا۔''اے عثمان یہ مردانگی سے بعید ہے کہ مکہ کی ایک بیٹی یوں تنہا سفر کرے اور تو اس کی مدد نہ کرے۔'' انھوں نے اُمِ سلمہؓ کے اونٹ کی نکیل پکڑی اور کشاں کشاں مدینہ کی طرف چل پڑے۔ جب کہیں پڑاؤ ہوتا تو وہ کسی درخت کی اوٹ میں ہو جاتے اور چلنے کے وقت اونٹ تیار کر کے لے آتے۔غرض یونہی چلتے چلاتے قبا پہنچ گئے۔ابو سلمہؓ وہیں مقیم تھے وہ اپنی نیک سیرت بیوی اور اور بچے کو پا کر خدا کا شکر بہ جالائے۔عثمان بن طلحہ یہاں سے مکہ کو واپس چلے گئے۔(انھوں نے فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کیا) حضرت اِمِ سلمہؓ نے ان کی نیکی کو ہمیشہ یاد رکھا، فرمایا کرتی تھیں۔''میں نے عثمان بن طلحہ سے زیادہ ساتھ دینے والا شریف آدمی نہیں دیکھا۔'' علامہ ابنِ اثیرؒ نے حضرت اُمِ سلمہؓ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ میں نہیں جانتی کہ خاندانِ ابوسلمہؓ سے زیادہ کسی گھرانے نے اسلام کی خاطر مصیبتیں جھیلیں ہوں۔

(۴)

ایک روایت کے مطابق حضرت ابوسلمہؓ پہلے مسلمان تھے جو مکّہ سے ہجرت کر کے مدینہ پہنچے۔اسی طرح ان کی اہلیہ حضرت اُمّ سلمہؓ پہلی مسلمان خاتون ہیں جو ہجرت کر کے مدینہ آئیں۔یہ ان کی تیسری ہجرت تھی جوان سعادت مند روحوں نے محض رضائے الٰہی کے حصول کی خاطر کی۔علاّمہ ابنِ سعد کا بیان ہے کہ رحمتِ عالم ﷺ کے مدینہ منوّرہ تشریف لانے تک حضرت ابوسلمہؓ نے قبا میں قبیلہ عمرو بن عوف کے ہاں قیام کیا۔حضوؐر نے ہجرت کے بعد مدینہ میں نزولِ اجلال فرمایا تو آپ نے مشہور صحابی حضرت ابوخیثمہ انصاریؓ سے حضرت ابوسلمہؓ کی مواخاۃ کرادی۔اور ان کی مستقل سکونت کے لیے ایک قطعۂ زمین مرحمت فرمایا۔

۲ھ میں حضرت ابوسلمہؓ کو ان تین سو تیرہ نفوسِ قدسی میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہوا جو حق و باطل کے معرکۂ اوّل ''غزوۂ بدر'' میں رحمتِ عالم ﷺ کے ہمرکاب تھے۔ ۳ھ میں انھوں نے غزوۂ اُحد میں سرفروشانہ حصہ لیا۔ اثنائے جنگ میں ایک مشرک ابو اُسامہ جشمی نے تاک کر زہر میں بجھا ہوا تیر ان کے بازو میں مارا جس سے وہ شدید زخمی ہوگئے۔ ایک ماہ کے علاج معالجے کے بعد بہ ظاہر تندرست ہوگئے لیکن تیر کا زہر اندر ہی اندر کام کرتا رہا۔ ۳ھ کے اواخر میں رسولِ اکرم ﷺ کو خبر ملی کہ جبلِ قطن کے دامن میں آباد بنو اسد بن خزیمہ کے سردار طلیحہ اور سلمہ (یا بہ روایت دیگر اسد بن خویلد) اپنے قبیلہ کو مدینہ منورہ پر حملہ کرنے کے لیے اُبھار رہے ہیں۔ حضورؐ نے حضرت ابوسلمہؓ کو ایک سو پچاس سوار دے کر حکم دیا کہ فوراً بنو اسد بن خزیمہ کے علاقے میں جاؤ اور ان کو منظم ہونے سے پہلے منتشر کردو۔

حضرت ابوسلمہؓ بڑی رازداری کے ساتھ سفر کرتے ہوئے یکم محرم ۴ھ کو یکایک مفسدین کے سر پر جا پہنچے اور انھیں اپنی تلواروں پر رکھ لیا۔ وہ بدحواسی کے عالم میں اِدھر اُدھر بھاگے تو حضرت ابوسلمہؓ نے مجاہدین کو تین دستوں میں تقسیم کرکے مختلف اطراف میں ان کے تعاقب میں بھیجا۔ مجاہدین نے بنو اسد کے سب کس بل نکال دیے اور اونٹ اور بھیڑ بکریوں کی ایک کثیر تعداد ان سے چھین لی۔ حضرت ابوسلمہؓ ۲۹ دن کے بعد مظفّر و منصور مدینہ منوّرہ واپس آئے اور یہ کثیر مالِ غنیمت دربارِ رسالت میں پیش کیا تو حضورؐ بہت مسرور ہوئے اور حضرت ابوسلمہؓ اور ان کے ساتھیوں کو دعا دی۔ تاریخ میں یہ سریہ ''سریۂ ابوسلمہؓ یا سریۂ قطن'' کے نام سے مشہور ہے۔ اس مہم سے واپسی کے کچھ عرصہ بعد وہ زخم جو ابوسلمہؓ کو جنگِ اُحد میں لگا تھا، پھر ہرا ہوگیا۔ بہتیرا علاج معالجہ کیا گیا لیکن زخم بگڑتا ہی گیا۔ یہاں تک کہ ابوسلمہؓ کے بچنے سے مایوسی ہوگئی۔ اسی دوران میں رسولِ اکرمؐ کئی بار حضرت ابوسلمہؓ کی عیادت کے لیے تشریف لائے۔ جمادی الاخریٰ ۴ھ کے اوائل میں ان پر نزع کی کیفیت طاری ہوئی تو حضورؐ کو اطلاع دی گئی آپؐ فوراً ابوسلمہؓ کے گھر تشریف لائے انھوں نے آپ کو دیکھتے دیکھتے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کردی۔ حضورؐ نے اپنے دستِ مبارک سے ان کی آنکھیں بند کیں اور فرمایا:

''انسان کی روح جس وقت بدن سے جدا ہوتی ہے تو آنکھیں اس کے دیکھنے کے لیے کھلی رہ جاتی ہیں۔''

اس وقت حضرت امِ سلمہؓ فرطِ الم سے نڈھال تھیں اور بار بار کہتی تھیں:

''ہائے ہائے غربت میں کیسی موت آئی ہے۔''

حضورؐ نے ان کو صبر کی تلقین فرمائی اور ساتھ میں یہ ہدایت بھی کہ ان کی مغفرت کی دُعا مانگو اور کہو، اے اللہ مجھے ان سے بہتر ان کا جانشین دے۔ اس کے بعد حضورؐ نے خود ابو سلمہؓ کے لیے دُعائے مغفرت مانگی اور خاص اہتمام کے ساتھ ان کی نمازِ جنازہ پڑھائی۔

حضرت ابو سلمہؓ نے اپنے پیچھے اہلیہ کے علاوہ چار بچے (دو لڑکے اور دو لڑکیاں) اپنی یادگار چھوڑے۔ لڑکوں کے نام سلمہؓ اور عمرؓ تھے اور لڑکیوں کے دُرّہؓ اور زینبؓ۔ ان سب بچوں نے حضورؐ کے سایۂ عاطفت میں پرورش پائی۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابو سلمہؓ اپنے اہل و عیال پر بے حد شفیق تھے۔ چناں چہ وفات کے وقت ان کی زبان پر یہ الفاظ تھے، الٰہی میرے کنبہ کی اچھی طرح نگہداشت فرمانا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دُعا کو اس طرح شرفِ قبول بخشا کہ حضرت اُمّ سلمہؓ چند ماہ بعد اُمّ المومنین بن گئیں۔ اور ان کے بچے رحمتِ عالم ﷺ کے ربیب بنے۔

اس ضمن میں ابن سعد نے طبقات میں یہ روایت بھی بیان کی ہے کہ حضرت ابو سلمہؓ کی زندگی میں ایک دفعہ حضرت اُمِ سلمہؓ نے ان سے کہا:

''میں نے سنا ہے کہ اگر کسی عورت کا شوہر اس کی زندگی میں فوت ہو جائے اور وہ عورت اس کے بعد دوسرا نکاح نہ کرے تو اللہ اُسے جنت میں داخل کرتا ہے اسی طرح کسی مرد کی زندگی میں اس کی بیوی مر جائے اور وہ مرد اس کے بعد دوسرا نکاح نہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس مرد کو بھی جنت عطا کرتا ہے۔ آؤ ہم دونوں عہد کریں کہ ہم میں سے جو پہلے مرے دوسرا اس کے بعد مجرّد زندگی گزارے۔

ابو سلمہؓ نے کہا۔ ''کیا تم میرا کہا مانو گی؟''

اُمِ سلمہؓ نے جواب دیا کیوں نہیں؟

ابو سلمہؓ نے فرمایا: ''تو سنو اگر میں پہلے مر جاؤں تو تم میرے بعد ضرور نکاح کر لینا۔''

اس کے بعد انھوں نے دستِ دعا اٹھائے اور بارگاہِ ایزدی میں یوں عرض پیرا ہوئے:

''اے مولائے کریم اگر میں اُمّ سلمہؓ کی زندگی میں مرجاؤں تو، تو اسے مجھ سے بہتر جانشین دے۔''

ان کی یہ دعا درِ اجابت پر پہنچ گئی اور ان کے بعد حضرت ابوسلمہؓ کے جانشین سید المرسلین ﷺ ہوئے۔

مسند احمد میں خود حضرت اُمِ سلمہؓ سے روایت ہے کہ:

''ایک دن ابوسلمہؓ دربارِ رسالت سے گھر واپس آئے تو بہت خوش تھے، مجھ سے کہنے لگے کہ آج رسول اللہ ﷺ کے ارشادِ مبارک نے مجھے بے حد مسرور کیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ جو مسلمان مصیبت کے وقت (سچے دل سے) اللہ کے در پر جھکتا ہے اور یہ دعا مانگتا ہے کہ الٰہی اس مصیبت میں میری مدد کر اور بہترنعم البدل مرحمت کر، تو اللہ اس کی دُعا قبول فرماتا ہے۔''

ابوسلمہؓ کی یہ بات میرے دل پر نقش ہوگئی۔ جب انھوں نے وفات پائی تو مجھے سخت صدمہ پہنچا اور میں نے یہی دُعا مانگی لیکن پھر میرے دل میں خیال آیا کہ ابوسلمہؓ سے بہترنعم البدل کون ہوسکتا ہے؟ جب عدّت گزرنے کے بعد خود رسول اللہ ﷺ نے مجھے نکاح کا پیغام بھیجا تو مجھ پر روشن ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ابوسلمہؓ سے بہترنعم البدل عطا فرمادیا۔''

سیدنا حضرت ابوسلمہؓ نے اگرچہ طویل زندگی نہیں پائی لیکن اپنے اخلاصِ عمل راہِ حق میں تحمل شدائد، حبّ رسولؐ اور ایثار و شجاعت کے جو نقوش انھوں نے صفحۂ تاریخ پر مرتسم کیے وہ قیامت تک ان کا نام زندہ و تاباں رکھیں گے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت ابنِ اُمِ مکتومؓ

(۱)

رحمتِ عالم ﷺ کی بعثت حق اور باطل کے درمیان ایک طویل کش مکش کا نقطۂ آغاز تھی تاہم جب تک (چوتھے سال نبوت میں) فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِکِیْنَ o (الحجر: ۹۴) ''احکامِ الٰہی علانیہ بیان کیجیے اور مشرکوں کی طرف سے منھ پھیر لیجیے۔'' کا فرمانِ خداوندی نازل نہ ہوا، اس کش مکش نے شدت اختیار نہ کی، چناں چہ نبوّت کے پہلے تین سالوں میں سرورِ عالمؐ اور کفّارِ مکّہ کے باہمی تعلقات کی یہ کیفیت رہی کہ آپؐ بھی ان لوگوں کے پاس بلا جھجک تشریف لے جاتے تھے اور وہ لوگ بھی مجلسِ نبوی میں حاضر ہو کر آپؐ کے ارشادات سن لیتے تھے۔

اسی زمانے کا ذکر ہے کہ ایک دن سرورِ عالم ﷺ کی مجلس میں ابو جہل، عتبہ، شیبہ، امیّہ بن خلف، ولید بن مغیرہ وغیرہ بہت سے رؤسائے قریش بیٹھے تھے اور آپؐ ان کو بڑے انہماک کے ساتھ حق کی تبلیغ فرما رہے تھے۔ اتنے میں ایک نابینا آدمی لاٹھی ٹیکتے ٹیکتے مجلسِ نبوی میں حاضر ہوئے اور یوں عرض پیرا ہوئے:

یا رسول اللہ ارشدنی ''یارسول اللہ مجھے راہِ ہدایت بتائیے۔''[۱]

حضور ﷺ کو اکابرِ قریش کے مشرّف بہ اسلام ہو جانے کی بہت آرزو تھی، اس لیے آپؐ پوری توجہ اور یکسوئی کے ساتھ انھیں محاسنِ اسلام سے آگاہ فرما رہے تھے کہ شاید ان میں

---

(۱) ترمذی میں یہ الفاظ اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے مروی ہیں۔ ابن جریر اور ابن ابی حاتمؒ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے قول کے مطابق ان صاحب نے اس موقع پر حضورؐ سے قرآنِ حکیم کی ایک آیت کا مطلب پوچھا اور ساتھ ہی عرض کیا: ''یارسول اللہؐ مجھے وہ علم سکھایئے جو اللہ نے آپ کو سکھایا ہے۔''

سے کسی کو قبولِ حق کی توفیق نصیب ہو جائے اور وہ اسلام کی تقویت کا باعث بن جائے۔ اس موقع پر نابینا نو وارد کا گفتگو میں دخل دینا آپؐ کو پسند نہ آیا اور آپؐ نے ان کی طرف چنداں التفات کیے بغیر رؤسائے قریش سے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا۔ حبیب رب العالمینؐ کے نابینا سے اس اعراض پر بارگاہِ رب العالمین سے معاً سورۂ عبس نازل ہوگئی۔ ارشاد ہوا:

عَبَسَ وَ تَوَلّٰیٓ ۙ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰی ؕ وَمَا یُدْرِیْکَ لَعَلَّهٗ یَزَّکّٰیٓ ۙ اَوْ یَذَّکَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّکْرٰی ؕ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی ۙ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰی ؕ وَمَا عَلَیْکَ اَلَّا یَزَّکّٰی ؕ وَ اَمَّا مَنْ جَآءَکَ یَسْعٰی ۙ وَ هُوَ یَخْشٰی ۙ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰی ۚ کَلَّآ اِنَّهَا تَذْکِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ ذَکَرَهٗ ۘ (عبس:۱-۱۲)

''ترش رو ہوئے اور منہ پھیر بیٹھے اس بات پر کہ وہ نابینا ان کے پاس آ گیا۔ آپ کیا جانیں شاید (آپ کی تعلیم سے) وہ سدھر جائے یا نصیحت پر دھیان دے اور نصیحت کرنا اس کے لیے سود مند ہو۔ جو شخص (دین کی طرف سے) بے پروائی برتتا ہے، اس کی طرف تو آپ خوب توجہ کرتے ہیں۔ حالاں کہ اگر وہ راہِ راست پر نہ آئے تو آپ پر اس کی کیا ذمے داری ہے اور جو شخص خود آپ کے پاس دوڑا آتا ہے اور وہ ڈر رہا ہوتا ہے، اس سے آپ بے اعتنائی کرتے ہیں۔ ہر گز نہیں یہ تو ایک نصیحت ہے جس کا جی چاہے اسے قبول کرے۔''

جبریلِ امین یہ آیتیں پڑھتے جاتے تھے اور سرورِ عالم ﷺ کے چہرۂ اقدس پر اضطراب کے آثار نمایاں ہوتے جاتے تھے، لیکن جب جبریل امین کَلَّآ اِنَّهَا تَذْکِرَةٌ پر پہنچے تو حضورؐ کو اطمینان ہوا کہ یہ فی الحقیقت فہمائش ہے۔ اس کے بعد آپ فوراً ان نابینا صاحب کے گھر تشریف لے گئے جو آپ کی بے رُخی دیکھ کر واپس چلے گئے تھے۔ حضورؐ ان کو اپنی مجلسِ مبارک میں واپس لائے، اپنی ردائے اقدس زمین پر بچھا دی اور بڑے احترام اور محبت کے ساتھ اس پر ان کو بٹھایا۔ اس کے بعد بارگاہِ نبوّت میں ان کو ہمیشہ کے لیے درجۂ محبوبیت حاصل ہوگیا۔ یہ خوش بخت نابینا جن کی خاطر ربِ ذوالجلال والاکرام نے اپنے حبیب کو فہمائش کی حضرت ابن اُمِ مکتومؓ تھے۔

(٢)

حضرت ابن ام مکتومؓ کا شمار بڑے جلیل القدر صحابہ میں ہوتا ہے۔ وہ سابقون الاوّلون کے اس مقدس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں، جو نبوّت کے بالکل ابتدائی دَور میں مشرف بہ اسلام ہوا۔

حضرت ابنِ امّ مکتومؓ کا اصل نام باختلافِ روایت عمرو یا عبداللہ یا حصین تھا، لیکن وہ اپنی ماں کی کنیت کی نسبت سے ابن اُمّ مکتومؓ مشہور ہوئے۔ باپ کا نام قیس بن زائدہ (بن اصم بن ہرم بن رواحہ بن حجر بن عدی بن معیص بن عامر لوئیّ القرشی) تھا جو اُمُّ المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ کے ماموں زاد بھائی تھے۔ والدہ کا نام عاتکہ (اُمِ مکتومؓ) بنتِ عبداللہ بن عنکثہ بن عامر بن مخزوم تھا۔

حضرت ابنِ اُمّ مکتومؓ اگرچہ نورِ بصارت سے محروم تھے، لیکن اللہ تعالیٰ نے انھیں نہایت صالح اور سعید فطرت سے نوازا تھا۔ اس لیے بعثتِ نبویؐ کے بعد ان کے کانوں میں جونہی دعوتِ حق کی آواز پڑی، انھوں نے بلا تامل اسے قبول کرلیا۔

انھوں نے سورۂ عبس کے نزول سے پہلے اسلام قبول کیا یا اس کے بعد، اس کے بارے میں اختلاف ہے تاہم ان کے قدیم الاسلام ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ حافظ ابنِ حجرؒ اور حافظ ابنِ کثیرؒ کا بیان ہے کہ حضرت ابن ام مکتومؓ ان اصحاب میں سے تھے، جو مکّہ میں بہت پہلے اسلام لائے تھے۔ سورۂ عبس کے نزول کے بعد رحمتِ عالم ﷺ، امہات المومنینؓ اور تمام صحابہ کرامؓ حضرت ابن ام مکتومؓ کا غیر معمولی اعزاز واکرام فرمایا کرتے۔ وہ جب کبھی کاشانۂ نبوی میں حاضر ہوتے اُمُّ المومنینؓ حضرت عائشہ صدیقہؓ اُن کی شہد اور لیمو سے خاطر مدارات فرمایا کرتی تھیں۔ مستدرک حاکم میں حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ سورۂ عبس کے نزول کے بعد شہد اور لیمو ابن اُمّ مکتوم کا روزینہ تھا۔ حافظ ابن عبد البرؒ لکھتے ہیں کہ اس واقعہ کے بعد حضرت ابنِ اُمّ مکتومؓ بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوتے تو رحمتِ عالم ﷺ انھیں دیکھ کر فرمایا کرتے کہ اس شخص کو مرحبا ہو کہ اس کی وجہ سے ربّ السمٰوات والارض نے مجھ کو فہمائش کی۔ پھر حضورؐ ان سے پوچھتے کہ کیا تمھیں کوئی حاجت ہے؟ اگر وہ اپنی کوئی حاجت بیان کرتے تو حضورؐ اسے فوراً پوری فرمادیتے۔

سرورِ عالم ﷺ نے جب صحابہ کرامؓ کو مدینہ منوّرہ کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت

دی تو حضرت ابن اُمِّ مکتوم بھی ہجرت کر کے مدینہ منوّرہ چلے گئے۔ جب حضورؐ خود ہجرت فرما کر مدینہ منوّرہ تشریف لائے تو حضرت ابنِ اُمِّ مکتومؓ کو اذان دینے کا فرض تفویض فرمایا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ رمضان المبارک میں ان کی اذان سن کر لوگ کھانا پینا بند کر دیتے تھے، گویا ان کی اذان کو سحری کے اختتام کا اعلان سمجھا جاتا تھا۔

ہجرت کے بعد غزوات کا سلسلہ شروع ہوا تو حضرت ابنِ امِ مکتوم کے دل میں بھی جہاد فی سبیل اللہ میں حصہ لینے کی بے پناہ تڑپ پیدا ہوئی، لیکن اپنی معذوری کی بنا پر لڑائی میں عملاً حصہ نہ لے سکتے تھے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی کہ جو مسلمان گھروں میں بیٹھے رہتے ہیں وہ رتبہ میں مجاہدینِ فی سبیل اللہ کے برابر نہیں ہیں۔ تو اتفاق سے اس وقت حضرت ابنِ اُمّ مکتومؓ بارگاہِ رسالت میں موجود تھے۔ یہ آیت سنی تو بڑی حسرت کے ساتھ سرورِ عالم ﷺ کی خدمت میں عرض کی، یارسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان اگر میں معذور نہ ہوتا تو ہرگز گھر پر نہ بیٹھتا بلکہ جہاد فی سبیل اللہ میں مشغول ہوتا۔

ان کی حسرت بھری آرزو بارگاہِ خداوندی میں اس قدر مقبول ہوئی کہ اسی وقت یہ آیت نازل ہوگئی۔

لَا يَسْتَوِی الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِی الضَّرَرِ
وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ ط (النسآء:۹۵)

”مسلمانوں میں سے وہ لوگ جو کسی معذوری کے بغیر گھر بیٹھے رہتے ہیں، وہ مرتبہ میں ان مجاہدین فی سبیل اللہ کے برابر نہیں ہیں جو اپنی جان اور مال سے جہاد کرتے ہیں۔“

گویا اس طرح حق تعالیٰ نے حضرت ابن اُمِ مکتومؓ جیسے معذور مسلمانوں کو جہاد کے حکم سے مستثنیٰ فرما دیا۔

حافظ ابنِ حجرؒ اور علاّمہ ابنِ عبد البرؒ نے لکھا ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد حضرت ابن اُمِ مکتومؓ نابینا (معذور) ہونے کی بنا پر جہاد میں شریک ہونے کے مکلّف نہیں رہتے تھے، لیکن انھیں جہاد فی سبیل اللہ کا اس قدر شوق تھا کہ بعض غزووں میں لوگوں سے عَلم لے کر دو صفوں کے درمیان کھڑے ہوگئے اور لڑائی ختم ہونے تک کوہِ استقامت بن کر اپنی جگہ پر ڈٹے رہے۔ ان کا یہی جذبۂ فدویت تھا، جس نے انھیں بارگاہِ رسالت میں نہایت معزّز و محترم بنا دیا تھا ——

چناں چہ متعدد موقعوں پر جب حضوؐر باہر تشریف لے گئے تو آپ نے مدینہ منوّرہ میں حضرت ابن اِمِ مکتومؓ کو اپنا جانشین اور امامِ نماز مقرر فرمایا۔ حافظ ابن عبدالبرؒ کا بیان ہے کہ حضرت ابن اُمِ مکتومؓ کو تیرہ مرتبہ رحمتِ عالم ﷺ کی نیابت کا شرف حاصل ہوا۔

علامہ ابنِ سعدؒ کا بیان ہے کہ حضرت ابن اُمِ مکتومؓ قرآن کریم کے حافظ تھے اور ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں لوگوں کو قرأت سکھایا کرتے تھے۔ ان کو مسجدِ نبویؐ میں باجماعت نماز ادا کرنے کا بھی بے حد شوق تھا۔ گھر اگرچہ مسجد نبوی سے دُور تھا، لیکن وہ پانچوں وقت بڑی مستعدی کے ساتھ راستہ ٹٹولتے مسجد میں پہنچ جاتے اور جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتے تھے۔ راستے میں کئی جگہ جھاڑیاں تھیں چوں کہ وہ کسی ساتھی یا رہ نما کے بغیر ہوتے تھے۔ اس لیے کئی بار ایسا ہوا کہ ان کے کپڑے کا دامن کسی جھاڑی میں الجھ گیا اور اسے چھڑانے کے لیے انھیں بڑی زحمت اٹھانی پڑی، چناں چہ ایک دفعہ رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں عرض کی:

”یارسول اللہؐ مجھے بعض دفعہ گھر سے مسجد آنے میں بڑی دقّت ہوتی ہے کیا گھر پر نماز پڑھ لیا کروں۔“

حضوؐر نے پوچھا، ”کیا تم اپنے گھر پر اذان اور اقامت کی آواز سن لیتے ہو؟“

انھوں نے عرض کیا: ہاں یارسول اللہ۔“

حضوؐر نے فرمایا: ”تو پھر تم ضرور مسجد ہی میں آکر نماز ادا کیا کرو۔“

چناں چہ اس کے بعد وہ ہمیشہ بڑے شوق اور لگن کے ساتھ پانچوں وقت مسجد نبوی میں باقاعدگی سے آتے رہے۔

سرورِ عالم ﷺ نے وصال فرمایا تو حضرت ابنِ امّ مکتومؓ پر کوہِ الم ٹوٹ پڑا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ نے ان کی ڈھارس بندھائی اور وہ خاموشی کے ساتھ مدینہ منوّرہ میں اپنے دن کاٹنے لگے، تاہم ان کے دل میں شوقِ جہاد اکثر چٹکیاں لیتا رہتا تھا۔ حصرت عمر فاروقؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں ان کا معقول وظیفہ مقرر کر دیا تھا اور گھر سے مسجد تک رہ نمائی کے لیے انھیں ایک خادم بھی عطا کیا تھا۔ لیکن شوقِ جہاد نے انھیں گھر میں چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کو عراقِ عرب کی تسخیر کے لیے روانہ کیا تو حضرت ابنِ امّ مکتومؓ بھی اپنی معذوری کے باوصف لشکرِ اسلام میں شامل ہو گئے۔

علاّمہ ابن سعدؒ اور حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ قادسیہ کے خون ریز معرکے میں، جس نے عراقِ عرب کی قسمت کا فیصلہ کر دیا، حضرت ابنِ امِّ مکتومؓ بھی شریک تھے۔ وہ زرہ بکتر پہن کر عَلَم بلند کیے مجاہدینِ اسلام کی صفوں کے درمیان کھڑے ہو گئے۔ لڑائی کا تنور گرم ہوا تو مسلمان اور ایرانی ایک دوسرے سے اس طرح گتھ گئے کہ صفوں کی ترتیب قائم نہ رہی۔ افراتفری میں حضرت ابنِ اُمِّ مکتومؓ جامِ شہادت پی کر عازمِ خلدِ بریں ہو گئے۔

علاّمہ واقدی کا بیان ہے کہ حضرت ابنِ اُمِّ مکتومؓ مدینہ منوّرہ میں فوت ہوئے، لیکن دوسرے اربابِ سِیَر پہلی روایت ہی کو صحیح قرار دیتے ہیں۔ حضرت ابنِ اُمِّ مکتومؓ سے چند احادیث بھی مروی ہیں۔ جن کے راوی حضرت انسؓ اور زر بن حبیشؒ ہیں۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت ارقم بن ابی الارقم مخزومیؓ

(۱)

بعثت کے بعد تین سال تک رحمتِ عالم ﷺ نہایت راز داری کے ساتھ فریضۂ تبلیغ ادا فرماتے رہے۔ اس مدّت میں متعدد سعید الفطرت ہستیوں نے دعوت حق پر لبیک کہی اور پھر اسے اپنے حلقۂ اثر میں پھیلانے کی مقدور بھر کوشش کی۔ اس طرح اسلام کا نورِ ہدایت اندر ہی اندر ضلالت کی تاریکیوں کو کافور کرنے لگا۔ اس زمانے میں اہل حق چھپ چھپ کر مکّہ کی سنسان گھاٹیوں میں نماز پڑھتے تھے تاکہ مشرکینِ قریش کو ان کے قبول حق کا علم نہ ہو سکے۔ لیکن کفّارِ مکّہ کے کانوں میں کسی نہ کسی طرح یہ بھنک پڑ ہی گئی کہ ان کے بھائی بندوں میں سے بعض نے ایک نیا دین قبول کر لیا ہے اور اپنا ایک نیا طریقۂ عبادت ایجاد کیا ہے۔ چناں چہ وہ سخت پیچ و تاب کھانے لگے اور اس ٹوہ میں رہنے لگے کہ کسی مسلمان کو اپنے طریقے پر عبادت کرتے دیکھیں تو اس کی گوشمالی کریں۔

اسی زمانے میں دو تین واقعات ایسے پیش آئے جن میں نماز پڑھنے والے حق پرستوں پر مشرکوں نے یورش کر دی۔ گو دین حق کے سرفروشوں نے ان کا منہ پھیر دیا، لیکن اس بات کا سخت اندیشہ پیدا ہو گیا کہ کہیں مشرکینِ مکّہ سے کھلم کھلا تصادم شروع نہ ہو جائے۔ اس وقت رحمتِ عالم ﷺ نہیں چاہتے تھے کہ حالات ایسی صورت اختیار کریں۔ آپؐ کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو مکّہ میں کوئی ایسی محفوظ جگہ مل جائے، جہاں کفّار کے حملے کا ڈر نہ ہو تو وہیں جمع ہو کر نماز پڑھ لیا کریں ـــــ ابھی ایسی جگہ کی تلاش جاری تھی کہ ایک دن اُنیس بیس برس کی عمر کے ایک جوانِ رعنا حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا:

''یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان، میرا وسیع مکان کوہِ صفا کے دامن میں،
بیت اللہ کے قریب واقع ہے، میں اسے آپ کی نذر کرتا ہوں، مسلمان اس میں جمع
ہو کر جو چاہیں کریں، مشرکین کی مجال نہیں کہ اس مکان میں داخل ہو سکیں۔''

رحمتِ عالم ﷺ نوجوان پرستارِ حق کے جذبۂ ایثار پر بہت مسرور ہوئے، ان کو دعائے خیر دی اور ان کی فیاضانہ پیش کش کو شرفِ قبول بخشتے ہوئے اس مکان کو مسلمانوں کے اجتماع اور دعوت و تبلیغ کا مرکز بنا دیا۔ یہ نوجوان جن کے گھر کو اسلام کا پہلا مرکز اور بلاکشانِ اسلام کی پناہ گاہ بننے کا شرف حاصل ہوا اور جن کے جذبۂ ایثار نے فخرِ بنی آدم سیّد المرسلین ہادیِ انام ﷺ کو مسرور کیا، بنو مخزوم کے چشم و چراغ ابو عبداللہ ارقمؓ بن ابی الارقم تھے۔

(۲)

حضرت ارقمؓ بن ابی الارقم عبد مناف اللہ کے ان پاک باز بندوں میں سے ہیں جو دعوتِ حق کے ابتدائی زمانے میں مشرف بہ اسلام ہوئے اور اپنی استقامت، ایثار اور اخلاصِ عمل کے لافانی نقوش صفحۂ تاریخ پر ثبت کیے۔ حضرت ارقمؓ کو اہلِ سِیَر میں سے کسی نے ساتواں، کسی نے گیارہواں اور کسی نے بارہواں مسلمان لکھا ہے، لیکن فی الحقیقت ان میں سے کسی روایت کو حتمی اور قطعی نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ وہ نہایت قدیم الاسلام تھے اور بعثت کے پہلے تین سالوں کے اندر سعادت اندوزِ اسلام ہوئے۔ علّامہ ابنِ اثیرؒ نے ''اسد الغابہ'' میں لکھا ہے کہ حضرت ارقمؓ، حضرت ابو سلمہؓ بن عبد الاسد، حضرت عبیدہؓ بن حارث مطّلبی اور حضرت عثمانؓ بن مظعون ایک ساتھ ایمان لائے تھے۔

حضرت ارقمؓ کا تعلق بنو مخزوم سے تھا، جو قریش کا بڑا معزّز اور مقتدر خاندان تھا۔ زمانۂ جاہلیت میں فوج کی سپہ سالاری اور فوجی کیمپ کے انتظام کا عہدہ اسی خاندان کے پاس تھا۔ ان کے دادا ابو جندب اسد بن عبداللہ اپنے زمانے میں مکّہ کے ممتاز رؤساء میں شمار ہوتے تھے۔ وہ امّ المومنین حضرت ام سلمہؓ اور حضرت خالد سیف اللہؓ کے دادا مغیرہ اور حضرت ابو سلمہؓ بن الاسد کے دادا ہلال کے بھائی تھے۔ شجرہ نسب یہ ہے:

ارقمؓ بن ابی الارقم عبد مناف بن ابو جندب اسد بن عبداللہ بن عمرو بن مخزوم بن یقظہ بن مرّہ بن کعب بن لُوی۔

مرّہ بن کعب پر حضرت ارقمؓ کا سلسلۂ نسب سرورِ عالم ﷺ کے نسب سے مل جاتا ہے۔ مرّہ حضورؐ کے جدِّ اعلیٰ قصیّ بن کلاب کے دادا تھے۔ مشہور دشمنِ اسلام ابوجہل کے دو بھائی سلمہؓ بن ہشام اور عیاشؓ بن ابی ربیعہ نہ صرف حضرت ارقمؓ کے یک جدی تھے بلکہ سبقت فی الاسلام میں بھی ان کے ساتھی تھے۔

حضرت ارقمؓ کی والدہ کے نام اور خاندان کے بارے میں اختلاف ہے بعض روایتوں کے مطابق ان کا نام امیمہ تھا اور وہ قبیلہ بنوخزاعہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ کچھ دوسری روایتوں میں ہے کہ ان کا تعلق بنوسہم سے تھا۔

اہلِ سِیَر نے حضرت ارقمؓ کے سالِ ولادت کی تصریح نہیں کی، لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہجرتِ نبوی سے تیس برس قبل ۵۹۴ء میں پیدا ہوئے۔ اس حساب سے بعثتِ نبوی ۶۱۱ء کے وقت ان کی عمر سترہ برس کے لگ بھگ تھی چوں کہ اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ حضرت ارقمؓ بعثت کے بالکل ابتدائی زمانے میں نعمتِ ایمان سے بہرہ ور ہوگئے، اس لیے قبولِ اسلام کے وقت ان کی عمر سترہ یا اٹھارہ برس متعین کی جاسکتی ہے۔ اٹھتی جوانی میں لوائے توحید تھام کر ہر قسم کے مصائب و آلام کو دعوت دینا کسی سعید روح ہی کا کام ہوسکتا تھا، بنومخزوم کے اس جوانِ سعادت مند نے یہ کام کر دکھایا اور ہر طرح کے خطرات کے علی الرغم اپنا مستقبل مکّہ کے دُرِیتیم ﷺ سے وابستہ کردیا۔ یہ حضرت ارقمؓ کا جذبۂ ایثار ہی تھا جس نے ان کے گھر ''دارِارقم'' کو انتہائی نامساعد حالات میں ''دارالاسلام'' بننے کا لازوال اور عظیم شرف بخشا۔

شعبِ ابی طالب کی محصوری (۷ نبوت) تک اسی مقدس مکان کو دعوتِ اسلام میں مرکزی حیثیت حاصل رہی۔ رحمتِ عالم ﷺ اس زمانے میں دارِارقم ہی میں تشریف فرما رہتے تھے۔ یہیں آکر اہلِ حق آپ کے پاس جمع ہوتے تھے اور مکان کا دروازہ بند کرکے نماز پڑھتے تھے۔ نئے لوگ بھی اسی جگہ آکر اسلام قبول کرتے تھے اور فیضانِ نبوی سے بہرہ یاب ہوتے تھے۔ دارِارقم بلاشبہ مسلمانوں کی پناہ گاہ تھا، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مسلمانوں نے اپنے آپ کو اس میں مقید کرلیا تھا۔ جب چوتھے سالِ نبوت کے آغاز میں بارگاہِ الٰہی سے یہ حکم نازل ہوا۔

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ○ (الحجر:۹۴)

''احکامِ الٰہی برملا سنائیے اور مشرکین کی پروانہ کیجیے۔''

تو رحمتِ عالم ﷺ نے علانیہ دعوتِ حق کا کام شروع کر دیا۔ آپؐ کبھی تنہا اور کبھی چند جاں نثاروں کے ہمراہ دارِ ارقم سے نکل کر لوگوں کو برملا اسلام کی دعوت دیتے اور شرک سے مجتنب رہنے کی تلقین فرماتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر طرف مخالفت کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا اور وہی لوگ جو آپ کی امانت، دیانت، صدق اور اعلیٰ وارفع کردار کے معترف و مدّاح تھے، آپؐ کے دشمنِ جاں ہو گئے۔ تاہم مخالفت کے ان طوفانوں میں دعوتِ حق کا کام برابر جاری رہا۔ تا آں کہ ۶ بعد بعثت میں قریش کے شیر عمِ رسولؐ حضرت حمزہؓ کو بھی اللہ تعالیٰ نے قبولِ اسلام کی توفیق بخشی اور وہ حضورؐ کے پاس دارِ ارقم ہی میں فروکش ہوئے۔ ان کے قبولِ اسلام کے تین دن بعد (اور ایک دوسری روایت کے مطابق تین ماہ بعد) حضرت عمر فاروقؓ نے بھی اسی جگہ آکر اپنا ہاتھ رحمتِ عالم ﷺ کے دستِ مبارک میں دے دیا۔

حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ جیسی بہادر اور بااثر شخصیتوں کا قبولِ اسلام اہل حق کے لیے زبردست تقویت کا موجب بنا۔ بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت عمرؓ قبولِ اسلام کے بعد تمام مسلمانوں کو ساتھ لے کر دارِ ارقم سے نکلے اور علی الاعلان مسجدِ حرام میں جا کر نماز پڑھی۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ خدا کی قسم جب تک عمرؓ اسلام نہ لائے ہم کعبہ کے گرد نماز نہیں پڑھ سکتے تھے۔ مسلمانوں کی تعداد اور قوّت میں یہ اضافہ کفّار کو ایک آنکھ نہ بھایا اور انھوں نے برافروختہ ہو کر طے کیا کہ جب تک بنو ہاشم اور بنو مطّلب محمد ﷺ کو ان کے حوالے نہ کریں۔ ان سے ہر قسم کے تعلقات منقطع کر لیے جائیں۔ ادھر بنو ہاشم اور بنو مطّلب کو کٹ مرنا منظور تھا، لیکن یہ گوارا نہیں تھا کہ حضورؐ کا بال بھی بیکا ہو۔ چناں چہ وہ تین سال تک شعبِ ابی طالب میں محصور رہ کر زہرہ گداز مصائب و آلام جھیلتے رہے۔ لیکن ایک لمحہ کے لیے بھی کفار کا مطالبہ منظور کرنے کا خیال تک دل میں نہ لائے۔

دارِ ارقم کو حضرت عمر فاروقؓ کے قبولِ اسلام (۶ نبوّت) تک یا شعبِ ابی طالب کی محصوری کے آغاز (۷ نبوت) تک مرکزِ اسلام کی حیثیت حاصل رہی۔ اس کے بارے میں اختلاف ہے۔ بہرصورت دارِ ارقم کو تاریخِ اسلام میں ابدی شہرت حاصل ہو گئی۔

(۳)

بیعتِ عقبہ کبیرہ (ذی الحجہ ۱۳ بعدِ بعثت) کے بعد سرورِ عالم ﷺ نے مکّے کے

مسلمانوں کو مدینہ کی طرف ہجرت کر جانے کا اذنِ عام دے دیا۔ چناں چہ مکہ کے بیشتر مسلمان چند ماہ کے اندر اندر ہجرت کر کے مدینہ منوّرہ چلے گئے۔ ان میں حضرت ارقمؓ بن ابی الارقم بھی تھے۔ رحمتِ عالم ﷺ ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لائے اور چند ماہ بعد مہاجرین اور انصار کے مابین مواخاۃ قائم فرمائی تو حضرت ارقمؓ کو حضرت ابوطلحہ زیدؓ بن سہل انصاری کا اسلامی بھائی بنایا۔ علامہ ابن سعدؒ کا بیان ہے کہ حضورؐ نے حضرت ارقمؓ کو مستقل قیام کے لیے مدینہ منوّرہ کے محلّہ بنی زریق میں زمین کا ایک ٹکڑا مرحمت فرمایا۔

۲ھ میں غزوات کا سلسلہ شروع ہوا، تو بدر الکبریٰ، اُحد، احزاب، خیبر، حنین غرض کوئی ایسا اہم معرکہ نہیں تھا، جس میں حضرت ارقمؓ نے سرفروشی اور جانبازی کا حق ادا نہ کیا ہو۔ علاّمہ ابنِ اثیرؒ نے اسدُ الغابہ میں لکھا ہے کہ حق و باطل کے معرکۂ اوّل میں رحمتِ عالم ﷺ نے حضرت ارقمؓ کو ایک تلوار مرحمت فرمائی جس سے وہ شروع سے اخیر تک میدانِ رزم میں دادِ شجاعت دیتے رہے۔

سرورِ کونین ﷺ کو حضرت ارقمؓ کی دیانت اور امانت داری پر بے حد اعتماد تھا۔ چناں چہ آپؐ نے ان کو تحصیلِ زکوٰۃ کی خدمت تفویض فرمائی اور وہ یہ خدمت تمام عہدِ رسالت میں نہایت حسن وخوبی کے ساتھ انجام دیتے رہے۔

اہلِ سِیَر نے لکھا ہے کہ حضرت ارقمؓ نہایت پرہیزگار، صادق القول اور شجاع بزرگ تھے۔ عبادتِ الٰہی سے ان کو خاص شغف تھا۔ ایک مرتبہ حصولِ ثواب کی غرض سے بیت المقدس میں نماز پڑھنے کا ارادہ کیا اور سفر کی تیاری کر کے حضور سرورِ عالم ﷺ سے اجازت لینے آئے۔ حضورؐ نے پوچھا:

"بیت المقدس کا قصد کس غرض سے کیا ہے، تجارت کے لیے یا کسی اور ضرورت کے لیے؟"

عرض کیا: یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان، صرف حصولِ ثواب کی غرض سے بیت المقدس میں نماز پڑھنا چاہتا ہوں۔

حضورؐ نے فرمایا: مسجد نبوی کی ایک نماز مسجدِ حرام (بیت اللہ) کے سوا دنیا کی تمام مساجد کی ہزار نمازوں سے بہتر ہے۔

حضرت ارقمؓ نے حضورؐ کا ارشاد سن کر سفر کا ارادہ ترک کر دیا۔

(۴)

حضرت ارقمؓ رحمتِ عالم ﷺ کے وصال کے بعد بیالیس یا چوالیس برس حیات رہے۔ اس دوران میں خلافتِ راشدہ کا سارا دَور گزر گیا۔ یہاں تک کہ سارے عالمِ اسلام پر امیر معاویہؓ کی حکومت قائم ہوگئی۔ تعجب ہے کہ اس طویل مدّت میں حضرت ارقمؓ کی زندگی کا کوئی واقعہ سیرت اور تاریخ کی کتابوں میں نہیں ملتا۔ انھوں نے باختلافِ روایت ۵۳ھ یا ۵۵ھ میں بعمر ۸۳ یا ۸۵ سال وفات پائی۔ علّامہ ابنِ سعدؒ نے طبقات میں لکھا ہے کہ حضرت ارقمؓ نے وفات سے پہلے وصیّت کی تھی کہ ان کی نمازِ جنازہ حضرت سعدؓ بن ابی وقّاص پڑھائیں۔ ان کا قیام مدینہ سے کچھ فاصلے پر عقیق میں تھا۔ اس لیے مدینہ پہنچنے میں دیر ہوگئی۔ والیِ مدینہ مروان بن الحکم کو انتظار گوارا نہ ہوا اور اس نے کہا کہ سعدؓ کے آنے تک جنازہ کب تک پڑا رہے گا۔ میں نماز پڑھا دیتا ہوں۔

حضرت ارقمؓ کے صاحب زادے عبید اللہؓ نے اس کی بات رد کر دی اور کہا کہ جب تک سعدؓ بن ابی وقاص تشریف نہیں لائیں گے نمازِ جنازہ نہیں پڑھی جائے گی۔

مروان نے اصرار کیا تو قبیلہ بنومخزوم حضرت عبید اللہ بن ارقمؓ کی حمایت پر کھڑا ہوگیا۔ اتنے میں حضرت سعدؓ بن ابی وقاص تشریف لے آئے اور نمازِ جنازہ پڑھا کر اسلام کے اس مہرِ عالم تاب کو قبرستانِ بقیع میں سپردِ خاک کر دیا۔

حضرت ارقمؓ نے اپنے پیچھے دو لڑکے عبید اللہ اور عثمان اور تین لڑکیاں صفیہ، مریم اور امیہ چھوڑیں۔

حضرت ارقمؓ بن ابی الارقم کا شمار اسلام کے عظیم فرزندوں میں ہوتا ہے، وہ نہ صرف السابقون الاوّلون کے سلسلے سے گوہرِ تابندہ ہیں بلکہ ان کو بدری ہونے کا عظیم شرف بھی حاصل ہے۔ بدر کے علاوہ انھیں دوسرے تمام اہم غزوات میں بھی رحمتِ عالم ﷺ کی ہمرکابی کی سعادت نصیب ہوئی۔ سب سے بڑھ کر جس بات نے ان کو شہرتِ عام اور بقائے دوام کے دربار میں نہایت ممتاز اور لازوال مقام عطا کیا وہ ان کا جذبۂ ایثار و فدویت ہے کہ انتہائی پُر آشوب زمانے میں مہبطِ وحی و رسالتؐ اور دوسرے اہلِ حق کے میزبان بنے اور اپنا مکان محض رضائے الٰہی کے حصول کی خاطر سید المرسلینؐ کی نذر کر دیا۔

حضرت ارقمؓ کو اس مکان کی اہمیت کا بہ خوبی احساس تھا۔ چناں چہ انھوں نے اس کو

وقف کی حیثیت دے دی تا کہ بیع و وراثت کے تنازعوں سے محفوظ رہے۔ تاہم یہ مکان ان کی وفات کے بعد ان کے خاندان کے قبضے میں رہا۔ اس میں ایک عبادت گاہ (قبہّ یا مسجد) بھی تھی۔ یہ مکان کعبۂ معلّٰی کے پاس ایسے موقع پر تھا کہ جو لوگ حج میں صفا و مروہ کے درمیان سعی کرتے وہ اس کے دروازے پر سے ہو کر گزرتے تھے۔ ۱۴۰ھ میں دوسرے عباسی خلیفہ ابو جعفر منصور نے اسے حضرت ارقمؓ کے پوتے عبداللہ بن عثمان اور دوسرے وُرثا سے زرِ خطیر کے عوض خرید لیا۔ بعد میں یہ خلیفہ مہدی کی جاریہ الخیزران کے قبضے میں چلا گیا۔ اس نے اسے اپنی مرضی کے مطابق از سرِ نو تعمیر کرایا۔ اس کے بعد امتدادِ زمانہ سے اس میں کئی تبدیلیاں آئیں۔ لیکن یہ جگہ ہمیشہ دارِ ارقم کے مقدّس نام ہی سے مشہور رہی۔

اسلام کا یہ اوّلین مرکز جہاں سے دین کی شعاعیں پھیلیں، اگرچہ اب حرمِ پاک کا حصہ بن گیا ہے، لیکن ''دارِ ارقم'' اور حضرت ارقمؓ کے جذبۂ ایثار کا ذکر ابد الآباد تک باقی رہے گا۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت عبیدہ بن حارث مطّلبیؓ
شیخ المہاجرین

(۱)

غزوۂ بدر سے ایک مدّت کے بعد رحمتِ عالم ﷺ ایک مرتبہ اپنے جاں نثاروں کے ہمراہ وادیِ صفراء سے گزرے اور رات گزارنے کے لیے وہیں پڑاؤ ڈال دیا۔ ہوا چلنی شروع ہوئی تو اس میں سے مشک کی مسحور کن لپٹیں آ رہی تھیں۔ صحابہ کرامؓ نے حضورؐ کی خدمت میں عرض کی:

"یارسول اللہ کہیں سے مشک کی لپٹیں بڑی شدّت اور فراوانی سے آ رہی ہیں ان سے ہمارا مشامِ جاں معطّر ہو گیا ہے۔"

سرورِ عالم ﷺ نے فرمایا:

"ابو معاویہ کی قبر کے یہاں ہوتے ہوئے تمھیں تعجب کیوں ہے؟"

ابو معاویہ کنیت کے یہ عاشقِ رسولؐ جن کی تربت کی بہ دولت ساری وادیِ صفراء معطّر ہو گئی تھی، سیّدنا حضرت عبیدہؓ بن حارث مطّلبی شہیدِ بدر تھے۔

(۲)

حضرت عبیدہؓ بن حارث بن مطّلِب بن عبد مناف بن قصیّ القرشی کا شمار بڑے جلیل القدر صحابہ میں ہوتا ہے۔ ان کی کنیت ابو معاویہ بھی تھی اور ابو الحارث بھی۔ لقب شیخ المہاجرین تھا۔ ان کا تعلق بنو عبد مناف کی شاخ بنو مطّلب سے تھا۔ اور وہ سرورِ عالم ﷺ کے پردادا ہاشم بن عبد مناف

کے بھائی مطلب کے پوتے تھے۔ اس لحاظ سے رشتہ میں حضورِ انور ﷺ کے چچا ہوتے تھے۔ والدہ کا نام سخیلہ تھا اور رحمتِ عالم ﷺ سے دس برس پہلے پیدا ہوئے تھے۔ بعض شارحینِ حدیث اور اہلِ سِیَر نے حضرت عبیدہؓ بن حارث کو حضرت عبدالمطّلب کا پوتا اور ہاشمی قرار دیا ہے۔ مگر یہ غلط فہمی ہے بلا شبہ حضرت عبدالمطلب کے ایک بیٹے کا نام بھی حارث تھا، لیکن حارث (عمّ النبیؐ) بن عبدالمطلب کے بیٹوں کے نام نوفل، عبداللہ، ربیعہ اور مغیرہ تھے۔ حضرت عبیدہؓ، حارث بن مطلب کے فرزند تھے اور ہاشمی نہیں بلکہ مطلبی تھے۔

حضرت عبیدہؓ نے ابتدائے بعثت میں حضرت عثمانؓ بن مظعون، حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف، حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراح، حضرت ابوسلمہؓ بن الاسد اور ارقمؓ بن الارقم کے ساتھ اس وقت دعوتِ حق پر لبّیک کہا جب ایسا کرنا ہول ناک خطرات کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ حضرت عبیدہؓ اس وقت جوانی کی منزلوں سے گزر کر بڑھاپے کی حدود میں داخل ہو چکے تھے لیکن انھوں نے نوجوانوں کے سے جوش اور ولولے کے ساتھ اسلام کو حرزِ جان بنایا اور مشرکینِ قریش کی مخالفت اور ایذا رسانی سے مطلق ہراساں نہ ہوئے۔ ان کے قبولِ اسلام کے کچھ عرصہ بعد جب مشرکین نے پرستارانِ حق پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا تو سرورِ عالم ﷺ نے اپنے مٹھی بھر جاں نثاروں کے ساتھ حضرت ارقمؓ بن ابی الارقم مخزومی کے مکان میں پناہ لی، ان جاں نثاروں میں حضرت عبیدہؓ بھی شامل تھے۔ حضرت ارقمؓ کا مکان کوہِ صفا کے دامن میں واقع تھا اور اس میں بیٹھ کر دشمن کے حملے کا اچھی طرح دفاع کیا جا سکتا تھا۔ ستم رسیدہ مسلمانوں نے اس خطیرۂ قدس کو اس وقت چھوڑا جب حضرت عمرؓ بن خطّاب اسی جگہ رحمتِ عالم ﷺ کے قدموں پر آن گرے اور ساقیِ کوثرؐ کے دستِ مبارک سے بادۂ توحید پی کر مخمور ہو گئے۔

(۳)

بعثتِ نبوی کے ساتویں سال جب قریشِ مکّہ نے دیکھا کہ ان کے بے پناہ ظلم وستم کے باوجود مسلمانوں کی تعداد بڑھتی ہی جاتی ہے اور ان کی ایک معقول تعداد ان کے پنجۂ ستم سے بچ کر حبش کے دارالعافیت میں بھی پہنچ گئی ہے تو وہ فرطِ غضب سے دیوانے ہو گئے اور ان کے صبر کا پیمانہ چھلک گیا۔ انھوں نے ایک اجتماع میں بالاتفاق یہ فیصلہ کیا کہ جب تک بنو ہاشم محمد (ﷺ)

کو ان کے حوالے نہیں کریں گے۔ کوئی شخص ان سے کسی قسم کا تعلق نہیں رکھے گا۔ نہ ان کے پاس کوئی چیز فروخت کی جائے گی، نہ ان سے رشتہ ناتا کیا جائے گا اور نہ انھیں کھلے بندوں پھرنے دیا جائے گا۔ یہ معاہدہ لکھ کر کعبہ کے دروازے پر لٹکا دیا گیا۔

جب بنو ہاشم کو اس معاہدے کا علم ہوا تو انھوں نے سرورِ عالمؐ کو مشرکین کے حوالے کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اور حضرت ابو طالب خاندان کے سب لوگوں کے ساتھ (سوائے ابولہب اور اس کے زیر اثر چند دوسرے ہاشمیوں کے) پہاڑ کے ایک درّہ میں چلے گئے جو بنو ہاشم کا موروثی تھا اور شعب ابی طالب کہلاتا تھا۔ اس کٹھن وقت میں بنو مطلب نے بنو ہاشم کا پورا پورا ساتھ دیا۔ فی الحقیقت مطلب بن عبد مناف کی اولاد شروع ہی سے ہاشمیوں کے دُکھ سُکھ میں شریک رہتی تھی، جس طرح بنو ہاشم نے حضورِ انورؐ کی حفاظت وصیانت کا عہد کیا تھا۔ اسی طرح بنو مطِّلب نے بھی آپؐ کے دفاع وحفظ کی قسم کھائی تھی۔ چناں چہ شِعب ابی طالب میں محصور رہ کر جس طرح بنو ہاشم مصائب وآلام کی چکی میں پستے رہے اسی طرح مطّلبی بھی درّہ میں اقامت گزین رہ کر ہر قسم کی سختیاں جھیلتے رہے۔ ان وفا شعاروں میں حضرت عبیدہؓ بن الحارث بھی شامل تھے۔ یہ زہرہ گداز محصوری پورے تین برس تک جاری رہی۔ اس دوران میں ظالم محاصرین کھانے پینے کی کوئی چیز حتی الوسع مسلمانوں کو نہیں پہنچنے دیتے تھے۔ محصورین کے بچے بھوک سے بلبلاتے تھے تو مشرکین ان کی آوازیں سن سن کر خوش ہوتے تھے۔ عورتوں کی چھاتیوں میں دودھ خشک ہو گیا تھا اور محصورین کے منھ میں کئی کئی دن تک ایک کھیل بھی اُڑ کر نہ جاتی تھی۔ بعض اوقات بے کس محصورین درختوں اور جھاڑیوں کی پتیاں کھا کر پیٹ بھرتے تھے اور اگر کہیں سے سوکھا چمڑا مل جاتا تو اس کو بھون کر ستو کی طرح پھانک لیتے تھے۔ ان سب مصائب وشدائد کے باوجود آفرین ہے محصورین پر، کہ وہ اس تین سال کے طویل عرصے میں ایک لمحہ کے لیے بھی مکّہ کے درِّ یتیم ﷺ کا ساتھ چھوڑنے کا تصور تک دل میں نہ لائے۔ بالآخر تین سال کے بعد مشرکین میں سے کچھ کو رحم آیا اور وہ اس ظالمانہ معاہدے کو توڑ کر بنو ہاشم اور بنو مطلب کو شِعب ابی طالب سے باہر لے آئے۔ اس محصوری میں حضرت عبیدہؓ نے شروع سے اخیر تک نہایت استقلال اور صبر کے ساتھ سرورِ عالم ﷺ کا ساتھ دیا۔

(۴)

جب سرورِ کائنات ﷺ نے صحابۂ کرامؓ کو مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت دی تو حضرت عبیدہؓ بن الحارث بھی اپنے بھائیوں طفیلؓ اور حصینؓ اور بھتیجے مسطحؓ بن اثاثہ (بن عباد بن مطلب) کے ساتھ ہجرت کر کے مدینہ پہنچے اور حضرت عبد اللہؓ بن سلمۃ العجلانی کے مکان میں فروکش ہوئے۔ ہجرت کے وقت ان کی عمر ۶۰ برس سے متجاوز تھی اور وہ رحمت عالم ﷺ کے نزدیک بڑی قدر و منزلت کے حامل تھے۔ اسی لیے لوگوں میں ''شیخ المہاجرین'' کے لقب سے مشہور ہو گئے تھے۔ سرورِ عالم ﷺ نے حضرت عبیدہؓ کو مستقل سکونت کے لیے مدینہ میں ایک قطعۂ زمین مرحمت فرمایا جس میں وہ اپنے سارے خاندان سمیت آباد ہو گئے۔ مہاجرین میں سے حضرت عبیدہؓ کا بھائی چارہ حضرت بلالؓ بن رباح حبشی سے قائم تھا۔ جب حضورؐ نے مہاجرین اور انصار کے مابین مواخاۃ قائم کرائی تو حضرت عبیدہؓ کو حضرت عمیرؓ بن حمام انصاری کا دینی بھائی بنایا۔

ہجرت کے بعد مسلمانوں کو کسی قدر اطمینان نصیب ہوا اور وہ کفار کے دستِ تعدّی سے محفوظ ہو گئے۔ تاہم مشرکین مکہ کے حملہ کا خطرہ ہر وقت موجود تھا۔ اسی خطرہ کے تدارک کے لیے سرورِ عالم ﷺ صحابہؓ کی چھوٹی چھوٹی جماعتیں وقتاً فوقتاً مکّہ کی طرف یا مدینہ کے نواح میں بھیجتے رہتے تھے۔ ایسی مہمات کو سرایا سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ان کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ دشمنوں کی نقل و حرکت پر نظر رکھی جائے تا کہ وہ بے خبری میں حملہ نہ کر دیں۔ غزوۂ بدر سے پہلے جو سرایا پیش آئے ان میں سے ایک سریّہ کی قیادت کا شرف حضرت عبیدہؓ کو حاصل ہوا۔ یہ مہم شوال ۱ھ میں پیش آئی اور ''سریّہ عبیدہؓ بن حارث'' یا سریّۂ رابغ'' کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں حضورؐ نے ساٹھ یا اسّی سواروں کے ساتھ حضرت عبیدہؓ بن حارث کو قریش کی نقل و حرکت کا پتہ چلانے کے لیے وادیِ رابغ کی طرف روانہ فرمایا۔ حجاز کے ساحلی علاقے میں ثنیۃ المرّہ کے مقام پر مسلمانوں کا سامنا قریش کے ایک قافلے سے ہوا جو ابو سفیان (یا بہ روایتِ دیگر عکرمہ بن ابی جہل) کی قیادت میں دو سو آدمیوں پر مشتمل تھا۔ قریش اگرچہ تعداد میں زیادہ تھے، لیکن انھوں نے

لڑنے سے گریز کیا اور پہلو بچا کر نکل گئے۔ حضرت عبیدہؓ کی ماتحتی میں حضرت سعدؓ بن ابی وقاص جیسے پُرجوش مجاہد بھی تھے۔ انھوں نے اس موقع پر راہِ حق میں ایک تیر چلا ہی دیا۔ صحیح بخاری میں حضرت سعدؓ سے روایت ہے کہ میں پہلا عرب ہوں جس نے راہِ خدا میں تیر چلایا۔ گویا سریّہ عبیدہؓ بن حارث میں سب سے پہلے اللہ کی راہ میں تیر چلایا گیا۔

بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت عبیدہؓ بن الحارث سب سے پہلے صحابی ہیں جنھیں رحمتِ عالم ﷺ نے کسی سریّہ کی قیادت کے لیے نشان (عَلَم یا لوا) مرحمت فرمایا، لیکن کچھ دوسری روایتوں کے مطابق اس شرف میں عمِ رسولؐ حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب کو سبقت حاصل ہے۔

(۵)

۱۷رمضان المبارک ۲ھ کو بدر کے میدان میں علم بردارانِ حق اور معبودانِ باطل کے پرستار ایک دوسرے کے مقابل ہوئے تو حضرت عبیدہؓ بن حارث بھی رحمتِ عالم ﷺ کے ہم کاب تھے۔ سب سے پہلے لشکرِ قریش سے (سریّہ عبداللہؓ بن جحش میں مارے جانے والے) عمرو بن الحضرمی کے بھائی عامر حضرمی نے آگے بڑھ کر مبارز طلبی کی۔ حضرت عمر فاروقؓ کے غلام حضرت مہجعؓ اس کے مقابلے کے لیے نکلے اور مردانہ وار لڑ کر شہید ہو گئے۔ (طبری اور کچھ دوسرے مؤرّخین کا بیان ہے کہ عامر سے مقابلہ کے دوران میں کسی بدنہاد مشرک نے ان پر تیر چلا دیا اور وہ اس تیر کے زخم سے واصل بہ حق ہوئے) اس کے بعد عتبہ وشیبہ پسرانِ ربیعہ بن عبدشمس بن عبدمناف اور ولید بن عتبہ آگے بڑھے اور مسلمانوں کو مقابلہ کے لیے للکارا۔ مسلمانوں کی طرف سے حضرت عوفؓ، معاذؓ اور معوّذؓ پسران حارث اُن کے مقابلے پر نکلے۔ (بعض روایتوں میں حضرت عوفؓ اور بعض میں حضرت معوّذؓ کی جگہ حضرت عبداللہؓ بن رواحہ انصاری کا نام لکھا ہے) یہ تینوں انصاری تھے۔ عتبہ نے ان کا نام ونسب پوچھا اور جب معلوم ہوا کہ یہ مدینہ والے ہیں تو پکارا:

''محمدؐ! یہ لوگ ہمارے جوڑ کے نہیں ہیں۔''

اس پر حضورؐ نے تینوں انصاری مجاہدوں کو پیچھے ہٹ آنے کا حکم دیا اور حضرت حمزہؓ، علیؓ اور عبیدہؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

''حمزہ، علی، عبیدہ جاؤ اور دینِ حق کی خاطر ان سے لڑو۔''

تینوں جواں مرد نیزے ہلاتے ہوئے اپنے حریفوں کے مقابل جا کھڑے ہوئے۔

بعض روایتوں میں ہے کہ سرورِ عالم ﷺ کی خواہش تھی کہ بنو عبد شمس کے تین مبارز خواہوں کے مقابلے میں تین ہاشمی بھیجے جائیں، لیکن مشکل یہ تھی کہ جہاں قریش کے لشکر میں عباس بن عبد المطلب، نوفل بن حارث بن عبد المطلب، مغیرہ بن عبد المطلب اور عقیل بن ابی طالب چار ہاشمی موجود تھے وہاں لشکرِ اسلام میں حضورؐ کو چھوڑ کر حضرت حمزہؓ اور حضرت علیؓ صرف دو ہاشمی تھے، اس لیے آپؐ نے حضرت عبیدہؓ کو جو مطلبی تھے اور بنو ہاشم کے حلیف تھے، شامل کر کے اس کمی کو پورا کیا۔

علاّمہ ابن سعد کا بیان ہے کہ حضرت حمزہؓ عتبہ کے مقابل ہوئے اور للکار کر کہا:

''میں حمزہ بن عبد المطلب ہوں، میں اللہ اور اس کے رسول کا شیر ہوں۔''

عتبہ نے اس کے جواب میں کہا: ''میں اپنے خلفاء کا شیر ہوں۔ یہ تمہارے ساتھ کون ہیں؟''

حضرت حمزہؓ نے فرمایا: یہ علیؓ بن ابی طالب اور عبیدہؓ بن حارث ہیں۔''

عتبہ بولا: ''ہاں اب یہ ہمارے کفو اور جوڑ کے آدمی ہیں۔''

لڑائی شروع ہوئی تو عتبہ حضرت حمزہؓ کے ہاتھ سے اور ولید حضرت علیؓ کے ہاتھ سے مارا گیا۔ یہ دیکھ کر طعیمہ بن عدی بن نوفل کو جوش آ گیا اور وہ بنکارتا ہوا آگے بڑھا، لیکن شیر خدا حضرت حمزہؓ نے ایک ہی وار میں اس کو بھی ڈھیر کر دیا۔ البتہ حضرت عبیدہؓ اور شیبہ میں دیر تک کش مکش ہوتی رہی، یہاں تک کہ دونوں بے دم ہو گئے، لیکن آخری مرتبہ شیبہ نے اپنی تلوار سے ایک بھر پور وار حضرت عبیدہؓ پر کیا جس سے وہ شدید زخمی ہو گئے۔ ان کا ایک پاؤں شہید ہو گیا اور پنڈلی کی ہڈی سے گودا بہنے لگا۔ یہ دیکھ کر حضرت علی کرم اللہ وجہہ (اور بہ روایتِ دیگر حضرت حمزہؓ بھی) جو اپنے دشمن سے فارغ ہو چکے تھے، ادھر بڑھے اور شیبہ کو جہنم واصل کر کے حضرت عبیدہؓ کو میدان جنگ سے اٹھا لائے۔

بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت عبیدہؓ کا مقابلہ عتبہ سے ہوا تھا جوان کا ہم سن تھا اور وہ عتبہ کے وار سے زخمی ہوئے تھے۔ حضرت حمزہؓ نے شیبہ کو قتل کیا تھا اور حضرت علیؓ نے ولید کو۔ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ عبیدہؓ ولید سے لڑے تھے اور اسی کے ہاتھ سے زخمی ہوئے تھے جب کہ حضرت علیؓ نے شیبہ کو اور حضرت حمزہؓ نے عتبہ کو ہلاک کیا تھا۔ بہر صورت قریش کے تینوں جنگ آزما اللہ کے شیروں کے ہاتھ سے اپنے انجام کو پہنچ گئے۔ ان میں عتبہ کی حیثیت سب سے نمایاں تھی۔ وہ بنو عبد شمس کا سردار اور قریش کے لشکر کا سپہ سالار تھا۔

(٦)

جب حضرت عبیدہؓ کو رحمتِ عالم ﷺ کی خدمت میں اٹھا کر لائے تو ان کا جسم زخموں سے چور چور تھا۔ ان کی حالت دیکھ کر حضورؐ کو سخت صدمہ پہنچا۔ آپؐ نے انھیں تسلّی دی اور اپنا سرِ اقدس اظہارِ شفقت کے طور پر ان کے زانو پر رکھ دیا۔ حضرت عبیدہؓ نے فخر موجودات ﷺ کی خدمت میں عرض کیا:

''یا رسول اللہؐ! کیا مجھے مرگِ شہادت نصیب نہ ہوگی؟''

حضورؐ نے فرمایا: ''بلا شبہ تم شہید ہو اور نیکو کاروں کے پیشوا ہو۔''

مہبطِ وحی و رسالت ﷺ کا ارشادِ گرامی سن کر حضرت عبیدہؓ کا چہرہ فرطِ مسرّت سے چمک اٹھا اور انھوں نے عرض کی:

''اگر آج ابو طالب زندہ ہوتے اور مجھے اس حالت میں دیکھتے تو ان کو یقین ہو جاتا کہ میں ان کے اس قول کا کس قدر مستحق ہوں۔''

و نسلمه حتّٰی نصرع حوله

و نذهل عن ابناء نا والحلائل

''ہم رسول اللہ کی حفاظت کریں گے یہاں تک کہ ان کے اردگرد جانیں دے دیں گے
اور اپنے اہل و عیال سے بے نیاز ہو جائیں گے۔''

معرکۂ بدر کے بعد لشکرِ اسلام نے مدینہ کو مراجعت کی تو راستے میں حضرت عبیدہؓ کا وقتِ آخر پہنچا ـــــ ان کی روحِ مطہر نے وادیِ صفراء میں پیکِ اجل کو لبیک کہا اور اسی وادی کو ان کی ابدی آرام گاہ بننے کی سعادت نصیب ہوئی۔ ان کی تدفین کے بعد مدتوں تک وادیِ صفراء کی فضا میں مشک کی خوش بو بسی رہی، جو کوئی ادھر سے گزرتا مسحور کُن خوش بو کی لپٹیں اسے مدہوش کر دیتیں۔ اللہ اللہ یہ درجہ ہے ایک عاشقِ رسولؐ اور شہیدِ راہِ حق کا ؎

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

شہادت کے وقت حضرت عبیدہؓ کی عمر ۶۳ برس کی تھی۔ انھوں نے اپنے پیچھے چار لڑکیاں، خدیجہ، صفیہ، سنجلہ اور ریطہ اور چھ لڑکے معاویہ، حارث، محمد، منقذ، عون اور ابراہیم چھوڑے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضؓ

(۱)

۶ ھ میں صلح حدیبیہ کے بعد ایک دن رحمتِ عالم ﷺ نے مسلمانوں کو مسجدِ نبوی میں جمع کیا اور اُن سے مخاطب ہو کر فرمایا:

''لوگو! اللہ تعالیٰ نے مجھے تمام روئے زمین کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ تم اس رحمت کو دنیا والوں میں بانٹو۔ اٹھو اور ساری دنیا کو حق کی دعوت دو۔''

اس کے بعد حضورِ اکرم ﷺ نے پڑوسی ممالک کے فرماں رواؤں اور رئیسوں کو دعوتِ اسلام کے خطوط لکھے اور انھیں پہنچانے کے لیے چند ہوشیار اور ذی فہم صحابہؓ کو منتخب فرمایا۔ مقوقس والیِ مصر کو مکتوب نبویؐ پہنچانے کی خدمت جن صاحب کے سپرد ہوئی وہ چالیس برس کی عمر کے ایک قدیم الاسلام جاں نثارِ رسولؐ تھے، کسی قدر پست قد لیکن نہایت متناسب الاعضاء اور خوب رو، چہرے پر ذکاوت وفراست کے آثار نمایاں تھے۔ انھوں نے حضور ﷺ کا نامۂ مبارک سر آنکھوں پر رکھا اور اُسے لے کر عازمِ مصر ہوئے۔ دارالحکومت اسکندریہ پہنچ کر اپنی آمد کی اطلاع مقوقس والیِ مصر کو دی تو اُس نے اپنے افسروں کو حکم دیا کہ سفیرِ عرب کے ساتھ نہایت تعظیم وتکریم سے پیش آئیں اور ان کے قیام وطعام کا عمدہ بندوبست کریں۔ دو تین دن بعد اس نے سفیرِ عرب سے گفتگو کے لیے اپنے دربار میں تمام عمائدِ سلطنت اور مذہبی پیشواؤں کو طلب کیا۔ اور سفیرِ عرب کو بھی دربار میں بلا بھیجا۔

سفیرِ عرب دربار میں تشریف لائے تو مقوقس نے ان کی خندہ پیشانی سے پذیرائی کی اور ان کو اس جگہ بٹھایا جہاں بادشاہوں کے سفیر بٹھائے جاتے تھے۔ بات چیت شروع ہوئی تو

اثنائے گفتگو میں مقوقس نے پوچھا:

''کیا محمدؐ واقعی اللہ کے فرستادہ ہیں؟''

سفیرِ عرب: یقیناً

مقوقس: ''اگر واقعی ایسا ہے تو جب ان کی قوم نے اُن کو اپنے آبائی وطن سے نکالا تو انھوں نے بددُعا کیوں نہ کی؟''

سفیرِ عرب: کیا آپ حضرت عیسیٰ بن مریمؑ کو خدا کا سچا پیغمبر مانتے ہیں؟

مقوقس: بے شک۔

سفیرِ عرب: ''اگر ایسا ہے تو جب اُن کو صلیب پر چڑھایا گیا تو انھوں نے اپنی قوم کے لیے بددُعا کیوں نہ کی؟''

مقوقس یہ جواب سن کر مبہوت ہو گیا اور پکار اٹھا، ''بے شک تم خود بھی دانا آدمی ہو اور جس ہستی کی طرف سے آئے ہو وہ بھی بڑی صاحبِ حکمت ہے۔''

یہ صاحبِ رسولؐ جن کی ذہانت اور فراست نے ایک باجبروت نصرانی فرماں روا سے نہ صرف ان کی بلکہ دانائے کونین ﷺ کی بھی دانائی اور حکمت کا اعتراف کروایا، حضرت حاطبؓ بن ابی بلتعہ تھے۔

(۲)

سیدنا حضرت ابوعبداللہ (یا ابو محمد) حاطبؓ بن ابی بلتعہ یمن کے رہنے والے تھے اور بنولخم بن عدی سے تعلق رکھتے تھے۔ سلسلۂ نسب یہ ہے:

حاطب بن ابی بلتعہ بن عمیر بن سلمہ بن صعب بن سہل بن انعتیک بن سعاد بن راشدہ (خالفہ) بن اذب بن جزیلہ بن لخم بن عدی۔

بعض اربابِ سِیَر نے انھیں قحطانی النسل قرار دیا ہے اور بعض نے ان کو بنو مذحج کا ایک رکن بتایا ہے۔ لیکن جمہور کی رائے میں وہ لخمی یمنی ہیں۔ عہدِ جاہلیت میں گردش زمانہ انھیں مکّہ لے آئی جہاں وہ بنواسد بن عبدالعزیٰ سے حلیفانہ تعلقات قائم کر کے مستقل طور پر مقیم ہو گئے۔

بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت حاطبؓ بنو اسد کے ایک شخص عبید اللہ بن حمید کے مکاتب تھے۔ لیکن بعض نے لکھا ہے کہ وہ حضرت زبیرؓ بن العوام کے حلیف تھے۔

حافظ ابنِ حجر عسقلانیؒ نے اصابہ میں لکھا ہے کہ حاطبؓ زمانۂ جاہلیت کے مشہور شہسواروں میں سے تھے اور شعروشاعری میں بھی دَرک رکھتے تھے۔

حضرت حاطبؓ اکیس بائیس برس کے پیٹے میں تھے کہ رسولِ اکرم ﷺ مبعوث ہوئے اور لوگوں کو حق کی طرف بلانا شروع کیا۔ حضرت حاطبؓ کو اللہ تعالیٰ نے فطرتِ سلیم عطا کی تھی انھوں نے آغازِ دعوت ہی میں لوائے توحید کو تھام لیا اور سید الانام ﷺ کے جاں نثاروں میں شامل ہو گئے۔ بعض اہلِ سِیَر نے ان کے قبولِ اسلام کے بارے میں صرف اتنا لکھنے پر اکتفا کیا ہے کہ وہ ہجرت سے پہلے ایمان لائے لیکن بعض نے تخصیص کے ساتھ لکھا ہے کہ وہ حواریِ رسول حضرت زبیرؓ بن العوام کے ساتھ (بعدِ بعثت کے ابتدائی سالوں میں) سعادت اندوز اسلام ہوئے۔ بہرصورت اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ وہ ''السّابقون الاولون'' کی مقدس جماعت کے ایک معزّز رکن تھے۔

قبولِ اسلام کے بعد مکّہ میں حضرت حاطبؓ پر کیا گزری؟ اس کے بارے میں کتبِ سِیَر میں کوئی تفصیل نہیں ملتی۔ قیاس یہ ہے کہ دوسرے اہلِ حق کے ساتھ وہ بھی کفار کے مظالم سہتے رہے تا آں کہ ۱۳ بعدِ بعثت میں حضور ﷺ نے صحابۂ کرامؓ کو مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کا اِذنِ عام دے دیا۔ ہجرتِ نبویؐ سے چند دن پہلے حضرت حاطبؓ بھی دوسرے صحابہ کرامؓ کی طرح ارضِ مکّہ کو الوداع کہہ کر مدینہ منوّرہ تشریف لے گئے اور عصبہ کے محلے میں حضرت منذرؓ بن محمد انصاری کے ہاں قیام کیا۔ سرورِ عالم ﷺ نے مدینہ منورہ میں نزولِ اجلال فرمانے کے چند ماہ بعد مہاجرین وانصار میں مواخات قائم کی تو حضرت حاطبؓ بن ابی بلتعہ کو حضرت عویمؓ بن ساعدہ انصاری کا بھائی بنایا۔

غزوات کا سلسلہ شروع ہوا تو سب سے پہلے حضرت حاطبؓ کی تلوار میدانِ بدر میں چمکی اور دشمنانِ حق کے سر پر برقِ خاطف بن کر گری۔ اس غزوہ میں وہ شروع سے اخیر تک دادِ شجاعت دیتے رہے۔ مشرکین کو ہزیمت ہوئی تو ان کے بہت سے ساتھیوں کو مسلمانوں نے قیدی بنالیا۔ بنو اسد کا ایک جنگجو حارث بن عائذ حضرت حاطبؓ کے ہاتھ اسیر ہوا۔ حارث کے ساتھ بنی اسد کے دو اور آدمیوں سائب بن ابی جبیش اور سالم بن شاخ کو حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف اور حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے قیدی بنایا تھا۔ ان تینوں کو عثمان بن ابی جبیش نے چار ہزار دینار فدیہ دے کر رہا کرایا۔

بدر کے بعد حضرت حاطبؓ نے اُحد، احزاب، خیبر، فتح مکہ، حنین، طائف اور تبوک تمام غزوات میں سرورِ عالم ﷺ کی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا۔ اس شرف کے ساتھ ۶ ھ میں ان کو بیعتِ رضوان میں شریک ہونے کی عظیم سعادت بھی نصیب ہوئی۔

(۳)

۶ ھ میں صلح حدیبیہ کے بعد سرورِ کونین ﷺ نے حضرت حاطبؓ کو مقوقس والیِ مصر کے پاس مبلّغِ اسلام (سفیر) بنا کر بھیجا۔ حضرت حاطبؓ مقوقس کے نام حضور ﷺ کا جو مکتوبِ گرامی لے کر گئے اس کا مضمون یہ تھا:

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ محمدؐ کی طرف سے جو اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہے یہ خط مقوقس رئیسِ اعظم قبط کے نام ہے۔ سلام ہے اس شخص پر جو ہدایت کی پیروی کرنے والا ہے۔ میں تم کو اسلام کی دعوت دیتا ہوں اور اسلام کی طرف بلاتا ہوں۔ اسلام قبول کرلو تو سلامت رہو گے اور اللہ تعالیٰ تم کو دوگنا اجر دے گا۔ اور اگر انکار کرو گے تو قبطیوں کا گناہ تمہارے سر ہوگا۔ اے اہلِ کتاب ایک ایسی بات کی طرف آؤ جو ہم میں اور تم میں یکساں ہے وہ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں اور ہم میں سے بعض اپنے بعض کو اللہ کے آگے پروردگار نہ بنائیں اور تم نہیں مانتے تو گواہ رہو کہ ہم (اللہ کو وحدہٗ لاشریک) مانتے ہیں۔''

حضرت حاطبؓ اسکندریہ پہنچ کر مقوقس کے دربار میں گئے تو اس نے ان کی بڑی تعظیم و تکریم کی۔ حضورؐ کے نامۂ مبارک کو بڑی تعظیم سے آنکھوں سے لگایا اور اس کو اوّل تا آخر بغور پڑھا۔ اس موقع پر حضرت حاطبؓ اور مقوقس کے درمیان جو گفتگو ہوئی اس کا خلاصہ یہ ہے:

حضرت حاطبؓ: ''تم سے پہلے یہاں ایک بادشاہ تھا جو خیال کرتا تھا کہ وہ خدا ہے، پس اللہ تعالیٰ نے اس کو دنیا اور آخرت کے عذاب میں گرفتار کیا اور اس سے بدلہ لیا۔ پس تم دوسروں کے انجام کو دیکھ کر عبرت حاصل کرو۔ ایسا نہ ہو کہ تم سے دوسرے عبرت حاصل کریں۔''

مقوقس: ہم پہلے ہی ایک مذہب کے پیرو ہیں، جس کو ہم اس وقت تک ترک نہیں کر سکتے، جب تک کوئی دوسرا مذہب اس سے اچھا نہ دیکھ لیں۔

حضرت حاطبؓ: ہم تم کو اسلام کی طرف بلاتے ہیں جو اکمل ترین دین ہے۔ ہمارے نبیؐ نے جب لوگوں کو اس کی دعوت دی تو ان کی قوم قریش نے سخت مخالفت کی۔ اسی طرح یہودی

بھی اس دین کے سخت دشمن ثابت ہوئے لیکن نصاریٰ ان کی نسبت اِس دین کے قریب تھے۔ خدا کی قسم جس طرح موسیٰ علیہ السلام نے مسیح ابنِ مریمؑ کی بشارت دی تھی۔ اسی طرح مسیح ابن مریمؑ نے محمد ﷺ کی بشارت دی۔ جس طرح نصاریٰ یہودیوں کو انجیل کی دعوت دیتے ہیں اسی طرح ہم تم کو قرآن کی طرف بلاتے ہیں۔

انبیاء علیہم السلام کی ہم عہد قوم اُن کی اُمت ہوتی ہے اور اس پر ان کا اتباع لازم ہے۔ چوں کہ تم نے ایک نبی کا زمانہ پایا ہے اس لیے تم پر فرض ہے کہ ان پر ایمان لاؤ۔ ہم تم کو دین عیسوی سے منحرف نہیں کرتے بلکہ فی الحقیقت اسی راہ پر لے جانا چاہتے ہیں۔"

مقوقِس حضرت حاطبؓ کی تقریر سے بہت متاثر ہوا لیکن عمائدِ حکومت کی بغاوت کے خوف سے اس کو دعوتِ حق قبول کرنے کی ہمت نہ پڑی تاہم اس نے حضورؐ کے نامۂ مبارک کو بڑے احترام کے ساتھ ہاتھی دانت کے ایک ڈبے میں بند کر کے اور مہر لگا کر اپنی کنیز خاص کی حفاظت میں دے دیا۔ دربار برخاست ہوا تو حضرت حاطبؓ اپنی قیام گاہ پر چلے گئے۔ دو تین دن گزرے تو مقوقِس نے پھر حضرت حاطبؓ کو دربار میں بلایا اور ان سے پوچھا کہ اگر تمہارے پیغمبر سچے ہیں تو انھوں نے وطن چھوڑتے ہوئے اپنی قوم کے لیے بددعا کیوں نہ کی۔ جب حضرت حاطبؓ نے اس کے جواب میں اس سے سوال کیا کہ حضرت عیسیٰؑ نے صلیب پر چڑھتے وقت اپنی قوم کے لیے بددعا کیوں نہ کی تو مقوقِس نے لاجواب ہو کر حضرت حاطبؓ اور رسول اکرم ﷺ کی حکمت کا اعتراف کر لیا۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت حاطبؓ پانچ دن تک اسکندریہ میں مقیم رہے۔ جب وہاں سے چلنے لگے تو مقوقِس نے انھیں نہایت عزت و احترام سے رخصت کیا، اور حضور ﷺ کے نام ایک خط کے علاوہ چند تحائف بھی سرورِ عالم ﷺ کے لیے حضرت حاطبؓ کے ساتھ کر دیے۔ بعض اہلِ سِیَر نے ان تحائف کی تفصیل اس طرح بیان کی ہے:

۱- دو کنیزیں: ماریہ اور سیرین

۲- ایک کنیز۔ نام نامعلوم

۳- "یعفور" نام کا ایک گدھا

۴- "دلدل" نام کا ایک خچر

۵- ایک نیزہ
۶- ایک حُلّہ حریر (بعض روایات کے مطابق بہت سے قیمتی جوڑے)
۷- ایک ہزار مثقال سونا۔

ان کے علاوہ ایک سو مثقال سونا حضرت حاطبؓ کو بہ طور انعام یا رخصتانہ دیا۔ حضرت حاطبؓ نے مدینہ منورہ واپس آ کر یہ تحائف حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کیے تو آپؐ نے ان کو قبول فرما لیا۔ ماریہ قبطیہؓ کو اپنی خدمت میں رکھا۔ ان کے بطن سے حضورؐ کے صاحب زادے ابراہیمؓ پیدا ہوئے۔ سیرین حضرت حسانؓ بن ثابت کو عطا کی گئیں۔ ان کے بطن سے عبدالرحمٰن بن حسانؓ پیدا ہوئے۔ کنیز نا معلوم کو حضرت جہمؓ بن حذیفہ کو عنایت فرمایا۔ یعفور خاص سواری میں تھا۔ حضور ﷺ حجۃ الوداع کے لیے روانہ ہوئے تو راستے میں مر گیا۔ دُلدُل بھی کچھ عرصے خاص سواری میں رہا۔ پھر حضورِ اکرم ﷺ نے اسے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو دے دیا۔

(۴)

صلح نامۂ حدیبیہ (ذی قعدہ ۶ ھ) کی رو سے مسلمان مکہ پر لشکر کشی نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن خدا کی قدرت دیکھیے کہ ۸ ھ میں خود اہل مکّہ نے اس کا موقع فراہم کر دیا۔ اس صلح نامہ میں ایک اہم شرط یہ بھی تھی کہ جو قبیلے فریقین میں سے کسی ایک کی حمایت میں آ جائیں ان کو کوئی فریق نقصان نہیں پہنچائے گا اور نہ ان کے مقابلے میں ان کے دشمنوں کی مدد کرے گا۔ اس شرط کے مطابق بنوخزاعہ نے مسلمانوں کی حمایت قبول کی اور بنوبکر نے قریش کی۔ معاہدہ کے ڈیڑھ سال تک تو حالات معمول کے مطابق رہے لیکن پھر ایک دن بنوبکر نے بنوخزاعہ پر دفعتاً حملہ کر دیا۔ نہایت بے رحمی سے ان کے مردوں عورتوں اور بچوں کو قتل کیا۔ یہاں تک کہ حرم میں پناہ لینے والوں کو بھی نہ چھوڑا، قریش نے اس موقع پر اعلانیہ بنوبکر کی امداد کی اور اس طرح معاہدۂ حدیبیہ کو توڑ دیا۔ بنوخزاعہ نے چالیس آدمیوں کا ایک وفد عمرو بن سالم خزاعی کی قیادت میں مدینہ بھیجا جس نے حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر نہایت دردانگیز الفاظ میں بنوبکر اور قریش کے وحشیانہ مظالم کی داستان سنائی۔ حضورؐ کو یہ داستان سن کر سخت رنج ہوا۔ آپؐ نے قریش کے پاس قاصد بھیجا جس نے آپؐ کی طرف سے ان کے سامنے یہ تین شرطیں پیش کیں:

۱- بنوخزاعہ کے مقتولوں کا خون بہا (دِیت) ادا کریں۔

۲- قریش بنو بکر کی حمایت سے دست کش ہو جائیں۔
اگر یہ دونوں شرطیں منظور نہ ہوں تو:
۳- صاف اعلان کر دیا جائے حدیبیہ کا معاہدہ ٹوٹ گیا۔

جب حضور ﷺ کا قاصد قریش کے پاس پہنچا تو ان کے بعض جوشیلے آدمیوں نے متکبرانہ انداز میں کہا کہ ہم محمد کے محکوم نہیں ہیں جو ہم نے چاہا، کیا۔ جاؤ ہم معاہدہ کی پروا نہیں کرتے۔ یا یہ کہ ہمیں تیسری شرط (فسخِ معاہدہ) منظور ہے۔

قاصد واپس چلا گیا تو قریش کو ہوش آیا کہ ہم نے کیسی نامعقول حرکت کی ہے اب انھوں نے ابوسفیان کو سفیر بنا کر حضورؐ کی خدمت میں بھیجا کہ حدیبیہ کے معاہدہ کی تجدید کرا لائیں۔ ابوسفیان نے مدینہ پہنچ کر تجدیدِ معاہدہ کی بہت کوشش کی لیکن انھیں کوئی خاطر خواہ جواب نہ ملا۔ ناچار مسجد میں جا کر خود ہی دس سال کے لیے تجدیدِ معاہدہ کا ایک طرفہ اعلان کر کے مکّہ واپس آ گئے۔ ادھر حضورؐ نے نہایت خاموشی سے مکّہ پر لشکر کشی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ آپؐ چاہتے ہیں کہ اہلِ مکّہ کو مسلمانوں کی تیاریوں اور ارادے کا مطلق علم نہ ہونے پائے۔ اس لیے تیاریوں کے دوران میں آپؐ نے صحابۂ کرامؓ پر بھی اپنا ارادہ ظاہر نہ فرمایا۔ حضرت حاطبؓ بن ابی بلتعہ بڑے ذہین و فریس آدمی تھے انھوں نے اپنی فراست سے سمجھ لیا کہ رسولِ اکرم ﷺ مکّے پر یلغار کی تیاری فرما رہے ہیں۔ ان کے اعزّہ و اقارب مکّہ میں تھے خیال آیا کہ تقریباً سب مہاجرین کے رشتہ دار مکّہ میں موجود ہیں وہ ان کے مال و عیال کی بہر حال حفاظت کریں گے۔ لیکن میں غیر کفو ہوں اور میرے اعزّہ و اقارب کی حمایت اور حفاظت کرنے والا وہاں کوئی نہیں۔ اگر میں قریش کو مسلمانوں کی لشکر کشی کا بروقت اطلاع دے دوں تو وہ میرے ممنونِ احسان ہو جائیں گے اور میرے اہل و عیال کی حفاظت کریں گے۔ چناں چہ انھوں نے ایک خط لکھ کر مکّہ جانے والی ایک عورت کے سپرد کیا اور اُسے تاکید کی کہ اسے ہر حال میں پوشیدہ رکھنا اور مکّہ پہنچ کر اس خط کو عِکرمہ بن ابوجہل کے ہاتھ میں دینا۔ اس کام کے عوض حضرت حاطبؓ نے اس عورت کو دس دینار دیے۔ یہ عورت خط لے کر روانہ ہوئی تو سرورِ عالم ﷺ کو وحی کے ذریعے اس واقعہ کا علم ہو گیا اور آپؐ نے حضرت علیؓ، حضرت زبیرؓ بن العوام اور حضرت مقدادؓ بن اسود کو حکم دیا کہ وہ اس عورت کا تعاقب کریں اور اس سے خط چھین لائیں۔ ان تینوں شہسواروں نے اس عورت کو روضۂ خاخ کے

مقام پر جا پکڑا اور خط چھین کر واپس آئے۔ یہ خط حضورؐ کے سامنے پڑھا گیا تو آپؐ نے حضرت حاطبؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

"حاطب یہ کیا معاملہ ہے؟"

انھوں نے عرض کیا: "یا رسول اللہ میرے معاملہ میں جلدی نہ فرمائیے۔ خدا کی قسم میں اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان رکھتا ہوں۔ میں نے اپنے دین کو تبدیل نہیں کیا اور نہ نفاق اور ارتداد کو اپنے دل میں جگہ دی ہے۔ میں غریب الوطن یمن کا رہنے والا ہوں، قریش کا حلیف ہوں اور قریشی نہیں ہوں۔ مکّے میں میرا کوئی حامی اور مددگار نہ تھا اس لیے میں نے سوچا کہ میں اپنا کوئی حق قریش پر ثابت کر دوں تاکہ وہ میرے اہل وعیال کی حمایت اور حفاظت کریں۔ اسی غرض نے مجھے خط لکھنے پر آمادہ کیا اور کوئی بات نہیں۔"

یہ سُن کر حضورؐ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ حاطبؓ نے سچ سچ بیان کر دیا۔ حضرت عمر فاروقؓ بھی اس مجلس میں موجود تھے، ان کو جوش آگیا اور بولے۔ "یا رسول اللہ! اگر اجازت ہو تو اس منافق کی گردن اڑا دوں۔"

حضور ﷺ نے فرمایا: "نہیں نہیں اے عمر! حاطبؓ اس غزوۂ بدر میں شریک ہو چکے ہیں جس کے شرکاء کے دلوں کو اللہ تعالیٰ نے دیکھا تو انھیں تمام عالم سے بہتر پایا۔ اب یہ منافق نہیں ہو سکتے۔"

رحمتِ عالم ﷺ کا ارشادِ مبارک سُن کر حضرت عمرؓ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ صحیح بخاری (کتاب الجہاد باب الجاسوس) میں یہ واقعہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی زبانی اس طرح منقول ہے:

"رسول اللہ ﷺ نے مجھ کو، زبیرؓ کو اور مقدادؓ بن اسود کو بھیجا اور فرمایا کہ تم لوگ روضۂ خاخ جاؤ وہاں ایک نقاب پوش (عورت) ہے۔ اس کے پاس ایک خط ہے اس کو چھین لاؤ۔ ہم لوگ گھوڑے اڑاتے ہوئے گئے روضۂ خاخ میں وہ نقاب پوش عورت ملی۔ ہم نے کہا، خط نکال۔ بولی، میرے پاس کوئی خط نہیں، ہم نے کہا خود ہی نکال دے ورنہ تیری تلاشی لی جائے گی۔ (تجھے برہنہ کر دیا جائے گا) اس نے (سر کی) چوٹی (یا کمر) سے خط نکالا۔ ہم اس کو لے کر رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے۔ یہ خط حاطبؓ بن ابی بلتعہ کی طرف سے مکّہ کے چند مشرکوں

کے نام تھا۔ اس میں رسول اللہ ﷺ کے بعض امور کی خبر درج تھی۔ آپؐ نے (حاطبؓ سے) پوچھا، اے حاطب یہ کیا ہے؟ انھوں نے کہا یا رسول اللہ عجلت نہ فرمائیے۔ میں قریش کا حلیف تھا، قریشی نہ تھا، آپؐ کے ساتھ جو مہاجرین ہیں ان کے مکّہ میں قرابت دار موجود ہیں جو ان کے اہل و عیال اور مال کی حفاظت کریں گے، میں نے چاہا تھا کہ اگر ان میں میرا نسب نہیں ہے تو ان کے ساتھ کوئی ایسا احسان کروں جس سے وہ میرے قرابت داروں کی حمایت کریں۔ (واللہ) یہ کام میں نے نہ تو کفر کی بنا پر کیا نہ، ارتداد کی وجہ سے اور نہ رضا بالکفر کی بنا پر۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، انھوں نے سچ سچ کہہ دیا۔ عمرؓ بولے، یا رسول اللہ اجازت ہو تو اس منافق کی گردن مار دوں۔ آپؐ نے فرمایا، وہ بدر میں شریک رہ چکے ہیں اور تم کو معلوم نہیں کہ اللہ نے اہلِ بدر پر مطّلع ہو کر یہ فرما دیا ہے کہ تم جو چاہو کرو، میں نے تمہاری مغفرت کر دی۔"

ایک روایت میں ہے کہ حضور ﷺ نے خط کا مضمون سننے کے بعد حضرت حاطبؓ کو مسجد سے نکال دینے کا حکم دیا۔ کچھ صحابہؓ حضرت حاطبؓ کو کشاں کشاں لے چلے۔ اس حالت میں حضرت حاطبؓ بے بسی کے عالم میں پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتے جاتے کہ شاید حضورؐ ان پر نظرِ کرم فرمائیں۔ اور پھر واقعی حضورؐ کا دریائے رحمت جوش میں آ گیا۔ آپؐ نے فرمایا، حاطبؓ کو میرے پاس لاؤ۔ جب وہ حضورؐ کے سامنے ندامت سے سر جھکائے کھڑے تھے تو آپؐ نے فرمایا کہ میں نے تمہارا قصور معاف کیا۔ اب اللہ تعالیٰ سے اپنی مغفرت کی دُعا مانگو، آئندہ ایسا کام کبھی نہ کرنا۔

بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت حاطبؓ نے جس عورت کو خط دیا تھا اس کا نام سارہ تھا۔ وہ ابوعمر بن صیفی بن ہاشم کی لونڈی تھی۔ گانا بجانا اور نوحہ کرنا اس کا پیشہ تھا۔ فتح مکّہ سے کچھ عرصہ پہلے حضورؐ سے کچھ مالی امداد حاصل کرنے کے لیے مدینہ منوّرہ آئی۔ سرورِ عالم ﷺ اور صحابہ مہاجرین نے نقد رقم اور کپڑوں کی صورت میں بہ قدرِ استطاعت اس کی امداد کی اور زادِ راہ اور سواری بھی مہیا کر دی۔ جب وہ چلنے لگی تو حضرت حاطبؓ نے علیحدگی میں یہ خط اس کو دے دیا۔

ابنِ اثیر کا بیان ہے کہ مکّہ کا ایک مشرک شاعر ابنِ خطل سرورِ عالم ﷺ اور صحابہ کرامؓ کی ہجو کہہ کر سارّہ کو یاد کرا دیتا تھا جسے وہ ترنّم سے گایا کرتی تھی۔ اسی لیے حضورؐ نے اس کو واجب القتل (مباح الدم) قرار دیا تھا۔ فتح مکّہ کے دن حضرت علیؓ نے اس کو قتل کر ڈالا۔ لیکن ابنِ ہشام اور علاّمہ ابوالفتح فتح الدین محمد صاحبِ "عیون الاثر" نے لکھا ہے کہ حضورؐ نے سارّہ کو

معاف فرمایا اور وہ سعادت اندوزِ اسلام ہو گئی۔ اس کی وفات چند سال بعد حضرت عمر فاروقؓ کے عہدِ خلافت میں ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ کسی سوار کے گھوڑے کی جھپٹ میں آ گئی واللہ اعلم بالصواب۔

صحیح بخاری (کتاب التفسیر) میں ہے کہ حضرت حاطبؓ والے واقعہ کے بعد قرآن پاک کی یہ آیت نازل ہوئی:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَ عَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَ قَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ ۚ

(سورۂ ممتحنہ: ۱)

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو میرے دشمن اور اپنے دشمن کو دوست نہ بناؤ۔ تم ان کو دوستانہ (محبت آمیز) پیغام بھیجتے ہو حالاں کہ تمہارے پاس جو دینِ حق آیا ہے اس کا انھوں نے انکار کیا ہے۔"

(۵)

حافظ ابنِ عبد البرؒ کا بیان ہے کہ رحمت عالم ﷺ کے وصال کے بعد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سریر آرائے خلافت ہوئے تو انھوں نے بھی حضرت حاطبؓ بن ابی بلتعہ کو مقوقس شاہ مصر کے پاس سفیر بنا کر بھیجا۔ انھوں نے سفارت کی خدمت ایسے احسن طریقہ سے انجام دی کہ خلافتِ اسلامیہ اور حکومتِ مصر کے درمیان ایک دوستانہ معاہدہ طے پا گیا۔ دونوں حکومتیں کئی سال تک اس معاہدے کی پابند رہیں تا آں کہ بعض ایسے اسباب پیدا ہو گئے جن کی بنا پر مسلمانوں کو (حضرت عمر فاروقؓ کے عہدِ خلافت میں) مصر پر حملہ کرنا پڑا۔

مصر کی سفارت سے واپسی کے بعد حضرت حاطبؓ بن ابی بلتعہ نے باقی زندگی مدینہ منورہ میں نہایت خاموشی سے گزاری۔ طبقات ابنِ سعد اور مسند احمد بن حنبلؒ کی بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے تجارت کو اپنا ذریعۂ معاش بنا لیا اور اس میں بڑا نفع کمایا۔

عہدِ فاروقی میں ایک مرتبہ بازار میں منقّیٰ اتنے ارزاں نرخ پر فروخت کر رہے تھے کہ دوسرے دوکان داروں کو گھاٹے کا خدشہ پیدا ہو گیا۔ اس پر امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ نے انھیں حکم دیا کہ بھاؤ بڑھاؤ یا ان کو اٹھا کر بازار سے لے جاؤ۔

ایک روایت میں ہے کہ انھوں نے کھانے کی ایک دکان کھول لی تھی۔ اس سے اتنا نفع

ہوا کہ کئی مکانات بنوالیے، پھر بھی وفات کے وقت گھر میں چار ہزار دینار نقد موجود تھے۔

حضرت حاطبؓ نے بعہد خلافتِ حضرت عثمان ذوالنورینؓ ۳۰ھ میں وفات پائی۔ اس وقت آپ عمر کی ۶۵ منزلیں طے کر چکے تھے۔

خود امیر المومنینؓ نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔ حافظ ابنِ عبد البرؒ نے لکھا ہے کہ ان کے جنازے اور تدفین میں بہت بڑی تعداد میں مسلمان شریک ہوئے۔ ازواج و اولاد کی تفصیل کتبِ سِیَر میں نہیں ملتی۔

سبقت فی الاسلام، ہجرت، بدر، بیعتِ رضوان اور دوسرے تمام غزواتِ نبویؐ میں شرکت حضرت حاطبؓ بن ابی بلتعہ کے خاص فضائل ہیں۔

خود سید المرسلین ﷺ ان کے فضائل کے مدّاح اور قدر دان تھے۔ ایک روایت میں ہے کہ ان کے مزاج میں کسی قدر سختی تھی۔ ایک دفعہ ان کے ایک غلام نے دربارِ رسالتؐ میں ان کی سخت مزاجی کی شکایت کی اور ساتھ ہی (غصّے کے عالم میں) کہا۔ ''یارسول اللہ حاطب یقیناً جہنم میں جائے گا۔'' حضورؐ نے فرمایا: ''نہیں وہ بدر اور حنین میں حاضر تھا۔'' ایک اور حدیث میں وارد ہوا ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

''جو مسلمان بدر اور اُحد میں حاضر تھا وہ ہرگز دوزخ میں داخل نہ ہوگا۔''

فتح مکّہ سے پہلے انھوں نے جن حالات کے پیشِ نظر مشرکین کو خط لکھا تھا، بلا کم و کاست سرورِ عالم ﷺ کی خدمت میں عرض کر دیے۔ چناں چہ حضورؐ نے ان کی صاف گوئی اور نیک نیتی کو ملحوظ رکھ کر نہ صرف معاف فرما دیا بلکہ ان کے ''بدری'' ہونے کے شرف کی برملا تحسین فرمائی۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

حضرت عکاشہ بن محصن اسدیؓ

(۱)

ایک دن رحمتِ عالم ﷺ مدینہ منورہ کے قبرستان ''جنت البقیع'' میں شمعِ توحید کے چند پروانوں کے درمیان رونق افروز تھے اور یومِ حشر کی باتیں ہو رہی تھیں۔ اثنائے گفتگو میں مہبطِ وحی و رسالتؐ نے فرمایا:

''قیامت کے دن اس قبرستان کے ستر ہزار آدمی کسی حساب کتاب کے بغیر بخش دیے جائیں گے۔''

حضورؐ کا ارشاد سُن کر حاضرین میں سے ایک صاحب نے بڑے اشتیاق اور معصومانہ سادگی کے ساتھ عرض کیا:

''اے اللہ کے رسولؐ! آپ میرے لیے دُعا کیجیے کہ اللہ مجھے ان میں سے کر دے۔''

حضورؐ نے فرمایا۔ ''تم بھی ان لوگوں میں شامل ہو گے۔''

یہ سُن کر وہ صاحب فرطِ مسرت سے بے خود ہو گئے اور بے اختیار ان کی زبان پر تحمید و تہلیل جاری ہو گئی۔

ایک دوسرے صاحب نے عرض کی۔ ''یا رسول اللہ! میرے بارے میں بھی۔''

حضورؐ نے فرمایا، سَبَقَکَ بِهَا عُكَّاشَةُ۔(۱) ''عکاشہ تم پر سبقت لے گیا۔''

اور پھر حضورؐ کے یہ الفاظِ مبارک ''ضرب المثل'' کی صورت اختیار کر گئے۔ جب کوئی شخص کسی کام میں پہل کر جاتا تو لوگ کہتے۔ ''فلاں عکاشہ کی طرح سبقت لے گیا۔''

بغیر حساب کتاب جنت میں داخل ہونے کی بشارت پانے میں دوسروں پر سبقت لے

---

(۱) بخاری مسلم وغیرہ۔

جانے والے یہ عکاشہؓ محصن بن حرثان کے لختِ جگر تھے اور بنو اسد بن خزیمہ کی شاخ بنی غنم دودان کے چشم و چراغ تھے۔ پورا سلسلۂ نسب یہ ہے:

عکاشہ بن محصن بن حرثان بن قیس بن مرۃ بن کبیر بن غنم بن دودان بن اسد بن خزیمہ۔

یہ قبیلہ ایّام جاہلیت میں بنو عبد شمس (قریش) کا حلیف تھا۔ حضرت عکاشہؓ کی کنیت ابو محصن تھی اور انھوں نے اس وقت دعوتِ حق پر لبیک کہی تھی۔ جب ایسا کرنا تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف تھا۔ اس طرح وہ سابقون الاوّلون کی مقدس جماعت میں شامل ہونے کی سعادتِ عظمیٰ سے بہرہ ور ہو گئے تھے۔ جب مشرکین قریش کے مظالم انتہا کو پہنچ گئے تو حضرت عکاشہ کے قبیلے کے بہت سے لوگ (جو مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے) حضورؐ کے ایما پر حبش کو ہجرت کر گئے اور وہاں امن و سکون کی زندگی بسر کرنے لگے۔ لیکن حضرت عُکاشہؓ ہجرتِ مدینہ تک مکہ ہی میں مقیم رہے اور مردانہ وار راہِ حق میں کفار کے ظلم و ستم سہتے رہے۔ جب سرور کائنات ﷺ نے مدینہ کو ہجرت فرمائی تو عُکاشہ بھی دوسرے بلا کشانِ اسلام کے ساتھ ارض مکہ کو الوداع کہہ کر مدینہ پہنچ گئے۔

(۲)

مدینہ منوّرہ میں سب سے پہلے وہ ''سریّۂ عبداللہ بن جحش'' (رجب ۲ ھ) میں شریک ہوئے۔ اس سریّہ میں سرور عالم ﷺ نے حضرت عبداللہؓ بن جحش کو دس یا بارہ صحابہ پر امیر مقرر فرمایا اور ایک سر بہ مہر خط دے کر انھیں حکم دیا کہ اس کو دو دن کے بعد کھولنا۔ دو دن کے بعد حضرت عبداللہؓ نے خط کھولا تو اس میں لکھا تھا کہ نخلہ (مکّہ اور طائف کے درمیان) ٹھہر کر قریش کے ارادوں کا پتہ لگاؤ۔ اور ہمیں مطلع کرو۔'' حضرت عبداللہؓ نے اس خط کے مضمون سے اپنے ساتھیوں کو آگاہ کر کے فرمایا کہ میں تو رسول اللہ ﷺ کے فرمان کو پورا کر کے رہوں گا۔ جسے راہِ حق میں جان قربان کرنے میں کوئی عار نہ ہو وہ میرے ساتھ چلے اور جس کی مرضی نہ ہو وہ بہ خوشی واپس چلا جائے۔

اِن کے سبھی ساتھیوں نے (جن میں عُکاشہؓ بن محصن بھی شامل تھے) یک زبان ہو کر کہا کہ ہم آپ کا ساتھ دیں گے۔ چناں چہ اس جیش نے وہاں سے چل کر نخلہ میں قیام کیا۔ اتفاق سے قریش کا ایک کاروان تجارت مسلمانوں کے پڑاؤ کے قریب ہی آ کر اترا۔ انھوں نے مسلمانوں کو دیکھا تو ڈرے۔ مگر پھر عُکاشہ بن محصن جنھوں نے سر منڈوا رکھا تھا، پہاڑ سے ان کے سامنے برآمد ہوئے تو وہ سمجھ کر بے فکر ہو گئے کہ یہ عمرہ کرنے والے لوگ ہیں اِن سے کوئی خطرہ نہیں۔

اُدھر مسلمانوں نے باہمی مشورہ کے بعد طے کیا کہ اس قافلے کو بچ کر نہیں جانے دینا چاہیے۔ مسلمانوں کا خیال تھا کہ یہ جمادی الآخرۃ کا آخری دن ہے۔ لیکن فی الحقیقت ماہِ رجب شروع ہو چکا تھا۔ جس میں جدال و قتال کی ممانعت ہے۔ مسلمانوں نے اشتباہ و التباس میں مشرکینِ قریش سے لڑائی چھیڑ دی۔ ایک مجاہد نے سالارِ قافلہ عمرو بن حضرمی کو تیر مار کر ہلاک کر دیا اور حکم بن کیسان اور عثمان بن عبد اللہ مخزومی کو گرفتار کر لیا۔ قافلہ کے باقی آدمی بھاگ گئے۔ مسلمانوں کو کثیر مالِ غنیمت ہاتھ آیا۔ حضرت عبد اللہؓ نے اس کا پانچواں حصہ علیحدہ کر کے باقی سب شرکائے سریّہ میں بحصہء مساوی تقسیم کر دیا۔ حضرت عبد اللہؓ مالِ غنیمت اور قیدی لے کر بارگاہِ نبوّت میں حاضر ہوئے تو حضورؐ نے فرمایا:

''کیا میں نے حرمت والے مہینے میں تمھیں لڑائی سے منع نہیں کیا تھا۔''

حضرت عبد اللہ اوران کے ساتھیوں نے عذر پیش کیا کہ ہم سے مہینوں کا حساب لگانے میں غلطی ہو گئی۔ ہمارا خیال تھا کہ لڑائی کے دن جمادی الآخرۃ کی آخری تاریخ ہے۔

اُدھر مشرکین مکّہ اور یہود نے بھی مسلمانوں کو طعنے دینے شروع کر دیے کہ محمدؐ اور ان کے ساتھیوں نے ماہِ حرام کو حلال کر لیا ہے۔

چناں چہ حضورؐ نے مالِ غنیمت میں تصرف کرنے سے انکار کر دیا۔ سب شرکائے سریّہ اپنے فعل پر سخت نادم اور پشیمان تھے۔ اور بارگاہِ خداوندی میں رو رو کر اپنی بخشش کی دُعائیں مانگ رہے تھے۔ اس وقت رحمتِ خداوندی جوش میں آئی اور یہ آیت نازل ہوئی:

یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ؕ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ؕ وَ صَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ كُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۗ وَ اِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ؕ

(سورہ بقرہ: ۲۱۷)

''لوگ تم سے ماہِ حرام کی نسبت دریافت کرتے ہیں کہ اس میں لڑنا (جائز) ہے؟ کہہ دو کہ اس میں لڑنا بڑا گناہ ہے۔ اور اللہ کی راہ سے روکنا اور اللہ سے کفر کرنا اور مسجدِ حرام اور اس کے اہل (مسلمانوں) کو اس سے خارج کرنا اللہ کے نزدیک اس سے بھی بڑا جرم ہے۔''

اس آیت کے نزول سے مسلمانوں کی تسکینِ خاطر ہو گئی۔ اور حضورؐ نے بھی مالِ غنیمت قبول فرما لیا۔

(۳)

غزواتِ نبوی کا سلسلہ شروع ہوا تو حضرت عُکاشہؓ بن محصن نے بدر، اُحُد، احزاب، خیبر، فتح حنین، تبوک سبھی غزوات میں جان بازانہ حصہ لیا۔ اور ہر معرکے میں اخلاص و ایثار اور شجاعت کا غیر معمولی مظاہرہ کیا۔ غزوۂ بدر میں اپنے بھائی ابوسنان بن محصن اور بھتیجے سنان بن ابی سنان بن محصن کو ساتھ لے کر شریک ہوئے اور حیرت انگیز شجاعت و بسالت سے لڑے۔ حافظ ابن عبد البرؒ نے الاستیعاب میں لکھا ہے کہ لڑتے لڑتے ان کی تلوار ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی، سرورِ عالم ﷺ نے دیکھا تو ان کو کھجور کی ایک چھڑی مرحمت فرمائی۔ وہ یہی چھڑی لے کر دشمن کی صفوں میں گھس گئے اور لڑائی ختم ہونے تک دادِ شجاعت دیتے رہے۔ اس غزوے میں قریش کا ایک نامی جنگجو معاویہ بن قیس ان کے ہاتھ سے جہنم واصل ہوا۔

ربیع الاوّل (یا بہ روایت دیگر ربیع الآخر) ۶ ھ میں رسولِ اکرم ﷺ کو خبر ملی کہ بنو اسد بن خزیمہ کی ایک جمعیت نے چشمۂ غمر مرزوق کے قریب پڑاؤ ڈال رکھا ہے اور اس کا ارادہ مدینہ منوّرہ پر حملہ آور ہونے کا ہے۔ حضورؐ نے حضرت عُکاّشہؓ بن محصن کو چالیس سوار دے کر حکم دیا کہ فوراً جا کر ان شرپسندوں کی سرکوبی کریں۔ حضرت عکاشہؓ طوفانِ باد کی طرح ان لوگوں کے سر پر پہنچے۔ بنو اسد کو مقابلے کی ہمّت نہ پڑی اور وہ افراتفری کے عالم میں بھاگ کھڑے ہوئے۔ حضرت عُکاشہؓ نے ان کو دو سو اونٹ پکڑ لیے اور انھیں ساتھ لے کر کام یاب و کامران مدینہ منوّرہ واپس آئے۔ یہ مہم سریّہ عکاّشہؓ بن محصن یا سریّۂ غمر مرزوق کے نام سے مشہور ہے۔

اسی سال ۶ ھ میں حضرت عکاشہؓ کو ان چودہ سو نفوسِ قدسی میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ جنھوں نے حدیبیہ کے مقام پر سرورِ کونین ﷺ کے دستِ مبارک پر لڑنے مرنے کی بیعت کی۔ اور ''اصحاب الشجر ہ'' کا لقب پا کر اللہ تعالیٰ کی خوش نودی اور جنت کی بشارت حاصل کی۔

(۴)

۱۱ ھ میں سرورِ عالم ﷺ نے رحلت فرمائی اور حضرت ابوبکر صدیقؓ سریر آرائے خلافت ہوئے تو سارے عرب میں دفعتاً فتنۂ ارتداد کے شعلے بھڑک اٹھے۔ اس موقعے پر خلیفۃ الرسول سیّدنا صدیق اکبرؓ نے انتہائی نامساعد حالات کے باوجود بے مثال استقامت، شجاعت اور جوشِ ایمانی کا مظاہرہ کیا، انھوں نے مرتدوں کے تمام مطالبے سختی کے ساتھ ردّ کر دیے اور ان کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا۔

مرتدین کے ایک طاقت ور گروہ کی قیادت طلیحہ بن خویلد کر رہا تھا۔ یہ شخص بلا کا جنگجو تھا اور شجاعانِ عرب میں شمار ہوتا تھا۔ دراصل وہ عہدِ رسالت کے اواخر ہی میں ارتداد میں مبتلا ہوگیا تھا اور نبوّت کا مدعی بن بیٹھا تھا۔ حضوؐر نے اس کے ارتداد اور جھوٹے دعویٰ کی خبر سُن کر حضرت ضرارؓ بن ازور کو اس کی سرکوبی پر مامور فرمایا تھا۔ طلیحہ حضرت عکاشہؓ کے قبیلے بنو اسد بن خزیمہ سے تعلق رکھتا تھا، اور حضرت ضرارؓ بن ازور بھی اسی قبیلے کے فرد تھے۔ حضرت ضرارؓ نے واردات کے مقام پر طلیحہ اور اس کے حواریوں کو زبردست شکست دی۔ اس لڑائی میں حضرت عکاشہؓ کے بھتیجے حضرت سنانؓ بن ابی سنان بن محصن نے حضرت ضرارؓ کے شانہ بہ شانہ حصہ لیا۔ ان کو سرورِ عالم ﷺ نے بہ طورِ خاص پیغام بھیجا تھا کہ وہ ضرارؓ کے ساتھ مل کر طلیحہ کے خلاف جنگ کریں۔ حضرت ضرارؓ طلیحہ کو شکست دے کر مدینہ منوّرہ کی طرف روانہ ہوئے، ابھی راستے ہی میں تھے کہ حضوؐر کا وصال ہوگیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے مرتدین کے خلاف جہاد کے لیے مختلف اطراف کو جیوش بھیجے تو حضرت عُکاشہؓ اور حضرت ضرارؓ خالد بن ولید کے دستے میں شامل ہوگئے۔ حضرت خالدؓ سب سے پہلے طلیحہ کی طرف متوجہ ہوئے جو حضرت ضرارؓ سے شکست کھا کر بزاخہ میں مقیم ہوگیا تھا۔ اور قبائلِ طے، فزارہ اور اسد کو اپنے جھنڈے تلے جمع کر لیا تھا۔ حضرت خالدؓ نے حضرت عکاشہؓ اور حضرت ثابتؓ بن اقرم کو طلیعہ کی خدمت پر مامور فرمایا۔ وہ دیکھ بھال کے لیے اپنے لشکر کے آگے گھوڑوں پر سوار جا رہے تھے کہ اتفاقاً دشمن کے سواروں سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ ان میں طلیحہ اور اس کا بھائی سلمہ بن خویلد بھی شامل تھے۔ طلیحہ نے حضرت عکاشہؓ پر حملہ کیا اور سلمہ نے حضرت ثابتؓ پر۔ حضرت ثابتؓ تو جلد ہی سلمہ کے ہاتھوں رتبۂ شہادت پر فائز ہوگئے۔ لیکن حضرت عکاشہؓ نے طلیحہ کو ایسا زچ کیا کہ وہ سلمہ کو اپنی مدد کے لیے پکارنے لگا۔ سلمہ حضرت ثابتؓ سے فارغ ہو چکا تھا۔ وہ فوراً اِدھر لپکا اور دونوں بھائیوں نے مل کر حضرت عکاشہؓ کو اپنے نرغے میں لے لیا۔ دونوں عرب کے نامی جنگجو تھے (بعد میں طلیحہ کو ایک ہزار شجاعانِ عرب کے برابر تسلیم کیا گیا) لیکن حضرت عکاشہ نے کمال ثابت قدمی کے ساتھ ان دونوں کا مقابلہ کیا۔ تمام بدن زخموں سے چھلنی ہوگیا لیکن برابر مقابلہ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ نڈھال ہو کر گر پڑے اور خلدِ بریں کو سدھارے۔

جب اسلامی لشکر وہاں پہنچا تو دونوں جاں بازوں (حضرت عکاشہؓ اور حضرت ثابتؓ) کو خاک وخون میں غلطاں دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ سرورِ عالم ﷺ کے ان جاں نثاروں کی شہادت کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ ہر شخص کی آنکھوں سے سیلِ اشک رواں ہوگیا۔ حضرت خالدؓ بن ولید

اپنے گھوڑے سے اتر پڑے اور ساری فوج کو روک کر بادیدۂ پُرنم راہِ حق کے دونوں شہیدوں کو ان کے خون آلود کپڑوں میں ہی سپردِ خاک کیا۔ اس کے بعد انھوں نے آگے بڑھ کر طلیحہ کو فیصلہ کن شکست دی اور وہ شام کی طرف بھاگ گیا۔ خدا کی شان بعد میں اسی طلیحہ کو اللہ تعالیٰ نے توبہ کی توفیق دی اور قیامِ شام کے دوران میں ہی اس نے سچے دل سے دوبارہ اسلام قبول کرلیا۔ ایک مرتبہ وہ خلافتِ صدیقی کے زمانے میں عمرہ کے لیے مکّہ جا رہا تھا۔ مدینہ کے قریب سے گزرا تو کسی نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو اطلاع دی کہ طلیحہ جا رہا ہے۔ سن کر فرمایا۔ ''اب وہ اسلام میں داخل ہو چکا ہے، جانے دو۔''

خلافتِ فاروقی میں وہ مدینہ آ کر حضرت عمر فاروقؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور بیعت کی خواہش ظاہر کی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا:

''طلیحہ تم نے اپنے من گھڑت الفاظ کو وحی الٰہی سے تعبیر کر کے خدا پر افترا کیا۔''

طلیحہ نے کہا۔ ''امیر المومنین یہ بھی کفر کے فتنوں میں سے ایک فتنہ تھا۔ جسے اسلام نے ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ اب مجھے اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی اُمید ہے۔''

حضرت عمرؓ یہ سن کر خاموش ہو گئے اور اس کی بیعت قبول کر لی۔ طلیحہ نے اپنے گزشتہ کردار کی تلافی یوں کی کہ اس دور کے متعدد معرکوں میں اعدائے اسلام کے خلاف جان بازانہ شرکت کی اور حیرت انگیز کارنامے سرانجام دیے۔

حضرت عکاشہؓ بن محصن کی کتابِ سیرت میں سبقت فی الاسلام، راہِ حق میں بلاکشی، شوقِ جہاد اور فکرِ آخرت سب سے نمایاں ابواب ہیں۔ علامہ ابن اثیر نے اسدُ الغابہ میں لکھا ہے کہ حضرت عکاشہؓ نہایت جلیل القدر صحابی تھے۔ اور فضلائے صحابہ میں شمار ہوتے تھے۔''

فی الحقیقت خوش بختی اور جلالتِ قدر کی اس سے بڑی دلیل کیا ہو سکتی ہے کہ خود لسان رسالتؐ نے انھیں بغیر حساب کتاب جنت میں داخل ہونے کی بشارت دی۔

ع یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت عبداللہ بن مخرمہ عامریؓ

(۱)

ابھی ابومحمد عبداللہ بن مخرمہ کی مسیں بھیگ رہی تھیں کہ مکّہ کے لوگوں میں انھوں نے ایک عجیب چرچا سنا —— ''ارے عبدالمطلب کا یتیم پوتا کہتا ہے کہ میں خدا کا رسول ہوں۔ بُت پرستش کے لائق نہیں یہ نہ کسی کو نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ ضرر، عبادت کے لائق صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ وہی ہر ایک کو رزق دیتا ہے اور وہی سب کے نفع اور نقصان کا مالک ہے۔''

نوجوان عبداللہ نے اگرچہ کفر و شرک کے ماحول میں پرورش پائی تھی لیکن مبدءِ فیض نے اسے نہایت پاک اور صالح فطرت سے نوازا تھا۔ قریش کے دوسرے نوجوانوں کی طرح اسے لہو و لعب سے مطلق کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے لوگوں کی یہ باتیں سنیں تو دل میں سوچا۔ ''اگر ابن عبدالمطلب ایسا کہتے ہیں تو لوگ اس پر یقین کیوں نہیں کر لیتے۔ ابھی چند دن پہلے تو یہی اہل مکّہ ان کی پاک بازی، امانت، دیانت اور صداقت کی تعریفیں کرتے کرتے نہیں تھکتے تھے۔ اب اتنی بات پر کیوں چراغ پا ہو گئے ہیں۔ آخر محمدؐ کسی بھوکے ننگے خاندان میں تو پیدا نہیں ہوئے کہ انھیں کوئی جھوٹ گھڑنے کی ضرورت پیش آتی۔ واللہ محمدؐ بھی سچے ہیں اور محمدؐ کا خدا بھی سچا ہے۔ میں اُن پر ضرور ایمان لاؤں گا۔

ابنِ مخرمہ نے یہ ارادہ تو کر لیا لیکن جب چاروں طرف نظر دوڑائی تو یتیم مکہ کے ماننے والوں کو طرح طرح کے روح فرسا مصائب و آلام سے دوچار پایا۔ یہ دعوتِ حق کا ابتدائی زمانہ تھا۔ جو شخص لوائے توحید کو تھامنے کی جرأت کرتا مشرکین قریش اس پر بھوکے بھیڑیوں کی طرح ٹوٹ پڑتے اور اپنے جور و تعدی سے اس پر جینا حرام کر دیتے۔ لیکن بنو عامر بن لویؓ کے اس

جوانِ رعنا کی رگوں میں خالص شریف اور شجاع خون دوڑ رہا تھا۔ اس کے ضمیر اور دل نے پکارا: ''عبداللہ جور وستم اور بلاؤں کے ہجوم سے گھبرا کر دعوتِ حق سے آنکھیں چُرانا پرلے درجے کی بزدلی ہے آگے بڑھ اور ہادیِ برحقؐ کا دامن تھام لے۔'' چناں چہ وہ مردانہ وار آگے بڑھا، ایک دن رحمتِ دوعالم علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور ایمان کی دولتِ لازوال سے مالا مال ہوگیا۔ اب وہ اس مقدّس جماعت کے رکن تھے جسے حق تعالیٰ نے سابقون الاوّلون کا عظیم لقب مرحمت فرمایا تھا۔

(۲)

حضرت عبداللہؓ بن مخرمہ بنو عامر بن لوئیؔ کے نوجوانوں کی آبرو تھے۔ نہایت شجاع اور شریف النفس۔ ان کے قبولِ حق کی خبر مشرکینِ مکہ پر بجلی بن کر گری۔ انھوں نے نوجوان عبداللہؓ کو اپنے آبائی مذہب پر لوٹانے کے لیے ترغیب وتخویف کا ہر حربہ استعمال کیا لیکن حق کا نشہ ایسا نہیں تھا جسے جبر وظلم کی ترشی اتار دیتی۔ عبداللہؓ نے کسی شیطانی حربے کو پرِکاہ کے برابر بھی وقعت نہ دی، دوسرے بلاکشانِ اسلام کی طرح وہ بھی مشرکین کے جور وستم کا ہدف بن گئے۔ انھوں نے مار پیٹ طعن وتشنیع اور تمسخر واستہزا کی صورت میں اپنے ترکش کے سارے تیر عبداللہؓ پر خالی کر دیے لیکن ان کے پائے استقامت میں لمحہ بھر کے لیے لغزش نہ آئی۔ جب مشرکین کی ایذارسانی کا سلسلہ حد سے گزر گیا تو سرورِ عالمؐ نے حضرت عبداللہؓ کو بلا کر ہدایت فرمائی کہ جب موقع ملے تم بھی دوسرے مسلمانوں کے ساتھ حبش چلے جاؤ وہاں کا بادشاہ رحم دل اور منصف مزاج ہے۔ امید ہے تم لوگ اس ملک میں امن سے رہو گے۔

حضرت عبداللہؓ نے حضورؐ کے ارشاد کی تعمیل یوں کی کہ دوسری ہجرتِ حبشہ کے موقع پر جب ۸۳ مردوں اور ۲۰ خواتین پر مشتمل ایک قافلہ مکّہ سے روانہ ہوا تو وہ بھی اس میں شامل ہوگئے۔ کفار نے اگرچہ اس قافلے کو روکنے کے لیے بہت کوشش کی لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے بہ حفاظت حبش پہنچا دیا۔ حضرت عبداللہؓ بن مخرمہ دوسرے مسلمانوں کے ساتھ کئی سال تک حبش میں غریب الوطنی کی زندگی گزارتے رہے یہاں تک کہ سرورِ کونین علیہ وسلم بھی مکّہ سے ہجرت فرما کر مدینہ منوّرہ تشریف لے گئے۔ مہاجرین حبشہ کو ہجرت نبویؐ کی خبر ملی تو ان کے دل میں بھی اپنے آقا و مولاؐ کے قدموں میں مدینہ منورہ پہنچنے کی تڑپ پیدا ہوئی لیکن ناداری اور تہی دستی طویل بحری

سفر کی راہ میں مانع تھی۔ پھر بھی اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ ۳۳ مردوں اور آٹھ خواتین نے کمرِ ہمت کس لی اور مکّہ کے راستہ سے مدینہ جانے کے لیے حبش سے کوچ کیا۔ ان میں حضرت عبد اللہ بن مخرمہ بھی تھے۔ یہ سب خیر و عافیت کے ساتھ مکّہ پہنچ گئے۔ لیکن جب وہ وہاں سے مدینہ منوّرہ کے لیے روانہ ہونے لگے تو مشرکینِ مکّہ مزاحم ہوئے۔ سات آدمیوں کو انھوں نے جبراً روک لیا البتہ باقی کسی نہ کسی طرح بچ بچا کر مدینہ منوّرہ پہنچنے میں کام یاب ہوگئے، ان خوش بختوں میں حضرت عبداللہؓ بن مخرمہ بھی شامل تھے۔ اس وقت ان کی عمر صرف انتیس برس کی تھی۔

(۳)

خاص مدینہ منوّرہ میں داخل ہونے سے پہلے حضرت عبداللہؓ بن مخرمہ نے قبا میں قیام کیا۔ ان کے میزبان صاحب رحلِ رسولُ اللہ حضرت کلثومؓ بن الہدم انصاری تھے۔ وہ قبیلہ عمرو بن عوف کے رئیس تھے اور اس سے پہلے سرورِ کون ومکاں ﷺ کی میزبانی کا شرف حاصل کر چکے تھے۔ اہلِ سِیَر نے قبا میں حضرت عبداللہؓ کی مدّتِ قیام کی تصریح نہیں کی لیکن قیاس یہ ہے کہ یہ مدّت بہت مختصر تھی۔ جب وہ اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ مدینہ منورہ سرورِ کونینؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضورؐ انھیں دیکھ کر بہت مسرور ہوئے اور حضرت فردہؓ بن عمرو بیاضی کو ان کا دینی بھائی بنا دیا۔ حضرت عبداللہؓ کو رحمتِ عالم ﷺ کے جمالِ جہاں آرا کی زیارت کیا نصیب ہوئی کہ دونوں جہاں کی نعمتیں مل گئیں۔ ۲ھ میں حق اور باطل کا معرکۂ اوّل بدر کے میدان میں پیش آیا تو حضرت عبداللہؓ بن مخرمہ ان تین سو تیرہ نفوسِ قدسی میں سے ایک تھے جنھیں میدانِ بدر میں سید الانام خیر الخلائق ﷺ کی ہمرکابی کا شرف حاصل ہوا۔ بدر کے بعد انھوں نے اُحد، احزاب اور خیبر کی لڑائیوں میں اپنی تلوار کے جوہر دکھائے۔ بیعتِ رضوان میں وہ اُن چودہ سو صحابہ میں بھی شامل تھے، جنھیں اللہ تعالیٰ نے اصحاب الشجرہ کے لقب سے نوازا اور کھلے لفظوں میں اپنی خوش نودی کی بشارت دی۔ اس کے بعد فتح مکّہ حنین، طائف اور تبوک میں بھی رحمتِ عالم ﷺ کا حقِ رفاقت ادا کیا۔ غرض شروع سے اخیر تک انھوں نے ہر موقع اور ہر مقام پر کمال درجہ کے جذبۂ فدویت کا مظاہرہ کیا اور یوں سرفروشانِ اسلام کی صف میں نہایت ممتاز مقام حاصل کر لیا۔

حضرت عبداللہؓ بن مخرمہ کا دل ہر وقت شوقِ شہادت سے بے تاب رہتا تھا اور ان کی زبان پر یہ دُعا جاری رہتی تھی۔

''الٰہی مجھ پر اس وقت تک موت وارد نہ فرما جب تک میرے جسم کا ایک بند تیرے راستے میں زخموں سے چور چور نہ ہو جائے۔''

۱۱ھ میں سرورِ کونینؐ نے وصال فرمایا تو حضرت عبداللہؓ کے دل میں راہِ حق میں سرفروشی کی آرزو اور بھی شدّت سے مچلنے لگی۔ اسی زمانے میں فتنۂ ارتداد کی آگ سارے عرب میں بھڑک اُٹھی۔ خلیفۃ الرسول سیّدنا صدیقِ اکبرؓ نے مجاہدین اسلام کے مختلف جیوش مرتدوں کی سرکوبی کے لیے روانہ کیے تو حضرت عبداللہؓ بھی ایک جیش میں شامل ہو گئے۔ ایک مقام پر اس جیش کو مرتدین سے سخت معرکہ پیش آیا۔ بعض روایتوں میں اس معرکہ کو جنگِ یمامہ بتایا گیا ہے۔ لیکن اکثر روایتوں میں اس معرکہ کے نام کی تصریح نہیں کی گئی۔ بہرصورت یہ ثابت ہے کہ یہ فتنۂ ارتداد ہی کے سلسلے کی کوئی لڑائی تھی۔ حضرت عبداللہؓ بن مخرمہ اس معرکے میں اس جوش اور ثابت قدمی سے لڑے کہ تن بدن کا ہوش نہ تھا۔ زخم پر زخم کھاتے تھے اور تلوار چلاتے جاتے تھے یہاں تک کہ ان کے جسم کا کوئی حصّہ ایسا نہ رہا جس پر دشمن کے ہتھیار کی ضرب نہ لگی ہو، اب ان کی دُعا کے قبول ہونے کا وقت آ گیا تھا۔ زخموں سے چور چور ہو کر گر پڑے۔ لوگ میدان سے اٹھا کر خیمے میں لے گئے۔ رمضان المبارک کا مہینہ تھا۔ حضرت عبداللہؓ بھی روزے سے تھے، زخموں نے نڈھال کر دیا تھا لیکن روزہ توڑنا گوارا نہ کیا۔ شام کے وقت حضرت عبداللہ بن عمرؓ ان کا حال دریافت کرنے آئے تو پوچھا: ''کیا افطار کر چکے؟''

انھوں نے اثبات میں جواب دیا تو فرمایا:

''میرے لیے بھی پانی لاؤ۔''

وہ حیران رہ گئے کہ یہ مردِ حق اس حالت میں بھی روزے سے ہے فوراً پانی لانے کے لیے دوڑے لیکن ابھی واپس نہ آنے پائے تھے کہ عبداللہؓ بن مخرمہ حوضِ کوثر جا پہنچے۔ اس وقت ان کی ولولہ انگیز زندگی کا اکتالیسواں سال تھا۔ علامہ ابنِ سعدؒ کا بیان ہے کہ انھوں نے اپنے پیچھے ایک لڑکا ساحق نام کا چھوڑا جوان کی زوجہ زینبؓ بنت سراقہ کے بطن سے تھا۔ علامہ ابنِ اثیر نے اسدُ الغابہ میں لکھا ہے کہ حضرت عبداللہؓ بن مخرمہ نہایت عابد و زاہد اور صاحبِ علم و عمل تھے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت ثمامہ بن اُثال حنفیؓ

(۱)

رحمتِ عالم ﷺ کی مکّہ معظّمہ سے ہجرت نے یثرب کو ایک نئی زندگی بخش دی۔ حضورؐ نے یہاں نزولِ اجلال فرمایا تو کھجور کے باغوں سے گھرے ہوئے اس قدیم شہر کے نصیب جاگ اُٹھے، جونہی اس کے در و دیوار طلعتِ انوار سے جگ مگائے یہ یثرب سے ''مدینۃ النبیؐ'' بن گیا۔ اب یہ شہر اعدائے اسلام کے خلاف علم بردارانِ حق کی عملی جدوجہد کا مرکز تھا۔ سرورِ عالم ﷺ وقتاً فوقتاً مختلف قبیلوں اور علاقوں کے اعدائے اسلام کی طرف یہاں سے مہمیں روانہ فرماتے رہتے تھے۔ فتح مکّہ سے کچھ عرصہ پہلے آپؐ نے چند سواروں پر مشتمل ایک فوجی دستہ نجد کی طرف بھیجا اور پھر اس مہم کے نتیجہ کا انتظار فرمانے لگے۔ اسی زمانے میں ایک دن شمع رسالتؐ کے کچھ پروانے مسجدِ نبوی میں رونق افروز تھے کہ غُل ہوا ''مجاہدین نجد سے مظفر و منصور واپس آ گئے۔'' اس وقت نجد سے واپس آنے والے مجاہدین اپنی سواریاں باہر باندھ کر بے تابی سے مسجد نبویؐ کی طرف لپکے چلے آ رہے تھے۔ ان کے لباس گرد آلود تھے لیکن چہرے نورِ ایمان سے تابندہ تھے۔ ان کے ساتھ ایک قیدی بھی تھا جس کے ہاتھ رسّی سے بندھے ہوئے تھے۔ یہ قیدی بڑا وجیہ شخص تھا اور اس کے بدن پر نہایت عمدہ لباس تھا۔ مجاہدین نے مسجدِ نبویؐ میں پہنچ کر وہاں پر موجود صحابہ کرامؓ کو سلام کیا اور پھر اپنے قیدی کو مسجد کے ایک ستون سے باندھ کر سرورِ عالم ﷺ کے انتظار میں بیٹھ گئے۔

(۲)

تھوڑی دیر کے بعد سرورِ کونین ﷺ مسجد میں تشریف لائے مجاہدین کی کارکردگی پر اظہارِ خوشنودی فرمایا اور انھیں دعائے خیر دی پھر آپؐ نے قیدی پر نظر ڈالی اور صحابہؓ سے مخاطب

ہو کر فرمایا:

''جانتے ہو یہ کون شخص ہے؟''

صحابہؓ نے عرض کیا۔ ''اللہ اور اللہ کا رسولؐ ہی بہتر جانتے ہیں۔''

فرمایا۔ ''یہ یمامہ کا رئیس ثمامہ بن اُثال ہے۔ اسلام کا بدترین دشمن (یا بہ روایتِ دیگر ایک مسلمان کا قاتل) یہ اس بات کا مستحق ہے کہ اس کی گردن اڑا دی جائے۔ اچھا فی الحال اسے باندھے رکھو مگر اس کے کھانے پینے کا اچھی طرح خیال رکھنا۔''

پھر حضورؐ نے (اسی وقت یا بہ روایتِ دیگر عشاء کی نماز کے بعد تشریف لا کر) ثمامہ سے پوچھا۔

''کہو ثمامہ کیا کہتے ہو۔''

جواب دیا۔ ''اے محمدؐ اگر مجھے قتل کرو گے تو میں واقعی مجرم اور مباح الدم ہوں۔ (یا بہ روایت دیگر ایک جان دار یا ایک خونی کو قتل کرو گے) اور اگر رہا کر دو گے تو مجھے شکر گزار اور احسان شناس پاؤ گے اور اگر زرِ فدیہ مطلوب ہو تو جی بھر کے مانگو میں ادا کر دوں گا۔''

یہ جواب سُن کر آپؐ ثمامہ کو اسی طرح چھوڑ کر تشریف لے گئے۔ دوسرے دن بھی رحمتِ عالم ﷺ اور ثمامہ کے مابین ایسی ہی گفتگو ہوئی اور حضورؐ کوئی فیصلہ کیے بغیر تشریف لے گئے۔ تیسرے دن پھر اس قسم کے سوال و جواب ہو چکے تو خیر البشر ﷺ نے معاً فرمایا:

''اطلقوا ثمامة'' ''ثمامہ کو رہا کر دو۔''

صحابہ کرامؓ نے فوراً ان کی مُشکیں کھول دیں اور حضورؐ نے ان سے مخاطب ہو کر فرمایا:

''ثمامہ اب تم آزاد ہو جہاں تمہارا جی چاہے جا سکتے ہو۔''

رحمتِ عالم ﷺ کے حسنِ سلوک سے ثمامہ اتنے متاثر ہوئے کہ ان کے نہاں خانۂ دل سے شرک و کفر کی تاریکیاں یکسر کافور ہو گئیں۔ مسجد سے نکل کر دوڑتے ہوئے قریب کے ایک نخلستان میں گئے اور نہا دھو کر اُلٹے پاؤں مسجد نبویؐ میں آئے۔ سرورِ عالم ﷺ ابھی وہیں تشریف فرما تھے۔ ثمامہ نے حضورؐ کے سامنے کلمۂ شہادت پڑھا اور پھر یوں عرض پیرا ہوئے:

''یا رسول اللہ! خدا کی قسم تھوڑی دیر پہلے تک دُنیا میں کوئی شخص میری نظر میں آپؐ سے زیادہ مبغوض نہیں تھا اور نہ میرے نزدیک آپؐ کے چہرے سے ناپسندیدہ کوئی اور چہرہ تھا لیکن

اب دنیا میں آپؐ سے بڑھ کر مجھے کوئی اور محبوب نہیں اور نہ آپؐ کے رُخ انور سے پیارا کسی اور کا چہرہ مجھے نظر آتا ہے۔ واللہ آج سے پہلے آپؐ کے دین سے بُرا دین میرے نزدیک کوئی اور نہ تھا لیکن اب اس دین سے بہتر اور اعلیٰ دین مجھے کوئی اور دکھائی نہیں دیتا۔ بخدا اس سے قبل (اس) بستی (مدینہ منورہ) سے زیادہ بری بستی میرے نزدیک کوئی نہ تھی لیکن آج یہ شہر روئے زمین کے شہروں سے مجھے اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اے خدا کے سچّے رسولؐ میں اپنے وطن سے عمرہ کی نیت سے چلا تھا۔ راستے میں یہ واقعہ پیش آ گیا۔ حق تعالیٰ نے اب مجھے نعمتِ اسلام سے بہرہ یاب کر دیا ہے تو کیا میں اب بھی عمرہ کر سکتا ہوں۔''

سرورِ عالم ﷺ نے فرمایا:

''ہاں ہاں تم عمرہ کر سکتے ہو بشرطے کہ مکّہ میں تمہاری جان کو کوئی خطرہ نہ ہو۔''

ثمامہؓ نے حضورؐ کو سلام کیا اور مکّہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

(۳)

حضرت ابو امامہ ثمامہؓ بن اُثال جن کے قبولِ اسلام کا واقعہ اُوپر بیان کیا گیا ہے، یمامہ (نجد) کے ایک بااثر رئیس تھے۔ ان کا تعلق عرب کے اس قبیلے سے تھا جس نے عہدِ رسالت کے اخیر بلکہ عہدِ صدیقی میں جنگِ یمامہ تک مسلسل اسلام سے سرتابی کی۔ یہ وہی قبیلہ تھا جس نے مسیلمہ کذّاب جیسے شیطان کو جنم دیا تھا یعنی قبیلۂ بنو حنیفہ۔ ثمامہؓ کا شمار اپنے قبیلہ کے مقتدر سرداروں میں ہوتا تھا۔ نسب نامہ یہ ہے:

ثمامہ بن اثال بن نعمان بن سلمہ بن عتبہ بن ثعلبہ بن یربوع بن ثعلبہ بن دوٗل بن حنیفہ حنفی یمامی۔

یمامہ میں غلّہ اس کثرت سے پیدا ہوتا تھا کہ اپنے علاقہ کی ضرورت پوری کرنے کے بعد باہر بھیجنے کے لیے بھی بچ رہتا تھا۔ ''وادیِ غیر ذی زرع'' کے لوگ اناج کے معاملہ میں یمامہ ہی کے محتاج تھے اور وہ یہیں سے غلّہ منگوایا کرتے تھے۔ ثمامہؓ اپنے علاقے میں اناج کے سب سے بڑے تاجر تھے اور مشرکینِ مکّہ سے ان کے بڑے گہرے روابط تھے۔ اسی ربط وضبط کی وجہ سے وہ بھی اسلام اور ہادیِ اکرم ﷺ کے شدید دشمن بن گئے تھے۔ (اپنی اسلام دشمنی کی کیفیت قبولِ اسلام کے موقع پر خود انھوں نے حضورؐ کے سامنے بیان کی) ایک روایت میں ہے کہ انھوں

نے زمانۂ جاہلیت میں ایک مسلمان کو شہید کر دیا تھا اور حضورؐ کو یہ سُن کر بہت صدمہ ہوا تھا۔ حافظ ابن حجرؒ نے اصابہ میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ مشہور صحابی حضرت علاءؓ بن عبد اللہ حضرمی کو ثمامہ نے اپنے علاقے سے گزرتے ہوئے گرفتار کرلیا۔ وہ اُن کو قتل کرنا چاہتے تھے لیکن ان کے چچا عامر بن سلمہ نے جو ایک سلیم الفطرت شخص تھے ان کو اس ظلم سے روکا اور ثمامہؓ سے ان کی گلو خلاصی کرا دی۔ علاءؓ نے سرورِ عالمؐ کی خدمت میں پہنچ کر یہ واقعہ بیان کیا تو آپؐ نے عامر کے لیے دعائے خیر کی اور ثمامہ کے بارے میں دعا کی کہ الٰہی اس کو میرے قابو میں لائیو۔ چناں چہ حضورؐ نے فتح مکّہ سے پہلے یمامہ کو مہم بھیجی تو یہ مسلمانوں کے ہاتھ گرفتار ہوگئے۔ اللہ کی قدرت کہ یہ گرفتاری ان کے حق میں رحمت ثابت ہوئی۔ اور وہ دینِ حق سے سعادت اندوز ہو کر شمعِ رسالتؐ کے پروانوں میں شامل ہوگئے۔

ثمامہؓ قبولِ اسلام کے بعد سیدھے مکّہ معظّمہ پہنچے۔ آدمی بڑے جی دار اور نڈر تھے بے دھڑے عمرہ ادا کیا اور پھر اپنے اسلام کا بھی اظہار کر دیا۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ قریش کو اپنے جاسوسوں کے ذریعے ان کے قبول اسلام کی اطلاع پہلے ہی مل چکی تھی چناں چہ وہ مکّہ پہنچے تو مشرکین ان کے عمرہ ادا کرنے میں مزاحم ہوئے اور کہا کہ تم صابی (بے دین اور لا مذہب) ہوگئے ہو۔ ثمامہؓ نے ان کو منھ توڑ جواب دیا اور کہا کہ:

> صابی نہیں ہوا بلکہ محمد ﷺ پر ایمان لایا ہوں۔ خدا کی قسم اب میری اجازت کے بغیر گیہوں کا ایک دانہ بھی یمامہ سے مکّہ نہیں آئے گا۔"

اور واقعی انھوں نے جو کہا تھا اسے کر دکھایا۔ وطن واپس گئے تو مکّہ کو غلّہ کی ترسیل روک دی۔ ان کے اس اقدام نے مکّہ میں قیامت برپا کر دی اور وہاں اناج کا کال پڑ گیا، قریش نے گھبرا کر ایک خط سرورِ کونین ﷺ کی خدمت میں مدینہ روانہ کیا۔ اس خط میں لکھا تھا:

> "محمد ﷺ باپوں کو تو تم نے جنگوں میں قتل کر ڈالا اب ان کے بچوں کو بھی بھوک سے مار رہے ہو حالاں کہ لوگوں کو صلۂ رحمی کا حکم دیتے ہو کیا تم یہ پسند کرتے ہو کہ تمھاری قوم بھوک سے تڑپ رہی ہو اور تم آرام سے مدینہ میں بیٹھے رہو۔ کیا اب یمامہ سے کوئی غلّہ نہ آئے گا۔"

اس خط کا لب ولہجہ بڑا گستاخانہ تھا اور یہ مشرکینِ قریش کی بد دماغی کی منھ بولتی تصویر تھا۔

یہ وہی لوگ تھے جنھوں نے چند سال پہلے بنی ہاشم کو شِعب ابو طالب میں مسلسل تین سال تک محصور رکھ کر ان پر جینا دوبھر کر دیا تھا۔ سرورِ عالم ﷺ چاہتے تو اس موقع پر قریش سے خوف ناک انتقام لے سکتے تھے اور پھر اس خط کے مندرجات بھی خلافِ حقیقت تھے نہ ثمامہؓ نے حضورؐ کے ایما پر غلّہ روکا تھا اور نہ کبھی حضورؐ نے جنگ میں قریش کے خلاف پیش قدمی کی تھی بلکہ وہ خود ہی بار بار مدینہ پر چڑھ کر آئے تھے۔ حضورؐ اس خط میں لکھی گئی خرافات کی سزا بھی مشرکین قریش کو دے سکتے تھے لیکن آپؐ رؤف و رحیم تھے آپؐ کی شان رحمۃ للعالمین نے گوارا نہ کیا کہ یہ لوگ بھوک سے تڑپ تڑپ کر ہلاک ہو جائیں۔ فوراً ثمامہؓ کو کہلا بھیجا کہ ''غلّہ نہ روکو'' ثمامہؓ نے بلا حیل و حجت حضورؐ کے ارشاد کی تعمیل کی اور حسبِ دستور مکّہ کو غلہ بھیجنے لگے۔

(۴)

سرورِ کونین ﷺ کے وصال کے بعد سارے عرب میں دفعتًا فتنۂ ارتداد کے شعلے بھڑک اٹھے۔ بنو حنیفہ نے مسیلمہ کذّاب کے دامِ تزویر میں پھنس کر اسلام سے سرکشی اختیار کی اور خلافتِ صدیقی کے خلاف جنگ پر کمر باندھ لی۔ اس زمانے میں ثمامہؓ اپنے وطن ہی میں موجود تھے وہ بڑے استقلال سے اسلام پر قائم رہے اور اپنے اہلِ قبیلہ کو بھی ارتداد سے بچانے کی مقدور بھر کوشش کی لیکن وہ لوگ مسیلمہ کے دامِ ہم رنگِ زمین میں کچھ ایسے گرفتار ہو گئے تھے کہ کسی نے ان کی باتوں پر دھیان نہ دھرا۔ ناچار انھوں نے اپنے وطن سے ہجرت کا ارادہ کر لیا۔ اسی زمانے میں علاءؓ بن عبداللہ حضرمی جو مرتدینِ بحرین کے استیصال پر مامور ہوئے تھے، یمامہ کی طرف سے گزرے۔ ثمامہؓ کو اطلاع ملی تو انھوں نے اپنے ہم خیال مسلمانوں کو جمع کیا اور ان سے کہا کہ خدا کی قسم بنو حنیفہ کے گمراہ ہو جانے کے بعد میں یہاں نہیں رہ سکتا۔ عنقریب وہ ایسے وبال میں گرفتار ہو جائیں گے کہ اس سے پیچھا چھڑانا ان کے لیے محال ہو جائے گا۔ اہلِ حق اس فتنہ کی سرکوبی کے لیے آ پہنچے ہیں اس کام میں ان کی اعانت کرنا ہر سچے مسلمان کا فرض ہے۔ میں نے ان کا ساتھ دینے کا عزم بالجزم کر لیا ہے جو شخص میرے ساتھ چلنا چاہے وہ فوراً تیار ہو جائے۔

بنو حنیفہ کے تمام ثابت قدم مسلمان ان کے ساتھ چلنے پر تیار ہو گئے۔ چناں چہ وہ علم بردارانِ حق کی اس مختصر جماعت کے ہمراہ حضرت علاءؓ کے لشکر میں شامل ہو گئے۔ بحرین میں ربیعہ کا پورا قبیلہ اور بشر بن عمرو عبدری اپنے زیرِ اثر لوگوں کے ساتھ مرتد ہو گیا تھا۔ دوسری طرف

بنوقیس بن ثعلبہ بن حطیم (یا حطم) ابنِ ضبعیہ کی سرکردگی میں اسلام سے برگشتہ ہو گئے تھے۔ یہ سارے شر پسند قلعہ جواث میں قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئے تھے۔ حضرت علاءؓ نے جواث کا محاصرہ کر لیا۔ اثنائے محاصرہ میں ایک رات کو قلعہ پر چھاپہ مارا جس میں بنوقیس کا سردار حطیم مارا گیا اور مرتدین نے ہتھیار پھینک دیے۔

حضرت ثمامہؓ شروع سے اخیر تک حضرت علاءؓ کے دست و بازو بنے رہے اور مرتدین کی سرکوبی میں ان کے ساتھ برابر کے شریک رہے۔ یہ مہم سر ہو گئی تو انھوں نے ایک مسلمان سپاہی کے پاس ایک خوب صورت حُلّہ دیکھا، پوچھا۔ کہاں سے لیا" اس نے جواب دیا۔ "شب خون کے دوران میں حطیم کو میں نے ہی قتل کیا تھا اور یہ حُلّہ میں نے اسی کے بدن سے اتارا تھا۔"

حضرت ثمامہؓ کو یہ حلّہ اس قدر پسند آیا کہ اس سے خرید لیا۔ پہن کر باہر نکلے تو بنوقیس کے کچھ بد طینت آدمیوں سے سامنا ہو گیا۔ وہ اپنے مقتول سردار کا حُلّہ ان کے بدن پر دیکھ کر بھڑک اٹھے یہ سمجھ کر کہ ثمامہؓ ہی حطیم کے قاتل ہیں، تلواریں لے کر یک بارگی اُن پر ٹوٹ پڑے اور اس مرد وفا کیش و صداقت شعار کو آناً فاناً شہید کر ڈالا ؎

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

حضرت ثمامہؓ کی ازواج و اولاد اور فضل و کمال کے بارے میں کتب سِیَر خاموش ہیں۔ البتہ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک اچھے مقرر تھے اور شاعری میں بھی درک رکھتے تھے فتنۂ ارتداد کے دوران میں مسیلمہ کذّاب کے خلاف انھوں نے بڑے زوردار اشعار کہے تھے:

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت سلمہ بن اکوع اسلمیؓ
صاحبِ غابہ
(۱)

ذی قعدہ ۶ ھ میں صلح نامہ حدیبیہ کی تکمیل ہوگئی تو رحمتِ عالم ﷺ نے حدیبیہ سے مدینہ منورہ کی طرف واپسی سفر کا آغاز فرمایا۔ اس وقت وہ تمام ۱۴ سو جان باز جنھوں نے حدیبیہ میں ایک درخت کے نیچے حضورؐ کے دستِ مبارک پر راہِ حق میں کٹ مرنے کی بیعت (بیعتِ رضوان) کی تھی۔ آپؐ کے ہم رکاب تھے۔

اثنائے سفر میں پہلی رات آئی تو اس مقدس قافلے نے ایک پہاڑ کے دامن میں پڑاؤ ڈالا۔ صلح نامے پر فریقین کے دستخط ہو جانے کے بعد دو واقعات ایسے پیش آئے تھے جن سے معلوم ہوتا تھا کہ مشرکین کی نیت صاف نہیں ہے۔ اس لیے خدشہ تھا کہ شاید وہ مسلمانوں پر بے خبری کے عالم میں حملہ کر دیں۔ اس خطرے کے تدارک کے لیے حضورؐ چاہتے تھے کہ رات کو قافلہ کی نگرانی کا کوئی معقول انتظام کیا جائے۔ چناں چہ آپ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ اس شخص پر اپنی رحمت کرے اور اس کی مغفرت کرے جو آج رات اس پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر پہرہ دے اور مشرکین کی نقل وحرکت کی ہمیں بروقت اطلاع دے۔''

حضورؐ کا ارشاد سن کر ایک قوی الجثہ اور وجیہہ شخص آگے بڑھے اور بڑے پُر اعتماد لہجے میں عرض کی۔ ''یا رسول اللہ یہ خدمت میں انجام دوں گا۔''

حضورؐ اُن کا جذبۂ فدویت دیکھ کر بہت مسرور ہوئے اور فرمایا ''ہاں تم ہی یہ کام کرو۔''

ان صاحب نے فوراً اپنے ہتھیار سنبھالے اور دوڑتے ہوئے پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گئے۔ انھوں

نے ساری رات اس طرح کاٹی کہ بار بار لشکر کے گرد چکّر لگاتے تھے اور پھر پہاڑ کی چوٹی پر جا کر دشمن کی آہٹ لیتے تھے۔ یہ ان کی مستعدی تھی یا اللہ کا فضل کہ دشمن کو کوئی شرارت کرنے کی ہمت نہ پڑی۔ اور مسلمانوں نے بہ خیریتِ تمام صبح کی۔ یہ صاحبِ رسولؐ جنھوں نے اس نازک موقع پر تن تنہا اہلِ حق کے مقدس قافلے کی نگرانی کی اور یوں رحمت دو عالم ﷺ کی دُعائے مغفرت کے حق دار بنے، سیّدنا حضرت سلمہؓ بن الاکوع الاسلمی تھے۔

(۲)

حضرت سلمہؓ بن اکوع کا شمار ان عظیم المرتبت صحابہ کرام میں ہوتا ہے جن کی شجاعت اور جذبۂ ایثار پر دوسرے مسلمان رشک کیا کرتے تھے۔ ان کا تعلق بنو قمعہ کی ایک شاخ بنو اسلم سے تھا۔ یہ قبیلہ مرظہران اور اس کے قرب و جوار میں آباد تھا۔ حضرت سلمہؓ کی کنیت ابو ایاس تھی اور اس پر سب اہلِ سِیَر کا اتفاق ہے البتہ ان کے اصل نام اور نسب کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ ان کا اصل نام ''سنان'' تھا اور باپ کا نام عبد اللہ۔ چناں چہ مستدرک حاکم میں ان کا سلسلۂ نسب اس طرح درج ہے:

سنان بن عبد اللہ بن عبد اللہ بن قشیر بن خزیمہ بن مالک بن سلامان بن اسلم۔

لیکن صحیح مسلم میں حضرت سلمہؓ کا اصل نام سلمہؓ ہی دیا گیا ہے اور ان کے باپ کا نام عمرو بن الاکوع بیان کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت سلمہؓ کے دادا کا نام عبد اللہ نہیں بلکہ اکوع تھا۔ اسی طرح ان کے والد کا نام عبد اللہ کے بہ جائے عمرو تھا تاہم وہ اپنے دادا کے نام کی نسبت سے ابن الاکوع مشہور ہوئے۔

بعض روایتوں میں ہے کہ اکوع کا اصل نام سنان تھا۔ کچھ دوسری روایتوں میں سنان کو اکوع کا بیٹا بتایا گیا ہے گویا حضرت سلمہؓ کے والد عمرو سنان بن اکوع کے بھائی تھے۔ واللہ اعلم بالصواب — بہر صورت صحیح مسلم کی روایت کو دوسری سب روایتوں پر ترجیح حاصل ہے اس لیے ہم حضرت سلمہؓ کے والد کا نام عمرو بن الاکوع ہی تسلیم کریں گے اور ساتھ ہی یہ بھی کہ حضرت سلمہؓ کا حقیقی نام سلمہؓ ہی تھا۔

حضرت سلمہؓ نے قبولِ اسلام کی سعادت کب حاصل کی؟ اہلِ سِیَر نے اس کی وضاحت نہیں کی لیکن بعض روایتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ٦ ھ سے پہلے سعادت اندوزِ اسلام

ہو چکے تھے اور راہِ حق میں اپنے وطن، قبیلے اور اہل وعیال سے منھ موڑ کر دیارِ حبیب ؐ ''مدینہ منوّرہ'' میں آبسے تھے اس طرح ان کو ہجرت کا شرف بھی حاصل ہو گیا تھا۔ مدینہ پہنچ کر وہ فیضان نبوی سے مقدور بھر فیض یاب ہوئے یہاں تک کہ سرورِ عالم ﷺ کے لطف و کرم کے مورد بن گئے۔

ذی قعدہ ۶ھ میں حضورؐ ۱۴ سو جاں نثاروں کے ہم راہ عمرہ کے لیے مدینہ منوّرہ سے مکّہ معظّمہ کی جانب روانہ ہوئے۔ راستے میں آپؐ کو معلوم ہوا کہ قریش مسلمانوں کی مزاحمت کا ارادہ رکھتے ہیں۔ چوں کہ یہ حرمت کا مہینہ تھا اس لیے مسلمان لڑنا نہیں چاہتے تھے۔ حضورؐ نے قریش کو پیغام بھیجا کہ ہم صرف عمرہ ادا کرنے آئے ہیں لڑنا نہیں چاہتے بہتر یہ ہے کہ قریش ہم سے تھوڑی مدت کے لیے صلح کا معاہدہ کرلیں۔ قریش نے اپنی طرف سے عروہؓ بن مسعود ثقفی کو (جو اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے) سفیر بنا کر حضورؐ سے گفتگو کے لیے بھیجا۔ انھوں نے سفارت سے واپس جا کر قریش کو حضورؐ سے اپنی بات چیت کی تفصیل سے آگاہ کیا اور ساتھ ہی ان کو مشورہ دیا کہ مسلمانوں سے صلح کر لینا بہتر ہے کیوں کہ میں نے محمد ﷺ سے مسلمانوں کی محبت اور عقیدت کے جو مناظر دیکھے ہیں اس سے پہلے میری نظر سے نہیں گزرے حالاں کہ میں دنیا کے بڑے بڑے بادشاہوں کے دربار دیکھ چکا ہوں۔ قریش نے عروہؓ کا مشورہ نہ مانا۔ حضورؐ نے پھر ایک سفیر بھیجا، قریش نے اس پر حملہ کر دیا لیکن وہ کسی طرح بچ گیا۔ اب قریش نے اپنے کچھ جنگجو مسلمانوں سے لڑنے کے لیے بھیج دیے مسلمانوں نے ان کو پکڑ لیا لیکن حضورؐ نے ان کو چھوڑ دیا اور معافی دے دی۔ اس کے بعد آپؐ نے حضرت عثمان غنیؓ کو سفیر بنا کر مکّہ بھیجا۔ قریش نے ان کو قید کرلیا۔ اُدھر مسلمانوں میں یہ خبر مشہور ہو گئی کہ حضرت عثمانؓ شہید کر دیے گئے۔ حضورؐ کو بہت صدمہ پہنچا اور مسلمانوں کا بھی پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔ سرورِ عالم ﷺ نے فرمایا کہ عثمانؓ کے خون کا بدلہ لینا فرض ہے۔ یہ فرما کر آپؐ ببول کے ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے اور تمام صحابہ کرامؓ سے جاں نثاری کی بیعت لی۔ اللہ تعالیٰ کو مسلمانوں کا جذبۂ فدویت اتنا پسند آیا کہ اس نے لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَکَ تَحْتَ الشَّجَرَۃِ فرما کر تمام بیعت کرنے والوں کو اپنی خوش نودی کی بشارت دی۔ اسی لیے تاریخ میں اس بیعت کو ''بیعتِ رضوان'' کے نام سے لازوال شہرت حاصل ہوئی۔ حضرت سلمہؓ بن اکوع بھی ان ۱۴ سو جلیل القدر صحابہؓ میں شامل تھے جنھیں بیعت رضوان میں شریک ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ لیکن اس موقع پر انھیں ایک ایسی

سعادت بھی نصیب ہوئی جس میں کوئی دوسرا مسلمان ان کا شریک و سہیم نہیں ہے۔ صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت سلمہؓ نے حدیبیہ میں پہلی بار اپنے اہلِ قبیلہ کے ساتھ حضورؐ کے دستِ مبارک پر موت کی بیعت کی۔ تھوڑی دیر بعد حضورؐ کی نظر ان پر پڑی تو آپؐ نے فرمایا۔ ''اے ابنِ اکوع کیا تم بیعت نہیں کرو گے۔'' انھوں نے عرض کیا'' یارسول اللہ میں تو بیعت کر چکا۔'' فرمایا'' پھر بیعت کرلو'' انھوں نے فوراً تعمیلِ ارشاد کی۔ حضورؐ نے از راہِ کرم انھیں ایک ڈھال مرحمت فرمائی۔ تیسری مرتبہ پھر حضورؐ کی نظر ان پر پڑی تو فرمایا۔ ''سلمہ، بیعت نہ کرو گے؟'' عرض کیا یارسولؐ اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان میں تو دو مرتبہ بیعت کر چکا ہوں۔'' حضورؐ نے فرمایا۔ ''کیا حرج ہے تیسری مرتبہ سہی'' حضرت سلمہؓ نے فوراً تیسری مرتبہ بیعت کا شرف حاصل کیا، اس وقت حضورؐ نے دیکھا کہ آپؐ نے جو ڈھال حضرت سلمہؓ کو عنایت فرمائی تھی وہ ان کے پاس نہیں ہے۔ پوچھا، سلمہ وہ ڈھال کہاں ہے؟ عرض کی'' یارسولؐ اللہ میرے چچا کے پاس کوئی ہتھیار نہ تھا ان کو دے دی۔'' حضورؐ ہنس پڑے اور فرمایا'' سلمہ تمہاری مثال تو اس آدمی جیسی ہے جس نے دعا کی تھی کہ الٰہی مجھ کو ایسا دوست دے جو مجھ کو اپنی جان سے بھی پیارا ہو۔''

قریش کو بیعتِ رضوان کا علم ہوا تو وہ مرعوب ہو گئے اور صلح پر آمادہ ہو گئے۔ معاہدۂ صلح کے بعد حضورؐ ابھی حدیبیہ ہی میں مقیم تھے کہ اسّی مشرک کوہِ مقیم سے صبح کے وقت اس ارادے سے اترے کہ نماز میں مشغول مسلمانوں پر حملہ کریں۔ حضرت سلمہؓ کے چچا (یا بہ روایت دیگر بھائی) حضرت عامرؓ بن الاکوع نے کچھ ایسی تدبیر کی کہ یہ سب ان کے ہاتھ گرفتار ہو گئے۔ حضرت عامرؓ ان کو لے کر حضورؐ کی خدمت میں پہنچے۔ اسی وقت حضرت سلمہؓ بھی چار مشرکوں کو گرفتار کر کے کشاں کشاں حضورؐ کی خدمت میں لائے۔ یہ لوگ ایک درخت کے نیچے لیٹ کر حضورؐ کے بارے میں ناپسندیدہ باتیں کر رہے تھے۔ حضرت سلمہؓ نے ان کی باتیں سُن لی تھیں، جب وہ سو گئے تو حضرت سلمہؓ نے ان کی ہتھیاروں پر قبضہ کرلیا اور پھر انھیں گرفتار کرلیا۔ رحمتِ عالم ﷺ نے از راہِ ترحم ان سب کو معاف کر دیا اور اجازت دے دی کہ جہاں چاہیں چلے جائیں۔ اس پر قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی۔

''اللہ وہ ہے جس نے وادیِ مکّہ میں تمہارے (دشمنوں کے ہاتھ تم سے روک دیے اور تمہارے ہاتھ، قابو پانے کے بعد ان سے روک دیے۔'' (الفتح:۲۲)

اُسی سال غزوۂ ذی قرد یا غابہ پیش آیا۔ حضرت سلمہؓ نے اس غزوہ میں ایسی بے مثال شجاعت اور بے خوفی کا مظاہرہ کیا کہ حضوؐر پرنور نے بھی اس کی تحسین فرمائی اور دوسرے صحابۂ کرامؓ کے نزدیک بھی وہ اس غزوہ کے بطلِ خاص متصور ہوئے۔ مدینہ منوّرہ سے تقریباً بارہ میل کے فاصلہ پر بنی غطفان کے علاقہ کے قریب ذی قرد یا ذی قردہ ایک آبشار یا چشمہ تھا اس سے متصل (مدینہ منوّرہ کی جانب) ایک وسیع جنگل یا غابہ تھا۔ جس میں رسولِ اکرم ﷺ کی اونٹنیاں چرا کرتی تھیں۔ ٦ھ میں (ایک روایت کے مطابق سال کے اواخر میں) ایک دشمنِ اسلام غارت گر عیینہ بن حصن فزاری نے چالیس سواروں کی جمعیت کے ساتھ غابہ کی چراگاہ پر چھاپہ مارا اور گلہ بان حضرت ذرؓ بن ابو ذر غفاریؓ کو شہید کر کے بیس شیر دار اونٹنیاں ہانک کر لے چلا۔ اتفاق سے حضرت سلمہؓ بن اکوع اور حضرت رباحؓ مولیٰ رسول اللہ ﷺ گھوڑے پر سوار وہاں آ نکلے۔ حضرت سلمہؓ کو اس واقعہ کا علم ہوا تو حضوؐر کی محبت اور غیرتِ دینی نے انھیں شعلۂ جوالہ بنا دیا۔ انھوں نے حضرت رباحؓ کو گھوڑے پر سوار کر کے حضوؐر کو اطلاع دینے کے لیے مدینہ کی طرف روانہ کیا اور خود تن تنہا مشرکین سے لڑنے مرنے کا عزم کر لیا۔ (یہ روایت مسند امام احمدؒ بن حنبل کی ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت سلمہؓ بن اکوع سے روایت ہے کہ ایک روز میں فجر کی اذان سے پہلے چلا، اتنے میں مجھ کو عبد الرحمٰنؓ بن عوف کا غلام ملا اور اس نے مجھے بتایا کہ رسول اللہ ﷺ کی اونٹنیاں پکڑی گئیں، میں نے پوچھا، کس نے پکڑیں تو اس نے کہا بنو غطفان نے۔ اس کے بعد حضرت سلمہؓ نے جو واقعات بیان کیے وہ تقریباً وہی ہیں جو مسند احمد بن حنبل میں درج ہیں۔) حضرت سلمہؓ نے پہلے تو ایک قریبی ٹیلے پر چڑھ کر مدینہ کی طرف منہ کر کے تین مرتبہ ''یا صباحاہ'' کا نعرہ لگایا (یہ نعرہ امداد طلب کرنے کے موقع پر لگایا جاتا تھا۔ اس کا مطلب ہے ''اے صبح کی مصیبت'') اور پھر اکیلے ہی درختوں کی آڑ لے کر چھاپہ ماروں پر تیروں اور پتھروں کی بوچھاڑ کر دی۔ وہ بڑے شجاع اور غضب کے تیر انداز تھے۔ جب تیر چلاتے تو للکار کر یہ رجز پڑھتے:

اَنَا ابنُ الاکوع   والیوم یوم الرضع

''میں ہوں اکوع کا بیٹا اور یہ چھٹی کا دودھ یاد کرانے کا دن ہے۔''

اگر دشمن کا کوئی سوار ان کا قصد کرتا تو وہ تاک کر اس کو اپنے تیر کا نشانہ بناتے اور یہ شعر پڑھتے ۔

خذھا و انا ابن الاکوع   والیوم یوم الرضع

"اسے لے میں اکوع کا بیٹا ہوں اور یہ دن چھٹی کا دودھ یاد کرانے کا دن ہے۔"

اس اکیلے مردِ مجاہد نے غارت گروں کو ایسا زچ کیا کہ وہ اپنی چوکڑی بھول گئے اور ساری اونٹنیاں چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ حضرت سلمہؓ نے اونٹنیوں کو مدینہ کی طرف ہانک دیا اور خود ڈاکوؤں کا تعاقب جاری رکھا جو اپنی چادریں اور نیزے پھینکتے جاتے تھے اور اس اکیلے مردِ مجاہد کے سامنے بھاگتے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ انھوں نے تیس چادریں اور تیس نیزے پھینک دیے۔ حضرت سلمہؓ ہر چادر اور نیزے پر بہ طورِ علامت ایک پتھر رکھ دیتے تھے اور پھر ان کا تعاقب شروع کر دیتے تھے۔ جب چاشت سے کچھ زیادہ وقت ہوا تو عیینہ بدر فزاری کچھ مسلح سواروں کے ساتھ غارت گروں کی مدد کے لیے آ پہنچا۔ حضرت سلمہؓ ایک قریبی پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گئے۔ عیینہ نے غطفانی ڈاکوؤں سے پوچھا "یہ کون شخص ہے؟ انھوں نے کہا، اس شخص نے ہمیں سخت تنگ کیا ہے، اس نے صبح سے اس وقت تک ہمارا پیچھا نہیں چھوڑا۔ اور ہم سے سب کچھ چھین لیا ہے۔

عیینہ بولا: "اس کے پیچھے یقیناً کوئی جماعت ہے ورنہ وہ تن تنہا تمہارا تعاقب کرنے کی جرأت نہ کرتا۔ اب تم اس کو گرفتار کرنے کی کوشش کرو۔" چناں چہ ان میں سے چار آدمی حضرت سلمہؓ کی طرف چلے جب وہ چوٹی پر حضرت سلمہؓ کے اتنے قریب پہنچے کہ ان کی آواز سُن سکیں تو انھوں نے پکار کر کہا، "کیا تمھیں معلوم ہے کہ میں کون ہوں۔" غطفانیوں نے کہا۔ "تو کون ہے؟"

حضرت سلمہؓ نے کہا۔ "میں اکوع کا بیٹا ہوں۔ اس ذات پاک کی قسم جس نے محمد ﷺ کے روئے انور کو بزرگ بنایا تم میں سے کسی کی مجال نہیں کہ مجھ کو پکڑ سکے اور تم میں سے ایک بھی ایسا نہیں کہ اگر میں اسے ہلاک کرنا چاہوں تو وہ بچ جائے۔"

حضرت سلمہؓ اور ڈاکوؤں کے درمیان ابھی یہی سوال و جواب ہو رہے تھے کہ دُور سے گرد اڑتی نظر آئی اور پھر درختوں کے جھنڈ سے تین شہسوار نمودار ہوئے جو حضرت سلمہؓ کی مدد کے لیے اپنے گھوڑے برق رفتاری سے دوڑاتے آ رہے تھے۔ یہ شہسوار اس امدادی دستے کا ہراول تھے جو رسولِ اکرم ﷺ نے ڈاکے کی اطلاع ملتے ہی لٹیروں کے تعاقب کے لیے روانہ فرمایا تھا۔ سب سے آگے حضرت محرزِ بن فضلہ المقلب بہ اخرم اسدیؓ تھے۔ ان کے پیچھے حضرت ابو قتادہؓ

انصاری اور ان کے پیچھے کچھ دور حضرت مقدادؓ بن عمرو الاسود کندی تھے۔ اس وقت حضرت سلمہؓ فوراً پہاڑ کی چوٹی سے نیچے اترے اور حضرت اخرمؓ کے گھوڑے کی باگ پکڑ کر کہا۔ ''اخرم آگے نہ بڑھو۔ مجھے خطرہ ہے کہ لٹیرے تمھیں گھیر نہ لیں۔ تھوڑی دیر صبر کرو تا کہ حضورؐ اور آپؐ کے صحابہؓ آ جائیں۔''

حضرت اخرمؓ نے کہا۔ ''اے سلمہؓ اگر تم اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو اور تم سمجھتے ہو کہ جنت حق ہے اور دوزخ حق ہے تو میری شہادت کے راستے میں حائل نہ ہو۔''

یہ جملے انھوں نے اس جوش اور جذبہ کے ساتھ کہے کہ حضرت سلمہؓ نے ان کے گھوڑے کی لگام چھوڑ دی اور وہ گھوڑا اڑاتے ہوئے عبدالرحمٰن فزاری کی طرف لپکے اور اس کے گھوڑے کے پاؤں پہلے ہی وار میں کاٹ ڈالے لیکن اس کے ساتھ ہی عبدالرحمٰن فزاری کا نیزہ بھی ان کے جگر کے پار ہو گیا اور وہ جامِ شہادت پی کر مولائے حقیقی سے جا ملے۔ اب عبدالرحمٰن اپنے گھوڑے سے اتر کر حضرت اخرمؓ کے گھوڑے پر سوار ہو گیا تو اتنے میں حضرت ابوقتادہؓ گھوڑا دوڑاتے آ پہنچے اور اپنے نیزے سے عبدالرحمٰن کو جہنم واصل کر کے اسی وقت حضرت اخرمؓ کا بدلہ لے لیا۔ عین اسی وقت حضرت مقدادؓ بھی ابوقتادہؓ اور سلمہؓ سے آن ملے اور ان تینوں جانبازوں نے غارت گروں کو اپنے نیزوں کی نوکوں پر رکھ لیا۔ کچھ دیر میں حضورؐ کے بھیجے ہوئے کچھ اور سوار بھی پہنچ گئے۔ بدطینت لٹیروں نے اب بھاگنے ہی میں اپنی عافیت دیکھی تاہم مجاہدین نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ سورج غروب ہونے سے کچھ پہلے فزاری غارت گر ایک چشمے پر جمع ہو کر پانی پینے کا ارادہ کر رہے تھے کہ حضرت سلمہؓ للکارتے ہوئے ان کے سر پر جا پہنچے۔ اس وقت حضرت سلمہؓ کے ساتھی بہت پیچھے رہ گئے تھے لیکن اللہ رے اس اکیلے شیر کی ہیبت کہ بیسیوں مسلّح جنگجو پانی پیے بغیر ان کے سامنے بھاگ کھڑے ہوئے اور بہت دور ثنیہ ذی بیر میں جا کر پناہ لی۔ اب سورج بالکل غروب ہو گیا لیکن حضرت سلمہؓ آگے ہی آگے بڑھتے گئے اتنے میں ایک فزاری غارت گر پر ان کی نظر پڑی۔ انھوں نے اس کو تیر مارا اور یہ رجز پڑھا ؎

خذھا و انا ابن الاکوع   والیوم یوم الرضع

اس نے جواب دیا۔ ''ابن اکوع کی صبح نہ پائے۔''

حضرت سلمہؓ نے یہ کہتے ہوئے کہ ''ہاں اے اپنے نفس کے دشمن'' ایک دوسرا تیر اس پر جڑ دیا۔ وہ شخص سخت گھائل ہو کر وہاں سے غائب ہو گیا اور دو گھوڑے اپنے پیچھے چھوڑ گیا۔ حضرت

سلمہؓ دونوں گھوڑوں کو ہنکا کر واپس ذوقرد کے چشمہ پر پہنچے جہاں رسولِ اکرم ﷺ پانچ سو مسلح جاں نثاروں کے ساتھ رونق افروز تھے اور حضرت بلالؓ بن رباح ایک اونٹ ذبح کر کے اس کا جگر اور کوہان حضورؐ کے لیے آگ پر بھون رہے تھے۔ حضرت سلمہؓ نے حضورؐ کی خدمت میں یہ گھوڑے پیش کرتے ہوئے عرض کی:

''یارسول اللہ اگر آپ مجھے سو آدمی دے دیں تو میں فزاری غارت گروں کا نام ونشان مٹا ڈالوں گا۔ یہاں تک کہ ان میں سے کوئی خبر دینے والا بھی نہیں بچے گا۔''

حضورؐ نے متبسم ہو کر فرمایا۔ ''اے سلمہؓ کیا تم واقعی ایسا کر گزرو گے۔'' حضرت سلمہؓ نے بڑے جوش کے ساتھ کہا۔ ''یارسول اللہ اس اللہ کی قسم جس نے آپؐ کو معزز و مکرّم بنایا ہے میں ایسا ہی کروں گا۔'' ان کا جوش وجذبہ دیکھ کر رحمتِ عالم ﷺ بشاش ہو گئے اور اس قدر ہنسے کہ آپ کے پچھلے دندانِ مبارک (ڈاڑھوں) سے نور کی شعاعیں پھوٹنے لگیں۔ پھر آپؐ نے فرمایا ''اے ابنِ اکوع جانے دو اور قابو پانے کے بعد درگزر کرو۔''

اتنے میں ایک غطفانی نے (قیاس ہے کہ وہ مسلمان ہوگا) آ کر خبر دی کہ فزاری غارت گر فلاں غطفانی کے پاس پہنچے تو ان کی مہمان داری کے لیے اس نے ایک اونٹ ذبح کیا وہ اس کی کھال اتار رہے تھے کہ اتفاقاً ایک غبار اٹھتا دیکھا وہ سمجھے کہ رسول اللہ ﷺ کا لشکر آ رہا ہے۔ چناں چہ وہ اس ذبیحہ کو چھوڑ کر وہاں سے بھاگ گئے۔ حضورؐ نے یہ خبر سُن کر تبسّم فرمایا۔ صبح ہوئی تو حضورؐ نے فرمایا:

''ہمارے سواروں میں سب سے بہترین ابوقتادہؓ ہیں اور پیادوں میں سب سے بہترین سلمہؓ ہیں۔''

اس کے بعد حضورؐ نے حضرت سلمہؓ کو مالِ غنیمت میں سے سوار اور پیادہ دونوں کا حصہ دیا۔ کوکبۂ نبویؐ ذی قرد سے مدینہ منوّرہ کی جانب روانہ ہوا تو چشمِ فلک نے حضرت سلمہؓ کی عظمت و شان کا عجیب منظر دیکھا، رحمتِ عالم ﷺ نے کمال شفقت سے حضرت سلمہؓ کو اپنی سواری (ایک روایت کے مطابق عضباء نامی (اونٹنی) پر اپنے پیچھے بٹھا رکھا تھا اور دوسرے سب صحابہ کرامؓ اپنی اپنی سواریوں پر آپؐ کے جلو میں تھے، یہ مقدّس قافلہ ابھی مدینہ منوّرہ سے کئی میل دور تھا کہ ایک انصاری صحابی، جن کو اپنی تیز رفتاری پر بڑا ناز تھا، بار بار آواز لگانے لگے، کیا کوئی مدینہ تک دوڑ

میں مجھ سے بازی لے جاسکتا ہے؟ حضرت سلمہؓ بن اکوع کے کان میں یہ آواز پہنچی تو انھوں نے پکار کر ان صاحبؓ سے فرمایا:

"کیا تم کسی معزز شخص کی عزت نہیں کرتے؟ کیا تم کسی شریف آدمی سے نہیں ڈرتے؟"

انھوں نے کہا۔ "رسول اللہ ﷺ کے سوا کسی سے نہیں۔"

حضرت سلمہؓ نے حضورؐ کی خدمت میں عرض کی: "یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان مجھے اجازت دیں کہ میں اس کے ساتھ دوڑ لگاؤں۔"

حضورؐ نے فرمایا، جو تمہاری مرضی۔

اب انھوں نے انصاری صحابی سے مخاطب ہو کر کہا۔ "تیار ہو جاؤ" میں تمہارے ساتھ دوڑ لگاؤں گا۔" چناں چہ دونوں اپنی اپنی سواریوں سے کود پڑے اور مدینہ کی جانب دوڑنے لگے۔ حضرت سلمہؓ کہتے ہیں کہ "میں نے اسے تھوڑی دور تک مہلت دی اور اپنے آپ کو اس سے پیچھے رکھا پھر میں دوڑ کر اس سے مل گیا اور اس کے بازوؤں پر اپنے ہاتھ مار کر کہا، خدا کی قسم اب میں تجھ سے آگے بڑھا، وہ ہنس پڑا اور کہنے لگا، میرا بھی یہی خیال ہے پس مدینہ پہنچ کر میں اس سے آگے بڑھ گیا۔"

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلمہؓ نہایت تیز رفتار تھے اور فی الواقع حضورؐ کے ارشاد کے مطابق بہترین پیادے تھے۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے اصابہ میں لکھا ہے کہ وہ گھوڑے سے زیادہ تیز دوڑتے تھے اور اگر کسی اسپ سوار سے مقابلہ پیش آجاتا تو وہ اس سے آگے بڑھ جاتے تھے۔

(۴)

غزوۂ ذی قردہ کے تین دن بعد رحمت عالم ﷺ یہودِ خیبر کی سرکوبی کے لیے مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے۔ اس مہم میں سولہ مجاہدین آپؐ کے ہم رکاب تھے جن میں حضرت سلمہؓ بن اکوع بھی شامل تھے۔ جنگِ خیبر عہدِ رسالت کی مشہور جنگ ہے۔ یہ لڑائی کافی دن جاری رہی اور اس دوران میں یہودیوں سے کئی معرکے پیش آئے۔ ان معرکوں میں حضرت سلمہؓ نے سرفروشانہ دادِ شجاعت دی، سرورِ عالم ﷺ حضرت سلمہؓ کے جان بازانہ کارناموں پر اتنے خوش تھے کہ جب

فتح خیبر کے بعد لشکرِ اسلام نے مدینہ منورہ کی طرف واپسی سفر کا آغاز کیا تو آپؐ حضرت سلمہؓ کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھے۔ صحیح بخاری میں غزوۂ خیبر سے متعلق حضرت سلمہؓ بن اکوع سے دو حدیثیں مروی ہیں۔ ایک حدیث میں وہ کہتے ہیں کہ خیبر کے روز میری پنڈلی میں تلوار کا ہاتھ لگ گیا، میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپؐ نے اس پر تین مرتبہ پھونکا، (میرا زخم ٹھیک ہوگیا) اور اس وقت سے لے کر مجھ کو اب تک کبھی درد کی شکایت نہیں ہوئی۔ دوسری حدیث میں وہ کہتے ہیں کہ ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ خیبر کی طرف روانہ ہوئے، تمام رات سفر کرتے رہے، اثنائے راہ میں ایک شخص نے عامرؓ (بن اکوع) سے کہا کہ عامرؓ ہم کو کچھ سناتے نہیں، چوں کہ عامر شاعر آدمی تھے وہ سواری سے اتر کر یہ حدی سنانے لگے:

"اے اللہ اگر تیری مدد نہ ہوتی تو ہم ہدایت نہ پاتے۔

نہ صدقہ کرتے، نہ نماز پڑھتے، اے اللہ تو ہماری مغفرت فرما۔

جب تک ہم زندہ ہیں تجھ پر فدا ہوں۔

اے اللہ ہم کو اطمینان اور وقار عطا فرما۔

اور جس وقت دشمن سے ہمارا سامنا ہو ہمیں ثابت قدم رکھ یہ لوگ ناحق کی بات کی طرف ہم کو بلاتے ہیں۔

مگر ہم انکار ہی کرتے ہیں، ان لوگوں نے ہم پر زیادتی کی ہے۔"

حضورؐ کے سمع مبارک میں ان کی آواز پہنچی تو پوچھا، یہ ہانکنے والا (حدی خوان) کون ہے۔ لوگوں نے عرض کیا "عامر بن اکوع" آپؐ نے فرمایا "اللہ اس کی مغفرت فرمائے ہم لوگوں میں سے ایک آدمی نے کہا، یا نبی اللہ، اس کی شہادت واجب ہوئی آپؐ نے ہم کو ان سے کچھ نفع نہ اٹھانے دیا۔ پھر ہم کوچ کرتے ہوئے خیبر پہنچے اور وہاں کا محاصرہ کرلیا۔ یہاں تک کہ صحابہ کو فتح نصیب ہوئی۔ ہم کو اس وقت سخت بھوک محسوس ہوئی اور فتح کے دن شام کو ہمارے پڑاؤ میں جگہ جگہ آگ جلنے لگی۔ حضورؐ نے پوچھا، یہ کیسی آگ ہے۔ اور تم لوگ کس چیز کے نیچے آگ جلا رہے ہو، ہم نے عرض کیا، یا رسول اللہ ہم گوشت پکا رہے ہیں، آپؐ نے پوچھا کس شے کا گوشت ہے؟ ہم نے کہا، گدھوں کا، فرمایا، اس گوشت کو پھینک دو اور ہانڈیاں توڑ ڈالو۔ ایک شخص نے کہا، ہم اس کو

پھینک کر ہانڈیاں دھونہ ڈالیں، حضورؐ نے فرمایا، اچھا یہی سہی، اس لڑائی میں جب دشمن سے ہمارا سامنا ہوا اور صف بندی ہوئی تو عامر نے کسی یہودی پر تلوار کا وار کیا۔ چوں کہ ان کی تلوار چھوٹی تھی اس کی وجہ سے لوٹ کر ان کے زانو پر لگی جس کے صدمہ سے یہ فوت ہو گئے۔ جب لشکر واپس ہوا تو رسول اللہ ﷺ میرا ہاتھ پکڑے ہوئے تھے۔ اس وقت آپؐ نے میری طرف دیکھا اور پوچھا، سلمہ تم غمگین کیوں ہو؟ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں لوگوں کا خیال ہے کہ عامر کے تمام اعمال بیکار گئے (ان لوگوں کے خیال میں عامرؓ نے خودکشی کی تھی) حضورؐ نے فرمایا، جو لوگ یہ کہتے ہیں وہ غلط کہتے ہیں، عامر کو دوہرا اجر ملے گا اور آپ نے اپنی دو انگلیاں ملائیں اور فرمایا، بے شک عامر جاہد اور مجاہد تھا۔"

صحیح مسلم اور حدیث کی بعض دوسری کتابوں میں بھی غزوۂ خیبر سے متعلق حضرت سلمہؓ بن اکوع کی ایک طویل روایت موجود ہے اس کی بعض جزئیات صحیح بخاری کی روایت سے کچھ مختلف ہیں، اس میں حضرت سلمہؓ نے وضاحت کے ساتھ کہا ہے کہ جنگِ خیبر میں جب مرحب نے مسلمانوں کو مقابلے کے لیے للکارا تو عامرؓ بن اکوع یہ رجز پڑھتے ہوئے اس کے مقابل ہوئے۔

قد علمت خیبر انی عامر　　　شاکی السلاح بطل مغامر

"خیبر جانتا ہے میں عامر ہوں، ہتھیاروں سے لیس اور خطرات میں گھس جانے والا بہادر ہوں۔"

ان دونوں میں تلوار کے دو دو ہاتھ ہوئے۔ مرحب کی تلوار عامرؓ کی ڈھال میں گھس گئی جس سے ان کی رگِ اکحل کٹ گئی اور وہ شہید ہو گئے۔ میں نے چند صحابہ کو یہ کہتے سنا حبط عَمَلُهٗ اس کا عمل رائیگاں گیا۔ (انھوں نے خودکشی کر لی) یہ سن کر میں روتا ہوا حضورؐ کی خامت میں حاضر ہوا، آپؐ نے پوچھا، تجھے کیا ہوا، میں نے عرض کیا کہ لوگ کہتے ہیں کہ عامرؓ کا عمل باطل ہو گیا۔ آپؐ نے فرمایا، یہ کس نے کہا؟ میں نے عرض کیا آپؐ کے اصحاب میں سے چند صحابہ نے۔ آپؐ نے فرمایا، ان لوگوں نے غلط کہا بلکہ عامر کے لیے دوہرا اجر ہے۔

اس واقعہ کے بعد رسول اللہؐ نے حضرت علیؓ کو بلا بھیجا اور فرمایا کہ آج میں ایسے آدمی کو جھنڈا دوں گا جو اللہ اور اس کے رسولؐ کو دوست رکھتا ہے۔ حضرت علیؓ اس وقت آشوبِ چشم میں مبتلا تھے میں ان کو سہارا دے کر حضورؐ کی خدمت میں لایا۔ آپؐ نے اپنا لعابِ دہن ان کی آنکھ میں

لگایا اور انھیں فی الفور شفا ہوگئی۔ پھر حضورؐ نے جھنڈا انھیں مرحمت فرمایا۔ وہ مرحب کے مقابلے پر نکلے اور اس کو قتل کر ڈالا۔ اس طرح خیبر فتح ہوگیا۔(۱)

(۵)

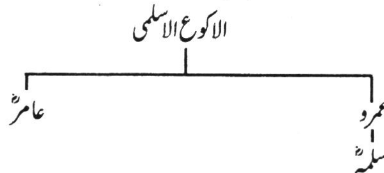
۷ھ میں رسولِ اکرم ﷺ کو اطلاع ملی کہ بنو کلاب کے لوگ سرکشی اور بغاوت پر آمادہ ہیں۔ حضورؐ نے حضرت ابو بکر صدیقؓ کو فوج کا ایک دستہ دے کر ان لوگوں کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا۔ اس دستے میں حضرت سلمہؓ بن اکوع بھی شامل تھے۔ علامہ ابنِ سعدؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کا بیان ہے کہ حضرت سلمہؓ نے اس سریّہ میں غیر معمولی شجاعت دکھائی اور تنِ تنہا سات خانوادوں کو قتل کیا اور جن لوگوں نے راہِ فرار اختیار کی ان کی عورتوں کو گرفتار کرلیا۔ ان میں ایک نہایت خوب صورت عورت تھی۔ حضرت ابو بکرؓ نے اُسے حضرت سلمہؓ کو دے دیا۔ (صحیح مسلم اور ابو داؤد میں ہے کہ یہ عورت حضرت سلمہؓ کے حصّہ میں آئی) بنو کلاب کی سرکوبی کے بعد جب مجاہدین واپس مدینہ پہنچے تو حضورؐ نے باصرار اس عورت کو حضرت سلمہؓ سے مانگ لیا اور پھر اسے مکہ بھیج کر اس کے بدلے کئی مسلمان قیدیوں کو رہا کرایا۔

علامہ ابن سعدؒ کہتے ہیں کہ حضرت ابو سلمہؓ نے اس عورت کو اپنے قبضہ میں ہونے کے باوجود ہاتھ تک نہ لگایا اور جب حضورؐ نے ایک دینی مقصد کی خاطر یہ عورت ان سے مانگی تو انھوں نے اس کو آزاد کر دیا۔ یہ واقعہ حضرت سلمہؓ کے زہد و وَرَع اور اطاعتِ رسولؐ کا منھ بولتا ثبوت ہے۔

۸ھ میں فتح مکّہ کے بعد حنین اور طائف کے معرکے پیش آئے۔ حضرت سلمہؓ نے ان

---

(۱) خیبر سے متعلق ایک روایت میں حضرت سلمہؓ نے حضرت عامرؓ کو اپنا چچا کہا ہے اور دوسری روایت میں اپنا بھائی کہا ہے۔ مولوی حکیم رحمان علی مرحوم نے اپنی کتاب ''المشاہد'' میں لکھا ہے کہ ان دونوں روایتوں میں اس طرح تطبیق ہوسکتی ہے کہ عامرؓ سلمہؓ کے برادرِ مادری قرار دیے جائیں یعنی اکوع نے زوجہ عمرو مادرِ سلمہؓ سے نکاح کرلیا ہو۔ جیسا کہ زمانۂ جاہلیت میں رائج تھا۔ یا یہ کہ سلمہؓ اور عامرؓ نے ایک ہی عورت کا دودھ پیا ہو۔ بہ صورتِ اوّل عامرؓ سلمہؓ کے چچا اور بہ صورتِ دوم بھائی ہوسکتے ہیں۔ شجرۂ نسب یہ ہے:



اگر اکوع نے بہ موجب رواجِ جاہلیت عمرو کی زوجہ یعنی مادرِ سلمہؓ سے نکاح کرلیا اور اس کے بطن سے عامرؓ پیدا ہوئے تو دونوں برادرِ مادری ہوئے اور چچا ہونا عامرؓ کا شجرہ سے ظاہر ہے واللہ اعلم۔ (المشاہد)

میں بھی اپنی تلوار کے جوہر دکھائے۔ صحیح مسلم میں حضرت سلمہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس مشرکین کا ایک جاسوس آیا۔ آپؐ اس وقت اپنی قیام گاہ میں تشریف نہیں رکھتے تھے۔ وہ صحابہ کے پاس بیٹھ کر باتیں کرتا رہا اور پھر چلا گیا۔ جب آپؐ تشریف لائے تو فرمایا اس شخص کو تلاش کرو اور قتل کر دو۔ میں نے اس کو پالیا اور قتل کر دیا، آپؐ نے پوچھا اس شخص کو کس نے قتل کیا؟ لوگوں نے کہا، سلمہؓ بن اکوع نے۔ آپؐ نے فرمایا اس کا سارا مال اسباب اسی کے لیے ہے۔

اس روایت میں یہ بیان نہیں کیا گیا کہ یہ واقعہ کس موقع پر پیش آیا لیکن مسند احمد بن حنبل میں صراحت کے ساتھ مذکور ہے کہ یہ واقعہ غزوۂ ثقیف وہوازن (حنین) کے موقع پر پیش آیا۔ اس میں بیان کیا گیا ہے کہ ایک شتر سوار مسلمانوں کے لشکر میں آیا اور کھانے میں شریک ہو گیا اس دوران میں وہ متجسسانہ نظر سے مسلمانوں کے لشکر کا جائزہ لیتا رہا۔ جب وہ چلا گیا تو مسلمانوں کو شبہ ہوا کہ وہ جاسوس تھا۔ حضرت سلمہؓ نے برق رفتاری سے اس کا تعاقب کیا اور راستے میں ہی اس کو جالیا۔ پھر اس کے اونٹ کی مہار پکڑ کر بٹھالیا اور اپنی تلوار کے ایک بھرپور وار سے اس کا سر اڑا دیا۔ پھر اس کی سواری اور دوسرے سامان پر قبضہ کر لیا۔ حضورؐ نے دیکھا تو پوچھا اس کو کس نے مارا ہے؟ لوگوں نے کہا سلمہؓ نے۔ آپؐ نے فرمایا تو اس کا سب سامان سلمہؓ کا ہے۔

حضرت سلمہؓ کے شوق جہاد کا یہ عالم تھا کہ مدینہ آنے کے بعد بہت کم غزوے ایسے ہوں گے جن میں وہ شریک نہ ہوئے ہوں۔ صحیح بخاری میں خود حضرت سلمہؓ بن اکوع سے روایت ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سات لڑائیوں میں شریک ہوا اور وہ لشکر جو نبی ﷺ روانہ کیا کرتے تھے میں ان میں نو لڑائیوں میں شریک ہوا۔

اس طرح عہدِ رسالت میں جن غزوات وسرایا میں حضرت سلمہؓ شریک ہوئے ان کی مجموعی تعداد سولہ ہوتی ہے۔ جن غزوات میں ان کو رحمتِ عالم ﷺ کی ہم رکابی کا شرف حاصل ہوا ان میں سے ''ذی قردہ'' یا ''غابہ'' خیبر اور حنین کا نام اہلِ سیَر نے خصوصیت کے ساتھ لیا ہے۔ قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے علاوہ انھیں جن غزوات میں حضورؐ کے ساتھ شریک ہونے کی سعادت نصیب ہوئی وہ یہ تھے:

۱- غزوۂ وادی القریٰ یا غزوۂ ذات الرقاع (محرم ۷ھ)
۲- غزوۂ فتح مکہ (۸ھ)
۳- غزوۂ طائف (۸ھ)
۴- غزوۂ تبوک (۹ھ)

(۶)

رحمتِ عالم ﷺ کے وصال کے بعد حضرت سلمہؓ بن اکوع بالاستقلال مدینہ منوّرہ میں مقیم رہے۔ لیکن جب امیر المومنین حضرت عثمانؓ شہید ہوئے تو ان کو اس قدر صدمہ پہنچا کہ مدینہ منوّرہ کی سکونت ترک کر کے ربذہ میں جا بسے۔ وہاں ایک خاتون سے شادی کی، جس سے چند اولادیں ہوئیں۔ ۷۴ھ میں مدینہ منوّرہ واپس آئے اور چند دن بعد وفات پائی۔

صحیح بخاری میں یزید بن ابی عبیدہؒ سے روایت ہے کہ جب عثمانؓ بن عفان شہید ہوئے سلمہؓ بن اکوع ربذہ چلے گئے وہاں ایک عورت سے شادی کی اور چند اولادیں ہوئیں۔ وہ برابر وہیں مقیم رہے یہاں تک کہ وفات سے چند روز قبل مدینہ آئے اور مدینہ میں انتقال فرمایا۔

(بخاری کتاب الفتن)

حضرت سلمہؓ بن اکوع کا شمار فضلائے صحابہ میں ہوتا ہے۔ ان سے ۷۷ احادیث مروی ہیں۔ ان میں ۱۶ متفق علیہ ہیں۔ ۹ میں مسلم اور ۵ میں بخاری منفرد ہیں۔ ان کے راویوں میں ایاس بن سلمہؓ بن اکوع، محمدؒ بن حنفیہ، عبدالرحمٰن بن عبداللہ اور یزید بن ابی عبیدؒ شامل ہیں۔

حضرت سلمہؓ عہدِ رسالت کے بعض واقعات جو ان کی آنکھوں کے سامنے گزرے، بڑے لطف و انبساط کے ساتھ بیان کیا کرتے تھے۔ صحیح بخاری میں ان سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھے تھے کہ ایک جنازہ لایا گیا اور آپؐ سے عرض کیا گیا اس کی نماز پڑھ دیجیے۔ آپؐ نے فرمایا، ''اس پر کچھ قرض تو نہیں؟'' لوگوں نے عرض کیا، نہیں۔ پھر فرمایا، ''کچھ چھوڑ بھی مرا ہے؟'' عرض کیا گیا نہیں۔ آپؐ نے اس پر نماز پڑھی۔ تھوڑی دیر بعد ایک اور جنازہ لایا گیا اور لوگوں نے حضوؐر سے نماز پڑھنے کی درخواست کی۔ آپؐ نے پوچھا، ''اس پر کچھ قرض تو نہیں۔'' عرض کیا گیا ہاں ہے۔ فرمایا کچھ چھوڑ مرا ہے، عرض کیا گیا، تین دینار۔ آپؐ نے اس کی بھی نماز جنازہ پڑھی۔ پھر تیسرا جنازہ لایا گیا اور حضوؐر سے نماز پڑھنے کے لیے عرض کیا گیا۔ آپ نے دریافت فرمایا کیا یہ کچھ چھوڑ مرا ہے۔ عرض کیا گیا، نہیں، فرمایا اس پر کچھ قرض ہے۔ عرض کیا گیا ''تین دینار۔'' فرمایا تم لوگ اپنے آدمی پر نماز پڑھو (میں نہیں پڑھوں گا) ابو قتادہؓ نے عرض کیا، یا رسول اللہؐ اس پر جو قرض ہے وہ میں اپنے ذمہ لیتا ہوں آپؐ نماز پڑھیں تو آپؐ نے اس کی نماز پڑھی۔

صحیح مسلم میں حضرت سلمہؓ بن اکوع سے روایت ہے کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کے سامنے بائیں ہاتھ سے کھانا کھاتا تھا۔ آپؐ نے اس سے فرمایا دائیں ہاتھ سے کھا۔ اس نے کہا میں داہنے ہاتھ سے کھانا کھانے کی طاقت نہیں رکھتا۔ آپؐ نے فرمایا'' خدا کرے تجھے طاقت نہ ہو۔۔۔''میں (سلمہؓ) نے دیکھا کہ وہ شخص داہنے ہاتھ کو اپنے منہ تک نہ اٹھا سکا (اس کا داہنا ہاتھ شل ہو گیا)۔

حضرت سلمہؓ سے مروی کئی احادیث بعض اہم دینی مسائل اور اخلاق سے متعلق ہیں مثلاً صحیحین کی ایک روایت میں حضرت سلمہؓ بن اکوع کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے جو شخص قربانی کرے وہ اس کا گوشت تین دن سے زیادہ نہ رکھے۔ پھر دوسرا سال آیا تو ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا ہم اس سال بھی گزشتہ سال کی طرح عمل کریں۔ آپؐ نے فرمایا نہیں، کھاؤ کھلاؤ، پچھلے سال تو میں نے اس لیے منع کر دیا تھا کہ وہ محنت مشقت افلاس (احتیاج) کا سال تھا، میں نے مناسب سمجھا کہ اس طرح تم غریبوں کی مدد کر سکو گے (اور گوشت تقسیم کر دو گے)

صحیح مسلم میں حضرت سلمہؓ بن الاکوع سے روایت ہے کہ ہم نبی ﷺ کے ساتھ دن ڈھلے ہی جمعہ ادا کر لیتے پھر لوٹتے تو سایہ کی تلاش کرتے۔ ابو داؤد اور نسائی نے حضرت سلمہؓ بن الاکوع سے روایت کی ہے کہ میں نے نبی ﷺ سے عرض کیا، یا رسول اللہ میں ایک شکاری آدمی ہوں، کیا میں ایک ہی کرتے میں نماز پڑھ لوں، آپؐ نے فرمایا۔'' ہاں مگر اس میں گھنڈی یا ٹانکا لگا لے اگرچہ کانٹے کا ٹانکا ہو۔ صحیح مسلم کی ایک روایت میں حضرت سلمہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص مسلمانوں پر تلوار اٹھائے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ ترمذی میں حضرت سلمہؓ بن اکوع سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ آدمی اپنی بڑائی کے زعم میں بڑھا چلا جاتا ہے اور آخر اس کو بھی وہی سزا ملتی ہے جو دوسرے متکبروں کو ملی۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلمہؓ بن اکوع اپنے علم و فضل کی بنا پر لوگوں میں بڑی عزت واحترام کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے اور صاحبِ افتاء صحابہ میں شمار ہوتے تھے۔ علامہ ابنِ سعدؒ نے زیاد بن میناء سے روایت کی ہے کہ سلمہؓ بن اکوع، ابن عباسؓ، ابن عمرؓ، ابو سعید خدریؓ، ابو ہریرہؓ، عبداللہ بن عمروؓ بن عاص، جابر بن عبداللہؓ، رافعؓ بن خدیج، ابو واقد لیثیؓ اور ان جیسے کچھ دوسرے صحابہؓ مدینہ میں فتویٰ دیا کرتے تھے اور حضورؐ کی حدیثیں بیان کرتے تھے۔

(۷)

حضرت سلمہؓ بن اکوع کے مصحفِ اخلاق میں اطاعتِ رسول، غیرتِ دینی، زہد و اِتقاء، شوقِ جہاد، جود و سخا اور ایثار سب سے روشن ابواب ہیں، سنتِ نبوی کی پیروی کے شوق نے ان کی طرزِ زندگی میں ایک گونہ رسولِ اکرم ﷺ کے مکارم و محامد کی جھلک پیدا کر دی تھی، جس طرح خاندانِ رسالت کے لیے صدقہ لینا جائز نہیں تھا وہ بھی اپنی ذات کے لیے صدقہ کا مال حرام سمجھتے تھے۔ اگر کسی چیز کے بارے میں انھیں شک ہوتا کہ اس میں صدقہ کا رائی برابر حصہ بھی ہے تو اس کو ہرگز استعمال نہ کرتے یہاں تک کہ اپنی صدقہ کی ہوئی چیز کو دوبارہ بہ قیمت خریدنا بھی جائز نہیں سمجھتے تھے، جن کاموں کی اللہ اور اس کے رسولؐ نے ممانعت فرمائی ہے ان سے ہر قیمت پر اپنا دامن بچاتے تھے۔ حتیٰ کہ بچوں کو بازی لگا کر کھیلنے سے بھی منع کرتے تھے۔ کہ شاید اس میں جوئے کی مشابہت ہو۔

علامہ ابنِ سعدؒ کا بیان ہے کہ حضرت سلمہؓ نہایت فیّاض اور دریا دل تھے۔ جو شخص ان سے خدا کا واسطہ دے کر سوال کرتا اس کو کبھی خالی ہاتھ نہ جانے دیتے۔ فرماتے تھے کہ اگر آدمی خدا کی راہ میں نہ دے گا تو پھر کس میں دے گا۔ تاہم خدا کا واسطہ دے کر سوال کرنے کو معیوب سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ آدمی سادہ طریقے سے اپنی احتیاج بیان کرے، صاحبِ استطاعت اگر اس کی احتیاج پوری کرے گا تو وہ خدا کے حکم کے مطابق ہی کرے گا۔ خدا کا واسطہ ڈالنے کی کیا ضرورت ہے۔

غیرتِ دینی اور حضور پُر نور سے محبت کی یہ کیفیت تھی کہ آپؐ کے بارے میں کوئی ناگوار بات سُن کر تڑپ اٹھتے تھے۔ فزاری لٹیروں نے آپؐ کی اونٹنیوں پر ڈاکہ ڈالا تو حضرت سلمہؓ تن تنہا مسلح ڈاکوؤں کی ایک بڑی جماعت سے بھڑ گئے۔ اور اپنی قوتِ ایمانی کی بہ دولت اِن سب کو آگے لگا لیا۔

فی الحقیقت حضرت سلمہؓ بن اکوع ملتِ اسلامیہ کے وہ فرزندِ جلیل ہیں جن کے کارناموں سے تاریخ اسلام کے اوراق ہمیشہ جگمگاتے رہیں گے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

حضرت عمرو بن عبسہؓ

(۱)

بعثت کے چوتھے سال جب رحمتِ عالم ﷺ نے علانیہ تبلیغِ حق کا آغاز فرمایا تو مشرکینِ قریش کے غیظ وغضب کا آتش فشاں پوری قوّت سے پھٹ پڑا۔ یہ وہی لوگ تھے جو آوازِ حق سننے سے قبل حضورؐ کی صداقت، امانت اور اخلاقِ عالیہ کے دل سے معترف اور مدّاح تھے لیکن وائے بدبختی کہ جب وہ بھلائی کی طرف بلائے گئے تو خیر الخلائق ﷺ کے خون کے پیاسے ہوگئے۔ انھوں نے نہ آپؐ کو ستانے میں کوئی کسر اٹھا رکھی اور نہ آپؐ کے نام لیواؤں کی ایذا رسانی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت کیا لیکن آفرین ہے اللہ کے ان پاک باز ترین بندوں پر کہ ہر قسم کے مصائب اور خطرات کے علی الرغم جادۂ حق پر بے مثال استقلال اور استقامت کے ساتھ گام زن رہے۔ اسی پُر آشوب زمانے میں رحمتِ عالم ﷺ ایک مرتبہ حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت بلالؓ بن رباح کی معیت میں تبلیغ حق کے لیے بازارِ عُکاظ میں تشریف لے گئے جہاں ہر سال عرب کے کونے کونے سے لوگ آتے تھے اور یہ بازار ایک عظیم قومی میلے کی حیثیت اختیار کر جاتا تھا۔ ہادیِ برحق ﷺ نے میلے میں شریک لوگوں کو دعوتِ توحید دینی شروع کی تو مشرکین کا ایک جمِ غفیر آپ کے گرد جمع ہو گیا اور آپؐ کا مضحکہ اڑانا شروع کر دیا۔ میلے میں قبیلہ بنو سلیم کا ایک نیک فطرت بدوی بھی موجود تھا۔ اس نے کفّار کی بدتمیزی کے مقابلے میں حضورؐ کی تبلیغ کا انداز اور آپؐ کا صبر وتحمل دیکھا تو بے حد متاثر ہوا۔ جب ذرا تخلیہ ہوا اور کفار پرے چلے گئے تو وہ آپؐ کے قریب پہنچا اور آپؐ کی دعوت کی تفصیل جاننے کا اشتیاق ظاہر کیا اس موقع پر سرورِ عالمؐ اور اس بدوی کے درمیان یہ گفتگو ہوئی۔

بدوی: آپؐ کون ہیں؟

رسولِ اکرمؐ: میں اللہ کا نبی ہوں۔

بدوی: نبی کس کو کہتے ہیں؟

رسولِ اکرمؐ: اللہ کی طرف سے پیغام لانے والے کو۔

بدوی: کیا واقعی آپ کو اللہ نے بھیجا ہے؟

رسولِ اکرمؐ: ہاں مجھ کو اللہ تعالیٰ نے نبوّت عطا فرمائی ہے۔

بدوی: آپؐ کی دعوت کیا ہے؟

رسولِ اکرمؐ: اللہ کو ایک مانا جائے، کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرایا جائے۔ بتوں کی پرستش نہ کی جائے۔ قرابت داروں سے محبت کی جائے اور ان سے اچھا سلوک اور برتاؤ کیا جائے۔

بدوی: کوئی شخص آپ پر ایمان بھی لایا ہے؟

رسولِ اکرمؐ: (حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت بلالؓ کی طرف اشارہ کر کے) یہ دونوں، ایک آزاد اور ایک غلام، مجھ پر ایمان لا چکے ہیں۔

بدوی: اسلام کیا ہے؟

رسولِ اکرمؐ: ہر شخص کے ساتھ خوش خلقی سے پیش آنا اور مساکین کو کھانا کھلانا اسلام ہے۔

بدوی: اور ایمان؟

رسولِ اکرمؐ: خدا کی راہ میں صبر و رضا کا نام ایمان ہے۔

بدوی: اسلام کا اعلیٰ درجہ کیا ہے؟

رسولِ اکرمؐ: دوسروں کو زبان سے بُرا بھلا کہے اور نہ کسی کو بدنی تکلیف پہنچائے۔

بدوی: ایمان کا اعلیٰ درجہ کیا ہے؟

رسولِ اکرمؐ: حسنِ کردار سے ایمان میں رفعت پیدا ہوتی ہے۔

بدوی: اے اللہ کے نبی میں بھی آپؐ پر ایمان لاتا ہوں، خدا کی وحدانیت کا اقرار کرتا ہوں، بتوں کی پرستش سے انکار کرتا ہوں اور قرابت داروں سے حسنِ سلوک میری زندگی کا لائحۂ عمل ہوگا۔

رسولِ اکرمؐ: اے بھائی آج کل ہم لوگ جن مظالم کا ہدف بنے ہوئے ہیں، ان کا برداشت

کرنا تمہاری طاقت سے باہر ہے۔ فی الحال تم اپنے وطن واپس چلے جاؤ۔
جب سنو کہ مجھے غلبہ ہو گیا تو اس وقت جہاں میرا قیام ہو وہاں آ جانا۔"

بدوی حضورؐ کے ارشاد کی تعمیل میں اپنے وطن کو لوٹ گیا لیکن وہ خالی ہاتھ نہیں گیا۔ اس نے اپنی جھولی دین و دنیا کی نعمتوں سے بھر لی تھی، وہ نہ صرف اسلام کی نعمتِ عظمیٰ سے بہرہ یاب ہو چکا تھا بلکہ اس نے سیّد المرسلینؐ کے ارشاداتِ عالیہ کو بھی اپنے دل و دماغ میں محفوظ کر لیا تھا اور زندگی بھر ان پر کار بند رہنے کا عہد کر لیا تھا۔ بنو سلیم کے یہ خوش بخت بدوی حضرت عمروؓ بن عبسہ تھے، گھر سے نکلے تو خالی ہاتھ تھے، واپس گئے تو تقدیر بدل چکی تھی اور دولتِ ایمان سے مالا مال تھے ؎

ایں سعادت بہ زورِ بازو نیست　　تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

(۲)

حضرت ابو نجیح عمروؓ بن عبسہ (بن عامر بن خالد بن غاضرہ بن عتاب بن امرؤ القیس) کا شمار ان معدودے چند صحابہ کرامؓ میں ہوتا ہے جو زمانۂ جاہلیت میں بھی اللہ تعالیٰ کو وحدہٗ لاشریک جانتے تھے، بت پرستی سے انکار کرتے تھے اور دینِ ابراہیمی کی پیروی کرنا چاہتے تھے۔ ایسے اصحاب کو تاریخ میں حنفا کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ حضرت عمروؓ کی والدہ کا نام رملہ بن دقیعہ تھا۔ مستدرک حاکم کی ایک روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ جلیل القدر صحابی حضرت ابو ذر غفاریؓ بھی انھی کے بطن سے تھے۔ اس رشتہ سے حضرت عمروؓ بن عبسہ، حضرت ابو ذر غفاریؓ کے ماں جائے (اخیافی) بھائی تھے۔

حافظ ابنِ حجر عسقلانیؒ نے اِصابہ میں خود حضرت عمروؓ بن عبسہ سے روایت کی ہے کہ ہوش سنبھالتے ہی میں نے بتوں کی پرستش کا جوا گردن سے اتار پھینکا کیوں کہ میرے دل میں یہ بات ڈال دی گئی تھی کہ یہ بُت کسی کو نفع یا نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ میں اس زمانے میں بُت پرستوں کو سراسر گمراہی میں مبتلا خیال کرتا تھا۔ اسی دوران میں ایک اہلِ کتاب سے میری ملاقات ہوئی۔ اس نے مجھے بتایا کہ ہمارے نوشتوں کے مطابق سرزمینِ مکّہ سے ایک ایسے شخص کا ظہور ہونے کو ہے جو لوگوں کو بتوں کی پرستش سے منع کرے گا اور ایک اَن دیکھے معبود کی پرستش کی دعوت دے گا اور اس کی شریعت تمام شریعتوں سے افضل ہو گی ـــــ یہ سن کر میں ہر وقت اس انتظار میں رہنے لگا کہ کب مجھے ایسے شخص کے ظہور کی اطلاع ملتی ہے۔ چناں چہ جو شخص مکّہ سے

آتا میں اس سے وہاں کے تازہ حالات دریافت کرتا۔ ایک دن مکّہ سے آنے والے ایک شخص نے مجھے بتایا کہ مکّہ میں ایک شخص ظاہر ہوا ہے جو لوگوں کو بتوں کی پوجا سے منع کرتا ہے اور خدائے واحد پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے۔ اس کے عمدہ طور طریقوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک اچھے دین کا داعی ہے۔

یہ اطلاع ملتے ہی میں اپنی سانڈنی پر سوار ہو کر مکّہ پہنچا اور بازارِ عکاظ میں جا کر رسولِ اکرمؐ کی خدمت میں پہنچ کر کچھ سوالات پوچھے۔ جب مجھے خاطر خواہ جواب ملا تو میں نے اسلام قبول کر لیا پھر رسولِ اکرمؐ نے مجھے اپنے وطن واپس جانے کا حکم دیا۔ (اس واقعہ کی تفصیل اوپر بیان کی جا چکی ہے)

ایک روایت میں حضرت عمروؓ بن عبسہ نے اپنے آپ کو چوتھا مسلمان بتایا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ جس وقت وہ مشرف بہ اسلام ہوئے سرورِ عالم ﷺ کی خدمت میں صرف دو مسلمان حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت بلال حبشیؓ حاضر تھے۔ حضرت عمروؓ کو دوسرے مسلمانوں کا علم نہیں تھا، اس لیے وہ اپنے آپ کو چوتھا مسلمان سمجھے ورنہ اس وقت تک اور بھی متعدد سعید الفطرت اصحاب دائرۂ اسلام میں داخل ہو چکے تھے۔

علّامہ ابنِ سعدؒ کا بیان ہے کہ اس موقع پر رسولِ اکرم ﷺ نے دوسری باتوں کے علاوہ حضرت عمروؓ بن عبسہ کو یہ تلقین بھی فرمائی کہ قتلِ ناحق سے بچا جائے اور راستوں میں امن رکھا جائے (لوٹ مار نہ کی جائے)۔

سِیَر الصحابہ جلد سوم (مہاجرین جلد ۲) میں مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم نے لکھا ہے کہ حضرت عمروؓ بن عبسہ پہلے پہل رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں اس وقت (خفیہ طور پر) حاضر ہوئے جب آپؐ مشرکین کی معاندانہ روش کے باعث علی الاعلان دعوتِ اسلام نہیں کرتے تھے۔ لیکن درایت کی رُو سے یہ روایت محلِ نظر ہے کیوں کہ مشرکین قریش نے مخالفت کا طوفان اسی وقت اٹھایا جب آپؐ نے علانیہ دعوتِ حق کا آغاز فرمایا۔ تمام اہلِ سِیَر اس بات پر متفق ہیں کہ رحمتِ عالم ﷺ نے نبوّت کے چوتھے سال کے آغاز میں دعوتِ حق کو عام لوگوں پر آشکارا کیا۔ اس سے پہلے تین سال کے دوران میں آپ نہایت رازداری کے ساتھ فریضۂ تبلیغ ادا فرماتے رہے۔ برملا تبلیغِ حق کے بعد ہی کفّار آپؐ کے درپے آزار ہوئے، آہستہ آہستہ مکّہ کے

مضافات اور عرب کے دوسرے علاقوں کے لوگوں کو بھی آپؐ کی دعوت کا علم ہوگیا اور آپ سارے عرب میں ''صاحبِ قریش'' کے لقب سے مشہور ہو گئے۔ حافظ ابنِ حجرؒ نے اصابہ میں عمروؓ بن عبسہ کے قبول اسلام کے بارے میں جو روایت بیان کی ہے۔ اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ اس وقت حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے جب آپؐ علانیہ دعوتِ حق کا آغاز فرما چکے تھے اور اہلِ حق مشرکین کے جور وستم کا نشانہ بنے ہوئے تھے۔

(۳)

سعادت اندوزِ اسلام ہونے کے بعد حضرت عمروؓ بن عبسہ سالہا سال تک اپنے وطن میں مقیم رہے۔ اس اثنا میں رحمتِ عالم ﷺ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئے، بدر، اُحد، احزاب اور خیبر کے معرکے گزر چکے، فتح مکّہ سے کچھ عرصہ پہلے مدینہ منورہ کے چند لوگوں کا حضرت عمروؓ بن عبسہ کی صحرائی بستی سے گزر ہوا۔ حضرت عمروؓ نے ان سے دریافت کیا کہ مکّہ سے جو صاحب تمہارے یہاں آئے ہیں ان کا کیا حال ہے؟

انھوں نے کہا، ان کی قوم نے تو ان کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا تھا مگر وہ اس میں کام یاب نہ ہوسکی، اللہ نے ان کی مدد کی اور وہ بہ خیریت مدینہ آگئے، اب ہم ان کو اس حال میں چھوڑ کر آئے ہیں کہ لوگ انبوہ در انبوہ ان کی طرف لپک رہے ہیں۔

حضرت عمروؓ یہ خبر سنتے ہی بے تاب ہوگئے اور فوراً اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر مدینہ روانہ ہوگئے۔ مدینہ پہنچ کر اونٹنی کو کسی جگہ باندھ کر سیدھے رحمتِ عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ نہایت ادب سے سلام کیا اور پھر عرض کیا:

''یارسول اللہؐ کیا آپ مجھ کو پہچانتے ہیں؟''

حضورؐ نے فرمایا: ''ہاں، تم وہی ہو نا جو چند سال پہلے مجھ سے مکّہ میں ملے تھے اور میری رسالت کی تصدیق کی تھی۔''

حضرت عمروؓ نے عرض کیا۔ ''بے شک یارسول اللہ میں وہی ہوں۔''

حافظ ابن حجرؒ نے اصابہ میں لکھا ہے کہ اپنا تعارف کرانے کے بعد حضرت عمروؓ بن عبسہ نے رسولِ اکرم ﷺ سے درخواست کی کہ:

''یارسول اللہ وہ قرآن مجھے بھی پڑھایئے جو آپ پر نازل ہوا ہے۔''

علاّمہ ابنِ سعدؒ کا بیان ہے کہ اس موقع پر حضرت عمروؓ نے حضورؐ کی خدمت میں عرض کیا:

یا رسول الله علمنی ما علمک الله

''اے اللہ کے رسول! آپ کو اللہ نے جو علم دیا ہے وہ تھوڑا مجھے بھی سکھایئے۔''

صحیح مسلم کی روایت کے مطابق حضرت عمروؓ بن عبسہ کے مدینہ آنے کے بعد رسول اللہؐ نے فتح مکّہ کا عزم فرمایا۔ اس موقع پر حضرت عمروؓ کو اس دس ہزار مردانِ حق میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہوا جو رحمتِ عالم ﷺ کے ہم رکاب تھے اور جن کو کتاب استثناء کی پیش گوئی میں قدوسی کہہ کر پکارا گیا تھا۔

فتح مکّہ کے بعد جس غزوہ میں حضرت عمروؓ بن عبسہ کی نمایاں شرکت کا ثبوت ملتا ہے وہ غزوۂ طائف ہے۔ مسند احمد بن حنبل میں خود حضرت عمروؓ بن عبسہ سے روایت ہے کہ محاصرہ کے دوران میں رسول اللہ ﷺ نے مسلمانان سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ ''جو شخص اللہ کی راہ میں ایک تیر چلائے گا اس کے لیے جنت میں ایک دروازہ کھل جائے گا۔'' حضورؐ کا ارشاد سن کر میں نے یکے بعد دیگرے سولہ تیر چلائے۔

سیر الصحابہ میں شاہ معین الدین احمد ندویؒ نے لکھا ہے کہ طائف کے علاوہ کسی اور غزوہ میں حضرت عمروؓ بن عبسہ کی شرکت متعین طور پر نہیں بتائی جا سکتی۔ لیکن اس قدر معلوم ہے کہ اس کے بعد بھی بعض غزوات میں شرکت کا شرف حاصل کیا۔

حضرت عمروؓ بن عبسہ فتح مکہ (رمضان ۸ھ) سے کچھ ہی پہلے مدینہ منورہ آئے تھے، ۱۱ھ میں رحمتِ عالم ﷺ وصال فرما گئے اس لیے حضرت عمروؓ کو فیضانِ نبوی سے بہرہ یاب ہونے کا زیادہ موقع نہ مل سکا۔ تاہم اپنی فطرتِ سلیم اور علمِ دین کی تحصیل کے شوق کی بہ دولت انھوں نے بہت کچھ حاصل کرلیا۔ چناں چہ ان سے ۱۴۸ احادیث مروی ہیں اور وہ راویانِ حدیث صحابہ کے طبقۂ چہارم میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کے رواۃ میں حضرت عبد اللہ بن مسعود اور حضرت ابو امامہؓ باہلیؓ جیسے اساطینِ امت بھی شامل ہیں۔

ایک روایت سے، جسے حافظ ابنِ حجر اور ابو نعیمؒ دونوں نے بیان کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اپنے زہد و اتقاء اور اتباعِ رسولؐ کی برکت سے حضرت عمروؓ بن عبسہ مقبولانِ بارگاہ الٰہی میں شامل ہو گئے تھے، یہ روایت حضرت کعبؓ کے غلام کی زبانی مروی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

''ہم حضرت مقدادؓ بن اسود، شافعؓ بن حبیب ہذلی اور عمروؓ بن عبسہ کے ساتھ کہیں جارہے تھے۔ اثنائے سفر میں ایک دن حضرت عمرو بن عبسہ جانوروں کو چرانے کے لیے جنگل کی طرف نکل گئے۔ میں دوپہر کو ان کی تلاش کے لیے گیا تو دیکھا کہ وہ (ایک کھلی جگہ) سوئے ہوئے ہیں اور ایک ابر نے ان پر سایہ ڈال رکھا ہے۔ میں نے انھیں بیدار کیا تو انھوں نے کہا کہ بھائی جو کچھ تو نے دیکھا تجھ کو قسم ہے کہ کسی دوسرے کو نہ بتانا۔ پس خدا کی قسم جب تک وہ فوت نہ ہو گئے میں نے یہ بات کسی سے نہ کہی۔''

(۵)

حضرت عمروؓ بن عبسہ بارگاہِ نبوتؐ میں اپنے مشاہدات اور حضورؐ کے ارشادات بڑے لطف و انبساط کے ساتھ لوگوں کو بتایا کرتے تھے۔ ہم یہاں ان سے مروی صرف دو احادیث تبرکاً بیان کریں گے۔

مسند احمد بن حنبلؒ میں حضرت عمروؓ بن عبسہ سے روایت ہے کہ ایک شخص رسولِ اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور دریافت کیا:

''یارسول اللہؐ اسلام کیا چیز ہے؟''

آپؐ نے فرمایا:

''اسلام یہ ہے کہ تیرا دل اللہ تعالیٰ کے سامنے جھک جائے اور تیری زبان اور ہاتھ سے کسی مسلمان کو آزار نہ پہنچے۔''

پھر اس نے پوچھا:

''اسلام کا سب سے بہتر جزو کیا ہے؟''

آپؐ نے فرمایا: ''ایمان''

اس نے پوچھا: ''ایمان کیا چیز ہے؟''

آپؐ نے فرمایا:

''ایمان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں اور اس کے اصولوں کو دل سے مانے اور مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھنے پر یقین رکھے۔''

اس نے پوچھا: ''اچھا، ایمان میں بہتر کیا ہے؟

آپؐ نے فرمایا: ''ہجرت''
اس نے عرض کیا: ''ہجرت سے کیا مراد ہے؟''
آپؐ نے فرمایا: ''یہ کہ تو برائیاں ترک کر دے۔''
اس نے پوچھا: ''اچھا تو سب سے بہتر ہجرت کون سی ہے؟''
آپؐ نے فرمایا: ''جہاد کرنا اور کافروں کے خلاف جان توڑ کر لڑنا۔''
اس نے پوچھا: ''اچھا تو جہاد کون سا افضل ہے؟''
آپؐ نے فرمایا: ''اس شخص کا جہاد جس کا گھوڑا زخمی ہو جاے اور خود اس کا خون بھی بہہ جائے۔''

ایک روایت کے مطابق اس ارشاد میں آپؐ نے یہ اضافہ بھی فرمایا کہ:

''اس کے بعد دو کام اور ہیں جو سب سے عمدہ ہیں مگر ہاں وہ شخص جو یہی کام کرے ایک حج جس میں جنایت نہ ہو (جس میں کوئی گناہ سرزد نہ ہو) دوم عمرہ کرنا۔''

مسند احمد بن حنبل کی ایک اور روایت میں حضرت عمروؓ بن عبسہ سے مروی ہے کہ ایک ضعیف العمر آدمی اپنی لکڑی کا سہارا لیے ہوئے رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی:

''یا رسول اللہؐ میں قبولِ اسلام سے پہلے بہت سی خیانتیں اور گناہ کر چکا ہوں کیا اسلام کے بعد میری یہ لغزشیں معاف کر دی جائیں گی۔''

آپؐ نے فرمایا: ''کیا تو یہ گواہی نہیں دیتا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں؟''
اس نے کہا: ''بے شک میں یہ گواہی دیتا ہوں اور یہ بھی کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں۔''
آپؐ نے فرمایا: ''تو جا اللہ تعالیٰ نے تیرے زمانۂ کفر کی تمام خیانتوں اور بیہودگیوں کو معاف کر دیا۔''

(۶)

اتباعِ رسول، زہد و ورع، خشیتِ الٰہی اور حق گوئی حضرت عمروؓ بن عبسہ کے صحیفۂ اخلاق کے نمایاں ابواب تھے۔ اللہ اور اللہ کے رسولؐ کے احکام سے سرِ مو انحراف بھی ان کو پسند نہیں تھا خواہ کیسے ہی حالات ہوں وہ لوگوں کو ہمیشہ صراطِ مستقیم پر چلنے کی تلقین کیا کرتے تھے۔ مسند احمد بن حنبل میں ہے کہ ایک دفعہ امیر معاویہؓ اور رومیوں کے مابین ایک معاہدہ قرار پایا جس کے

مطابق کوئی فریق ایک خاص مدّت تک دوسرے فریق پر حملہ نہیں کرسکتا تھا لیکن حالات نے کچھ ایسی صورت اختیار کی کہ امیر معاویہؓ نے لڑائی کی تیاری شروع کر دی اور اپنی فوجوں کو رومیوں کی سرحد پر متعین کر کے ارادہ کیا کہ معاہدہ کی میعاد ختم ہوتے ہی رومیوں پر دفعتاً حملہ کر دیا جائے۔ حضرت عمروؓ بن عبسہ بھی امیر معاویہؓ کے لشکر میں موجود تھے انھیں امیر معاویہؓ کے ارادے کا علم ہوا تو انھوں نے بآوازِ بلند لوگوں کو تلقین کرنی شروع کر دی کہ مسلمانو کسی کو دھوکا نہ دو اور وعدہ کی پابندی کرو —— ان کی تلقین کا نتیجہ یہ ہوا کہ امیر معاویہؓ نے اپنا ارادہ فسخ کر دیا۔

حافظ ابنِ حجرؒ نے اصابہ میں لکھا ہے کہ حضرت عمروؓ بن عبسہ نے حضرت عثمان ذوالنورینؓ کے عہدِ خلافت کے آخر میں وفات پائی۔ مسند احمد بن حنبل کی روایت سے شبہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ امیر معاویہؓ کے زمانے تک زندہ تھے لیکن اصابہ اور مسند کی روایتوں کی اس طرح تطبیق ہوسکتی ہے کہ حضرت عمروؓ بن عبسہ امیر معاویہؓ کے لشکر میں اس وقت شامل تھے جب امیر موصوفؓ حضرت عثمانؓ کی طرف سے شام کے گورنر تھے اور وقتاً فوقتاً رومیوں کے خلاف مہمیں بھیجتے رہتے تھے۔

اربابِ سیَر نے حضرت عمروؓ بن عبسہ کو فضلائے صحابہ میں شمار کیا ہے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت عبداللہ بن ابوبکر صدیقؓ

(۱)

رحمتِ عالم ﷺ نے صدیقِ اکبرؓ کی معیت میں ہجرت کے مبارک سفر کا آغاز فرمایا تو پہلے تین شب و روز آپؐ غارِ ثور میں تشریف فرما رہے۔ اس دوران میں ہر روز جب شب کا اندھیرا گہرا ہو جاتا تو کسرتی بدن کے ایک خوب رو نوجوان حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور قریشِ مکّہ کی دن بھر کی تمام کارروائیوں سے آپ کو آگاہ کرتے اور پھر وہیں غار میں پڑ رہتے۔ آخرِ شب میں چپکے سے اٹھتے اور مکہ جا کر قریش میں گھل مل جاتے۔ یہ ایسا نازک موقع تھا کہ اگر مشرکین مکہ کو اس نوجوان پر مخبری کا ذرا سا شبہ بھی ہو جاتا تو شاید وہ اُن کو زندہ نہ چھوڑتے۔ یہ سعادت مند نوجوان جنھوں نے ہجرت کے موقع پر اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر سرورِ عالم ﷺ کی اعانت و خدمت کی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے لختِ جگر حضرت عبداللہؓ تھے۔

(۲)

حضرت عبداللہؓ بن ابوبکر صدیقؓ (بن ابی قحافہ عثمان بن عامر بن عمرو بن کعب بن سعد بن تیم بن کعب بن لوی بن غالب) ذات النطاقین حضرت اسماءؓ بنت ابوبکر صدیقؓ کے برادرِ حقیقی تھے۔ ماں کا نام قتیلہ (مصغر) بنت عبد العزیٰ تھا، جو قبیلہ بنی عامر بن لوی سے تھیں۔ وہ اسلام سے مشرف نہیں ہوئیں اور اسی وجہ سے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے انھیں طلاق دے دی تھی۔ اہل سِیَر نے حضرت عبداللہؓ کو سالِ ولادت کی تصریح نہیں کی لیکن اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ ہجرتِ نبوی کے وقت وہ نوجوان تھے اور شرفِ اسلام سے بہرہ ور ہو چکے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ

کے بڑے فرزند حضرت عبدالرحمٰنؓ تو صلح حدیبیہ تک کفر وشرک کی بھول بھلیوں میں بھٹکتے رہے لیکن چھوٹے حضرت عبداللہؓ کو یہ سعادت نصیب ہوئی کہ اوائلِ بعثت ہی میں بادۂ توحید سے مخمور ہو گئے اور یوں سابقون الاوّلون کی مقدس جماعت میں شمار ہوئے۔ وہ بڑے ہوشیار اور زود فہم نوجوان تھے۔ ہجرت کے سفر پر روانہ ہونے سے پہلے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے انھیں تاکید فرمائی کہ وہ قریش کے ارادوں اور مشوروں سے انھیں برابر آگاہ کرتے رہیں۔ حضرت عبداللہؓ نے یہ خدمت بہ خوشی اپنے ذمہ لی اور اس کو بہ طریقِ احسن بڑی رازداری کے ساتھ نباہا۔ وہ دن بھر مشرکینِ قریش کے منصوبوں کا کھوج لگایا کرتے اور رات کو غارِ ثور میں پہنچ کر تمام خبروں سے سرورِ عالم ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کو آگاہ کر دیتے اور پھر وہیں سو جاتے۔ طلوعِ فجر سے پہلے اٹھ کھڑے ہوتے اور خاموشی سے مکّہ واپس آجاتے۔

ایک روایت میں ہے کہ وہ روزانہ رات کو سرورِ عالم ﷺ اور اپنے والدِ ماجد کے لیے کھانا بھی ساتھ لے جاتے تھے۔ علاّمہ ابنِ اسحاقؒ کا بیان ہے کہ حضرت اسماءؓ ہر رات حضورؐ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کو تازہ کھانا بھی پہنچاتی رہیں۔ اس روایت سے بعض علماء نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ حضرت اسماءؓ خود کھانا لے کر جاتی تھیں اور بعض نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ وہ اپنے بھائی عبداللہؓ کے ہاتھ کھانا بھیجتی تھیں۔ مدینہ منورہ پہنچنے کے کچھ عرصہ بعد رحمتِ عالم ﷺ نے حضرت زیدؓ بن حارثہ اور حضرت ابورافعؓ کو مکے بھیجا تاکہ وہ آپؐ کے اہل وعیال اور متعلقین کو وہاں سے مدینہ منورہ لے آئیں۔ ان دونوں کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے عبداللہ بن اُریقط کو اپنے فرزند عبداللہؓ کے نام خط دے کر بھیجا کہ وہ بھی اپنی (سوتیلی) والدہ اُمِ رومانؓ اور بہنوں (حضرت اسماءؓ اور حضرت عائشہ صدیقہؓ) کو مدینہ لے آئیں۔ چناں چہ حضرت زیدؓ بن حارثہ اُمّ المومنین حضرت سودہؓ، حضورؐ کی دو صاحب زادیوں حضرت فاطمۃ الزہرا اور حضرت اُمِ کلثومؓ کو اور اپنی اہلیہ حضرت اُمِ ایمنؓ اور فرزند اُسامہؓ کو لے آئے اور حضرت عبداللہؓ حضرت اُمِ رومانؓ، حضرت اسماءؓ اور حضرت عائشہ صدیقہؓ کو ساتھ لے کر مدینہ منوّرہ پہنچے۔ صحیح بخاری اور مسند ابوداوٗد میں ہے کہ حضورؐ کے اہل وعیال مسجد نبوی سے ملحقہ نو تعمیر حجروں میں فروکش ہوئے اور حضرت ابوبکر صدیقؓ

کے اہل وعیال نے بنو حارث بن خزرج کے محلّہ میں حضرت حارثؓ بن نعمان انصاری کے مکان میں قیام کیا۔

(۳)

حضرت عبد اللہؓ بن ابو بکرؓ کی شادی جلیل القدر صحابی حضرت سعید بن زیدؓ کی ہمشیرہ عاتکہؓ بنت زید بن عمرو بن نفیل سے ہوئی تھی۔ وہ شرف صحابیت سے بہرہ ور تھیں اور نہایت حسین و جمیل اور عاقلہ وفاضلہ خاتون تھیں۔ ابن اثیر جزری نے اسدُ الغابہ میں لکھا ہے کہ حضرت عبد اللہؓ کو ان سے اس قدر محبت تھی کہ ان کے عشق میں جہاد تک کو ترک کر دیا تھا۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ ان کے ترکِ جہاد سے سخت آزردہ تھے۔ چوں کہ حضرت عاتکہؓ نے حضرت عبد اللہؓ کو جہاد پر جانے پر مجبور نہیں کیا تھا اس لیے حضرت ابو بکر صدیقؓ نے حضرت عبد اللہؓ کو حکم دیا کہ وہ عاتکہؓ کو طلاق دے دیں۔ پہلے تو وہ کچھ عرصہ ٹالتے رہے لیکن جب والدِ ماجد کی طرف سے اصرار ہوا تو انھوں نے اطاعت والدین کے حکمِ الٰہی کے مطابق طلاق دے دی اور یہ اشعار کہے ؎

اعاتک لا انساک ما ذر شارق وما ناح قمری الحمام المطوق

''اے عاتکہ جب تک سورج چمکتا، اور قمری بولتی رہے گی میں تجھے نہ بھولوں گا۔''

اعاتک قلبی کل یوم و لیلة الیک بما تخفی النفوس معلق

''اے عاتکہ میرا دل شب و روز، بصد ہزار تمنّا وشوق تجھ سے لگا ہوا ہے۔''

ولم ار مثلی طلق الیوم مثلها ولا مثلها فی غیر جرم تطلق

''مجھ جیسے آدمی نے اس جیسی خاتون کو کبھی طلاق نہ دی ہوگی اور نہ اس جیسی خاتون کو بغیر گناہ طلاق دی جاتی۔''

حضرت ابو بکر صدیقؓ بڑے رقیق القلب تھے، وہ ان اشعار سے بہت متاثر ہوئے اور انھوں نے حضرت عبد اللہؓ کو رجعت کرنے کی اجازت دے دی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ فتح مکّہ (رمضان ۸ ھ) سے کچھ پہلے کا ہے کیوں کہ کئی اربابِ سِیَر نے لکھا ہے کہ حضرت عبد اللہؓ نے فتح مکّہ اور حنین وطائف کے غزوات میں شرکت کی۔ طائف کے محاصرے کے دوران میں ایک دن وہ دشمن کی طرف سے آنے والے ایک تیر سے سخت زخمی ہو گئے (کہا جاتا ہے کہ یہ تیر

بنو ثقیف کے ایک شخص نے چلایا تھا) اگر چہ یہ زخم بہ ظاہر مندمل ہو گیا لیکن تیر کا زہر اندر ہی اندر کام کرتا رہا۔ چناں چہ سرورِ عالم ﷺ کے وصال کے کچھ عرصہ بعد شوال ۱۱ھ میں زخم عود کر آیا اور اسی کے صدمہ سے حضرت عبداللہؓ نے وفات پائی۔ انھوں نے اپنے پیچھے کوئی اولاد نہیں چھوڑی۔

ایک روایت میں ہے کہ ایک چادر حضورؐ کے کفن مبارک سے بچ گئی تھی حضرت عبداللہؓ نے اس کو سات دینار دے کر بہ خیالِ تبرک اپنے کفن کے لیے خرید لیا تھا لیکن جب ان کی وفات کا وقت قریب آیا تو انھوں نے وصیت کی کہ اب اس چادر میں مجھ کو نہ کفنانا کیوں کہ اس چادر میں کچھ بہتری ہوتی تو سید المرسلین ﷺ ضرور اس میں مکفون ہوتے۔ حضرت عبداللہؓ کی نمازِ جنازہ صدیقِ اکبرؓ نے پڑھائی، حضرت عبدالرحمٰنؓ بن ابی بکرؓ، حضرت عمر فاروقؓ اور طلحہؓ بن عبیداللہ قبر میں اترے اور ظہر کی نماز کے بعد خلیفۃ الرسولؐ کے لختِ جگر کو سپردِ خاک کر دیا۔ چوں کہ حضرت عبداللہؓ طائف کے غزوے میں لگنے والے زخم کی وجہ سے فوت ہوئے تھے اس لیے بعض اہل سِیَر نے انھیں شہدائے طائف میں شمار کیا ہے۔ حضرت عاتکہؓ کو اپنے محبوب خاوند کی وفات سے سخت صدمہ پہنچا اور انھوں نے ایک پُر درد مرثیہ کہا جس کے کچھ اشعار یہ ہیں:

الیت لا ینفک عینی حزینه — علیک ولا نبفک حلدی اغبرا
للّٰه عیناً من مای مثله فتی — اکرّوا حمٰی فی الهیاج واصبرا
اذا شرعت فیه الا سنة خاصها — الی الموت حتّٰی یترک الموت احمرا

''قسم کھا کر کہتی ہوں کہ تیرے غم میں میری آنکھ روئے گی اور میرا جسم غبار آلود رہے گا۔ زہے قسمت اس آنکھ کی جس نے تجھ جیسا جنگجو اور ثابت قدم جوان دیکھا۔ اس پر تیر برستے تو ان کی بوچھاڑ میں گھستا ہوا، وہ اس وقت تک موت کی طرف چلتا رہتا جب تک کہ خون کی ندیاں نہ بہا لیتا۔''

سیرت اور تاریخ کی کتابوں میں حضرت عبداللہؓ بن ابی بکرؓ کے حالات زندگی بہت کم ملتے ہیں۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ وہ عہدِ رسالت کے بیش تر غزوات میں شریک نہ ہو سکے۔ تاہم ان کی زندگی کے بعض پہلو بڑی فضیلت کے حامل ہیں انھیں نہ صرف سبقت فی الاسلام اور ہجرت کا شرف حاصل ہوا بلکہ ہجرتِ نبوی کے موقع پر انھوں نے آقائے دوجہاں ﷺ کی خاطر جس طرح اپنی جان کو خطرے میں ڈالا، اس سعادت میں بہت کم صحابہ ان کے شریک و سہیم ہیں۔

فتح مکّہ کے موقع پر وہ ان دس ہزار مجاہدوں میں سے ایک تھے جو رحمتِ عالم ﷺ کے ہم رکاب تھے اور جنھیں سینکڑوں سال پہلے کتابِ استثنا کی پیشین گوئی میں قدوسی کہہ کر پکارا گیا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے حنین اور طائف کے غزووں میں جان بازانہ شرکت کر کے مجاہد فی سبیل اللہ ہونے کا شرف بھی حاصل کر لیا۔ بعض روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہؓ لکھنا پڑھنا جانتے تھے اور شعر و شاعری میں بھی درک رکھتے تھے۔ اپنے عظیم المرتبت والدِ گرامی کے بے حد اطاعت گزار تھے یہاں تک کہ ان کے حکم پر اپنی ''دل و جان سے عزیز'' بیوی کو طلاق دے دی۔ جس مردِ حق کی نماز جنازہ انبیاء علیہم السلام کے بعد دنیا کی افضل ترین ہستی نے پڑھائی ہو اور جس کو فاروقِ اعظم اور طلحۃ الخیرؓ۔ صاحبِ اُحد جیسی ہستیوں نے ابدی آرام گاہ میں لٹایا ہو اس کی جلالتِ قدر میں کیا کلام ہو سکتا ہے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت ابو رُہم منحور غفاریؓ

(۱)

۸ھ میں فتح مکہ کے معًا بعد حنین اور طائف کے خونیں معرکے پیش آئے۔ حنین میں تو بنوہوازن کو عبرت ناک شکست ہوئی، لیکن طائف کی لڑائی کسی حتمی نتیجے کے بغیر ختم ہوگئی۔ فی الحقیقت یہ کھلے میدان کی لڑائی نہیں تھی کیوں کہ اہل طائف قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئے تھے اور سرورِ عالم ﷺ نے ان کا محاصرہ کرلیا تھا۔ یہ محاصرہ کم وبیش تین ہفتے تک جاری رہا۔ اس کے بعد جب حضورؐ نے اہل طائف کی تادیب کے لیے شہر سے باہر ان کی انگور کی ٹٹیاں برباد کرنے کا حکم دیا تو انھوں نے قاصد بھیج کر بڑی لجاجت سے درخواست کی کہ آپ ایسا نہ کریں۔ اسی انگور پر ہماری روزی کا انحصار ہے۔ اگر یہ برباد ہوگئے تو ہم بھوکے مرجائیں گے۔

سرورِ عالم ﷺ کی شانِ رافت ورحمت نے ان بدترین دشمنانِ حق کو بھی بھوکا مارنا گوارا نہ کیا اور آپؐ نے طائف کا محاصرہ اٹھالیا۔ طائف سے حضورؐ اپنے جاں نثاروں کے ہم راہ جعرانہ کی طرف روانہ ہوئے۔ جہاں غزوۂ حنین کا کثیر مالِ غنیمت آپؐ کو مجاہدین میں تقسیم کرنا تھا۔ اثنائے راہ میں آپؐ کے ایک جاں نثار کی اونٹنی سوئے اتفاق سے حضورؐ کی اونٹنی سے بھڑ گئی اور ان کے جوتے کا کنارہ حضورؐ کی ران مبارک سے رگڑ گیا۔ رحمتِ عالم ﷺ کو اس سے بہت تکلیف ہوئی۔ آپؐ نے ان صاحب کے پاؤں پر کوڑا مار کر فرمایا:

''اپنا پاؤں پیچھے ہٹاؤ، میری ران زخمی ہوگئی ہے۔''

حضورؐ کے عتاب نے ان صاحب پر لرزہ طاری کردیا۔ کوڑے کی تکلیف تو خیر کیا ہونی تھی۔ اپنی آخرت برباد ہونے کا خوف تھا۔ صبح کو جب لشکر نے جعرانہ پہنچ کر پڑاؤ ڈالا تو وہ صاحب

اپنے معمول کے مطابق اونٹ چرانے نکل گئے۔ لیکن ہر وقت دھڑ کا لگا تھا کہ کہیں بارگاہِ الٰہی سے میری حرکت کی مذمّت نازل نہ ہو جائے۔ واپس آئے تو لوگوں سے پوچھا، حضورؐ نے مجھے طلب تو نہیں فرمایا ـــــ لوگوں نے بتایا کہ حضورؐ نے تمھیں یاد فرمایا تھا۔ یہ سن کر ان صاحب کی عجیب کیفیت ہوئی، انھیں یقین ہو گیا کہ میں راندۂ درگاہ ہو گیا۔ لرزاں و ترساں رحمتِ عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حضورؐ کے ارشاد کے لیے ہمہ تن گوش ہو گئے۔ ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب رحمتِ دو عالم ﷺ نے ان پر نہایت محبت اور شفقت بھری نظر ڈالی اور فرمایا:

> ''تمھارے جوتے سے میری ران میں خراش آ گئی تھی اس پر میں نے تمھارے پاؤں کو کوڑے سے ہٹایا تھا، میرے کوڑے سے تم کو ضرور تکلیف پہنچی ہو گی۔ اس کے عوض بکریوں کا یہ ریوڑ انعام لے لو۔''

حضورؐ کی شانِ رحیمی دیکھ کر ان صاحب کے جسم کا رواں رواں ''اللہ اکبر'' پکار اٹھا۔ فرطِ مسرت سے ان کے قدم زمین پر نہ ٹکتے تھے اور وہ بار بار کہتے تھے کہ آج مجھ سے بڑھ کر کون خوش نصیب ہے۔ میرے آقا نے نہ صرف مجھے معاف فرما دیا بلکہ اپنے خاص لطف و کرم سے بھی نوازا۔

رحمتِ عالم ﷺ کے یہ محبِ صادق سیّدنا حضرت ابورُہم منحور غفاریؓ تھے۔

(۲)

حضرت ابورُہم کا نام کلثوم تھا اور منحور لقب تھا۔ سلسلۂ نسب یہ ہے:

کلثوم بن حصین بن خالد بن عسعس بن زید بن عمیس بن احمس بن غفار۔

اہلِ سیَر نے ان کے قبولِ اسلام کے زمانہ کی تصریح نہیں کی، لیکن یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ وہ ہجرتِ نبویؐ کے بعد مدینہ منوّرہ آئے اور رحمتِ عالمؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر دولتِ اسلام سے بہرہ یاب ہوئے۔ غالباً یہ غزوۂ بدر کے بعد کا واقعہ ہے کیوں کہ اصحابِ بدر میں حضرت ابورُہمؓ کا نام نظر نہیں آتا اور اگر انھوں نے غزوۂ بدر سے پہلے اسلام قبول کیا تو پھر اپنے وطن واپس چلے گئے ہوں گے۔ اور غزوۂ بدر کے بعد دوبارہ مدینہ آئے ہوں گے۔

۳ھ میں اُحد کی لڑائی پیش آئی تو حضرت ابورُہمؓ اس میں بڑے جوش سے شریک ہوئے اور نہایت پامردی سے لڑے۔ عین معرکۂ کارزار میں ایک تیر سینے میں آ کر لگا، جس سے

سخت زخمی ہو گئے۔ علامہ ابن سعدؒ کاتب الواقدی کا بیان ہے کہ لڑائی کے بعد انھیں سرورِ عالمؐ کی خدمت میں لایا گیا تو آپؐ نے اپنا لعاب دہن ان کے زخم پر لگا دیا جس کی برکت سے وہ بہت جلد مندمل ہو گیا۔

چوں کہ سینہ کو "نحر" کہتے ہیں اور حضورؐ نے ان کے "نحر" پر لعابِ دہن لگایا تھا اس لیے وہ لوگوں میں "منحور" کے لقب سے مشہور ہو گئے۔

۶ھ میں حضرت ابو رُہمؓ کو ان چودہ سو نفوس قدسی میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہوا جنھوں نے حدیبیہ کے مقام پر حضورؐ کے دستِ مبارک پر موت کی بیعت کی اور بارگاہِ خداوندی سے اصحاب الشجرہ کا لقب اور جنت کی بشارت پائی۔

بیعتِ رضوان کے بعد حضرت ابو رُہم نے غزوۂ خیبر میں مجاہدانہ شرکت کی علامہ ابن اثیر نے اُسدُ الغابہ میں لکھا ہے کہ حضورؐ نے غزوۂ خیبر کے مالِ غنیمت سے حضرت ابو رہمؓ کو دوہرا حصہ مرحمت فرمایا۔

ابنِ اثیر نے اس کا سبب بیان نہیں کیا، لیکن قیاس یہ ہے کہ انھوں نے کوئی خاص کارنامہ انجام دیا ہوگا۔

(۳)

رحمتِ عالم ﷺ کے نزدیک حضرت ابو رُہمؓ کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ ۸ھ میں آپ فتح مکہ کے ارادے سے مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے تو حضرت ابو رُہمؓ کو مدینہ منورہ میں اپنا قائم مقام بنایا۔ حافظ ابن عبد البرؒ نے الاستیعاب میں لکھا ہے کہ اس کے علاوہ حضرت ابو رُہمؓ کو عمرۃ القضاء میں بھی یہ شرف حاصل ہوا تھا۔

طبقات ابنِ سعد سے معلوم ہوتا ہے کہ فتح مکہ اور غزوۂ حنین کے بعد طائف کا محاصرہ شروع ہوا تو حضرت ابو رُہمؓ حضورؐ کی اجازت سے طائف پہنچ کر محاصرہ کرنے والے مجاہدین میں شامل ہو گئے۔

غزوۂ تبوک یا عسرۃ (۹ھ) کے موقع پر حضورؐ نے ابو رہمؓ کو قبیلہ غفار کی طرف روانہ کیا تا کہ وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو جہاد میں شامل ہونے پر آمادہ کریں۔ اس سال سخت خشک سالی اور شدّت کی گرمی تھی اس لیے لوگ اتنے طویل سفر سے گھبراتے تھے۔ تاہم حضرت ابو رُہمؓ نے

بنو غفار کو ایسی دل سوزی اور خلوص کے ساتھ جہاد کی ترغیب دی کہ ان کی ایک بڑی تعداد اپنے وطن سے آ کر مجاہدین میں شامل ہو گئی۔

امام حاکمؒ نے مستدرک میں لکھا ہے کہ تبوک سے واپسی کے سفر میں بھی حضرت ابورُہمؓ کی اونٹنی حضورؐ کی سواری کے قریب تھی۔ حضرت ابورُہمؓ کو سفرِ جعرانہ کا واقعہ یاد تھا۔ اس لیے جب بھی ان کی اونٹنی حضورؐ کی اونٹنی کے زیادہ قریب جاتی یا انھیں اونگھ آنے لگتی تو وہ فوراً اپنی اونٹنی کو پرے ہٹا لیتے۔

حضرت ابورُہمؓ کے اس سے زیادہ حالات کتبِ سِیَر میں نہیں ملتے۔ یہاں تک کہ ان کے سالِ وفات کا پتہ بھی نہیں چلتا۔ البتہ کتبِ حدیث میں ان سے مروی دو حدیثوں کا سراغ ملتا ہے۔ حضرت ابورُہمؓ کے جس قدر حالات بھی کتابوں میں ملتے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں اعلیٰ درجہ کے اوصاف و محاسن سے نوازا تھا اور انہی کی بہ دولت وہ رحمتِ عالمؐ کے لطف و کرم کے مورد بن گئے تھے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت ضمام بن ثعلبہؓ

(۱)

وہ آیا — تو اس کے نہاں خانۂ دل میں یقین اور تشکیک کے درمیان جنگ برپا تھی — وہ اس ذاتِ اقدسؐ کی خدمت میں حاضر ہوا جس کا سینہ مہبطِ وحی اور مخزونِ انوارِ الٰہی تھا۔

اس نے پوچھا،

اس نے سنا،

اور جب وہ واپس چلا تو اس کا ذہن — دل اور دماغ — یقین اور ایمان کے نور سے معمور تھے۔ وہ اپنی قوم میں گیا، اس نور کو اس کے سینے میں بھی اتارا۔ اور پھر تاریخ کی پہنائیوں میں ہمیشہ کے لیے مستور ہو گیا۔

خدائے علیم و خبیر کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ اس کا بچپن کیسا تھا اور اس کا بڑھاپا کیسے گزرا، لیکن اس کا آنا — پوچھنا — سننا اور لوٹنا تاریخِ اسلام کا ایک ایمان افروز باب بن گیا۔

اس کے مختصر سے کردار نے صفحۂ تاریخ پر جو نقوش مرتسم کیے وہ آج بھی جگمگا رہے ہیں اور ان کی ضیاپاشی قلوب و اذہان کو منوّر کر رہی ہے۔

(۲)

۹ ھ کا ذکر ہے کہ ایک دن رحمتِ عالم ﷺ مسجدِ نبویؐ میں رونق افروز تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ، حضرت طلحہؓ بن عبید اللہ، حضرت انسؓ بن مالک اور کئی دوسرے جلیل القدر صحابۂ کرامؓ بھی بارگاہِ نبویؐ میں حاضر تھے۔ اتنے میں سامنے سے ایک اعرابی (بدّو) نمودار ہوا۔ یہ دوہرے بدن کا ایک دیدارُو نوجوان تھا، بلند قامت، گورا چٹّا رنگ، سیاہ گیسو کانوں کی لَو سے اس طرح نکلے ہوئے جیسے چاند کے گرد ہالہ۔ وہ اپنی اونٹنی کی مہار تھامے بدویانہ انداز میں رواں دواں مسجد کے اندر گھس آیا۔ اونٹنی کو ایک کونے میں بٹھایا۔ اور پھر حضورؐ کی مجلس مبارک کے قریب پہنچ کر

بلند آواز سے پوچھا:

"آپ حضرات میں ابن عبدالمطلب کون ہیں۔"

حضورؐ: ابنِ عبدالمطلب میں ہوں۔ فرمائیے؟

اعرابی: محمدؐ، آپ ہی کا نام ہے؟

رسولِ اکرمؐ: ہاں۔

اعرابی: اے صاحب! میں ایک دیہاتی آدمی ہوں، کچھ باتیں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ میری زبان کی درشتی سے آپ ناراض تو نہیں ہوں گے؟

رسولِ اکرمؐ: نہیں نہیں، تم جو پوچھنا چاہتے ہو بے تکلفی سے پوچھو۔ میں ہرگز کبیدہ خاطر نہ ہوں گا۔

اعرابی: اے محمدؐ! آپ کا قاصد (داعی) ہمارے قبیلے میں آیا تھا، اس نے ہمیں بتایا کہ آپ کو اس بات کا یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنا رسول مبعوث کیا ہے؟

رسولِ اکرمؐ: ہاں اس نے سچ کہا۔

اعرابی: آسمان کس نے بنایا ہے؟

رسولِ اکرمؐ: اللہ نے۔

اعرابی: زمین کس نے بنائی ہے؟

رسولِ اکرمؐ: اللہ نے۔

اعرابی: ان پہاڑوں کو کس نے قائم کیا اور ان میں انواع واقسام کی چیزیں کس نے بنائیں؟

رسولِ اکرمؐ: اللہ نے۔

اعرابی: اسی اللہ کی قسم ہے جس نے آسمان اور زمین بنائے اور ان پہاڑوں کو قائم کیا۔ کیا واقعی اللہ نے آپ کو اپنا پیغمبر بنا کر بھیجا ہے؟

رسولِ اکرمؐ: (نَعَمْ) ہاں۔

اعرابی: آپ کے قاصد نے ہمیں یہ بھی بتایا تھا کہ رات دن ہمارے لیے پانچ نمازیں پڑھنا فرض ہے۔

رسولِ اکرمؐ: اس نے سچ کہا۔

اعرابی: اس ذات کی قسم جس نے آپ کو منصبِ رسالت پر فائز کیا، کیا واقعی اس نے آپ کو ان نمازوں کا حکم دیا ہے؟

رسولِ اکرمؐ: ہاں۔

اعرابی: آپ کے قاصد نے ہمیں یہ بھی کہا تھا کہ سال میں ایک مرتبہ ہمیں اپنے مال پر زکوٰۃ دینی چاہیے۔

رسولِ اکرمؐ: اس نے سچ کہا۔

اعرابی: اس ذات کی قسم جس نے آپ کو نبوّت عطا کی، کیا واقعی اللہ نے آپ کو اس کا حکم دیا؟

رسولِ اکرمؐ: ہاں۔

اعرابی: آپ کے قاصد نے ہمیں یہ تلقین بھی کی کہ ہر سال رمضان کا پورا مہینہ ہم روزے رکھا کریں گے۔

رسولِ اکرمؐ: ہاں اس نے سچ کہا۔

اعرابی: اس اللہ کی قسم جس نے آپ کو اپنا رسول بنا کر بھیجا، کیا اسی نے آپ کو اس کا حکم دیا؟

رسولِ اکرمؐ: ہاں۔

اعرابی: آپ کے قاصد نے ہم سے یہ بھی کہا کہ جس شخص کو استطاعت ہو اس پر بیت اللہ کا حج کرنا بھی فرض ہے۔

رسولِ اکرمؐ: اس نے سچ کہا۔

یہ سوال وجواب ہو چکے تو اعرابی نے کلمۂ شہادت پڑھا اور عرض کیا:

> ”یا رسولؐ اللہ! میری قوم نے مجھے اپنا قاصد بنا کر آپ کی خدمت میں بھیجا ہے، میرا نام ضمام بن ثعلبہ ہے اور میں بنو سعد بن بکر کا بھائی ہوں۔ اس ذاتِ برحق کی قسم جس نے آپ کو سچا نبی بنایا ہے جو باتیں آپؐ نے ارشاد فرمائی ہیں، میں ان میں کمی نہ کروں گا اور نہ زیادتی۔“

یہ کہہ کر انھوں نے نہایت ادب سے سلام کیا اور اپنے وطن کی طرف چل دیے۔ اس موقع پر رحمتِ عالم ﷺ نے صحابہؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

> ”اگر اس گیسوؤں والے نے سچ کہا ہے تو ضرور جنت میں داخل ہوگا۔“

(۳)

حضرت ضمامؓ بن ثعلبہ، جنھیں احکام اسلام کی پابندی کا اقرار کرنے پر رحمتِ عالم ﷺ نے جنت کی بشارت دی قبیلہ سعد بن بکر سے نسبی تعلق رکھتے تھے۔ ضمامؓ نہایت وجیہہ اور شکیل جوان تھے۔ اور اپنے قبیلے کے اصحابِ فہم و دانش میں شمار ہوتے تھے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ وہ بنوسعد کے رؤسا میں سے تھے۔ ان کی زندگی کے ابتدائی حالات کا پتہ نہیں چلتا۔ البتہ حافظ ابن حجرؒ نے اصابہ میں لکھا ہے کہ ضمامؓ ایک سلیم الفطرت آدمی تھے اور جس زمانے میں سارا عرب طرح طرح کی اخلاقی برائیوں میں مبتلا تھا وہ اس وقت بھی ان برائیوں سے ہمیشہ مجتنب رہے۔

صلح حدیبیہ کے بعد سرورِ دو عالم ﷺ نے اشاعتِ حق اور تبلیغ دین کے لیے عرب کے تمام قبائل میں مبلغین روانہ کیے۔ حضورؐ کے داعی بنوسعد میں بھی پہنچے اور ان لوگوں کو اسلام کی دعوت دی۔ اہلِ قبیلہ نے اس سلسلے میں رسولِ اکرم ﷺ سے بہ راہِ راست گفتگو کرنا مناسب سمجھا اور اس مقصد کے لیے ضمامؓ بن ثعلبہ کو اپنا نمائندہ منتخب کر کے مدینے روانہ کیا۔

امام بخاریؒ کا قیاس یہ ہے کہ ضمامؓ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہونے سے پہلے ہی مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے۔ لیکن علامہ قرطبیؒ اور بعض دوسرے علماء نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ وہ حضورؐ سے بالمشافہ گفتگو کے بعد دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے۔ دونوں قسم کی روایتوں میں اس طرح تطبیق ہو سکتی ہے کہ وہ اسلام سے متاثر تو پہلے ہی ہو چکے تھے۔ البتہ عملی طور پر انھوں نے اسلام حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر ہی قبول کیا۔ ضمامؓ جس انداز سے بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے انھوں نے جس بے باکی سے گفتگو کی وہ ان کی بدویانہ طرزِ زندگی کا بھرپور اظہار تھا۔ حضورؐ اور ان کے مابین جو مکالمہ ہوا، اربابِ سِیَر نے اسے تواتر کے ساتھ نقل کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض روایتوں کے الفاظ میں قدرے اختلاف ہے، لیکن ان سب کا مفہوم ایک ہی ہے۔ البتہ کچھ روایتوں میں یہ اضافہ ضرور ہے کہ حضورؐ نے ضمامؓ کو احکامِ شریعت کے علاوہ اوامر و نواہی کی تعلیم بھی دی۔

نجدی قبائل ٹھیٹ، فصیح و بلیغ عربی زبان بولنے میں منفرد حیثیت کے حامل تھے۔ ضمامؓ نجد ہی کے ایک قبیلہ کے فرزند تھے اس لیے اِن کے بدویانہ طرزِ گفتگو میں بھی ایک خاص شان تھی۔ اس نے حضرت عمر فاروقؓ جیسے فرزانۂ روزگار کو بھی اتنا متاثر کیا کہ وہ بے ساختہ پکار اٹھے:

"میں نے ضمامؓ سے بہتر اور مؤثر گفتگو کرنے والا کوئی نہیں دیکھا۔"

حافظ ابنِ حجرؒ کا بیان ہے کہ خود دانائے کونین ﷺ نے ایک مرتبہ (اسی موقع پر یا کسی دوسرے موقع پر) حضرت ضمامؓ کے متعلق ارشاد فرمایا:

"ضمامؓ عقل مند آدمی ہیں۔"

جس شخص کو خود نطقِ رسالت سے عقل مندی کی سند حاصل ہو جائے، اس کی دانائی اور خوش بختی میں کون شک کر سکتا ہے؟

(۴)

حضرت ضمامؓ بارگاہِ نبوّت سے رخصت ہو کر اپنے قبیلے میں پہنچے تو تمام اہلِ قبیلہ، جو بڑے اشتیاق سے ضمامؓ کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے، ان کے گرد جمع ہو گئے اور پوچھا:

"کہیے مدینہ میں کیا دیکھا اور محمدؐ سے کیا گفتگو ہوئی؟"

اس وقت حضرت ضمامؓ کے منہ سے بے اختیار یہ الفاظ نکلے:

بئست اللاّت و العزّیٰ۔

"لات اور عزیٰ ذلیل وخوار ہیں یا لات اور عزّیٰ کا برا ہو۔"

بتوں کی شان میں یہ الفاظ سن کر بنو سعد لرز اُٹھے۔ ایسے الفاظ منہ سے نکالنا ان کے نزدیک تباہی اور بربادی کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ سب لوگ بیک زبان پکار اٹھے:

"ضمام اپنی زبان بند کرو۔ معزّز لات اور عزّیٰ کی توہین تمھیں کہیں جذام، برص یا خللِ دماغ میں مبتلا نہ کر دے۔ فوراً توبہ کرو، ورنہ اپنے ساتھ ہمیں بھی لے ڈوبو گے۔"

ضمامؓ نشۂ توحید سے سرشار تھے۔ بڑی دردمندی اور اخلاص کے ساتھ ان سے یوں خطاب کیا:

"اے میری قوم کان کھول کر سن لو۔ لات اور عزّیٰ محض پتھر ہیں، نہ کسی کو نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ ضرر، افسوس ہے تم پر کہ تم نے ان پتھروں کو معبود بنا لیا ہے۔ عبادت کے لائق صرف اللہ تعالیٰ کی ذاتِ واحد ہے، اسی نے محمد ﷺ کو اپنا سچا رسول بنا کر بھیجا ہے اور ان پر اپنی کتاب نازل کی ہے جو ہدایت اور فلاح وخیر کا سرچشمہ ہے۔ اس کتاب پر عمل کر کے تم ظلمت اور گمراہی کی اس دلدل سے نکل آؤ گے جس میں تم گلے گلے تک دھنس گئے ہو۔ میں نے صداقت معلوم کر لی ہے اور میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے

سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اس کے بندے اور رسول ہیں۔ میرا کہنا مانو اور فوراً اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لے آؤ۔ اسی میں تمھاری بھلائی ہے ورنہ تباہ اور برباد ہو جاؤ گے۔ میں نے رسول اللہؐ سے وہ تمام باتیں دریافت کر لی ہیں جن پر تمھیں عمل کرنا چاہیے اور وہ بھی جن سے تمھیں بچنا چاہیے۔"

حضرت ضمامؓ کی تقریر ایسی پُر اثر اور دل نشین تھی کہ تمام اہل قبیلہ شرک سے متنفر ہو گئے، اور شام ہوتے ہوتے ان میں سے ایک متنفس بھی ایسا باقی نہ رہا جو مشرف بہ اسلام نہ ہو گیا ہو۔

حضرت ضمامؓ کی زندگی کے اس سے زیادہ حالات کتبِ سِیَر میں نہیں ملتے۔ تاہم پورے قبیلے کو ایک دن میں کفر و شرک کی بھول بھلیوں سے نکال کر جادۂ حق پر چلا دینا ان کا ایک ایسا شرف ہے جس میں بہت کم لوگ ان کے شریک و سہیم ہیں۔ ترجمان القرآن حبر الامۃ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرمایا کرتے تھے:

"میں نے کسی قوم میں ضمامؓ سے بہتر کوئی شخص نہیں دیکھا۔"

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت کعب بن مالک انصاریؓ

(۱)

عہدِ رسالتؐ کے ایک مبارک دن کا ذکر ہے کہ رحمتِ عالم ﷺ اپنے ایک انصاری جاں نثار کے مکان پر تشریف لے گئے۔ یہ صاحبِ رسول ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ ان کے اشعار میں کچھ ایسی تاثیر اور ہیبت ہوتی تھی کہ کفار انھیں سن کر لرزہ براندام ہو جاتے تھے۔ ان کو سید المرسلین ﷺ کی تشریف آوری کی اطلاع ہوئی تو فرطِ مسرت سے بے خود ہو گئے بے تابانہ مکان سے باہر نکل کر حضورؐ کا استقبال کیا۔ سرورِ عالم ﷺ ان کو دیکھ کر متبسّم ہو گئے اور فرمایا:

"ابوعبداللہ اپنے کچھ اشعار تو سناؤ۔"

انھیں تعمیلِ ارشاد میں کیا عذر تھا، اسی وقت اپنے کئی اشعار بڑے ذوق وشوق سے پڑھ دیئے۔ حضورؐ ان کو سن کر بہت محظوظ ہوئے اور فرمایا: "اور" انھوں نے پھر کئی اشعار پڑھے۔ سرورِ عالمؐ نے فرمایا "اور" اور اس طرح آپؐ نے ان سے تین بار فرمائش کر کے اشعار سنے اور پھر ان کی تحسین کرتے ہوئے فرمایا:

ھٰذا اشد علیھم من وقع النبل

"کفار پر ان کی زد تیر سے بھی زیادہ سخت ہے۔"

یہ صاحبِ رسول جن کے اشعار سننے کے لیے آقائے دو جہاں ﷺ خود ان کے پاس تشریف لے گئے اور جن کے کلام کی حضور پُر نور ﷺ نے ستائش فرمائی، سیّدنا ابوعبداللہ کعبؓ بن مالک سلمی انصاری تھے۔

حضرت کعبؓ بن مالک انصاری کا شمار نہایت جلیل القدر صحابہ میں ہوتا ہے۔ ان کا تعلق

قبیلہ خزرج کے خاندان بنو سلمہ سے تھا۔ شجرۂ نسب یہ ہے:
کعبؓ بن مالک بن ابی کعب عمرو بن قین بن سواد بن غنم بن کعب بن سلمہ بن علی بن اسد بن ساردہ بن یزید بن جشم بن خزرج۔ والدہ کا نام لیلیٰ بنت زید بن ثعلبہ تھا اور وہ بھی بنو سلمہ سے تھیں۔ حضرت کعبؓ اپنے والدین کے اکلوتے فرزند تھے اس لیے بڑے ناز و نعم میں پرورش پائی۔ ایک روایت کے مطابق وہ ہجرتِ نبوی سے تقریباً ستائیس برس پہلے پیدا ہوئے۔ شروع ہی سے نہایت سلیم الطبع اور پاک باز تھے۔ اللہ تعالیٰ نے شعر گوئی کا ذوق بھی ان کی فطرت میں ودیعت کیا تھا چناں چہ منزلِ شباب تک پہنچتے پہنچتے ان کے کلام کی شہرت دُور دُور تک پھیل گئی یہاں تک کہ تین سو میل دور مکّہ کے لوگ بھی انھیں ایک شاعر کی حیثیت سے جاننے لگے۔ بیعت عقبۂ ثانیہ کے بعد حضرت مصعبؓ بن عمیر اسلام کے مبلّغِ اوّل کی حیثیت سے مدینہ منورہ تشریف لائے تو ان کی تبلیغی مساعی کے نتیجہ میں مدینہ کے گھر گھر میں اسلام کا چرچا پھیل گیا۔ حضرت کعبؓ بن مالک بھی اسی زمانے میں مشرف بہ اسلام ہو گئے۔ وہ مدینہ منوّرہ کے ان چالیس اوّلین مسلمانوں میں سے ایک تھے جنھوں نے ہجرتِ نبوی سے پہلے حضرت اسعدؓ بن زُرارہ انصاری کی امامت میں نماز جمعہ پڑھی۔ خود حضرت کعبؓ بن مالک سے روایت ہے کہ نمازِ جمعہ کا حکم آنے سے پہلے ہی ہم (انصارِ مدینہ) نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ ہفتے میں ایک دن سب اکٹھے ہو کر نماز پڑھیں گے اس مقصد کے لیے ہم نے یومِ عروبہ (جمعہ) کو اختیار کیا۔ سب سے پہلا جمعہ حضرت اسعدؓ بن زرارہ نے بنی بیاضہ کے علاقہ میں پڑھایا جس میں چالیس آدمی شریک تھے۔"

۱۳ نبوت میں پانچ سو اہلِ مدینہ کا ایک قافلہ حج کے لیے مکّہ روانہ ہوا اس قافلے میں پچھتر ایسے اصحاب (دو خواتین اور ۷۳ مرد) بھی شامل تھے جو اگرچہ دولتِ ایمان سے بہرہ یاب ہو چکے تھے لیکن ان کا اسلام دوسرے (غیر مسلم) اہل مدینہ سے پوشیدہ تھا۔ ان اہل ایمان میں حضرت کعبؓ بن مالک بھی شامل تھے۔ ان اصحاب کا مقصد حج کے علاوہ یہ بھی تھا کہ رسولِ اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ کی بیعت کا شرف حاصل کریں اور ساتھ ہی آپؐ کو مدینہ تشریف لانے کی دعوت دیں۔ ان لوگوں نے جس کام کا ارادہ کیا تھا وہ کوئی معمولی کام نہیں تھا۔ اس وقت عرب کا ذرّہ ذرّہ رحمتِ عالم ﷺ اور آپؐ کے نام لیواؤں کا دشمن تھا اور آپؐ کی بیعت کرنا اور پھر آپؐ کو اپنے ہاں بلانے کی دعوت دینا گویا سارے عرب کو للکارنے کے مترادف تھا۔ لیکن مدینہ

کے پرستارانِ حق کی یہ اولوالعزم جماعت اپنا ارادہ پورا کر کے رہی۔ تاریخِ اسلام کا یہ مہتم بالشان واقعہ بیعت عقبۂ کبیرہ یا بیعت لیلۃ العقبہ کے نام سے مشہور ہے۔ حضرت کعبؓ بن مالک نے یہ ایمان افروز واقعہ اس طرح بیان کیا ہے:

''ہم اپنی قوم کے مشرکین کے ساتھ حج کے لیے مکّہ روانہ ہوئے۔ راستے میں ہمارے سردارِ قبیلہ براءؓ بن معرور نے کہا کہ میرا خیال ہے کہ میں کعبہ کی طرف پیٹھ کرنے کے بجائے اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھوں۔ ہم نے کہا کہ ہمارے علم کے مطابق نبی کریم ﷺ شام (بیت المقدس) کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں ہم تو آپؐ کے طریقے پر ہی عمل کریں گے۔ مگر براءؓ کعبہ کی طرف ہی منہ کر کے نماز پڑھتے رہے اور ہم انھیں ٹوکتے رہے۔ مکّے پہنچے تو براءؓ نے مجھ سے کہا، بھتیجے آؤ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں چلیں اور آپ سے اس معاملہ کے بارے میں پوچھیں۔ ہم نے حضورؐ کو پہلے کبھی دیکھا نہ تھا اور نہ آپ کو پہچانتے تھے البتہ آپ کے چچا عباسؓ کو جانتے تھے کیوں کہ وہ تجارت کے سلسلے میں مدینہ آتے جاتے رہتے تھے۔ ایک شخص نے بتایا کہ تم حرم میں جاؤ تو رسول اللہ ﷺ تمھیں وہاں عباسؓ کے ساتھ بیٹھے نظر آئیں گے —— ہم نے وہاں پہنچ کر حضورؐ کو سلام کیا۔ آپؐ نے عباسؓ سے پوچھا یہ کون ہیں؟ انھوں نے کہا یہ براء بن معرور ہیں اور یہ کعب بن مالک، مجھے حضورؐ کا یہ ارشاد کبھی نہیں بھولتا کہ میرا نام سُن کر آپؐ نے فرمایا ''شاعر''؟ عباسؓ نے کہا ''ہاں'' پھر براءؓ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ ہم نماز میں اپنا منہ کس طرف کریں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ بیت المقدس کی طرف (چناں چہ انھوں نے بعد میں اسی کے مطابق عمل شروع کر دیا) اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ آپ لوگ ایامِ تشریق کے بیچ والے دن عقبہ میں مجھ سے رات کے وقت ملیں۔ جب وہ رات آئی تو ہم اپنی قوم کے ساتھ اپنی قیام گاہ پر سوئے، ایک تہائی رات گزر گئی تو ہم بڑی رازداری کے ساتھ آپؐ سے ملنے کے لیے عقبہ کی طرف چلے۔ صرف ایک غیر مسلم کو ہم نے اپنے ارادے سے مطلع کیا وہ ابو جابر عبداللہ بن عمرو بن حرام تھے۔ وہ ہمارے اشراف اور رؤسا میں سے تھے اور ابھی تک اپنے آبائی دین پر قائم تھے۔ ہم نے کہا کہ ہم نہیں چاہتے کہ آپ جہنم کا ایندھن بنیں، ہم نے اُن کے سامنے اسلام پیش کیا تو وہ بلا تامل ایمان لے آئے اور ہمارے ساتھ بیعتِ عقبہ میں شریک ہوئے۔ اس وقت ہم ۷۳ مرد تھے اور ہمارے ساتھ دو عورتیں تھیں۔ جب ہم سب عقبہ میں جمع ہو گئے تو رسول اللہ ﷺ حضرت عباسؓ کے ہم راہ

تشریف لائے۔ عباسؓ نے ہم سے مخاطب ہو کر کہا۔ اے گروہِ خزرج محمدؐ اپنے خاندان میں جو مرتبہ رکھتے ہیں تمھیں معلوم ہے، ہم (بنو ہاشم اور بنو مطّلب) نے ہمیشہ دشمنوں سے ان کی حفاظت کی ہے اور آئندہ بھی اپنی استطاعت کے مطابق کریں گے۔ اگر تم اپنے وعدوں کو پورا کر سکتے ہو اور مرتے دم تک محمدؐ کی حفاظت کر سکتے ہو تو کوئی بات کرنا، خوب سوچ سمجھ لو کہ محمدؐ کی حفاظت کی ذمہ داری اٹھانا گویا ہول ناک مصائب اور خون ریز جنگوں کو دعوت دینا ہے اس لیے سب کچھ ذہن میں رکھ کر کوئی قدم اٹھانا اگر تمھیں اندیشہ ہو کہ کل کلاں حالات سے مجبور ہو کر تمھیں ان کا ساتھ چھوڑنا اور دشمنوں کے حوالے کرنا پڑے گا تو بہتر یہ ہے کہ ان کو اپنے حال پر چھوڑ دو۔

ہم نے کہا، عباسؓ کی باتیں ہم نے سُن لی ہیں، یا رسول اللہ اب آپ ارشاد فرمائیں کہ آپؐ ہم سے کیا عہد لینا چاہتے ہیں۔

اس پر رسول اللہ (ﷺ) نے قرآن کی چند آیات پڑھیں ہمیں اسلام پر قائم رہنے کی تلقین فرمائی اور پھر فرمایا، میں تم سے اس بات پر بیعت لیتا ہوں کہ تم اپنی جانوں اور اپنے اہل و عیال کی مانند میری حمایت و حفاظت کرو گے۔

براءؓ بن معرور نے آپؐ کا دستِ مبارک اپنے ہاتھ میں لے لیا اور کہا:

''یا رسول اللہؐ خدائے برتر کی قسم ہم اپنی جانوں اور مالوں کے ساتھ آپ کی حفاظت کریں گے، ہم نے تلواروں کی گود میں پرورش پائی ہے اور جنگ آزمائی ہم نے اپنے باپ دادا سے ورثے میں پائی ہے۔ ان کی بات کاٹ کر ابوالہیثم بن التّیہان نے کہا، یا رسول اللہ اس وقت ہمارے اور یہود کے مابین معاہدات ہیں جو بیعت کے بعد فسخ ہو جائیں گے ایسا تو نہ ہو گا کہ آپ قوت اور اقتدار پا کر ہمیں چھوڑ دیں اور اپنے قبیلے میں واپس تشریف لے جائیں۔

حضوؐر نے مسکرا کر جواب دیا، نہیں میرا خون تمھارا خون اور میرا ذمہ تمھارا ذمّہ ہے میں تمھارا ہوں اور تم میرے ہو تم جس سے لڑو گے میں بھی اس سے لڑوں گا اور تم جس سے صلح کرو گے میں بھی اس سے صلح کروں گا۔''

حضوؐر کے ارشادات سُن کر حضرت کعبؓ سمیت مدینہ کے سبھی اہلِ ایمان آپ کی بیعت سے سعادت اندوز ہو گئے۔ اہل مدینہ اس بیعت پر ہمیشہ فخر کیا کرتے تھے بعض اوقات تو ان میں اس بات پر بحث ہو جاتی تھی کہ لیلۃ العقبہ میں کس کو سب سے پہلے حضوؐر کی بیعت کا شرف حاصل

ہوا تھا۔ بنونجّار کہتے تھے کہ اوّلین بیعت کرنے والے اسعدؓ بن زرارہ نجّاری تھے، بنوعبد الاشہل حضرت ابوالہیثمؓ بن التیہان کا نام لیتے تھے اور بنوسلمہ کا دعویٰ تھا کہ سب سے پہلے یہ سعادت کعبؓ بن مالک کو حاصل ہوئی۔

بہ ہر حال بیعت کے بعد حضوؐر نے انصار کو ہدایت فرمائی کہ تم اپنے میں سے بارہ نقیب منتخب کرلو۔ انھوں نے حضوؐر کے ارشاد کی تعمیل میں نو نقیب قبیلہ خزرج میں سے اور تین اوس میں سے منتخب کرلیے۔ ابنِ ہشامؒ کا بیان ہے کہ حضرت کعبؓ بن مالک نے اس واقعہ سے متعلق ایک نظم لکھی جس میں ان تمام نقباء کے نام بیان کیے۔ صحیح بخاری کی ایک روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت کعبؓ بن مالک بیعت عقبہٗ کبیرہ میں اپنی شرکت پر ہمیشہ فخر کیا کرتے تھے۔ (اظہارِ تشکّر کے طور پر کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں اس عظیم شرف سے بہرہ ور کیا)۔

(۳)

قبولِ اسلام سے پہلے حضرت کعبؓ بن مالک کی کنیت ابوبشیر تھی جب وہ سعادت اندوزِ ایمان ہوئے تو رحمتِ عالم ﷺ نے حکم دیا کہ اب تمھاری کنیت ابوبشیر کے بہ جائے ابوعبداللہ ہوگی۔ چناں چہ ان کی اسی کنیت نے شہرت پائی۔ ہجرت کے چند ماہ بعد نبی اکرم ﷺ نے مہاجرین اور انصار کے درمیان مؤاخاۃ قائم کرائی تو حضرت کعبؓ بن مالکؓ کو حضرت طلحہؓ بن عبید اللہ کا اسلامی بھائی بنایا جو اصحابِ عشرہ مبشرہ میں سے ایک ہیں۔

حضرت کعبؓ نہ صرف صاحبِ سیف تھے بلکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں قاطع شرک زبان بھی عطا کر رکھی تھی۔ ان کا شمار مشہور شعرائے مخضر میں ہوتا ہے یعنی وہ زمانۂ جاہلیت میں بھی مشہور شاعر تھے اور زمانۂ اسلام میں بھی۔ حافظ ابن عبد البرؒ کا بیان ہے کہ مشرکین کی ہجو گوئی کی خدمت انصار کے تین شخصوں نے اپنے ذمہ لی یعنی حسانؓ بن ثابت، کعبؓ بن مالک اور عبد اللہؓ بن رواحہ نے۔

حضرت حسانؓ اپنے کلام میں مشرکین کے نسب پر اس طرح طعنہ زن ہوتے تھے کہ وہ سر پیٹ کر رہ جاتے تھے۔ حضرت عبد اللہؓ بن رواحہ کفّار کو گم راہ ہونے پر ملامت کرتے رہتے تھے۔ حضرت کعبؓ اپنے اشعار میں کفّار کو لڑائی کی دھمکیاں اس انداز سے دیتے تھے کہ وہ دہشت زدہ ہوجاتے تھے۔ ایک روایت میں ہے کہ غزوۂ خیبر کے بعد جب قبیلہ دوس نے حضرت

کعبؓ کے یہ شعر سنے تو سارا قبیلہ اسی وقت مسلمان ہو گیا:

قضینا من تھامۃ کل وتر و خیبر ثم اغمدنا السیوفا

یخرھا و لو نطقت لقالت قواطعھن دوسا او ثقیفا

''ہم نے تہامہ اور خیبر سے نپٹ لینے کے بعد اپنی تلواریں نیام میں کرلیں اب ہم پھر اٹھاتے ہیں اور اگر بول سکیں تو کہیں کہ اب دوس یا ثقیف کی باری ہے۔''

رحمتِ عالم ﷺ کو حضرت کعبؓ کا کلام اس قدر پسند تھا کہ ایک مرتبہ آپؐ بہ نفس نفیس ان کے مکان پر تشریف لے گئے اور تین بار فرمائش کر کے ان سے اشعار سُنے۔

حضرت کعبؓ بدر اور تبوک کے سوا تمام غزوات میں رحمتِ عالم ﷺ کے ہم رکاب رہے اور ہر معرکہ میں شجاعت کے جوہر دکھائے۔ غزوۂ بدر میں ان کے تیار ہونے سے پہلے ہی رسولِ اکرمؐ مدینہ سے روانہ ہو گئے اس لیے وہ اس میں شرکت سے محروم رہ گئے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ وہ اس محرومی کی تلافی یہ کہہ کر کیا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے لیلۃ العقبہ میں شریک ہونے کی سعادت نصیب کی جس کو بدر پر فضیلت حاصل ہے۔

غزوۂ اُحد میں انھوں نے اپنے مواخاتی بھائی حضرت طلحہؓ کی طرح بے مثال شجاعت اور استقامت کا مظاہرہ کیا اور لڑائی میں گیارہ زخم کھائے۔ عین معرکۂ کارزار میں جب سرورِ عالم ﷺ کی شہادت کی خبر مشہور ہوئی تو صحابہ کرامؓ پر رنج وغم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اتفاق سے حضرت کعبؓ کی نظر حضورؐ پر پڑی، وہ آپ کو سلامت دیکھ کر جوشِ مسرّت میں پکارے:

''یہ رسول اللہ ہیں۔''

حضورؐ نے اشارہ سے فرمایا۔ ''خاموش رہو۔''

(۴)

غزوۂ تبوک کے سلسلے میں حضرت کعبؓ بن مالک کو ایک شدید امتحان میں مبتلا ہونا پڑا جسے ایک طویل روایت میں انھوں نے خود بیان کیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے:

۹ھ میں رسولِ اکرم ﷺ کو اطلاع ملی کہ روم کا بادشاہ مدینہ منوّرہ پر حملہ کرنے کا ارادہ کر رہا ہے اور بہت بڑا لشکر لے کر شام کے راستہ سے عرب کی طرف بڑھ رہا ہے۔ حضورؐ نے اعلان فرما دیا کہ ہم آگے بڑھ کر عرب کی سرحد پر رومیوں کا مقابلہ کریں گے۔ اس کے ساتھ ہی

آپ نے صحابہ کرامؓ کو غزوۂ تبوک کی تیاری کا حکم دیا۔ اس سال بارش نہ ہونے کی وجہ سے ملک میں قحط پڑ رہا تھا اور شدّت کی گرمی تھی۔ اہلِ مدینہ کی روزی کا انحصار کھجوروں کی فصل پر تھا جو پکنے کے بالکل قریب تھی۔ اس موسم میں وہ باہر نہیں جاتے تھے لیکن حضوؐر کا حکم سنتے ہی سوائے چند منافقوں اور معذور مسلمانوں کے سب مسلمان دل و جان سے جہاد کی تیاریوں میں مشغول ہو گئے۔ البتہ منافقین اور معذورین کے علاوہ تین سچے مسلمان بھی ایسے تھے جو کسی قوی عذر کے بغیر اس لڑائی میں شریک نہ ہو سکے۔ ایک کعبؓ بن مالکؓ دوسرے ہلالؓ بن امیہ اور تیسرے مرارہؓ بن ربیع۔ اس کا سبب یہ نہ تھا کہ ان کے دل میں کوئی نفاق تھا بلکہ محض سستی اور کاہلی نے انھیں غزوہ میں شرکت کی سعادت سے محروم رکھا۔

حضرت کعبؓ ان دنوں بہت آسودہ حال تھے، سفر کے لیے انھوں نے دو اونٹنیاں بھی خرید لی تھیں۔ اور دوسرا سامان بھی مہیّا کر لیا تھا لیکن لشکرِ اسلام کے کوچ کے وقت تساہل میں مبتلا ہو گئے کہ ایسی بھی کیا جلدی ہے کل جا ملوں گا، دوسرے دن بھی سستی نے غلبہ کیا اور وہ نہ جا سکے۔ غرض اسی حیص بیص میں کئی دن گزر گئے حتیٰ کہ انھیں حضوؐر کے تبوک پہنچنے کی خبر ملی، اس وقت تیس ہزار جاں نثار آپؐ کے ہم رکاب تھے لیکن کعبؓ ان میں نہیں تھے۔ حضورِ اکرمؐ کو حضرت کعبؓ سے بڑا تعلقِ خاطر تھا آپؐ نے تبوک پہنچ کر بہ طورِ خاص دریافت فرمایا کہ کعبؓ نظر نہیں آئے کیا بات ہوئی، ایک صاحب نے کہا، یا رسول اللہ اس کو اپنے مال و جمال کی اکڑ نے روکا، حضرت معاذؓ بن جبل نے ان کی بات کی تردید کرتے ہوئے عرض کی، یا رسول اللہ جہاں تک ہمیں علم ہے کعب بھلا آدمی ہے۔ اس پر حضورِ اقدسؐ نے سکوت فرمایا اور کچھ نہ بولے۔

حضوؐر غزوۂ تبوک سے واپس تشریف لائے تو بعض لوگوں نے حضرت کعبؓ کو طرح طرح کے حیلے بہانے سمجھائے کہ یوں کہہ دو تو حضوؐر درگزر فرمائیں گے لیکن کعبؓ نے تہیّہ کر لیا کہ حضوؐر کے سامنے اپنی خطا کا صاف اقرار کر لوں گا اور کوئی بہانہ ہرگز نہ تراشوں گا۔

اسّی کے قریب اور لوگ بھی تھے جو تبوک نہیں گئے تھے وہ سب حضوؐر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنے اپنے عذر بیان کیے۔ حضوؐر نے سب کو معاف کر دیا۔ حضرت کعبؓ بارگاہِ رسالت میں پیش ہوئے تو حضوؐر نے مسکرا کر پوچھا۔ ''کعب تم غزوہ میں کیوں شریک نہیں ہوئے کیا بیمار تھے یا سامان نہ تھا؟''

عرض کیا۔ ''یا رسول اللہ مجھے کوئی عذر نہ تھا، بالکل تندرست و توانا تھا اور سامان بھی تھا محض میرے نفس کی سستی اور تذبذب نے مجھے شرکتِ جہاد سے محروم رکھا۔''

حضورؐ نے فرمایا۔ ''تم نے سچ کہا اب گھر جاؤ اور حکمِ خداوندی کا انتظار کرو۔''

یہی صورت حضرت مرارہؓ بن ربیع اور ہلالؓ بن امیہ کے ساتھ پیش آئی۔ حضورؐ نے تمام مسلمانوں کو منع کر دیا کوئی ان تینوں سے بات چیت نہ کرے۔ حضرت کعبؓ کہتے ہیں کہ بارگاہِ رسالتؐ سے واپس آیا تو میری قوم کے بعض لوگوں نے مجھے ملامت کی کہ تو نے اس سے پہلے کوئی گناہ نہیں کیا تھا اگر تو کوئی عذر کر دیتا تو حضورؐ قبول فرما لیتے۔ میں نے ان لوگوں کی بات رد کر دی لیکن اس دن سے زمین باوجود اپنی وسعت کے مجھے تنگ معلوم ہونے لگی، ہر شخص مجھ سے اجتناب کرتا تھا اور مجھے یہ فکر کھائے جاتی تھی کہ اس حال میں مر گیا تو حضورؐ جنازہ کی نماز بھی نہ پڑھیں گے اور خدانخواستہ حضورؐ کا وصال ہو گیا تو میں مسلمانوں کے نزدیک ہمیشہ مردود رہوں گا۔ غرض میں نے پچاس دن سخت ابتلا اور کرب کی حالت میں گزارے۔ میرے دونوں ساتھی تو شروع ہی سے اپنے گھروں میں چھپ کر بیٹھ گئے تھے۔ میں گھر سے نکل کر مسجد میں جاتا، نماز میں شریک ہوتا اور حضورؐ کی مجلس میں بھی حاضر ہوتا لیکن نہ حضورؐ اور نہ کوئی دوسرا مسلمان مجھ سے کوئی بات کرتا۔ میں حضورؐ کی طرف متوجہ ہوتا تو آپؐ منہ پھیر لیتے اور میری جانب سے اعراض فرماتے۔ ایک دن میں اپنے پڑوسی ابن عم ابوقتادہؓ کی دیوار پر چڑھا اور انھیں سلام کیا۔ انھوں نے سلام کا جواب نہ دیا۔ میں نے قسم دے کر ان سے پوچھا۔ ''ابوقتادہ تم خوب جانتے ہو کہ میں اللہ اور اللہ کے رسولؐ سے محبت رکھتا ہوں۔'' ابوقتادہ اس کے جواب میں بھی خاموش رہے۔ میں نے تین بار اپنے الفاظ کی تکرار کی تو وہ صرف اتنا بولے ''اللہ اور اللہ کا رسولؐ ہی بہتر جانتے ہیں۔'' یہ سُن کر میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اسی دوران میں ایک دن میں مدینہ کے بازار میں جا رہا تھا کہ ایک قبطی عیسائی ملاوہ غستان کے بادشاہ کا خط میرے نام لایا تھا جس میں شاہِ غسان نے لکھا تھا:

''ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تمھارے آقا نے تمھارے ساتھ بدسلوکی کی ہے اب میرے پاس چلے آؤ اور دیکھو کہ یہاں تمھاری کیسی عزت ہوتی ہے۔''

میں نے خط پڑھ کر انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا کہ مجھے یہ روزِ بد بھی دیکھنا تھا کہ ایک کافر مجھے راہِ حق سے ہٹانا چاہتا ہے اور میرے آقاؐ سے جدا کرنا چاہتا ہے۔ میں نے گھر پہنچ کر یہ

خط نذرِ آتش کر دیا۔ مقاطعہ کے چالیسویں روز حضورؐ نے مجھے پیغام بھیجا کہ اپنی بیوی سے الگ ہو جاؤ، میں نے قاصد سے پوچھا، کیا طلاق دے دوں؟ اس نے کہا ''نہیں بلکہ اس سے الگ رہو۔'' میں نے فوراً اپنی بیوی کو اس کے میکے بھیج دیا۔ پچاسویں دن میں صبح کی نماز پڑھ کر اپنے گھر کی چھت پر لیٹا ہوا تھا، زندگی مجھ پر دوبھر ہو رہی تھی اور سخت بے چین تھا کہ یکایک کوہِ سلع کی چوٹی سے کسی نے پکار کر کہا ''کعب، بشارت ہو۔'' میں یہ الفاظ سنتے ہی سجدے میں گر گیا اور فرطِ مسرت سے رونے لگا، بعد میں معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے فجر کی نماز کے بعد میری اور میرے دونوں ساتھیوں کی معافی کا اعلان فرما دیا تھا اور پہاڑ کی چوٹی سے پکارنے والے نے مجھے اسی کی اطلاع دی تھی، اس کے بعد ایک صاحب گھوڑا دوڑاتے میرے پاس آئے اور مجھے بشارت دی۔ میں نے اپنے دونوں کپڑے ان کی نذر کر دیے خود کسی سے مانگ کر کپڑے پہنے اور سیدھا حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا، اس وقت جو لوگ وہاں موجود تھے سب مجھے مبارک باد دینے دوڑے۔ سب سے پہلے طلحہؓ نے بڑھ کر مبارک باد دی اور مصافحہ کیا۔ میں ان کے اس اخلاق اور گرم جوشی کو کبھی نہ بھولوں گا۔ میں نے حضورؐ کو سلام کیا تو آپؐ کے رُخِ انور پر بشاشت پھیل گئی اور وہ چاند کی طرح چمکنے لگا۔ آپؐ نے فرمایا:

''کعب تمہاری زندگی میں ایسا مبارک دن کبھی نہیں آیا تمھیں مبارک ہو اللہ نے تمھاری توبہ قبول فرمائی۔''

میں نے عرض کیا۔ ''یا رسول اللہؐ میری توبہ کی تکمیل یہ ہے کہ میں اپنی تمام جائداد اور مال صدقہ کرتا ہوں۔'' حضورؐ نے فرمایا:

''نہیں اس میں تنگی ہے اپنے مال کا ایک حصہ صدقہ کرو۔''

میں نے خیبر کا حصہ راہِ حق میں دے دیا اور کہا ''اللہ نے میری راست گوئی کی وجہ سے مجھے نجات دی، ان شاء اللہ مرتے دم تک راست گوئی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑوں گا۔''

حضرت مرارہؓ اور حضرت ہلالؓ کی توبہ بھی اسی طرح قبول ہوگئی۔

قرآنِ کریم میں اس واقعہ کی طرف ان آیات میں اشارہ کیا گیا ہے:

وَ عَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ؕ حَتّٰۤى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَ ضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَ ظَنُّوْۤا اَنْ لَّا

مَلْجَاَ مِنَ اللّٰہِ اِلَّآ اِلَیْہِ ط ثُمَّ تَابَ عَلَیْھِمْ لِیَتُوْبُوْا ط اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ o (التوبہ:۱۱۸)

''اور ان تین شخصوں پر بھی، جن کو چھوڑ دیا گیا تھا۔ یہاں تک کہ جب زمین باوجود وسعت کے ان پر تنگ ہوگئی اور جو اپنی جانوں سے بیزار آ گئے اور سمجھ گئے کہ اللہ کے سوا اور کسی کے پاس پناہ نہیں، تو اللہ ان پر مہربان ہوا کہ توبہ کیے رہیں۔ بے شک اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔''

صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت کعبؓ اس واقعہ کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ اسلام لانے کے بعد اللہ نے مجھ پر کوئی ایسا احسان نہیں کیا جس کی وقعت میرے دل میں اس سچائی سے زیادہ ہو جس کا اظہار میں نے رسولؐ اللہ کے سامنے کیا۔ اگر میں جھوٹ بولتا تو اسی طرح ہلاک ہو جاتا جس طرح جھوٹ بولنے والے ہلاک ہوئے یعنی منافقین۔

(۵)

حضرت کعبؓ بن مالک کے صحیفۂ حیات میں سبقت فی الاسلام، حبِ رسول، غیرت دینی، خشیتِ الٰہی، حق شناسی اور راست گوئی کے ابواب سب سے نمایاں ہیں۔

علامہ ابن اسحاق نے حضرت تمیم داریؓ کے غلام ابوالحسنؓ سے روایت کی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی: وَالشُّعَرَآءُ یَتَّبِعُھُمُ الْغَاوٗنَ ''اور شاعروں کی پیروی کرنے والے تو گم راہ لوگ ہوتے ہیں۔'' تو حضرت کعبؓ بن مالک، حضرت حسانؓ بن ثابت اور حضرت عبداللہؓ بن رواحہ روتے ہوئے حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی:

''یارسول اللہ جس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی تو وہ جانتا تھا کہ ہم سب شاعر ہیں۔''

حضورؐ نے ان کو تسلی دی اور فرمایا کہ تم ان شعراء میں سے نہیں ہو جن کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ہے بلکہ ان لوگوں میں سے ہو جن کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ ذَکَرُوا اللّٰہَ کَثِیْرًا
(الشعراء:۲۲۷)

''ہاں مگر جو لوگ ایمان لائے اور اچھے اچھے کام کیے اور اللہ کا ذکر کثرت سے کیا۔''

ایک اور موقعے پر حضرت کعبؓ نے رحمتِ عالم ﷺ سے دریافت کیا:

''یارسول اللہ شعر گوئی کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں۔''

حضورؐ نے فرمایا:

''کوئی مضائقہ نہیں۔ مسلمان اس کی وجہ سے تلوار اور زبان دونوں سے جہاد کرتا ہے۔''

اخیر عمر میں حضرت کعبؓ کی بینائی جاتی رہی تھی، ان کے صاحب زادے عبدالرحمٰنؓ کہتے ہیں کہ میں اس زمانے میں اپنے والد کو ساتھ لے کر باہر جاتا تھا۔ جب میں ان کو لے کر جمعہ کے لیے نکلتا اور وہ جمعہ کی اذان سنتے تو بالالتزام حضرت ابوامامہ اسعدؓ بن زرارہ کے لیے مغفرت کی دعا کرتے۔ میں نے ان سے دریافت کیا کہ آپ ہمیشہ ایسا کیوں کرتے ہیں انھوں نے کہا، اے میرے بیٹے اسعدؓ وہ پہلے آدمی ہیں جو نبیٔ کریم ﷺ کی تشریف آوری سے قبل بقیع خضمات میں بنی بیاضہ کی قبروں کے قریب ہمیں جمعہ پڑھایا کرتے تھے۔ میں نے پوچھا اس وقت آپ کتنے آدمی تھے، کہا ''چالیس۔''

گویا حضرت اسعدؓ بن زرارہ کا جمعہ پڑھانا حضرت کعبؓ اپنے آپ پر احسان سمجھتے تھے اور ان کے لیے دعائے مغفرت کر کے وہ حقِ احسان ادا کرتے تھے۔

مسند ابوداؤد میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت کعبؓ بن مالک نے مسجد نبوی میں ایک صحابی پر قرض کا تقاضا کیا، شور وغل ہوا تو حجرۂ نبوی میں آواز پہنچی، حضورؐ نے کاشانۂ اقدس کا پردہ اٹھا کر فرمایا:

''کعب آدھا قرض معاف کردو۔''

حضرت کعبؓ فوراً بولے:

''یارسولؐ اللہ معاف کرتا ہوں۔''

سرورِ عالم ﷺ کی رحلت کے بعد حضرت کعبؓ بن مالک تقریباً انتالیس برس تک زندہ رہے۔ اس دوران میں کئی انقلابات آئے لیکن انھوں نے مسلمانوں کی باہمی لڑائیوں میں مطلق کوئی حصہ نہ لیا۔ البتہ حضرت عثمان ذوالنورینؓ کی شہادت پر وہ خاموش نہ رہ سکے اور اس سانحۂ جان گداز پر ایک دل دوز مرثیہ کہا۔

حضرت کعبؓ نے امیر معاویہؓ کے عہدِ حکومت میں کسی وقت وفات پائی۔ بعض اہلِ سیَر نے ان کا سالِ وفات ۵۰ ہجری لکھا ہے۔ اس وقت ان کی عمر ۷۷ برس کی تھی۔ انھوں نے اپنے پیچھے پانچ بیٹے چھوڑے۔ ان کے نام عبدالرحمٰن، عبداللہ، عبیداللہ، معبد اور محمد تھے۔ حضرت کعبؓ سے ۸۰ احادیث مروی ہیں، ان کے راویوں میں حضرت عبداللہؓ بن عباس، حضرت جابرؓ بن عبداللہ، حضرت ابوامامہؓ جیسے اکابر صحابہ اور حضرت امام محمد باقرؒ، علیؒ بن ابی طلحہ اور عمرؒ بن حکم بن ثوبان جیسے اکابر تابعین شامل ہیں۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت ابی بن کعب انصاریؓ

سیّدالمسلمین

(۱)

ہجرتِ نبوی سے چند سال بعد کا ذکر ہے کہ ایک دن میانہ قد اور اکہرے بدن کے ایک گورے چٹے پاکیزہ صورت آدمی بارگاہِ رسالتؐ میں حاضر ہوئے۔ انھوں نے بڑے ادب سے حضورؐ کو سلام کیا اور پھر آپؐ کی خدمت میں بیٹھ کر ارشاداتِ نبویؐ سے مستفیض ہونے لگے۔ یکا یک سرورِ عالم ﷺ پر آثارِ وحی طاری ہوئے اور زبانِ رسالت پر قرآنِ حکیم کی ایک سورۃ جاری ہوگئی[۱] وہ صاحب وحی الٰہی کا ایک ایک لفظ بہ غور سنتے اور اس کو لکھتے جاتے تھے۔ جب جبریلِ امینؑ پیغامِ الٰہی پہنچا کر واپس چلے گئے تو رحمتِ عالم ﷺ نے ان صاحب سے مخاطب ہو کر فرمایا:

''مجھے اللہ نے حکم دیا ہے کہ میں تم کو قرآن سنایا کروں (تاکہ تمھیں یاد ہو)'' ان صاحب نے عرض کیا: ''یارسول اللہ کیا اللہ تعالیٰ نے میرا نام لیا ہے؟''

حضورؐ نے فرمایا: ''ہاں''

یہ سُن کر وہ صاحب فرطِ مسرّت سے بے خود ہو گئے اور بے اختیار رونے لگے۔

یہ صاحبِؓ رسولؐ جن کا خود رب ذوالجلال والاکرام نے نام لے کر اپنے حبیب پاک ﷺ کو حکم دیا کہ ان کو قرآن سنائیں۔ سیدالمسلمین حضرت ابی بن کعب انصاری تھے۔

---

(۱) بعض روایتوں میں ہے کہ یہ سورۃ البیّنہ تھی۔

(۲)

سیّدنا حضرت ابیؓ بن کعب انصاری کا شمار تاریخِ اسلام کی اس مہتم بالشان شخصیتوں میں ہوتا ہے جن کو دربارِ رسالت میں نہایت ممتاز درجہ حاصل تھا اور جن کی جلالتِ قدر اور تبحر علمی پر مسلمانوں کے سبھی مکاتبِ فکر کا کامل اتفاق ہے۔ حضرت ابیؓ کا تعلق انصار کی نہایت معزز شاخ نجّار (خزرج) کے خاندانِ بنی جدیلہ سے تھا۔ شجرۂ نسب یہ ہے:

ابیؓ بن کعب بن قیس بن عبید بن زیاد بن معاویہ بن عمر بن مالک بن نجّار بن ثعلبہ بن عمرو بن خزرج الاکبر۔ والدہ کا نام صہیلہ تھا جو خاندان عدی بن نجّار سے تھیں۔

حضرت ابیؓ دو کنیتوں سے مشہور تھے ایک کنیت ابوالمنذر تھی جو رحمتِ عالم ﷺ نے رکھی تھی۔ دوسری کنیت ابوالطفیل تھی جو ان کے بیٹے طفیل کے نام کی نسبت سے حضرت عمر فاروقؓ نے رکھی تھی۔ سیّد الانصار، سیّد المسلمین اور سیّد القراء حضرت ابیؓ کے القاب تھے۔

حضرت ابیؓ کے لڑکپن اور جوانی کے حالات کتبِ سِیَر میں نہیں ملتے۔ البتہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اوائل عمر میں ہی لکھنا پڑھنا سیکھ گئے تھے اور ان کا شمار انصار کے تعلیم یافتہ لوگوں میں ہوتا تھا۔ مولانا سعید انصاری مرحوم نے سِیَر انصار میں یہ رائے ظاہر کی ہے کہ غالبًا حضرت ابیؓ اسلام سے پہلے توراۃ پڑھ چکے تھے اور اسی کا اثر تھا کہ اسلام کی آواز نے انھیں بہت جلد اپنی طرف متوجہ کرلیا۔

حضرت انسؓ بن مالک سے روایت ہے کہ حضرت ابیؓ عہد شباب میں دُخترِ رز کا شوق بھی کرتے تھے اور اُن (حضرت انسؓ) کے سوتیلے باپ ابوطلحہؓ کی محافل ناؤ نوش کے سرگرم رُکن تھے۔ (قبولِ اسلام کے بعد دونوں کا شمار جلیل القدر صحابہ میں ہوا۔ حضرت ابوطلحہؓ زید بن سہل انصاری، حضرت ابیؓ کے ماموں زاد بھائی تھے اور رزم و بزم میں ان کے ساتھی تھے)۔

حضرت ابیؓ کے سعادت اندوز ہونے کے بارے میں مشہور روایت یہ ہے کہ انھوں نے بیعتِ عقبۂ ثانیہ میں مکّہ جا کر رحمتِ عالم ﷺ کے دستِ مبارک پر بیعت کی۔ لیکن تاریخ و سِیَر کی اکثر کتابوں میں اصحابِ عقبہ ثانی کی جو فہرست دی گئی ہے اس میں حضرت ابیؓ بن کعب کا نام نہیں ہے۔ اس سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ وہ بیعتِ عقبہ سے پہلے ہی مشرف بہ اسلام

ہو چکے تھے۔ رہی یہ بات کہ وہ بیعتِ عقبہ میں شریک ہوئے یا نہیں اس میں اختلاف ہے۔ بہر صورت ہجرتِ نبویؐ سے پہلے ان کا شرفِ ایمان سے بہرہ ور ہونا سب کے نزدیک مسلم ہے۔

(۳)

ہجرت کے بعد سیّد الانام ﷺ نے مدینہ منوّرہ میں نزولِ اجلال فرمایا تو انصار میں سے حضرت ابیؓ بن کعب کو سب سے پہلے وحی لکھنے کا شرف حاصل ہوا۔ اس لحاظ سے ان کو انصاری کاتبین وحی میں امتیازی درجہ حاصل ہے۔

ہجرت کے چند ماہ بعد حضوؐر نے مہاجرین اور انصار کے مابین مواخاۃ قائم کرائی تو حضرت اُبیؓ کو جلیل القدر صحابی (یکے از عشرہ مبشرہ) حضرت سعیدؓ بن زید کا اسلامی بھائی بنایا۔

غزوات کا سلسلہ شروع ہوا تو حضرت ابیؓ بدر سے لے کر طائف تک تمام غزوات میں رحمتِ عالم ﷺ کے ہم رکاب رہے۔

حضرت جابرؓ بن عبد اللہ سے روایت ہے کہ حضرت اُبیؓ کو غزوۂ اُحد میں ایک تیر ہفت اندام میں لگا۔ جس سے وہ شدید زخمی ہو گئے۔ سرورِ عالم ﷺ کو اطلاع ملی تو آپؐ نے اس رگ کو اپنے ہاتھ سے داغ دیا اور حضرت ابیؓ کا زخم جلد ہی مندمل ہو گیا۔

حضرت ابیؓ کو رحمتِ عالم ﷺ سے بے پناہ محبت تھی اور کلامِ الٰہی سے بھی گہرا شغف تھا۔ چناں چہ وہ اپنے وقت کا بیشتر حصہ بارگاہِ نبویؐ میں گزارتے تھے۔ حضوؐر ان کو قرآن سناتے اور حفظ کراتے تھے اور کتابت وحی کی خدمت بھی لیتے تھے۔ اس طرح ان کو بارگاہِ رسالت میں خصوصی تقرب حاصل ہو گیا تھا۔ قرآنِ حکیم سے حضرت ابیؓ کا غیر معمولی شغف اس قدر مقبول ہوا کہ خود ذاتِ باری تعالیٰ نے حضرت اُبیؓ کا نام لے کر رسول اللہ ﷺ سے فرمایا کہ ان کو قرآن سنایا کریں۔ ارشادِ ربّانی کے مطابق حضورِ اکرمؐ نے حضرت ابیؓ کی تعلیم پر خاص توجہ فرمائی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ قرآنِ حکیم کے حافظ اور قرآنی علوم و معارف کے بہت بڑے عالم بن گئے۔ ان کی قرأت سرورِ عالم ﷺ کو اس قدر پسند تھی کہ ایک مرتبہ آپؐ نے فرمایا کہ ''لوگوں میں سب سے بڑے قاری ابیؓ بن کعب ہیں۔''

ایک دفعہ حضورؐ نے حضرت ابیؓ سے دریافت فرمایا کہ ''قرآن میں کون سی آیت بے انتہا عظمت کی حامل ہے؟''

حضرت ابیؓ نے عرض کیا: آیۃ الکرسی۔''

اُن کا جواب سن کر حضورؐ بہت خوش ہوئے اور فرمایا: ''ابیؓ تمھیں یہ علم مسرور کرے۔

رحمتِ عالم ﷺ نے حضرت اُبیؓ کو اجازت دے رکھی تھی کہ وہ جو چاہیں اور جب چاہیں آپؐ سے پوچھیں۔ چناں چہ وہ بڑی آزادی کے ساتھ فیضان نبوی سے خوب خوب فیضیاب ہوتے تھے۔ بعض اوقات سرورِ عالم ﷺ ان کو بغیر پوچھے بھی قرآنِ حکیم کے اسرار و رموز سے آگاہ فرماتے تھے۔

خود حضرت اُبیؓ بن کعب سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''ابیؓ کیا میں تجھ کو ایسی سورت نہ بتاؤں جو نہ توراۃ میں ہے نہ زبور میں اور نہ انجیل اور نہ قرآن ہی میں اس جیسی اتاری گئی۔''

میں نے عرض کیا۔ ''بے شک ضرور بتایئے۔''

آپؐ نے فرمایا: ''بے شک میں امید کرتا ہوں کہ تو اس دروازہ سے نکلنے نہ پائے گا یہاں تک کہ تو اس کو جان جائے گا۔'' اس کے بعد آپؐ کھڑے ہو گئے اور میں بھی آپؐ کے ساتھ کھڑا ہو گیا، آپؐ مجھ سے بات کر رہے تھے اور میرا ہاتھ آپ کے ہاتھ میں تھا تو میں نے پیچھے ہٹنا شروع کیا اس خوف سے کہ آپؐ اس سورۃ کی خبر دینے سے پہلے ہی دروازہ سے باہر نہ چلے جائیں۔ جب میں دروازہ کے قریب ہوا تو میں نے عرض کیا: ''یارسولؐ اللہ وہ سورۃ جس کا آپؐ نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے؟''

آپؐ نے فرمایا کہ:

''تم جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہو تو کس طرح پڑھتے ہو؟''

میں نے سورۂ فاتحہ پڑھی۔ آپ نے فرمایا وہ سورۃ یہی ہے اور یہ سبع مثانی ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے کہا ہے:

وَ لَقَدْ اٰتَیْنٰکَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَ الْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ۝

(الحجر:۸۷)

''اور ہم نے آپ کو سات آیتیں دیں جو مکرر پڑھی جاتی ہیں اور قرآنِ عظیم دیا۔''

رحمت عالم ﷺ کو حضرت اُبیؓ کے حفظِ قرآن اور حافظہ پر پورا اعتماد تھا۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ ایک دفعہ حضورؐ فجر کی نماز پڑھاتے ہوئے ایک آیت پڑھنا بھول گئے۔ نماز سے فارغ ہو کر حضورؐ کو خود اس آیت کا خیال آ گیا، صحابہؓ سے پوچھا کہ کسی نے میری قرأت پر خیال کیا تھا، تمام صحابہ خاموش رہے لیکن حضرت اُبیؓ بن کعب نے فوراً عرض کیا:

''یا رسولؐ اللہ میں بھی ٹھیک پڑھتا ہوں اور عبد اللہ بھی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

کہنے کو تو یہ الفاظ کہہ دیے لیکن رعب نبوّت نے جسم پر کپکپی طاری کر دی اور پسینے میں نہا گئے۔ حضورؐ نے ان کی حالت دیکھی تو ان کے سینے پر اپنا دست مبارک رکھ کر فرمایا:

''الٰہی اُبیؓ کا شک دور کر۔'' آناً فاناً ان کا دل وسوسہ سے پاک ہو گیا اور اس معاملے میں ان کو پورا اطمینان ہو گیا۔

رحمتِ عالم ﷺ کا سحابِ لطف و کرم حضرت اُبیؓ پر ایسا جھوم جھوم کر برسا کہ وہ عہدِ رسالت میں ہی مسندِ درس و افتا پر فائز ہو گئے۔ لوگ ان سے قرآن پڑھتے اور مختلف مسائل دریافت کرتے تھے۔ ایک دفعہ ایک ایرانی صاحبِ رسول نے ان سے قرآن پڑھنا شروع کیا، جب اس آیت پر پہنچے ''اِنَّ شَجَرَةَ الزَّقُّوْمِ طَعَامُ الْاَثِیْمِ'' تو ایرانی صحابیؓ کی زبان سے اثیم کی بہ جائے یتیم نکلتا تھا۔ بہت کوشش کی لیکن ان سے صحیح تلفظ ادا نہ ہو سکا۔ بالآخر ان کو ساتھ لے کر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی مشکل بیان کی۔ حضورؐ نے ایرانی سے فرمایا۔ ''کہو طعام الظالم'' انھوں نے یہ الفاظ بالکل صحیح ادا کیے، سرورِ عالمؐ نے حضرت ابیؓ سے فرمایا۔ ''اس کی زبان درست کرنے کی کوشش کرتے رہو، اللہ تمھیں اس کا اجر دے گا۔''

مشہور صحابی حضرت طفیلؓ بن عمرو دوسی نے حضرت اُبیؓ بن کعب سے قرآن پڑھا تو انھوں نے ایک کمان ہدیتاً پیش کی۔ حضرت اُبیؓ اس کو لگا کر بارگاہِ نبوت میں حاضر ہوئے تو حضورؐ

نے پوچھا۔ ''اُبیؓ یہ کمان کس نے دی ہے؟'' عرض کیا۔ ''طفیل بن عمرو دوسی نے، میں نے اُسے قرآن پڑھایا ہے۔''
حضورؐ نے فرمایا:

''اس کو واپس کر دو ورنہ یہ جہنم کے ایک ٹکڑے کا قلاوہ بن جائے گی۔''

انھوں نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ! ہم اپنے شاگردوں کے ہاں کھانا بھی کھا لیتے ہیں؟'' فرمایا: ''وہ کھانا بہ طور خاص تمھارے لیے تیار نہیں کیا جاتا، اگر تم کھانے کے موقع پر پہنچ گئے اور اس میں شریک ہو گئے تو اس میں کوئی حرج نہیں لیکن جو چیز خاص تمھارے لیے تیار کی جائے اگر تم اس کو استعمال کر لو تو اپنی آخرت کے اجر کو ضائع کرو گے۔''

ایک اور روایت میں خود حضرت اُبیؓ بن کعب کہتے ہیں کہ میں نے ایک آدمی کو قرآن کی ایک سورۃ سکھائی اس نے میرے پاس ایک کپڑا ہدیتاً بھیجا۔ میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس کا ذکر کیا تو آپؐ نے فرمایا۔ ''اگر تو نے اسے لے لیا تو تجھے آگ کا کپڑا پہنایا جائے گا۔''

حضرت اُبیؓ رحمتِ عالم ﷺ کے ارشادات کا ایک ایک لفظ بہ غور سنتے تھے اور اس کو حرزِ جان بنا لیتے تھے۔ ایک دفعہ بارگاہِ رسالت میں حاضر تھے کہ ایک شخص نے حضورؐ سے سوال کیا:

''یا رسول اللہ ہم لوگ جو بیمار ہوتے ہیں یا دوسری تکلیفیں اٹھاتے ہیں اس میں بھی کچھ ثواب ہے؟''

حضورؐ نے فرمایا:

''ہاں یہ بیماریاں اور تکلیفیں مسلمان کے گناہوں کا کفّارہ بن جاتی ہیں۔''

حضرت اُبیؓ نے پوچھا: ''یا رسول اللہ کیا معمولی تکلیفیں بھی گناہ کا کفارہ ہو جاتی ہیں؟''
فرمایا: ''چھوٹی چھوٹی تکلیفیں کیا، مسلمان کو ایک کانٹا بھی چبھ جائے تو وہ اس کے گناہ کا کفّارہ بن جاتا ہے۔''

یہ سنتے ہی جوشِ ایمان کی یہ کیفیت ہوئی کہ بے ساختہ زبان پر یہ دعا جاری ہو گئی۔
''الٰہی میں ہمیشہ بخار میں مبتلا رہوں مگر نماز با جماعت، حج، عمرہ اور جہاد کے قابل رہوں۔''

یہ دعا فوراً درِ اجابت پر پہنچ گئی۔ اہلِ سِیَر کا بیان ہے کہ اس کے بعد حضرت اُبیؓ کو ہر وقت خفیف سی حرارت رہتی تھی۔ شاید اس کی وجہ سے ان کے مزاج میں قدرے حِدّت پیدا ہو گئی تھی۔

۹ھ میں رحمتِ عالم ﷺ نے حضرت اُبیؓ کو قبائل بلی، عذرہ اور بنوسعد میں عامل صدقات بنا کر بھیجا۔ انھوں نے اپنے فرائض نہایت دیانت اور جفاکشی کے ساتھ انجام دیے۔ ایک دفعہ کسی گاؤں میں گئے تو ایک شخص نے اپنے تمام جانوران کے سامنے لاکر کھڑے کر دیے کہ ان میں سے آپ جو چاہیں چن لیں۔ انھوں نے اونٹ کا ایک دوسالہ بچہ لے لیا۔ جانوروں کے مالک نے کہا:

''یہ بچہ آپ کے کس کام کا، یہ جوان اور فربہ اونٹنی لے جائیں۔''

حضرت اُبیؓ نے کہا:

''نہیں نہیں یہ رسول اللہ ﷺ کے حکم کے خلاف ہے بہتر یہ ہے کہ تم میرے ساتھ مدینہ منورہ حضورؐ کی خدمت میں چلو، آپؐ جو حکم دیں گے اس کی تعمیل کرنا۔''

جانوروں کے مالک بڑے مخلص مسلمان تھے وہ حضرت اُبیؓ کے ساتھ بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے اور وہی اونٹنی حضورؐ کی خدمت میں پیش کی۔

آپؐ نے فرمایا:

''اگر تم یہی اونٹنی بہ خوشی دینا چاہتے ہو تو دے دو اللہ تعالیٰ تمھیں اس کا اجر دے گا،

انھوں نے بہ رضا و رغبت یہ اونٹنی صدقہ میں دے دی اور خوش خوش اپنے گاؤں کو مراجعت کی۔

ایک دفعہ حضرت اُبیؓ نے کہیں سے ایک تھیلی پڑی پائی۔ کھول کر دیکھا تو اس میں سو دینار تھے۔ دوڑے دوڑے حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور واقعہ عرض کیا —— آپؐ نے فرمایا کہ سال بھر تک اس کا اعلان کرتے رہو۔ وہ سال بھر ان دیناروں کا اعلان کرتے رہے لیکن کسی نے ان کی ملکیت کا دعویٰ نہ کیا۔ حضرت اُبیؓ پھر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا:

''یا رسول اللہ میں سال بھر تک لوگوں کو خبر کرتا رہا لیکن کوئی یہ رقم لینے نہیں آیا۔''

حضورؐ نے فرمایا:

''ایک سال اور انتظار کرو، اگر کوئی شخص رقم کی مقدار اور تھیلی کا نشان بتا کر ان دیناروں کا دعویٰ کرے تو اس کے حوالے کر دینا۔ ورنہ یہ مال تمھارا ہو چکا۔''

حضرت اُبیؓ کو قرأتِ قرآن میں ایسا کمال حاصل ہو گیا تھا کہ خود حاملِ وحی و نبوت ﷺ ان سے قرآن کا دورہ فرمایا کرتے تھے۔ اپنے سالِ رحلت (۱۱ھ) میں بھی حضرت اُبیؓ کو آخری بار

قرآن سنایا اور ساتھ ہی ارشاد فرمایا:

"مجھے جبریلِ امینؑ نے آکر کہا ہے کہ اُبیؓ کو قرآن سنا دیجیے۔"

(۴)

رحمت عالم ﷺ کے وصال کے بعد خلافت کا مسئلہ پیدا ہوا تو حضرت اُبیؓ ان چند صحابہ میں سے تھے جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو خلافت کا مستحق سمجھتے تھے تاہم جب جمہور مسلمانوں کی رائے کے مطابق حضرت ابوبکرؓ مسند آرائے خلافت ہوئے تو حضرت اُبیؓ نے خوش دلی سے ان کی بیعت کرلی۔ صدیقِ اکبرؓ حضرت اُبیؓ کا بے حد احترام کرتے تھے۔ جب انھوں نے قرآن حکیم کی ترتیب وتدوین کا کام اہلِ علم صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت کے سپرد کیا تو حضرت اُبیؓ کو اس جماعت کا امیر مقرر کیا۔ وہ قرآن کے الفاظ بولتے جاتے تھے اور لوگ ان کو لکھتے جاتے تھے اگر کسی آیت کی تقدیم وتاخیر کے بارے میں اختلاف ہو جاتا تو سب اس کو مل کر طے کرتے تھے۔ صدیقِ اکبرؓ کے بعد حضرت عمر فاروقؓ منصبِ خلافت پر فائز ہوئے تو انھوں نے حضرت اُبیؓ کو مجلس شوریٰ کا رکن نامزد کیا۔ وہ حضرت اُبیؓ کی جلالتِ علمی اور اصابتِ رائے کے بے حد معتقد تھے اور ان کا غیر معمولی اعزاز واکرام کرتے تھے اور اہم ملکی اور دینی معاملات میں ان کی رائے کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔

حافظ ابنِ حجر عسقلانیؒ نے اصابہ میں لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ ان (حضرت اُبیؓ) کو سیّد المسلمین کہتے تھے اور فرماتے تھے کہ "ہم میں سب سے بڑے قاری اُبیؓ ہیں۔" اسی طرح حافظ ابن عبد البرؒ "الاستیعاب" میں لکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ سے متعدد طرق سے یہ روایت ہم کو پہنچی ہے کہ آپؓ نے کہا، ہم میں علم قضا کے سب سے بڑے ماہر علیؓ بن ابی طالب اور حفظ قرآن میں سب سے بڑے اُبیؓ ہیں۔

سید محمد علی بلاوی نے اپنی کتاب "التعرف بالنبی والقرآن الشریف" میں مستند حوالوں کے ساتھ لکھا ہے کہ:

"حضرت عمرؓ مشکل مسائل میں حضرت ابیؓ کی طرف رجوع کیا کرتے تھے اور پیچیدہ مقدمات میں ان سے فیصلہ کراتے تھے اور آپؓ انہیں سیّد المسلمین اور سیّد القراء کے القاب سے یاد کرتے تھے۔"

حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں نمازِ تراویح کو با جماعت کیا تو حضرت ابیؓ بن کعب کو مردوں کا اور حضرت سلیمانؓ بن ابی حثمہ کو عورتوں کا امام مقرر فرمایا۔ امیر المومنین حضرت عمرؓ اگرچہ حضرت اُبیؓ پر بے حد مہربان تھے اور ان کی تعظیم و تکریم میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے تھے لیکن حضرت ابیؓ دینی معاملات میں مطلق اُن کی رُو رعایت نہ کرتے اور جس بات کو حق سمجھتے برملا اس کا اظہار کر دیتے تھے۔ کنز العمال میں ہے کہ:

> ''حضرت عمرؓ کا ایک شخص پر گزر ہوا جو یہ آیت پڑھ رہا تھا۔ **وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ**، آپؓ ٹھہر گئے اور کہا ذرا ادھر تو آؤ، وہ آپؓ کے پاس آیا تو آپؓ نے پوچھا، تمہیں یہ آیت کس نے یاد کرائی ہے۔ اس نے کہا یہ مجھے اُبیؓ بن کعب نے یاد کرائی ہے۔ آپؓ نے فرمایا کہ چلو اُبیؓ بن کعب کے پاس۔ وہ آپ کو ساتھ لے کر اُبیؓ کے پاس آیا۔ آپؓ نے فرمایا کہ ''اے ابا المنذر یہ شخص کہتا ہے کہ تم نے اسے یہ آیت تعلیم کی ہے۔'' اُبیؓ نے کہا سچ کہتا ہے۔ میں نے یہ آیت رسول اللہ ﷺ کے دہن مبارک سے سنی ہے۔ حضرت عمرؓ نے (تعجب سے) کہا۔ ''تم نے اس کو محمد ﷺ کے دہن مبارک سے سنا ہے۔'' اُبیؓ نے کہا۔ ''ہاں'' تیسری بار پوچھنے پر بڑے غصہ سے کہا کہ ''ہاں خدا کی قسم! اس کو اللہ نے جبریلؑ کے واسطے محمد ﷺ کے قلب پر نازل کیا۔ بے شک خطّاب اور اس کے بیٹے سے مشورہ نہیں لیا۔'' یہ سن کر حضرت عمرؓ وہاں سے باہر نکلے اس طرح کہ دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا رکھے تھے اور کہہ رہے تھے اللہ اکبر، اللہ اکبر۔''

اسی سلسلے میں کنز العمال میں اور روایتیں بھی ملتی ہیں ان میں سے کچھ یہ ہیں:

> ایک دفعہ حضرت ابو درداءؓ اہلِ شام کی ایک بڑی جماعت کو اپنے ساتھ مدینہ منوّرہ لائے۔ ان لوگوں نے حضرت اُبیؓ سے قرآن کی تعلیم حاصل کی۔ ایک دن ان میں سے ایک شخص نے حضرت عمرؓ کے سامنے کوئی آیت پڑھی۔ حضرت عمرؓ نے اس کی قرأت پر اعتراض کیا۔ اس نے کہا میں نے اُبیؓ بن کعب سے یہ آیت اسی طرح سُنی ہے۔ حضرت عمرؓ نے ایک آدمی کو بھیجا کہ اُبیؓ کو بلا لاؤ۔ اس وقت اُبیؓ اپنے اونٹ کو چارہ دے رہے تھے۔ امیر المومنین کا پیغام ملا تو قاصد سے پوچھا کہ کیا کام ہے؟ انھوں نے واقعہ بیان کیا تو حضرت اُبیؓ کو غصّہ آ گیا اور اس حالت میں دربارِ خلافت میں حاضر

ہوئے کہ ہاتھ میں چارہ تھا اور دامن چڑھا رکھا تھا، حضرت عمرؓ نے وہ آیت ان سے پڑھوائی۔ اس کے بعد حضرت زیدؓ بن ثابت کو حکم دیا کہ وہی آیت پڑھیں، انھوں نے حکم کی تعمیل کی۔ تو ان کی قرأت حضرت اُبیؓ کی قرأت سے کسی قدر مختلف تھی۔ حضرت عمرؓ نے حضرت زیدؓ کی تائید کی۔ اس پر حضرت اُبیؓ نے خشم ناک ہو کر کہا۔ ''عمرؓ خدا کی قسم! آپؓ جانتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس اندر ہوتا تھا اور آپ لوگ باہر کھڑے رہتے تھے۔ اب آج میری یہ قدر افزائی کی جارہی ہے۔ خدا کی قسم اگر آپ کہیں تو میں خانہ نشین ہو جاؤں نہ کسی سے کلام کروں اور نہ لوگوں کو قرآن پڑھاؤں یہاں تک کہ مجھ پر موت وارد ہو جائے۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا:

''ہرگز نہیں جب اللہ نے آپؓ کو علم دیا ہے۔ تو آپؓ شوق سے لوگوں کو قرآن کی تعلیم دیں۔''

ایک اور موقع پر حضرت عمرؓ نے حضرت ابیؓ بن کعب پر کسی آیت کی قرأت کے متعلق اعتراض کیا تو انھوں نے برہم ہو کر کہا۔ ''میں نے رسول اللہ ﷺ سے خود سنا ہے اور آپ کو بقیع کے بازار میں خرید و فروخت سے فرصت نہ تھی۔'' حضرت عمرؓ نے (جن کو اُبیؓ کا بڑا لحاظ تھا اور وہ ان سے الجھنا نہیں چاہتے تھے) فرمایا ''تم ٹھیک کہتے ہو۔''

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ میں مدینہ کی ایک گلی میں قرآن مجید کی ایک آیت پڑھتا ہوا جارہا تھا، اتنے میں پیچھے سے آواز آئی ''سند بتاؤ! اے ابن عباسؓ سند بتاؤ۔'' میں نے مڑ کر دیکھا تو حضرت عمرؓ تھے، میں نے کہا، میں آپؓ کو اُبیؓ بن کعب کا حوالہ دیتا ہوں۔ یہ سُن کر انھوں نے اپنے ایک غلام سے کہا کہ اُبیؓ کے پاس جا اور ان سے دریافت کر کہ کیا تم نے ان کو یہ آیت یاد کرائی ہے۔ ہم اُبیؓ کے پاس گئے، ابھی ہم ان کے دروازے پر پہنچے تھے کہ خود حضرت عمرؓ آگئے اور اندر آنے کی اجازت طلب کی۔ اُبیؓ نے اجازت دے دی۔ ہم لوگ اُبیؓ کے پاس ایسی حالت میں پہنچے کہ ان کی کنیز ان کے سر میں کنگھی کر رہی تھی۔ حضرت عمرؓ کے لیے چمڑے کا ایک ٹکڑا ڈال دیا گیا۔ وہ اس پر بیٹھ گئے۔ اُبیؓ بن کعب دیوار کی طرف منہ کیے بیٹھے تھے وہ اسی طرح بیٹھے رہے اور ان کی پشت حضرت عمرؓ کی طرف تھی۔ یہ دیکھ کر حضرت عمرؓ نے ہماری طرف

رُخ کیا اور کہا۔ ''دیکھو تو اس (اُبیؓ) کو ہماری پرواہی نہیں۔'' تھوڑی دیر بعد اُبیؓ بن کعب نے حضرت عمرؓ کی طرف رُخ کیا اور کہا'' خوش آمدید امیر المومنین اس وقت کیسے تشریف آوری ہوئی؟ صرف ملاقات کے لیے یا کسی اور غرض سے؟'' حضرت عمرؓ نے کہا۔ ''میں کسی غرض ہی سے آیا ہوں۔ آخر تم لوگوں کو اللہ کی رحمت سے کیوں مایوس کرتے ہو؟''

اُبیؓ نے کہا۔ ''اچھا شاید کوئی آیت آپؓ نے سنی ہے جو سخت ہے۔ آپ کو علم ہونا چاہیے کہ میں نے قرآن اس ہستی سے سیکھا ہے جس نے تازہ تازہ اس کو جبریل امین سے حاصل کیا تھا۔'' یہ سُن کر حضرت عمرؓ نے ہاتھ پر ہاتھ مارا اور یہ کہتے ہوئے کھڑے ہوگئے، خدا کی قسم تم احسان جتانا چاہتے ہو لیکن میری تشفی نہیں ہوئی تم کسی طرح (اپنی بات کہنے سے) باز نہ آؤ گے اور مجھے کسی طرح تاب نہ آئے گی۔''

کبھی کبھی اختلافِ رائے ہو جانے کے باوجود حضرت عمرؓ، حضرت ابیؓ کے دل سے قدردان اور مدّاح تھے۔ شام کے مشہور سفر میں انھوں نے جابیہ کے مقام پر جو خطبہ دیا اس میں فرمایا:

''من اراد القرآن فلیاتِ ابیّا''

''جس کو قرآن کا شوق ہو وہ ابیؓ کے پاس جائے۔''

حضرت عثمان ذوالنورینؓ بھی حضرت ابیؓ کے تبحر علمی کے معترف تھے۔ انھوں نے اپنے دورِ خلافت میں محسوس کیا کہ بعض صحابہ کی قرأت میں اختلاف ہے۔ چناں چہ انھوں نے پختہ ارادہ کرلیا کہ تمام مسلمانوں کو ایک قرأت پر جمع کروں گا۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے انصار اور مہاجرین میں سے بارہ ایسے صحابہ منتخب کیے جن کو قرآن پر پورا عبور تھا اور پھر انہیں یہ کام سونپا کہ باہمی مشورہ سے قرأت کا اختلاف دُور کریں۔ اس مجلس کے امیر حضرت ابیؓ مقرر ہوئے۔ وہ بولتے جاتے تھے اور حضرت زیدؓ بن ثابت لکھتے جاتے تھے۔ جہاں اختلاف پیدا ہوتا سب آپس میں مشورہ کرکے اس کو دور کرلیتے۔ کنز العمال میں ہے کہ اس کے بعد قرآنِ حکیم کے تمام نسخے حضرت ابیؓ کی قرأت کے مطابق ہوگئے۔ لیکن بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت اُبیؓ، حضرت عمر فاروقؓ کے عہدِ خلافت میں (۱۹ یا ۲۰ یا ۲۲ھ) وفات پاچکے تھے۔ سب سے مشہور

روایت یہ ہے کہ انھوں نے بہ زمانہ حضرت عثمان ۳۲ھ میں وفات پائی۔ اختلافِ قرأت دور کرنے والی روایت اسی صورت میں صحیح ہوسکتی ہے جب حضرت اُبیؓ کی وفات ۳۲ھ میں تسلیم کی جائے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

حضرت ابیؓ نے اپنے پیچھے جو اولاد چھوڑی اس میں سے طفیل، محمد، ربیع، عبداللہ اور اُمِ عمر کے نام معلوم ہیں ان کی اہلیہ اُمِ طفیلؓ بھی صحابیہ تھیں۔

(۵)

حضرت اُبیؓ علم و فضل کا مجمع البحرین تھے۔ وہ نہ صرف قرآن اور جملہ علومِ قرآنی میں درجۂ تبحر رکھتے تھے بلکہ حدیث اور فقہ کے بھی بہت بڑے عالم تھے۔ امام ذہبیؒ کا بیان ہے کہ ''حضرت اُبیؓ نے رسول اللہ ﷺ سے احادیث کا بہت بڑا حصّہ سنا تھا ——'' تاہم حضرت ابیؓ روایتِ حدیث میں بے حد محتاط تھے۔ چناں چہ ان سے صرف ۱۶۴ احادیث مروی ہیں۔

حضرت ابیؓ کی جلالتِ علمی کی یہ کیفیت تھی کہ بڑے بڑے جلیل القدر صحابہؓ ان کے حلقۂ درس میں شامل ہوتے تھے۔ ان میں سے حضرت عمر فاروقؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت عبادہؓ بن صامت، حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ، حضرت ابو ایوب انصاریؓ، حبر الامۃ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ اور حضرت انسؓ بن مالک جیسے اساطینِ اُمّت بھی شامل ہیں۔ ان بزرگوں کو حضرت ابیؓ کے گھر جا کر مسائل دریافت کرنے سے بھی اجتناب نہ تھا۔

بعض روایتوں میں ہے کہ انہیں انصار میں سب سے بڑا عالم تسلیم کیا جاتا تھا۔ ان کو اسلامی علوم کے علاوہ تورات اور انجیل پر بھی عبور حاصل تھا۔ ان کتابوں میں سرورِ عالم ﷺ کے بارے میں جو بشارتیں مذکور ہیں وہ انہیں بڑے لطف و انبساط کے ساتھ لوگوں کو سنایا کرتے تھے۔

رحمتِ عالم ﷺ کے وصال کے بعد حضرت اُبیؓ بن کعب کی ذات ایک ایسے چشمۂ فیض کی حیثیت رکھتی تھی جس سے ہر مسلمان بہ قدرِ ظرف فیضیاب ہوتا تھا۔ وہ لوگوں کو شرعی مسائل بھی بتاتے تھے اور قرآنِ حکیم کے حقائق و معارف کی تعلیم بھی دیتے تھے۔ ان کے نزدیک قرآنِ کریم پر عمل کر کے ہی مسلمان اپنی دنیا اور آخرت سنوار سکتے تھے۔ ایک دفعہ کسی شخص نے عرض کی کہ مجھے کوئی وصیت کیجیے۔ فرمایا:

’’قرآنِ کریم کو اپنا امام بنالو، اس کے فیصلوں اور احکام پر راضی ہو جاؤ، بے شک یہ قرآن وہی ہے جو تمھارے لیے رسول اللہ ﷺ نے چھوڑا ہے اور یہ ایسا شاہد ہے جس پر کوئی حرف گیری نہیں کر سکتا۔ اس میں تمھارا تذکرہ بھی ہے اور تم سے پہلی امتوں کا بھی۔ یہی تمھارے باہمی جھگڑوں کا فیصلہ کرنے والا ہے۔ اس میں تمھارا بھی اور تمھارے بعد آنے والوں کا بھی حال درج ہے۔‘‘

ابو نعیمؒ نے ’’حلیہ‘‘ میں لکھا ہے کہ حضرت اُبیؓ بن کعب فرمایا کرتے تھے کہ مؤمن میں چار صفتیں ضرور ہوتی ہیں:

۱- اگر مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے تو صبر کرتا ہے۔

۲- اگر اسے کوئی نعمت عطا ہو تو اللہ کا شکر کرتا ہے۔

۳- اگر کوئی فیصلہ دیتا ہے تو پورا انصاف کرتا ہے۔

۴- اگر وہ بولتا ہے تو ہمیشہ سچ بولتا ہے۔ اور جب کوئی بندہ اللہ تعالیٰ کے ڈر سے کوئی چیز ترک کر دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے عوض اسے اس سے بہتر چیز ایسی جگہ سے دیتا ہے جہاں سے اسے ملنے کا گمان تک نہیں ہوتا اور جب کوئی بندہ اللہ کی دی ہوئی نعمت کی قدر نہیں کرتا اور اسے اس طرح استعمال کرتا ہے جو شرعاً اس کے لیے جائز نہیں تو اللہ تعالیٰ ضرور اس کے بدلے میں ایسے طریقے سے سزا دیتا ہے جو اس کے گمان میں بھی نہیں ہوتا۔

بعض شرعی مسائل میں حضرت ابیؓ اپنا خاص مسلک رکھتے تھے۔ مثلاً وہ ظہر اور عصر کی نماز میں امام کے پیچھے قرأت کرتے تھے اور دوسری نمازوں میں خاموش رہتے تھے۔ زنا کی سزا تین قسم کی بتاتے تھے۔ متاہل بڈھے کو تازیانہ و رجم دونوں، متاہل جوان کو محض رجم اور غیر متاہل جوان کو فقط تازیانہ۔

مزاج میں کسی قدر تکلف تھا۔ حلقۂ درس میں گدّے پر بیٹھ کر تعلیم دیا کرتے تھے اور تلامذہ کو اپنی تعظیم کے لیے سرو قد کھڑے ہونے سے منع نہیں فرماتے تھے۔ بڑھاپے میں بھی جب سر اور ڈاڑھی کے بال سفید ہو گئے تھے پراگندہ مو ہونا پسند نہیں فرماتے تھے۔ ایک لونڈی کے ذمہ

یہ کام تھا کہ وہ آپ کے بالوں کو بنا سنوار دیا کرے۔ دیوار میں ایک آئینہ لگا ہوا تھا جب کنگھی کرتے تھے تو اس کی طرف منہ کر لیتے تھے۔

حضرت ابیؓ کی شخصیت علم اور عمل دونوں کی جامع تھی۔ بدعات سے اجتناب کرتے تھے اور اپنے ہر کام میں سنتِ نبوی کو ملحوظ رکھتے تھے۔ عبادات میں خاص لطف حاصل ہوتا تھا۔ نہایت خشوع وخضوع سے نماز پڑھتے تھے۔ اکثر شب بیدار رہتے تھے۔ تلاوت اور نماز میں آنکھوں سے آنسو جاری رہتے تھے۔ عموماً تیسری رات کو قرآن مجید ختم کر لیا کرتے تھے۔ رات کے ایک حصے میں درود وسلام میں مصروف رہتے تھے۔

تقدّم فی الاسلام، حبِ رسولؐ، شوقِ جہاد، شغفِ قرآن وحدیث اور جذبہ اصلاح وتبلیغ حضرت ابیؓ بن کعب کی کتابِ سیرت کے نمایاں ابواب ہیں۔ ان میں سے کسی باب پر بھی نظر ڈالیں، ان کی شخصیت منارۂ نور نظر آتی ہے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت زید بن ارقم انصاریؓ

(۱)

غزوۂ احزاب (ذی قعدہ ۵ ھ) کے کچھ عرصہ بعد رحمتِ عالم ﷺ کو اطلاع ملی کہ قبیلہ مصطلق کے سردار حارث بن ابی ضرار نے مسلمانوں کے خلاف جنگ کے لیے زبردست جمعیت فراہم کی ہے اور وہ مدینہ منوّرہ پر حملہ آور ہونے کا ارادہ کر رہا ہے۔ حضوؐر نے صحابہ کرامؓ کو اس فتنہ کی سرکوبی کے لیے تیاری کا حکم دیا اور پھر شعبان ۶ ھ کے آغاز میں جاں نثاروں کی ایک معقول جمعیت کے ہم راہ مدینہ سے کوچ کر کے مریسیع نامی کنویں (یا چشمے) کے قریب پڑاؤ ڈالا، جس کے نواح میں بنو مصطلق آباد تھے۔ سرورِ عالمؐ نے ان لوگوں کو حضرت عمر فاروقؓ کی وساطت سے دعوتِ اسلام دی اور شر انگیزی سے باز رہنے کی تلقین فرمائی لیکن ان بدبختوں نے حضوؐر کے پیغام کو قبول نہ کیا اور مسلمانوں سے لڑائی چھیڑ دی۔ مسلمانوں نے حضوؐر کے ارشاد کے مطابق ان پر دفعتاً ایک ساتھ اس زور کا حملہ کیا کہ وہ حواس باختہ ہو گئے اور اپنے دس آدمی کٹوا کر میدانِ جنگ سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ بنو مصطلق کی شکست کے بعد لشکرِ اسلام مریسیع سے متصل بستی میں چند روز کے لیے ٹھہر گیا۔ وہاں کے اثنائے قیام میں ایک دن بدقسمتی سے ایک مہاجر حضرت جہجاہؓ بن مسعود غفاری اور ایک انصاری حضرت سِنان بن وبراء الجہنی پانی پر آپس میں جھگڑ پڑے۔ یہاں تک کہ ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے۔ لڑائی میں جہجاہؓ نے سنانؓ کو ایک لات رسید کر دی۔ انصار کے نزدیک کسی سے لات کی ضرب کھانا سخت ننگ کی بات تھی۔ چناں چہ سِنانؓ نے اپنی مدد کے لیے انصار کو پکارنا شروع کر دیا۔ جہجاہؓ نے اپنے آپ کو خطرے میں دیکھا تو انھوں نے مہاجرین کو آواز دی کہ میری مدد کے لیے پہنچو انصار مجھے مارے ڈالتے ہیں۔ رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی بھی اس موقع پر موجود تھا اس کو مسلمانوں کے درمیان نفاق ڈالنے کا نادر موقع ہاتھ آیا، اس نے انصار کو سخت اشتعال دلایا اور سِنان کی مدد کے لیے ابھارا۔ دوسری طرف سے کچھ مہاجرین بھی تلواریں سونت کر نکل آئے، اس طرح انصار و مہاجرین میں کشت و خون ہونے میں

کوئی کسر باقی نہ رہ گئی تھی کہ رحمتِ عالم ﷺ کے سمعِ مبارک تک اس شور کی آواز پہنچ گئی۔ آپ فوراً اپنے خیمے سے باہر تشریف لائے اور فرمایا:

”ما بالُ دعوی الجاھلیة؟ مالکم والدعوة الجاھلیة؟ دعوھا فانھا منتنة۔“

”یہ جاہلیت کی دہائی کیسی؟ تم لوگ کہاں اور جاہلیت کی دہائی کیسی؟ اسے چھوڑو یہ بہت بری چیز ہے۔“

حضورؐ کا ارشاد سن کر دونوں طرف کے کچھ اصحاب آگے بڑھے اور سنانؓ اور جہجاہؓ کو گلے ملوا دیا۔ اس طرح معاملہ رفت گزشت ہو گیا۔ لیکن عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھی منافقین پر یہ بات سخت شاق گزری وہ آپس میں سر جوڑ کر بیٹھے تو عبداللہ نے ان کے سامنے اپنے دل کے جلے پھپھولے یوں پھوڑے۔

”یہ سب کچھ تمھارا اپنا ہی کیا دھرا ہے اگر تم مہاجرین کی امداد بند کر دو تو وہ تنگ آ کر خود ہی مدینہ چھوڑ دیں گے۔ خدا کی قسم مدینے واپس جا کر ہم میں سے جو عزت والا ہے وہ ذلیل کو شہر بدر کر دے گا۔“

اتفاق سے اس مجمع میں مدینہ کے ایک نوجوان بھی موجود تھے جن کو دینِ حق اور داعیِ حق ﷺ سے والہانہ محبت تھی، عبداللہ بن ابی کی باتیں سن کر اُن کا خون کھول اُٹھا۔ فوراً اپنے چچا حضرت عبداللہؓ بن رواحہ کے پاس دوڑے گئے اور سارا واقعہ ان کے گوش گزار کر دیا، ان کو بڑی غیرت آئی اور بارگاہِ رسالتؐ میں حاضر ہو کر ابنِ اُبی کی خرافات کا ذکر کیا۔ حضورؐ نے نوجوان کو بلا کر دریافت کیا تو انھوں نے وہی باتیں دہرائیں جو اپنے چچا سے کہہ چکے تھے۔ حضورؐ نے فرمایا، ”شاید تم عبداللہ بن ابی سے ناراض ہو، ہو سکتا ہے تم سے سننے میں کچھ غلطی ہو گئی ہو۔“ نوجوان نے قسم کھا کر کہا۔ ”یا رسول اللہؐ میں نے فی الواقع یہ باتیں عبداللہ بن ابی کے منہ سے سنی ہیں۔“ اس پر سرورِ عالمؐ نے ابن ابی کو بلا کر پوچھا کہ کیا تم نے یہ باتیں کہی ہیں؟ وہ صاف مُکر گیا اور قسمیں کھانے لگا کہ میں نے ایسی باتیں ہرگز نہیں کہیں، یہ لڑکا جھوٹ بولتا ہے۔

انصار کو جن میں اس نوجوان کے چچا بھی شامل تھے، ابنِ ابی کی قسموں پر یقین آ گیا اور لڑکے کو ملامت کرنے لگے کہ تم نے خواہ مخواہ ایسی شکایت کر کے رسول اللہ ﷺ کو ناراض کر دیا۔ نوجوان صاحب زادے سخت رنجیدہ ہوئے اور اپنی قیام گاہ پر جا کر بیٹھ رہے۔ اس دل گرفتگی

کے عالم میں نیند نے غلبہ کیا اور سو گئے ابھی بیدار نہیں ہوئے تھے کہ رحمتِ الٰہی کو جوش آ گیا اور سرورِ عالم ﷺ پر سورۂ منافقون نازل ہوئی جس میں اس صالح نوجوان کی تصدیق کی گئی تھی اور منافقین کا کچا چٹھا کھول کر بیان کر دیا گیا تھا۔(۱)

حضورؐ نے اسی وقت اس نوجوان کو بلا بھیجا، جب وہ حاضر ہوئے تو آپؐ نے اُن کے سامنے سورۂ منافقون کی آیتیں پڑھیں اور پھر ہنستے ہوئے ان کا کان پکڑ کر فرمایا: ''لڑکے کا کان سچا تھا، اللہ نے خود اس کی تصدیق فرما دی۔''

---

(۱) سورۂ منافقون کے محلِ نزول کے بارے میں مختلف روایتیں ہیں، ایک روایت یہ ہے کہ یہ سورۃ مریسیع کے پڑاؤ میں نازل ہوئی۔ دوسری روایت یہ ہے کہ واپسی کے سفر کے دوران میں نازل ہوئی اور تیسری روایت کے مطابق حضورؐ کے مدینہ پہنچنے کے فوراً بعد نازل ہوئی۔ بہرصورت تمام اہلِ سیَر نے یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ کو ابنِ ابی کی حرکت پر ایسا غصہ آیا کہ انھوں نے حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا۔ ''یا رسول اللہ آپ اجازت دیں تو میں اس منافق کا سر اڑا دوں۔ اور اگر آپؐ یہ مناسب نہ سمجھیں تو انصار میں سے سعدؓ، معاذؓ بن جبل، عبادؓ بن بشر یا محمدؓ بن مسلمہ کو حکم دیں کہ وہ اس کا قصہ پاک کر دیں۔'' رحمتِ عالم ﷺ نے فرمایا۔ ''نہیں ایسا مت کرو، لوگ کہیں گے کہ محمدؐ اپنے ساتھیوں کو قتل کراتے ہیں۔''

عبداللہ بن اُبی کے فرزند کا نام بھی عبداللہؓ تھا۔ وہ ایک سچے مسلمان اور نہایت مخلص صحابی تھے۔ علامہ ابن اثیر کا بیان ہے کہ حضرت عمرؓ کے بعد وہ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا:

> ''یا رسول اللہ میرے باپ نے آپؐ کو ذلیل کہا، خدا کی قسم وہ خود ذلیل ہے، اگرچہ میں اپنے باپ کا اطاعت گزار ہوں لیکن آپؐ حکم دیں تو ابھی اس کا سر اڑائے دیتا ہوں۔ دوسرا کوئی اسے قتل کرے گا تو شاید میرے دل میں انتقام کا جذبہ بیدار ہو جائے اور میری آخرت برباد ہو جائے۔''

حضورؐ نے ان کو بھی وہی جواب دیا جو حضرت عمرؓ کو دیا تھا۔ اس کے بعد جب لشکرِ اسلام مدینہ کو واپس ہوا تو عبداللہؓ تلوار سونت کر باپ کے آگے کھڑے ہو گئے اور کہا:

> ''تم اقرار کرو کہ میں ذلیل ہوں اور محمدؐ عزت والے ہیں، ورنہ خدا کی قسم رسولؐ اللہ کی اجازت کے بغیر میں تمہیں مدینہ میں ہرگز داخل نہیں ہونے دوں گا۔''

اس پر ابن ابی چیخنے چلانے لگا ''دیکھو میرا بیٹا ہی مجھے مدینہ میں داخل ہونے سے روک رہا ہے۔''

حضورؐ کو خبر ہوئی تو آپؐ نے عبداللہؓ کو کہلا بھیجا کہ ''اپنے باپ کو گھر آنے دو، جب تک یہ ہم میں موجود ہیں ہم ان سے اچھا برتاؤ ہی کریں گے۔'' عبداللہؓ نے ارشادِ نبوی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا اور یوں ابن اُبی مدینہ میں داخل ہو سکا۔

یہ سعادت مند نوجوان جن کی صداقت کی خود اللہ تعالیٰ نے گواہی دی، قبیلہ حارث بن خزرج کے چشم و چراغ حضرت زیدؓ بن ارقم تھے۔

(۲)

سیدنا حضرت ابوعمر زیدؓ بن ارقم انصاری کا شمار بڑے عظیم المرتبت صحابہ میں ہوتا ہے۔ ان کا تعلق خزرج کی شاخ حارث بن خزرج سے تھا۔ سلسلۂ نسب اس طرح ہے۔

زیدؓ بن ارقم بن زید بن قیس بن نعمان بن مالک الاعز بن ثعلبہ بن کعب بن خزرج بن حارث بن خزرج اکبر۔

زیدؓ بن ارقم ابھی کم سن تھے کہ ان کے والد ارقم بن زید نے انتقال کیا۔ جلیل القدر صحابی حضرت عبداللہؓ بن رواحہ انصاری کا تعلق بھی اسی خاندان (حارث بن خزرج) سے تھا۔ وہ بڑے نیک نفس بزرگ تھے اور دُور کے رشتہ سے زیدؓ بن ارقم کے چچا ہوتے تھے، انھوں نے یتیم اور بے سہارا زیدؓ کو اپنی سرپرستی میں لے لیا اور بڑی شفقت اور دل سوزی کے ساتھ ان کی پرورش کی۔ حضرت عبداللہؓ بن رواحہ انصار کے سابقون الاوّلون میں سے ہیں۔ وہ بیعت عقبۂ کبیرہ میں سعادت اندوزِ اسلام ہو کر مدینہ واپس آئے تو ننھے زید کو بھی اسلام کی تلقین کی۔ انھوں نے چچا کی پیروی کی اور ہجرتِ نبوی سے قبل ہی ''فرزندانِ اسلام'' میں شامل ہو گئے۔ رحمتِ عالم ﷺ مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لائے، تو انصار کے دوسرے بچوں کی طرح زیدؓ کی بھی عید ہو گئی۔ اس دن نونہالانِ انصار کا مسرّت کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ وہ جوشِ مسرت میں ''جاء رسول اللّٰه جاءَ نبی اللّٰه'' کہہ کہہ کر شہر کی گلیوں اور سڑکوں پر خوشی کے عالم میں اچھلتے کودتے پھرتے تھے۔ ۲ھ میں غزوۂ بدر پیش آیا تو حضرت زیدؓ دس گیارہ برس کے بچے تھے اس لیے لڑائی میں شامل نہ ہو سکے۔ غزوۂ اُحد میں بھی ان کی عمر لڑائی کے قابل نہ تھی لیکن راہِ حق میں جان قربان کرنے کے لیے بے تاب تھے تاہم جب رسولِ اکرم ﷺ نے انہیں لڑائی میں شامل ہونے کی اجازت نہ دی تو بادلِ ناخواستہ گھر چلے گئے۔ اس کے بعد انہیں سب سے پہلے غزوۂ خندق میں شرکت کا شرف حاصل ہوا، آغازِ شباب تھا اور خون میں حرارت تھی خندق کی کھدائی اور دوسرے کاموں میں بڑے جوش و خروش سے حصّہ لیا۔ خندق کے بعد غزوۂ بنومصطلق میں شریک

ہوئے۔ بعض روایات کے مطابق یہ غزوہ، خندق کی لڑائی سے پہلے پیش آیا۔ لیکن صحیح یہی ہے کہ یہ غزوۂ خندق کے بعد پیش آیا۔(۱)

اس موقع پر حضرت زیدؓ بن ارقم نے حبِ رسول اور غیرتِ ایمانی کا جو مظاہرہ کیا اس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ خود حضرت زیدؓ بن ارقم سے روایت ہے کہ جب عبداللہ بن ابی، رسول اللہ ﷺ کے سامنے اپنی باتوں سے صاف مکر گیا اور قسم کھا کر اپنی پاک دامنی کا یقین دلایا تو انصار کے بزرگوں اور خود میرے چچا نے مجھے بہت بُرا بھلا کہا یہاں تک کہ مجھے محسوس ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے بھی مجھے جھوٹا سمجھا ہے۔ اس سے مجھے ایسا صدمہ ہوا کہ عمر بھر کبھی نہیں ہوا تھا۔ میں سخت رنج اور غم کی حالت میں اپنی جگہ جا کر بیٹھ گیا، جب سورۂ منافقون کی دوسری آیات کے ساتھ یہ آیت نازل ہوئی:

يَقُولُونَ لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَ عَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ ط وَ لِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَ لِرَسُوْلِهٖ وَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَ لٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (المنافقون:۸)

''یہ کہتے ہیں کہ ہم مدینے واپس پہنچ جائیں تو جو عزت والا ہے وہ ذلیل کو وہاں سے نکال دے گا۔ حالاں کہ عزت تو اللہ اور اس کے رسولؐ اور مومنین کے لیے ہے مگر یہ منافق جانتے نہیں ہیں۔''

تو گویا اللہ تعالیٰ نے حرف بہ حرف میری بات کی تصدیق کر دی۔ اس پر رسول اللہ ﷺ کے روئے انور پر مسرّت کے آثار نمایاں ہوئے اور آپؐ نے ہنستے ہوئے مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

اِنّ اللّٰہ صدقک یا زید۔

''اے زید۔ اللہ نے تمھاری تصدیق فرمائی۔''

ایک دوسری روایت میں حضرت زیدؓ سے یہ الفاظ منسوب ہیں کہ حضورؐ نے ہنستے ہوئے میرا کان پکڑا اور فرمایا:

''لڑکے کا کان سچا تھا، اللہ نے خود اس کی تصدیق فرما دی۔''

---

(۱) تفہیم القرآن۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، دیباچہ سورۂ نور۔

خندق اور بنو مصطلق کے علاوہ حضرت زیدؓ پندرہ دوسرے غزوات میں بھی شریک ہوئے۔ صحیح بخاری کی ایک روایت میں کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ۱۹ غزوے کیے۔ ان میں سے سترہ میں آپؐ کے ہم رکاب تھا۔

ذی قعدہ ۶ھ میں حضرت زیدؓ کو بیعتِ رضوان میں شریک ہونے کا شرف بھی حاصل ہوا اس طرح وہ ان خوش بخت صحابہ میں شامل ہو گئے جن کو اللہ تعالیٰ نے اصحاب الشجرہ کا لقب عطا فرمایا اور کھلے لفظوں میں اپنی خوش نودی کی بشارت دی۔

(۳)

جمادی الاولیٰ ۸ھ میں حضرت زیدؓ بن ارقم اپنے جلیل القدر چچا حضرت عبد اللہؓ بن رواحہ کے ساتھ غزوۂ موتہ کے لیے روانہ ہوئے۔ دونوں چچا بھتیجے ایک ہی اونٹ پر سوار تھے۔ اثنائے راہ میں حضرت عبد اللہؓ بڑے ذوق شوق سے یہ شعر پڑھنے لگے۔

اذا دنیتنی و حملت رحلی — مسیر اربع بعد الحساء

الٰہی جب تو نے مجھے قریب کر دیا اور میں راحت و آرام کے بعد اپنے کجاوہ کو چار دن کی مسافت پر لے چلا۔

فشأنک انعم و خلاک ذم — ولا ارجع الی اهلی و رائی

پس یہ تیری شان ہے کہ انعام و اکرام سے نوازتا ہے اور تیری ذات بے عیب ہے مجھ کو میرے گھر والوں تک جو میرے پیچھے ہیں، مت واپس لے جانا۔

و جاء المسلمون و غادرونی — بارض الشام مستنهی الثواء

اور مسلمان آگئے اور کفّار نے مجھ سے سرزمین شام میں غدّاری کی جو آبادیوں کے کنارے پر ہے

وردل کل ذی نسب قریب — الی الرحمن منقطع الاخاء

تجھ کو ہر قریبی نسب والے نے اللہ کی طرف جاتے ہوئے چھوڑ دیا اور بھائی بندی ختم کر دی

هنالک لا ابالی طلع بعل — ولا نخل اسافلها رواء

اس وقت مجھے تر اور خشک کھجوروں کے خوشہ کی پروا نہیں کہ سیرابی کے لیے ان کو چھوڑوں۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ حضرت عبداللہؓ نے یہ اشعار شہادت سے ایک رات قبل موتہ کے میدان میں پڑھے۔ چوں کہ ان میں شہادت کا بے پناہ اشتیاق ظاہر کیا گیا تھا اس لیے حضرت زیدؓ نے یہ اشعار سُن کر رونا شروع کر دیا، اس پر حضرت عبداللہؓ بن رواحہ کو غصہ آ گیا انھوں نے اپنا دُرّہ اٹھایا اور جھڑک کر حضرت زیدؓ سے کہا:

''اس میں تیرا کیا حرج ہے کہ اللہ مجھے شہادت کی توفیق دے اور تو میرے کجاوے کو میرے خاندان میں واپس لے جائے۔''

(۴)

رحمتِ عالم ﷺ کے وصال کے بعد حضرت زیدؓ نے اپنی زندگی کا بیش تر حصہ درس و ارشاد اور تعلیم و تعلّم میں گزارا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مخلصانہ روابط تھے۔ چناں چہ جنگِ صفین میں ان کے لشکر میں شامل ہو کر دادِ شجاعت دی۔ علامہ ابنِ سعدؒ کا بیان ہے کہ حضرت زیدؓ بن ارقم نے کوفہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔

حضرت زیدؓ کے قیامِ کوفہ کے دوران میں ہی کربلا کا سانحہ پیش آیا۔ حضرت زیدؓ کو اس سے سخت صدمہ پہنچا۔ ابو حنیفہ دینوری نے ''اخبار الطّوال'' میں لکھا ہے کہ حضرت حسینؓ کا سرِ اقدس عبیداللہ بن زیاد کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے اپنی چھڑی آپؓ کے ہونٹوں کو لگائی اتفاق سے حضرت زیدؓ بن ارقم بھی وہاں موجود تھے وہ تڑپ اٹھے اور فرمایا:

''نہ، نہ ان لبوں سے اپنی چھڑی ہٹا لے۔ خدا کی قسم میں نے رسول اللہ ﷺ کو ان لبوں پر بوسہ دیتے دیکھا ہے۔''

پھر ان کی آواز بھرّا گئی اور انھوں نے زار و قطار رونا شروع کر دیا۔ ابنِ زیاد جس نے خاندانِ رسالت کو تاراج کیا تھا، بھلا اُن کی کیا عزت کرتا جھلّا کر بولا:

''روتے کیوں ہو؟ خدا تمھاری آنکھوں کو رُلاتا رہے، خدا کی قسم اگر مجھے یہ خیال نہ ہوتا کہ بڑھاپے کے باعث تمھاری عقل ٹھکانے نہیں رہی تو میں تمھارا سر اڑا دیتا۔''

ایسی باتوں کے باوجود وہ خاندانِ نبوّت سے اپنی محبت کا اظہار کرنے سے باز نہیں رہتے تھے۔ مسند احمد حنبل میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت مغیرہؓ بن شعبہ نے ان کے سامنے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شان میں کچھ سخت جملے کہے۔

انھوں نے فرمایا:

''مُغیرہ میں نے اپنے کانوں سے سنا ہے کہ رسول اللہ ﷺ موتی کو بُرا کہنے سے منع فرماتے تھے۔ علیؓ اپنے رب کے حضور پہنچ چکے اب ان کے لیے ایسے الفاظ کیوں استعمال کرتے ہو۔''

خاندانِ نبوّت کے مصائب پر اُن کا دل کڑھتا ہی تھا، دوسرے مسلمانوں کی مصیبت پر بھی تڑپ اٹھتے تھے۔ واقعۂ حرّہ میں یزیدی فوج کے ہاتھوں حضرت انسؓ بن مالک کے ایک فرزند اور کچھ دوسرے رشتہ دار شہید ہو گئے تو حضرت زید نے ان کو تعزیت کا خط لکھا جس میں بدیں الفاظ ان کا غم ہلکا کرنے کی کوشش کی۔

''میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ دُعا مانگتے سنا ہے کہ خدایا انصار ان کی اولاد، اولاد در اولاد ان کی عورتوں اور ان کی تمام اولاد کی مغفرت فرما۔''

۶۸ھ میں حضرت زیدؓ بن ارقم کا وقتِ آخر پہنچا اور انھوں نے تقریباً اسّی برس کی عمر میں کوفہ میں پیکِ اجل کو لبیّک کہا۔

(۵)

حضرت زیدؓ بن ارقم علم و فضل کا مجمع البحرین تھے تاہم روایتِ حدیث میں بڑی احتیاط سے کام لیتے تھے۔ اس لیے ان سے مروی احادیث کی کل تعداد نوے ہے، ان روایت کرنے والوں میں کئی جلیل القدر صحابہؓ اور سر آمدِ روزگار تابعین شامل ہیں۔ اپنے تبحر علمی اور جلالتِ قدر کے باوجود انہیں معاصرین کے علم و فضل کا اعتراف کرنے میں کوئی باک نہیں تھا۔ حضرت ابو منہال سیار بن سلامہؒ کا بیان ہے کہ میں نے براءؓ بن عازب اور زیدؓ بن ارقم سے ''بیع صرف'' کے متعلق سوال کیا، براءؓ کہتے تھے زید سے پوچھو یہ مجھ سے زیادہ عالم ہیں۔ اور زیدؓ کہتے تھے کہ براءؓ مجھ سے افضل اور مجھ سے بڑھ کر ہیں انہیں سے پوچھو۔ بالآخر دونوں نے متفق ہو کر کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع کیا ہے کہ سونے کی بیع چاندی سے ادھار کی جائے۔

حضرت زیدؓ بن ارقم کے صحیفۂ اخلاق میں حبِ رسول، شوقِ جہاد، حق گوئی، انکسار، اتباعِ سنت اور مخلوقِ خدا کی غم گساری سب سے نمایاں ابواب ہیں۔ وہ اپنے اوصاف و محاسن کی

بہ دولت بارگاہِ رسالت میں خاص امتیاز کے حامل ہو گئے تھے یہاں تک کہ کبھی علیل ہوتے تو رحمتِ عالم ﷺ بہ نفسِ نفیس ان کی عیادت کے لیے تشریف لے جاتے۔

مسند احمد حنبلؒ میں ہے کہ ایک مرتبہ ان کی آنکھ میں کوئی تکلیف ہو گئی، حضورؐ بیمار پُرسی کے لیے تشریف لے گئے۔ جب صحت یاب ہو گئے تو آپؐ نے زیدؓ سے پوچھا:

''ابنِ ارقم اگر یہ تکلیف دُور نہ ہوتی تو کیا کرتے؟''

عرض کیا: ''یا رسولؐ اللہ صبر کرتا اور آخرت میں اجر کا امیدوار ہوتا۔''

حضورؐ نے فرمایا:

''اگر تم ایسا کرتے تو آخرت میں یہی ایک کام تمہارے سب گناہوں کی تلافی کر دیتا۔''

ازواج و اولاد کی تفصیل کتابوں میں نہیں ملتی۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت براابن مالکؓ

(۱)

ہجرتِ نبویؐ کے چند سال بعد کا ذکر ہے، مدینہ منوّرہ میں کسی جگہ شمعِ رسالتؐ کے چند پروانے سیّدالانام، رحمتِ عالم، صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد حلقے کی صورت میں بیٹھے تھے اور مقدر بھر فیضانِ نبوی سے بہرہ یاب ہو رہے تھے۔ اتنے میں دُور ایک گلی کی نکڑ سے ایک صاحب نمودار ہوئے جو بھاگم بھاگ بارگاہِ رسالتؐ کی جانب آرہے تھے، وہ ایک قوی الجثہ اور کشیدہ قامت آدمی تھے۔ اُن کے جسم پر نہایت پرانی پیوند لگی دو چادریں تھیں اور سر ڈاڑھی کے بال پراگندہ، انھوں نے قریب آکر نہایت ادب سے سلام کیا اور پھر مجلس نبوی میں بیٹھ کر بڑے ذوق وشوق سے دانائے کونینؐ کے ارشادات سننے لگے۔ اثنائے گفتگو میں رحمتِ عالمؐ نے فرمایا:

''بہت سے گرد آلود اور پراگندہ مو آدمی، دو پُرانی چادروں والے، جو لوگوں کے نزدیک بالکل حقیر ہیں، جب قسم کھا بیٹھتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ اُن کی قسم پوری کر دیتا ہے اور براءؓ بھی ایسے ہی آدمیوں میں سے ہیں۔''

یہ نو وارد ''براءؓ'' ہی تو تھے۔ خیر الخلائقؐ کا ارشادِ گرامی سُن کر وہ فرطِ مسرّت سے بے خود ہو گئے اور بے اختیار ان کی زبان پر تحمید وتہلیل جاری ہو گئی۔

براءؓ جن کی قسم کا خود ربِ ذوالجلال والاکرام کو اس قدر پاس تھا، خزرج کے خاندانِ نجار کے رکن، مالک بن نضر کے لختِ جگر، حضرت انسؓ بن نضر شہیدِ اُحد کے بھتیجے اور خادمِ رسولؐ اللہ حضرت انسؓ بن مالک کے علاتی بھائی تھے۔

نسب نامہ یہ ہے:
''براءؓ بن مالک بن نضر بن ضمضم بن زید بن حرام بن جندب بن عامر بن غنم بن عدی بن نجار۔''

والدہ کا نام سمحاء تھا، مالک بن نضر کی دوسری بیوی ام سلیم سہلہؓ بنت ملحان تھیں۔ ان کا شمار جلیل القدر صحابیات میں ہوتا ہے، خادمِ رسولؐ اللہ حضرت انسؓ انہی کے بطن سے پیدا ہوئے۔ حضرت امِ سلیمؓ کو اللہ تعالیٰ نے فطرتِ سعید سے نوازا تھا، وہ اوائل اسلام ہی میں حلقہ بہ گوشِ اسلام ہوگئیں اور اپنے کم سن فرزند انسؓ کو بھی کلمہ پڑھانے لگیں۔ مالک بن نضر سخت مشرک تھا، وہ اُمِ سلیم پر ناراض ہوتا کہ تم میرے بچے کو بھی بے دین کیے دیتی ہو۔ اُمِ سلیمؓ نے اُسے بہت سمجھایا، لیکن وہ قبولِ اسلام پر آمادہ نہ ہوا اور ناراض ہو کر شام چلا گیا۔ وہاں کسی دشمن نے اُسے قتل کر ڈالا۔ اس طرح حضرت براءؓ اور حضرت انسؓ دونوں یتیم ہوگئے۔

حضرت انسؓ کو تو اُن کی والدہ نے سرورِ کونین ﷺ کا خادم بنا دیا، لیکن حضرت براءؓ بے یار و مددگار رہ گئے۔ اہلِ سِیَر نے اُن کے قبولِ اسلام کا زمانہ متعین نہیں کیا، لیکن قرینے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہجرتِ نبویؐ سے کچھ عرصہ پہلے یا کچھ عرصے بعد شرفِ اسلام سے بہرہ ور ہوگئے تھے۔ چوں کہ والد کا سایہ سر پر نہ تھا اور نہ اُس نے کوئی جائداد چھوڑی تھی، اس لیے حضرت براءؓ اضیاف اللہ یعنی اصحابِ صفہ میں شامل ہوگئے۔

اللہ کے ان پاک باز بندوں نے اپنی جانیں خدمتِ اسلام کے لیے وقف کر رکھی تھیں۔ سرورِ عالمؐ نے ان کے قیام کے لیے ایک مسقف چبوترہ بنوا دیا تھا۔ وہ وہیں تحصیلِ علم اور یادِ الٰہی میں مشغول رہ کر فقر و فاقہ اور عسرت و افلاس کی زندگی گزارتے تھے۔ رحمتِ عالمؐ، اصحابِ صفہؓ پر بے پناہ شفقت فرماتے تھے اور اُن کی خوراک اور لباس کے کفیل تھے۔ ان مردانِ حق نے یہ زندگی محض رضائے الٰہی کی خاطر اختیار کی تھی اور اس کو رہبانیت سے دُور کا واسطہ بھی نہ تھا۔ وہ حالتِ امن میں خدا کے مسکین ترین بندے تھے اور میدانِ جہاد میں شیرانِ نر سے بڑھ کر۔ آقائے دو جہاںؐ کے فیضِ صحبت نے انہیں کچھ کا کچھ بنا دیا۔ یہ وہ درس گاہ تھی جس کے فیض پانے والوں میں دنیا کے بہترین حکمران، بہترین مدبّر، بہترین معلّم اور بہترین مجاہد پیدا ہوئے۔

حضرت براءؓ اصحابِ صفّہ میں کب شامل ہوئے؟ اربابِ سِیَر نے اس کی بھی تصریح نہیں کی، تاہم خیال یہ ہے کہ وہ شروع سے ہی اس مقدّس جماعت میں شامل ہو گئے اور بالکل اپنے ساتھیوں کے رنگ میں رنگ گئے۔ موٹا جھوٹا لباس اُن کے زیبِ بدن ہوتا اور روکھی سوکھی غذا سے جسم وروح کا رشتہ قائم رکھتے۔

اُنہیں رحمتِ عالم ﷺ سے غایت درجہ محبت تھی اور حضورؐ کی خدمت اور اطاعت اُن کا محبوب مشغلہ تھا۔ یہی سبب تھا کہ حضورؐ بھی اُن پر بے حد شفیق تھے اور اُنہیں اللہ کے پیارے بندوں میں سے ایک قرار دیتے تھے۔

(۲)

حق و باطل کے معرکہ اوّل ''غزوۂ بدر'' میں حضرت براءؓ بن مالک اور اُن کے چچا حضرت انسؓ بن نضر کسی وجہ سے شریک نہ ہو سکے۔ دونوں نہایت مخلص مسلمان اور سرورِ عالم ﷺ کے جاں نثار تھے، اس لیے بدر میں اُن کے شریک نہ ہونے کا کوئی خاص سبب ہوگا! ہوسکتا ہے کہ علیل ہوں یا مدینہ سے باہر گئے ہوئے ہوں۔ حضرت انسؓ بن نضر نے تو اس سعادت سے محروم رہنے کی تلافی یوں کی کہ غزوۂ اُحد میں مردانہ وار لڑ کر رتبۂ شہادت پر فائز ہوئے اور حضرت براءؓ نے یوں کہ اُحد سے لے کر غزوۂ تبوک تک ہر معرکے میں سرورِ عالم ﷺ کے ہم رکاب رہے، یہاں تک کہ آپ کے وصال کے بعد بھی زندگی کے آخری سانس تک جہاد فی سبیل اللہ میں مصروف رہے۔

۱۱ھ میں سرورِ کونینؐ کی رحلت کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ سریر آرائے خلافت ہوئے تو دفعتاً سارے عرب میں فتنۂ ارتداد کے شعلے بھڑک اٹھے۔ مرتدین میں سب سے طاقت ور یمامہ کے قبیلہ بنو حنیفہ کا ایک شخص مسیلمہ بن حبیب تھا جو تاریخ میں ''مسیلمہ کذّاب'' کے نام سے مشہور ہے۔ مسیلمہ عہدِ رسالت کے اواخر ہی میں اسلام سے برگشتہ ہو گیا تھا اور مدینہ منوّرہ آ کر سرورِ عالمؐ سے مطالبہ کیا تھا کہ آپ اُسے اپنے بعد خلیفہ بنانے کا وعدہ کریں۔ حضورؐ نے اس کے مطالبے کو رد کرتے ہوئے فرمایا:

''خلافت تو بڑی چیز ہے میں تجھے اپنے ہاتھ کی چھڑی تک دینا پسند نہیں کرتا۔''

یمامہ واپس جا کر اس نے حضورؐ کو خط لکھا کہ:

''میں آپ کے کام میں شریک ہو گیا ہوں، نصف ملک میرا اور نصف قریش کا۔''

سرورِ عالمؐ نے اس کو جواب بھیجا:

''ملک اللہ تعالیٰ کا ہے وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے اس کا وارث بنا دے اور آخرت کی بھلائی پرہیز گاروں کے لیے ہے۔''

حضورؐ کے وصال کے بعد مسیلمہ کذّاب کھل کھیلا اور تقریباً ایک لاکھ آدمیوں کو اپنا معتقد بنا کر اسلامی حکومت سے سرکشی کا علَم بلند کر دیا۔ وہ اپنی طاقت کے گھمنڈ میں اتنا بد دماغ ہو گیا تھا کہ کوئی مسلمان مل جاتا، تو اُس سے زبردستی اپنی نبوّت منوانے کی کوشش کرتا، اگر وہ انکار کر دیتا تو طرح طرح کی اذیتیں دے کر شہید کرا دیتا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس کی سرکوبی کے لیے حضرت عکرمہؓ بن ابوجہل کو مقرر فرمایا، وہ روانہ ہو گئے تو مسیلمہ کی کثیر جمعیت کے پیشِ نظر حضرت شرحبیلؓ بن حسنہ کو ان کی امداد کے لیے مزید فوج دے کر بھیجا۔ حضرت عکرمہؓ نے جوشِ شجاعت میں کمک پہنچنے سے پہلے ہی مسیلمہ سے لڑائی چھیڑ دی۔ لیکن اُن کی مٹھی بھر فوج کی مسیلمہ کی ٹڈی دَل کے سامنے کچھ پیش نہ چلی اور حضرت عکرمہؓ کو پسپا ہونا پڑا۔ حضرت ابوبکرؓ کو اس ہزیمت کی اطلاع ملی تو وہ عکرمہؓ کی جلد بازی پر سخت ناراض ہوئے اور انہیں حکم بھیجا کہ مدینے واپس آنے کی بجائے مہرہ اور عمان کا رُخ کرو اور وہاں کے مرتدوں سے جنگ کرو! دوسری طرف حضرت شرحبیلؓ بن حسنہ کو حکم بھیجا کہ تم یمامہؓ جا کر خالدؓ بن ولید کی معیت میں مسیلمہ سے لڑو۔ حضرت خالدؓ ان دنوں مدینہ منوّرہ آئے ہوئے تھے۔ شرحبیلؓ نے بھی وہی غلطی کی جو عکرمہؓ کر چکے تھے اور حضرت خالدؓ کے پہنچنے سے پہلے ہی مسیلمہ سے لڑائی چھیڑ دی۔ مسلمانوں کی قلیل جماعت کو ہزیمت اٹھا کر پیچھے ہٹنا پڑا۔ اسی اثنا میں حضرت خالدؓ بن ولید مہاجرین اور انصار کی ایک فوج کے ہمراہ بطاح آ گئے تو حضرت خالدؓ مسیلمہ کی طرف بڑھے۔ اس وقت مسیلمہ کے پاس چالیس ہزار سے زیادہ جنگجوؤں کا لشکر تھا، اُن کے مقابلے میں مسلمان سرفروشوں کی تعداد صرف تیرہ ہزار تھی۔

عقرباء کے میدان میں اہلِ حق اور مرتدین کے درمیان سخت خون ریز جنگ ہوئی، مورّخ ابن جریر طبری کا بیان ہے:

لَمْ یَلْقِ الْمُسْلِمُوْنَ حَرْبًا مِثْلُهَا قَطُّ۔

''مسلمانوں کو اس سے زیادہ سخت معرکہ کبھی پیش نہیں آیا۔''

لڑائی کے آغاز سے پہلے مسیلمہ کے بیٹے شرحبیل نے رجز خوانی کرتے ہوئے اپنے قبیلے کو خوب مشتعل کیا اور ان کی قومی عصبیت کو یہ کہہ کر ابھارا کہ اے بنو حنیفہ آج تم اپنے ننگ و ناموس کے لیے کٹ مرو، ورنہ مسلمان تمھاری عورتوں اور لڑکیوں کو لونڈیاں بنالیں گے۔

شرحبیل کی للکار سن کر مرتدین نے بڑے جوش سے مسلمانوں پر حملہ کیا۔ مسلمانوں نے بھی جانیں ہتھیلی پر رکھ لیں اور نہایت پامردی سے اس طوفانی حملے کو روکا، لیکن مرتدین کا دباؤ اتنا شدید تھا کہ مسلمانوں کی صفیں ٹوٹ ٹوٹ جاتی تھیں۔ مسلمی لشکر کے جوان بھی کٹ کٹ کر گر رہے تھے، مگر پیچھے ہٹنے کا نام نہ لیتے تھے۔ حضرت خالدؓ بن ولید اور اسلامی لشکر کے دوسرے افسر مسلمانوں کی ہزیمت سے بچانے کے لیے از خود رفتہ ہو کر لڑ رہے تھے۔ اسی کوشش میں حضرت قیسؓ بن ثابت، حضرت زیدؓ بن خطاب، حضرت ابو حذیفہؓ، حضرت سالمؓ مولائے ابو حذیفہؓ اور کئی دوسرے جلیل القدر صحابہؓ نے مردانہ وار لڑتے ہوئے اپنی جانیں اسلام پر قربان کر دیں۔ اس نازک موقع پر حضرت براءؓ بن مالک آگے بڑھے۔ اہل سِیَر کا بیان ہے کہ جب وہ میدانِ رزم کا رُخ کیا کرتے، تو ان کے بدن پر شدید لرزہ طاری ہو جاتا جس پر قابو پانے کے لیے کئی آدمی اُن کو دبا لیتے تھے۔ جب یہ لرزہ دُور ہو جاتا، تو اُن میں بلا کی قوّت پیدا ہو جاتی اور وہ میدانِ جنگ میں آکر شیر کی طرح بپھرتے۔ اُس روز بھی یہی ہوا، مسلمانوں کو خطرے میں دیکھ کر اُن کو سخت جوش آیا اور لرزہ سے فارغ ہو کر میدانِ جنگ میں پہنچ کر للکارے:

اَیْنَ یَا مَعْشَرَ الْمُسْلِمِیْنَ اَنَا الْبَرَاءُ بْنُ مَالِکٍ هَلُمَّ اِلَیَّ

''اے گروہِ مسلمین کدھر جاتے ہو، میں براء بن مالک ہوں میری طرف آؤ۔''

اُن کی للکار پر مسلمانوں کے اکھڑے ہوئے قدم پھر جم گئے اور انھوں نے تازہ جوش کے ساتھ دشمن پر زبردست حملہ کیا۔ اس وقت دشمن کا ایک نامی جنگجو حضرت براءؓ کے سامنے آگیا، وہ بڑا لحیم شحیم اور قدآور آدمی تھا اور لوگوں میں حمارِ یمامہ'' کے لقب سے مشہور تھا۔ حضرت براءؓ نے اُس کے پاؤں پر تلوار کا وار کیا۔ اس نے بدحواس ہو کر اپنے پاؤں بچانے چاہے اور دھڑام سے چت گر گیا۔ حضرت براءؓ نے اپنی تلوار نیام میں ڈال لی اور اس کی تلوار چھین کر ایسی بھرپور ضرب لگائی کہ دو ٹکڑے ہو گیا۔

لڑائی جس نہج پر ہو رہی تھی اُسے دیکھ کر حضرت خالدؓ بن ولید نے اندازہ لگایا کہ جب تک مسیلمہ کو ختم نہیں کیا جاتا لڑائی کا فیصلہ نہ ہوگا، چناں چہ انھوں نے جان بازوں کا ایک دستہ لے کر دشمن پر ایک طوفانی حملہ کیا اور مرتدین کی صفوں کو درہم برہم کرتے مسیلمہ کی طرف بڑھے۔ حضرت براءؓ بن مالک اُسی دستے میں دادِ شجاعت دے رہے تھے۔ مسیلمہ نے جب دیکھا کہ مسلمان اس کے سر پر پہنچا چاہتے ہیں، تو وہ گھبرا کر اپنے قبیلہ بنو حنیفہ سمیت پیچھے ہٹا اور اپنے قلعہ بند باغ ''حَدِيْقَةُ الرَّحْمٰن'' میں جا گھسا۔ اس کا دروازہ بہت مضبوط تھا اور اُسے توڑنا ناممکن تھا۔ حضرت براءؓ بن مالک اور ابو دجانہؓ نے مسلمانوں سے کہا: ''مسلمانو! باغ کے اندر ہمیں اتار دو، ہم اس کے اندر جا کر دشمنانِ خدا سے لڑیں گے۔'' مسلمان اپنے ان سرفروشوں کو خطرے میں ڈالنے سے ہچکچائے۔ حضرت ابو دجانہؓ تو دیوار پھاند کر خود ہی باغ کے اندر کود گئے براءؓ نے مسلمانوں کو قسم دے کر کہا کہ مجھے بھی باغ میں اتار دو اور پھر دیکھو میں کیا کرتا ہوں!

مسلمانوں نے مجبور ہو کر انہیں دیوار پر چڑھا دیا اور وہ بھی مردانہ وار باغ میں جا کودے۔ بیہقیؒ نے محمد بن سیرینؒ سے روایت کی ہے کہ حضرت براءؓ ایک ڈھال پر بیٹھ گئے تھے اور مسلمانوں سے کہا تھا کہ اُس ڈھال کو نیزوں پر اٹھا کر انہیں دیوار پر چڑھا دیں، چناں چہ انھوں نے ایسا ہی کیا۔

حضرت ابو دجانہؓ کا چھلانگ لگانے سے ایک پاؤں ٹوٹ گیا تھا، لیکن براءؓ بہ خیریت باغ میں اتر گئے اور بھوکے شیر کی طرح مرتدین پر ٹوٹ پڑے۔ لڑتے بھڑتے باغ کے پھاٹک پر پہنچ گئے اور اُسے کھول دیا۔ اس وقت تک وہ دس مشرکوں کو قتل کر چکے تھے۔ مسلمان فوج یلغار کر کے اندر گھسی اور مرتدین کو اپنی تلواروں پر رکھ لیا۔ مسیلمہ بھاگنے کی فکر میں تھا کہ حضرت وحشیؓ نے دیکھ لیا، تاک کر اپنا برچھا اس پر پھینکا اور وہ دو ٹکڑے ہو کر زمین پر گر پڑا۔ اُسے قتل ہوتے دیکھ کر مرتدین میں بھگدڑ مچ گئی اور وہ اپنے ہزاروں آدمی کٹوا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ مسلمانوں کا نقصان بھی کچھ کم نہ تھا۔ ان کے ایک ہزار آدمیوں نے جامِ شہادت پیا جن میں بہت سے جلیل القدر صحابہؓ اور حفاظِ قرآن بھی شامل تھے۔

حضرت براءؓ بن مالک زخموں سے چور چور ہو گئے تھے۔ تیر اور تلوار کے اسّی سے زیادہ زخم تھے۔ حضرت خالدؓ بن ولید اٹھوا کر اپنی قیام گاہ پر لائے اور بہ ذاتِ خود اُن کی تیمارداری کی۔

حافظ ابنِ حجر عسقلانیؒ کا بیان ہے کہ حضرت براءؓ کے علاج کے لیے حضرت خالدؓ نے ایک ماہ تک وہاں قیام کیا۔ جب براءؓ کے زخم مندمل ہو گئے تو وہ پہلے کے سے جوش اور ولولہ کے ساتھ پھر جہاد کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

(۳)

فتنۂ ارتداد کے خاتمے کے بعد ایران اور شام سے معرکہ آرائیوں کا طویل سلسلہ شروع ہو گیا اور عرب کے کونے کونے سے توحید کے نام لیواؤں نے قیصری صولت اور کسروی سطوت سے نبرد آزما ہونے کے لیے ایران اور شام کے میدانوں کا رُخ کیا۔ حضرت براءؓ بن مالک بھی مجاہدینِ اسلام میں شامل ہو گئے اور زندگی کی آخری سانس تک جہاد فی سبیل اللہ میں مشغول رہے۔ انھوں نے جن معرکوں میں شرکت کی، مؤرّخین نے دو تین کے سوا کسی کی تفصیل نہیں دی۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ انھوں نے بالعموم ایک سپاہی کی حیثیت سے جہاد میں حصہ لیا۔ حضرت عمر فاروقؓ کا ارشاد تھا کہ براءؓ کو فوج کا افسر بنانا بہت خطرناک ہے، کیوں کہ وہ نتائج و عواقب سے بے پروا ہو کر سیدھے ہی جائیں گے اور یہ تھا بھی صحیح۔ حضرت براءؓ کو اللہ تعالیٰ نے شیر کا دِل گردہ عطا کیا تھا۔ وہ بلا کے جری اور دلیر تھے اور حقیقی معنوں میں خدا کے شیر تھے۔ راہِ حق میں اس بے جگری سے لڑتے تھے کہ شجاعت اور استقامت بھی آفرین کہہ اُٹھتی تھی۔ حضرت عمرؓ انہیں بلا کہہ کر پکارا کرتے تھے اور واقعی وہ دشمن کے لیے بلائے بے درماں ثابت ہوتے تھے۔ محمد حسین ہیکل اپنی کتاب ''عمر فاروق اعظمؓ'' میں حضرت براءؓ کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''وہ ایک آزمودہ کار سورما اور نامور شہسوار تھے، مسلمانوں نے ارتداد کی جنگوں اور عراق و شام کی معرکہ آرائیوں میں اُن کے شجاعت آفریں کارنامے دیکھے اور گواہ تھے کہ وہ کہیں مغلوب نہیں ہوئے۔''

عراقِ عرب اور ایران کے کئی معرکوں میں حضرت براءؓ اور حضرت انسؓ دونوں بھائی اکٹھے شریک ہوئے۔ عراق عرب کے ایک معرکے میں حضرت انسؓ بن مالک سخت مصیبت میں گرفتار ہو گئے تھے۔ اگر اس موقع پر حضرت براءؓ ان کی مدد کے لیے نہ پہنچتے تو اسلام کے اس مایۂ ناز گوہرِ تابندہ کی جان جانے میں کوئی کسر باقی نہ رہ گئی تھی۔ بعض مؤرخین نے اسے معرکۂ حریق کا نام دیا ہے۔ حریق (عراقِ عرب) کا قلعہ نہایت مضبوط تھا۔ مسلمان اس پر حملہ آور ہوئے تو

اہلِ حریق نے قلعے کے دروازے بند کر لیے اور مقابلے پر ڈٹ گئے۔ انھوں نے قلعے کی دیواروں پر کانٹے دار زنجیریں لٹکا دیں، کوئی مسلمان دیوار پر چڑھنے کی کوشش کرتا، تو اُسے زنجیر سے اوپر کھینچ لیتے۔ ایک دن حضرت انسؓ بن مالک نے جوشِ شجاعت میں دیوار پر چڑھنے کی کوشش کی۔ قلعہ والوں نے انہیں زنجیر میں جکڑ لیا۔ اوپر کھینچ ہی رہے تھے کہ حضرت براءؓ کی نظر پڑ گئی، وہ بھائی کو بچانے کے لیے دیوانہ وار لپکے اور زنجیر کو پکڑ کر اس زور سے جھٹکا دیا کہ وہ اہلِ قلعہ کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور حضرت انسؓ زمین پر آ گرے، چوں کہ ابھی زیادہ بلندی پر نہیں گئے تھے اس لیے بچ گئے، لیکن زنجیر کے کانٹوں سے حضرت براءؓ کے ہاتھ کا تمام گوشت نچ گیا اور ہڈیاں نکل آئیں، تاہم انہیں اپنے زخمی ہونے کا غم نہ تھا، بلکہ وہ اپنے بھائی کے موت کے منہ سے بچ نکلنے پر بہت خوش تھے اور بار بار خدا کا شکر ادا کرتے تھے۔ اس واقعے کے بعد مسلمان بہت چوکنّے ہو گئے اور بڑی احتیاط سے کام لینے لگے۔ بالآخر ایک دن انھوں نے قلعے پر ایسا تند و تیز حملہ کیا کہ محصورین کی ہمتیں پست ہو گئیں اور انھوں نے ہتھیار پھینک دیے۔ مسلمان قلعے میں فاتحانہ داخل ہوئے اور اس کے سب سے بُلند برج پر پرچم اسلام نصب کر دیا۔

(۴)

۱۷ھ میں حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ بصرہ کے گورنر مقرر ہوئے، تو قریب کے ایرانی علاقے خوزستان کے رئیسوں نے مسلمانوں کے خلاف شورش پر کمر باندھی اور اعلانیہ بغاوت کا اظہار کیا۔ حضرت ابو موسیٰ نے سرفروشانِ اسلام کی ایک مضبوط جمعیت کے ساتھ خوزستان پر یلغار کر دی اور وہاں کے اہم شہروں اہواز، مناذر، سوس اور امہرز کو یکے بعد دیگرے فتح کر لیا۔ شاہِ ایران یزدگرد کو جو اُس وقت قُم میں مقیم تھا، ابو موسیٰ کی فتوحات کی خبریں پہنچیں، تو اس نے اپنے ایک سردار ہرمزان کو حکم دیا کہ وہ فوراً جا کر اہواز اور فارس کی حکومت سنبھالے اور مسلمانوں کو ان علاقوں سے باہر نکال دے۔ ہرمزان کا تعلق ایران کے شاہی خاندان سے تھا اور وہ بڑا صاحبِ تدبیر اور بارسوخ آدمی تھا۔ اُس نے ایک زبردست لشکر لے کر خوزستان کے صدر مقام تستَر (شوستر) کو اپنا مستقر بنایا اور بڑے زور شور سے مسلمانوں سے رزم آرائی کی تیاریاں کیں۔ اُس نے ایرانیوں کی قومی عصبیت کو ابھار کر ان میں آگ سی لگا دی اور ایرانی جنگجوؤں کی ایک کثیر تعداد شوستر آ کر اُس کے جھنڈے تلے لڑنے مرنے کے لیے آمادہ ہو گئی۔ ہرمزان نے قلعۂ شوستر

کی دیواروں، برجوں اور خندق کی مرمّت کروائی اور اس کو اپنی طرف سے ناقابلِ تسخیر بنانے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ حضرت ابو موسیٰ نے تستر کا رُخ کیا اور شہر کے قریب پہنچ کر خیمہ زن ہو گئے۔ مجاہدینِ اسلام میں حضرت براءؓ بن مالک اور انسؓ بن مالک بھی شامل تھے۔ دونوں بھائی جلیل القدر صحابی تھے اور میدانِ جہاد میں متعدد موقعوں پر اپنی شجاعت اور بسالت کا لوہا منوا چکے تھے۔ حضرت عمرؓ نے اگرچہ بر بنائے احتیاط حضرت براءؓ کو فوج کا افسر بنانے سے منع کیا تھا، لیکن حضرت ابو موسیٰ نے اپنی صواب دید پر اُنھیں میمنہ کا افسر بنا دیا اور حضرت انسؓ کو سواروں کی قیادت سپرد کی۔ ہرمزان نے اپنی فوج کی کثرت کے بل پر شہر سے باہر نکل کر مسلمانوں پر حملہ کیا، لیکن مجاہدینِ اسلام ہتھیلی پر سر رکھ کر لڑے اور ہرمزان کو پسپا کر کے قلعہ بند ہونے پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد جب کبھی اس کی باسی کڑھی میں اُبال آتا شہر سے باہر نکل کر مسلمانوں پر حملہ کرتا، لیکن ہر بار منھ کی کھا کر واپس جاتا۔ ان معرکوں میں حضرت براءؓ نے کمال درجے کی جان بازی دکھائی اور تنہا دشمن کے سو آدمی ہلاک کیے۔ ان کے علاوہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر انھوں نے اس قدر ایرانی قتل کیے کہ ان کا شمار کرنا مشکل ہے۔ اثنائے محاصرہ میں ایک دن حضرت براءؓ خوش الحانی سے شعر پڑھ رہے تھے کہ حضرت انسؓ اُن کے خیمے میں پہنچ گئے اور کہا: ”بھائی جان! اللہ نے آپ کو اس سے اچھی چیز (قرآنِ حکیم) سے نوازا ہے، آپ اس کو کیوں لحن سے نہیں پڑھتے؟“ حضرت براءؓ نے جواب دیا ”انسؓ شاید تمھیں یہ خوف ہے کہ کہیں میں بستر پر ہی نہ مر جاؤں! خدا کی قسم ایسا نہیں ہوگا، میری موت میدانِ جنگ ہی میں آئے گی۔“

ایک دن دشمن نے باہر نکل کر مسلمانوں پر ایسا خوف ناک حملہ کیا کہ ان کے قدم ڈگ مگا گئے، مسلمانوں کو حضرت براءؓ کے متعلق سرورِ عالمؐ کی حدیث یاد تھی، اُن کے پاس آئے اور کہا ” آج قسم کھائیے کہ خدا ہمیں فتح دے گا۔“ براءؓ نے فوراً دست بہ دُعا ہو کر کہا: ”الٰہی میں تجھ کو قسم دیتا ہوں کہ مسلمانوں کو مظفّر و منصور کر، کفّار کے ہاتھ ان کے ہاتھوں میں دے دے۔ اور مجھ کو میرے آقاؐ کی زیارت نصیب فرما۔“

اس کے بعد فوج لے کر دشمن پر ٹوٹ پڑے، جو سامنے آیا اُسے مار گرایا۔ اسی طرح دادِ شجاعت دیتے ہوئے قلعے کے پھاٹک تک جا پہنچے۔ یہاں ہرمزان خود ان کے مقابل ہوا، وہ سر سے پاؤں تک لوہے میں غرق تھا اور بالکل تازہ دم۔ دونوں میں بڑے زور کا مقابلہ ہوا۔ براءؓ کو

اس کے ہاتھ سے ایک کاری زخم لگا اور حق کا یہ جان باز سپاہی جامِ شہادت پی کر عازمِ خلدِ بریں ہو گیا، لیکن اللہ کے اس شیر کا خوں رائیگاں نہ گیا۔ مسلمانوں نے اُن کی شہادت کے بعد فتح عظیم حاصل کی اور ایرانیوں کو پسپا ہو کر قلعے میں پناہ لینی پڑی۔ یوں اللہ تعالیٰ نے اپنے لاڈلے براءؓ کی قسم پوری کر دی۔ چند دن بعد مسلمانوں نے نہ صرف تستر کو فتح کر لیا، بلکہ ہرمزان کو گرفتار کر کے حضرت انسؓ کی حفاظت میں بارگاہِ خلافت میں روانہ کر دیا۔ وہاں اس نے ایک حیلے سے اپنی جان بچائی اور پھر اسلام کے دامن میں پناہ لی۔

حضرت براءؓ بن مالک کا شمار جلیل القدر صحابہ میں ہوتا ہے۔ حافظ ابنِ عبد البرؒ نے تو ان فضلاء صحابہؓ میں شامل کیا ہے، کیوں کہ وہ برسوں فیضانِ نبوی سے بہرہ یاب ہوئے، تاہم ان سے کوئی حدیث مروی نہیں ہے۔ بہ ظاہر اس کا سبب یہ ہے کہ وہ بنیادی طور پر ایک مردِ سپاہی تھے۔ ساری زندگی میدانِ جہاد میں گزار دی اور حدیث بیان کرنے کی طرف توجہ ہی نہ دی۔ تمام اہلِ سِیَر ان کی بے مثل شجاعت، جرأت اور بے خوفی کے معترف ہیں اور اس کے ساتھ ان کے مستجاب الدّعوات ہونے پر بھی سب کا اتفاق ہے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت ابو جابر عبد اللہ سلمیؓ

(۱)

۷ ر شوال ۳ھ پرستارانِ حق کے لیے سخت ابتلا اور دُکھ کا دن تھا۔ اس دن میدانِ احد میں رحمتِ دو عالم ﷺ زخمی ہوئے اور ستّر مسلمانوں نے راہِ حق میں اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔ مشرکینِ مکّہ نے اس موقع پر ایسی بہیمیت اور قساوتِ قلبی کا مظاہرہ کیا کہ انسانیت سر پیٹ کر رہ گئی۔ انھوں نے جوشِ انتقام میں مسلمان مقتولوں میں سے اکثر کی لاشوں کا مُثلہ کر ڈالا (اُن کے کان ناک ہونٹ کاٹ ڈالے)۔ لڑائی کے مجاہدین کے اعزّہ واقارب دریافت حال کے لیے مدینہ منوّرہ سے جوق در جوق میدانِ اُحد میں پہنچے۔ سرورِ عالم ﷺ نے ان کے ہم راہ میدان کا چکر لگایا اور شہیدوں کی خون آغشتہ لاشوں کو دیکھ کر آب دیدہ ہوگئے۔ ایک شہیدِ راہِ حق کی بہن اپنے محبوب بھائی کی مثلہ کی ہوئی لاش دیکھ کر غم واندوہ سے نڈھال ہوگئیں، بے اختیار چیخ ماری اور زار وقطار رونے لگیں۔ رحمتِ عالم ﷺ نے ان کو تسلّی وتشفی دی اور فرمایا:

"تم روؤ یا نہ روؤ (اللہ نے تمھارے بھائی کو یہ مرتبہ عطا کیا ہے) کہ فرشتے اس پر اپنے پروں کا سایہ کیے ہوئے ہیں۔"

اُحد کے یہ عظیم المرتبت شہید جن کے جنازے پر ملائکۂ آسمانی نے پروں سے سایہ کیا۔ سیدنا ابو جابر عبد اللہؓ بن عمرو بن حرام السلمی الانصاری تھے۔

(۲)

سیّدنا ابو جابر عبد اللہؓ بن عمرو کا شمار بڑے جلیل القدر صحابہ میں ہوتا ہے۔ وہ خزرج کی شاخ بنو سلمہ کے رؤسا میں سے تھے۔ سلسلۂ نسب یہ ہے:

عبد اللہؓ بن عمرو بن حرام بن کعب بن غنم بن سلمہ بن سعد بن علی بن اسد بن سارد ہ بن یزید بن جشم بن خزرج۔

بنو سلمہ کی آبادی حرّہ اور مسجدِ قبلتین تک پھیلی ہوئی تھی لیکن خاص عبد اللہؓ بن عمرو کا خاندان قبرستان اور ایک چھوٹی مسجد کے درمیان آباد تھا۔ عبد اللہؓ کے والد عمرو بن حرام صاحبِ ثروت آدمی تھے اور اپنے خاندان کے رئیس تھے۔ ایک چشمہ عین الازرق اور کئی قلعے ان کے تصرف میں تھے۔ ان کی وفات کے بعد یہ ساری جائداد حضرت عبد اللہؓ کو ملی۔ وہ بڑے کثیر العیال اور کشادہ دست تھے اس لیے ریاست اور تموّل کے باوجود مقروض رہتے تھے۔ اہلِ سیَر نے ان کے سالِ ولادت کی تصریح نہیں کی لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ چھٹی صدی عیسوی کے اواخر میں پیدا ہوئے (ہجرت سے تقریباً چالیس برس پہلے)۔

انصار میں اسلام کی ابتدا بیعتِ عقبہ سے ہوئی۔ ۱۱ نبوّت میں چھ انصاری مکہ جا کر شرفِ اسلام اور حضورؐ کی بیعت سے بہرہ یاب ہوئے۔ دوسرے سال مدینہ کی بارہ سعید روحوں نے یہ سعادت حاصل کی اور اسی سال ان کی درخواست پر جب حضورؐ نے حضرت مصعبؓ بن عمیر کو اسلام کا مبلغِ اوّل بنا کر مدینہ منورہ روانہ کیا تو اُن کی تبلیغی مساعی کے نتیجہ میں انصار کے گھر گھر میں اسلام کا چرچا پھیل گیا، معلوم نہیں کیا چیز مانع ہوئی کہ حضرت عبد اللہؓ اس زمانے میں اسلام قبول نہ کر سکے۔ البتہ ۱۳ نبوّت کے موسمِ حج میں جب اہلِ مدینہ کا ایک قافلہ حج کے لیے مکّہ جانے کے لیے تیار ہوا تو وہ بھی اس میں شامل ہو گئے۔ (اس زمانے میں عرب کے مسلم اور کافر سبھی حج کو اپنی مذہبی فریضہ سمجھتے تھے) اس قافلے میں چوہتر مسلمان اور باقی سب کافر تھے۔ ابنِ جریر طبری نے حضرت کعبؓ بن مالک سے روایت کی ہے کہ اثنائے سفر میں ہم نے عبد اللہؓ بن عمرو بن حرام سے کہا:

> ''اے ابو جابر آپ بھی ہماری قوم کے ایک سردار ہیں اور آپ کو بڑی عزّت اور مرتبہ حاصل ہے لیکن ہمیں یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ آپ ابھی تک کفر و شرک کی بھول بھلیّوں میں بھٹک رہے ہیں۔ اگر آپ اپنی روش پر قائم رہے تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ آپ کو دوزخ میں پھینک دے گا۔ ہم نہیں چاہتے کہ آپ جیسے ذی فہم آدمی کا یہ انجام ہو۔ کیا ہی خوب ہو کہ آپ ہمارا ساتھ دیں اور دینِ حق قبول کرنے میں تاخیر نہ کریں۔ رسول اللہ ﷺ نے ہم سے ملاقات کا وعدہ فرما رکھا ہے۔ ہم حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت کریں گے۔''

غرض ہم نے ایسے دل نشین پیرائے میں عبداللہؓ کو اسلام کی دعوت دی کہ وہ فی الفور ہمارے ہاتھ پر مسلمان ہو گئے۔ ان کے نوجوان فرزند جابرؓ بھی اس قافلے میں شامل تھے وہ بھی ان کے ساتھ ہی سعادت اندوزِ اسلام ہو گئے۔(۱)

اس طرح قافلہ کے مسلم شرکاء کی تعداد پچھتر ہو گئی (۷۳ مرد اور دو خواتین)۔

(۳)

اس کے بعد اہل قافلہ میں سے حضرت عویمؓ بن ساعدہ اور کچھ دوسرے حضرات (جو اسلام قبول کر چکے تھے) حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپؐ سے استدعا کی کہ مدینہ کے اہلِ حق سے ملاقات کے لیے کوئی وقت مقرر فرمائیں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ یہ لوگ مجھ سے یوم النفر الآخر (وہ آخری دن جب حاجی منیٰ سے روانہ ہو جاتے ہیں) سے پہلی رات عقبہ کے نشیبی حصے میں ملیں۔ چناں چہ مقررہ رات کو قافلہ کے تمام مسلمان چھپتے چھپاتے دو دو چار چار کر کے مقررہ جگہ پر پہنچ گئے۔ وہاں سرورِ عالم ﷺ اپنے چچا عباسؓ بن عبدالمطلب کے ساتھ موجود تھے۔(۲)

حضرت معاذؓ بن رِفاعہ بن رافع سے روایت ہے(۳) کہ جب سب لوگ عقبہ کے مقام پر جمع ہو گئے تو حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب نے اس طرح گفتگو شروع کی:

"اے خزرج(۴) کے لوگو! تم نے محمد (ﷺ) کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دی ہے تو سُن لو

---

(۱) ایک دوسری روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت جابرؓ اپنے والد سے پہلے ہی مسلمان ہو چکے تھے۔ امام احمدؒ اور طبرانیؒ نے خود حضرت جابرؓ سے روایت کی ہے کہ بیعتِ عقبہ کبیرہ سے پہلے انصار کے محلوں میں کوئی ایسا نہ تھا جس میں مسلمانوں کی ایک جماعت نہ پائی جاتی ہو۔ ایک روز ہم سب جمع ہوئے اور طے کیا کہ ہم رسول اللہ ﷺ کو کب تک مکّہ میں بے یار و مددگار چھوڑے رکھیں گے، اس کے بعد ہم حج کے موقعے پر مکّہ گئے اور حضورؐ سے عقبہ میں ملے۔

(۲) حضرت عباسؓ نے اس وقت تک اسلام قبول نہیں کیا تھا لیکن وہ شروع ہی سے حضورؐ کے خیر خواہ اور مددگار تھے۔ اس لیے حضورؐ ان پر اعتماد فرماتے تھے۔ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ حضرت عباسؓ دل سے مسلمان ہو چکے تھے لیکن اپنا اسلام چھپائے ہوئے تھے۔

(۳) اس سلسلے کی روایات میں قدرے اختلاف ہے۔ ہم نے یہ روایت جو ابنِ سعد نے واقدی کے حوالہ سے نقل کی ہے، اس لیے یہاں درج کی ہے کہ اس میں حضرت عبداللہؓ بن عمرو بن حرام کا نام خصوصیت سے آیا ہے۔

(۴) اس زمانے میں اوس اور خزرج کے مجموعے کو خزرج کہا جاتا تھا۔

کہ محمد (ﷺ) اپنے قبیلے اور رشتہ داروں کے درمیان بڑی مضبوط حیثیت کے مالک ہیں۔ ہم میں سے جنھوں نے ان کا دین قبول کر لیا ہے اور وہ بھی جنھوں نے قبول نہیں کیا، سب ان کی حفاظت اور حمایت کر رہے ہیں مگر محمد (ﷺ) سب کو چھوڑ کر تمھارے پاس ہی جانا چاہتے ہیں۔ اب تم سوچ لو کہ تم میں اتنی قوت اور حوصلہ ہے کہ سارے عرب کی مخالفت مول لے سکو کیوں کہ تمام عرب متحد ہو کر تم پر یلغار کر دیں گے۔ لہٰذا آپس میں اچھی طرح مشورہ کر کے کوئی متفقہ فیصلہ کرو کیوں کہ سب سے اچھی سچی بات ہے۔''

اس کے بعد حضرت عباسؓ نے پوچھا۔ ''ذرا مجھے یہ تو بتاؤ کہ تم اپنے دشمن سے کس طرح نبرد آزما ہوتے ہو؟''

اس پر حضرت عبداللہؓ بن عمرو بن حرام بولے:

''واللہ اے عباس! ہم لڑنے مرنے والے لوگ ہیں، جنگ ہماری گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ ہم اس کے ماہر ہو چکے ہیں کیوں کہ یہ ہمیں باپ دادا سے ورثے میں ملی ہے۔ ہم پہلے قدر اندازی کرتے ہیں یہاں تک کہ ہمارے تیر ختم ہو جائیں پھر ہم نیزوں سے دشمن پر پل پڑتے ہیں یہاں تک کہ نیزے بھی ٹوٹ جائیں پھر ہم تلواریں کھینچ لیتے ہیں اور دشمن سے دو بدو مقابلہ کرتے ہیں یہاں تک کہ ایک نہ ایک فریق ختم ہو جاتا ہے۔''

عبداللہؓ کی باتیں سُن کر حضرت عباسؓ نے کہا: ''واقعی تم جنگ آزما لوگ ہو۔''

پھر براءؓ بن معرور جوش میں آ کر کھڑے ہو گئے اور کہا:

''اے عباسؓ! ہم نے آپ کی بات سنی آپ بھی ہماری یہ بات سن لیں کہ ہم نامرد نہیں ہیں ہم نے تلواروں کی گود میں پرورش پائی ہے۔ خدا کی قسم ہمارے دلوں میں اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کریں اور اپنی جانوں اور مالوں کے ساتھ آپؐ کی حفاظت کریں۔''

دوسرے انصار نے ان کی بات کاٹ کر فرمایا: ''یا رسولؐ اللہ آپ بھی کچھ فرمائیے۔''

حضورؐ نے قرآنِ کریم کی چند آیتیں پڑھیں اور اہلِ یثرب کو اسلام پر مضبوطی سے قائم رہنے کی ہدایت فرمائی اور پھر فرمایا:

''میں تم سے اس بات کی بیعت لیتا ہوں کہ تم اپنی جانوں اور اہل و عیال کی مانند میری

حفاظت کرو گے اور دین کی اشاعت میں میری پوری مدد کرو گے۔''

حضرت براءؓ بن معرور نے پھر کہا:

''یا رسول اللہ خدا کی قسم ہم آپؐ کی ہر طریقہ سے حفاظت اور مدد کریں گے۔''

حضرت ابوالہیثمؓ بن التیہان نے بیچ میں بات کاٹ کر کہا:

''یا رسول اللہ ہمارے اور یہود کے مابین معاہدات ہیں جو بیعت کے بعد ٹوٹ جائیں گے ایسا نہ ہو کہ جب اللہ تعالیٰ آپؐ کو غلبہ عطا کر دے تو آپؐ ہمیں چھوڑ کر اپنی قوم میں واپس چلے جائیں۔''

سرورِ عالم ﷺ نے مسکرا کر فرمایا:

''نہیں بلکہ میرا خون تمھارا خون ہے اور میرا ذمہ تمھارا ذمہ ہے۔ میں تمھارا ہوں اور تم میرے ہو۔ تم جس سے لڑو گے میں بھی اس سے لڑوں گا اور جس سے تمھاری صلح ہوگی میری بھی اس سے صلح ہوگی۔''

حضورؐ کے ارشادات سُن کر یہ سب نفوسِ قدسی بیعت کے لیے لپکے۔ سب سے پہلے حضرت براءؓ بن معرور (اور ایک دوسری روایت کے مطابق حضرت اسعدؓ بن زرارہ) نے حضورؐ کی بیعت کی۔ اس موقعے پر حضرت اسعدؓ بن زرارہ (اور ایک دوسری روایت کے مطابق حضرت عباسؓ بن عُبادہ بن نضلہ انصاری) نے پکار کر کہا:

''اے اہلِ یثرب! خبردار رہو کہ تم کس چیز پر بیعت کر رہے ہو، یہ بیعت ساری دنیا سے لڑائی مول لینے کے مترادف ہے (گورے اور کالے سب سے لڑنے کے لیے ہے) خوب جان لو کہ اس کے نتیجے میں ایسا وقت آ سکتا ہے کہ ہمارے شرفا قتل ہوں، ہمارا مال برباد ہو جائے، ہماری عزّت و ناموس خطرے میں پڑ جائے۔ اس وقت ایسا نہ ہو کہ مشکلات و مصائب کے ہجوم سے گھبرا کر تم محمد رسول اللہؐ کو دشمنوں کے حوالے کر دو۔ اگر تم کو اپنی جانوں کا خوف ہے تو پھر ابھی انھیں چھوڑ دو اور صاف صاف عذر کر دو اور اگر آخری دم تک ان کا ساتھ دینے کی ہمت اپنے اندر پاتے ہو تو پھر ان کا ہاتھ تھام لو۔''

سب انصار نے بیک آواز کہا: ''ہاں ہاں ہم سب خطرات کو دیکھ کر بیعت کر رہے ہیں۔'' پھر انھوں نے عرض کیا: ''یا رسول اللہؐ اگر ہم اپنے پیمانِ وفا کو پورا کر دکھائیں تو ہمارے لیے کیا ہے؟''

حضوؐر نے فرمایا: جنت‘‘

حضوؐر کا جواب سُن کر سب لوگ بڑے ذوق وشوق سے یکے بعد دیگرے حضوؐر کی بیعت سے مشرف ہوگئے۔ حضرت عبداللہؓ بن عمرو بن حرام بھی بالاتفاق ان نفوسِ قدسی میں شامل تھے۔ اس بیعت کو تاریخ بیعت لیلۃ العقبہ بیعتِ عقبہ ثانیہ، بیعتِ عقبہ کبیرہ مختلف ناموں سے پکارا گیا ہے، یہ بیعت تاریخِ اسلام میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے اور اس میں شامل ہونے والے مردانِ حق کا درجہ اصحابِ بدر سے بھی افضل ہے۔ اور ان میں سے جو بدر میں بھی شریک ہوئے ان کی عظمت اور رفعتِ قدر کا اندازہ کون کرسکتا ہے؟

بیعت کے بعد سرورِ کائنات ﷺ نے اہل مدینہ سے فرمایا:

’’موسیٰؑ نے بنی اسرائیل کے بارہ نقیب منتخب کیے تھے، تم بھی دینی امور کی حفاظت کے لیے اپنے بارہ نقیب منتخب کرلو۔‘‘

چناں چہ مؤمنینِ مدینہ نے بارہ نقباء اتفاقِ رائے سے منتخب کرلیے۔ ان میں سے نو قبیلہ خزرج اور تین قبیلہ اوس کے چشم وچراغ تھے۔

خزرج کے نو نقباء میں سے ایک حضرت عبداللہؓ بن عمرو بن حرام تھے۔ وہ اپنے خاندان بنو سلمہ کے جو خزرج ہی کی ایک شاخ تھا نقیب بنائے گئے۔ مدینہ واپس پہنچ کر انھوں نے بڑی تندہی کے ساتھ اسلام کی اشاعت کی۔ حضرت سعدؓ بن عبادہ رئیسِ خزرج بھی اُن کی طرح تبلیغ میں بہت سرگرم تھے۔ سرورِ عالمؐ نے ایک موقع پر ان کے بارے میں ارشاد فرمایا:

’’خدا تمام انصار کو ہماری طرف سے جزائے خیر دے خصوصاً عبداللہؓ بن عمرو بن حرام اور سعدؓ بن عبادہ کو۔‘‘

(۳)

بیعت عقبہ کبیرہ ذوی الحجہ ۱۳ نبوّت کے بعد سرورِ عالم ﷺ نے مکّہ کے مسلمانوں کو مدینے کی طرف ہجرت کرنے کا اِذن دے دیا لیکن آپ خود ڈھائی مہینے مکّہ ہی میں مقیم رہے۔ اس دوران میں مکّہ سے بیشتر مسلمان ہجرت کرکے مدینہ کے دار الامن میں پہنچ گئے۔ اس کے بعد جب حضوؐر خود ہجرت فرما کر مدینہ منوّرہ تشریف لے گئے تو اہلِ مدینہ نے دیدہ و دل فرشِ راہ

کر دیے اور بیعتِ عقبہ کے عہد کے مطابق اپنی جانیں اور مال مکّہ کے دُرِّ یتیم علیہ وسلم کی خدمت اور اعانت کے لیے وقف کر دیئے۔

رمضان المبارک ۲ ھ میں میدانِ بدر میں حق اور باطل کا پہلا معرکہ برپا ہوا تو حضرت عبداللہؓ بن عمرو ان تین سو تیرہ نفوس قدسی میں سے ایک تھے جن کو اس موقع پر رحمتِ عالم علیہ وسلم کی ہم رکابی کا شرف حاصل ہوا اور جو اپنی بے سروسامانی کے باوجود کفر کی مہیب طاغوتی قوت سے بھڑ گئے۔ انھوں نے محض اپنی قوتِ ایمانی کے بل پر مشرکین کو عبرت ناک شکست دی اور انھیں سخت جانی نقصان پہنچایا۔ اس ہزیمت نے مسلمانوں سے بدلہ لینے کے لیے قریش مکہ کو آتش زیرپا کر دیا۔ اور وہ پہلے سے سہ چند تیاری کے ساتھ اگلے سال مدینہ منوّرہ پر چڑھ آئے۔ سرورِ عالم علیہ وسلم مدینہ منوّرہ سے باہر نکل کر کوہِ اُحد کے دامن میں اس شیطانی لشکر کے مقابل ہوئے اس وقت صرف سات سو فدائیانِ توحید آپؐ کے ہم راہ تھے جب کہ کیل کانٹے سے لیس حملہ آوروں کی تعداد تین ہزار تھی۔ غازیانِ اسلام میں حضرت عبداللہؓ بن عمرو بھی شامل تھے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ غزوہ سے پہلے ایک شب انھوں نے اپنے نوجوان فرزند حضرت جابرؓ کو بلایا اور کہا:

> ''بیٹے میرا دل کہہ رہا ہے کہ اس لڑائی میں مجھے سب سے پہلے شہادت نصیب ہوگی۔ مجھے اپنی جان مال اولاد ہر چیز سے بڑھ کر رسول اللہ علیہ وسلم محبوب ہیں، آپؐ کے بعد تم سب سے بڑھ کر محبوب ہو، تم کو وصیت کرتا ہوں کہ تم گھر پر رہ کر اپنی بہنوں کی اچھی طرح خبر گیری کرنا اور مجھ پر جو قرض ہے اس کو ادا کر دینا۔''

یہ وصیت حضرت عبداللہؓ نے اس لیے کی کہ ان کی نو بچیاں تھیں جن میں چھ بہت چھوٹی تھیں۔ نو بہنوں کے صرف ایک بھائی حضرت جابرؓ تھے۔ اگر وہ بھی لڑائی میں شامل ہو جاتے تو گھر بالکل خالی ہو جاتا۔

میدان رزم گرم ہوا تو حضرت عبداللہؓ نے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر شیر کی طرح مشرکوں پر جھپٹے اور دُور تک ان کی صفوں کے اندر گھس گئے۔ ایک مشرک اسامۃ الاعور بن عبید (یا بہ روایت دیگر سفیان بن عبد شمس) نے ان پر تاک کر حملہ کیا، عبداللہؓ شہید ہو کر فرشِ خاک پر گر گئے اور یوں ان کے دل کی تمنّا پوری ہوگئی۔ شقی القلب مشرکین نے اُن کی لاش کا مُثلہ کر ڈالا۔ لڑائی ختم ہوئی تو مسلمانوں نے نعش پر کپڑا ڈال دیا۔ حضرت جابرؓ نے آ کر لاش کے منہ سے

کپڑا ہٹایا تو اس کی حالت دیکھ کر رونے لگے، بنو سلمہ ان کو بہتیرا منع کرتے تھے لیکن ان کا گریہ تھمتا نہ تھا۔ حضرت عبداللہؓ بن عمرو کے بہنوئی حضرت عمروؓ بن الجموح اور بھانجے خلادؓ بن عمروؓ بن الجموح بھی اس لڑائی میں مردانہ وار لڑ کر شہید ہو گئے تھے، ان کی بہن ہندؓ بنت عمرو بن حرام میدانِ احد میں پہنچیں تو شوہر، بیٹے اور بھائی کو خاک وخون میں غلطاں دیکھا، یہ ان کے لیے صدمۂ عظیم تھا لیکن جب سرورِ عالم ﷺ کو اپنے درمیان موجود پایا تو دل کو قرار آ گیا تاہم جب حضرت عبداللہؓ کے منھ سے کپڑا ہٹایا گیا تو بھائی کو اس حالت میں دیکھ کر بے اختیار منھ سے چیخ نکل گئی اور حضرت جابرؓ (بھتیجے) کے ساتھ مل کر رونے لگیں۔ اسی موقع پر رحمت عالم ﷺ نے فرمایا کہ ''تم روؤ یا نہ روؤ فرشتے اپنے پروں سے عبداللہؓ پر سایہ کیے ہوئے ہیں۔''

ایک روایت میں ہے کہ حضرت ہندؓ بنت عمرو اپنے شوہر عمروؓ بن الجموح لختِ جگر خلادؓ اور بھائی عبداللہؓ تینوں کی لاشیں اونٹ پر لاد کر بہ غرض تجہیز و تکفین مدینہ کو لے چلیں، راستے میں حضرت عائشہ صدیقہؓ میدانِ جنگ کی طرف آتے ہوئے ملیں۔ (اس وقت تک آیتِ حجاب نازل نہیں ہوئی تھی)[(۱)] انھوں نے ہندؓ سے رسول اللہ ﷺ کے بارے میں دریافت کیا۔ ہندؓ نے کہا۔ ''الحمد للہ حضورؐ بہ خیریت ہیں اور یہ لاشیں میرے شوہر، فرزند اور بھائی کی ہیں۔'' اتنے میں وہ اونٹ خود بہ خود بیٹھ گیا، اس کو بہت ہانکا گیا لیکن اس نے ایک قدم بھی مدینہ کی جانب نہ بڑھایا۔ اُمُّ المومنینؓ نے پوچھا، ''شاید اس پر بوجھ زیادہ ہے۔'' ہندؓ نے عرض کیا: نہیں ہم اس سے زیادہ بوجھ اس اونٹ پر لادتے ہیں۔''

اُمُّ المومنین نے فرمایا: ''کیا ان میں سے کسی نے مدینہ سے چلتے وقت کچھ کہا تھا؟''

ہندؓ نے کہا: ''میرے شوہر عمروؓ بن الجموح نے چلتے وقت دعا مانگی تھی کہ الٰہی مجھے اپنے اہل وعیال میں واپس نہ لائیو۔''

اُمُّ المومنین نے فرمایا: ''انصار میں بعض لوگ ایسے ہیں کہ جب کسی بات پر قسم کھا لیتے

---

(۱) بعض روایتوں میں ہے کہ اُحد کے دن حضرت عائشہ صدیقہؓ کچھ دوسری خواتین کے ہم راہ میدان جنگ میں زخمیوں کو پانی پلاتی تھیں گویا وہ میدان جنگ میں پہلے ہی موجود تھیں لیکن اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لڑائی ختم ہونے کے بعد تشریف لائیں۔ ہوسکتا ہے کہ جب مسلمانوں میں انتشار پھیلا تو وہ مدینہ منورہ چلی گئی ہوں اور دوبارہ وہاں سے میدانِ احد میں آئی ہوں۔

ہیں تو اللہ ان کی قسم پوری کر دیتا ہے عمروؓ بن الجموح بھی ایسے ہی لوگوں میں تھے۔ اب تم ان لاشوں کو واپس میدان اُحد لے جاؤ اور دوسرے شہیدوں کے ساتھ دفن کرو۔''

ہندؓ نے اب اونٹ کا منھ اُحد کی جانب کیا تو وہ تیزی سے چلنے لگا اور تینوں شہداء کو پھر میدانِ اُحد میں پہنچا دیا جہاں خود سرورِ عالمؐ نے انہیں اپنے سامنے سپردِ خاک کرایا۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ حضرت جابرؓ اپنے والد عبد اللہؓ کی لاش اونٹ پر لاد کر مدینے لے گئے تھے۔ حضورؐ کو علم ہوا تو ان کو حکم دیا کہ عبد اللہؓ کی لاش میدانِ اُحد میں واپس لائیں۔ ایک اور روایت میں ہے کہ وہ اپنی خورد سال بہنوں کی خواہش پر لاش مدینے لے جا کر بنو سلمہ کے خاندانی قبرستان میں دفن کرنا چاہتے تھے لیکن حضورؐ نے اجازت نہ دی۔ رحمتِ عالمؐ کے حکم کے مطابق ایک ایک قبر میں دو دو شہید دفن کیے گئے۔

علامہ ابنِ اثیرؒ کا بیان ہے کہ حضرت عبد اللہؓ کو اپنے بہنوئی عمروؓ بن الجموح سے بہت محبت تھی چناں چہ عبد اللہؓ اور عمروؓ کو ایک ہی قبر میں دفن کیا گیا۔

صحیح بخاری میں حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ:

''غزوۂ اُحد میں میرے باپ اور چچا کو ایک چادر میں کفنایا گیا۔''

اس روایت میں چچا کے نام کی تصریح نہیں کی گئی۔ قیاسِ غالب یہی ہے کہ انھوں نے حضرت عمروؓ بن الجموح ہی کو چچا کہا ہوگا، وہ رشتہ میں حضرت جابرؓ کے پھوپھا تھے۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت عبد اللہؓ بن عمرو کے چہرے پر ایک زخم تھا جس پر ان کا ہاتھ رکھا ہوا تھا۔ کسی نے ان کا ہاتھ چہرے سے ہٹا دیا تو زخم سے خون ٹپکنے لگا پھر ان کا ہاتھ خود بہ خود اپنی جگہ پر پہنچا تو خون بند ہو گیا۔

صحیح بخاری میں ہے کہ غزوۂ اُحد کے چھ ماہ بعد حضرت جابرؓ نے والد کی لاش کو دوسری قبر میں منتقل کر دیا اس وقت ان کا جسم بالکل اسی حالت میں تھا جب وہ اُحد کے دن دفن کیے گئے تھے۔

مؤطا امام مالکؒ میں ہے کہ اس واقعہ کے چھیالیسویں برس بعد حضرت عبد اللہؓ بن عمرو کی قبر سیلاب میں کھل گئی۔ لوگوں نے دیکھا تو لاش بالکل صحیح سالم تھی۔

مولانا حکیم رحمٰن علی خاں نے اپنی کتاب ''المشاہد'' میں حضرت جابرؓ بن عبد اللہ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ جب امیر معاویہؓ نے اپنے عہدِ حکومت میں ایک نہر جاری کرنے کا ارادہ کیا تو اس کے راستے میں کئی شہیدوں کی قبریں پڑتی تھیں۔ انھوں نے شہیدوں کے ورثاء کو اطلاع

بھیجی کہ وہ اپنے مورثوں کی متبادل قبروں کا انتظام کریں۔ ورثاء نے اپنے اپنے مورثوں کی قبریں کھولیں تو ان کی لاشوں کو تروتازہ پایا۔ میں نے بھی اپنے والد (عبد اللہؓ بن عمرو) کے جسم کو بالکل نرم اور ان کے ہاتھ کو جھکتا لچکتا پایا —— جامع ترمذی میں ہے کہ غزوۂ اُحد کے بعد حضرت جابرؓ سخت غم زدہ اور دل گیر تھے۔ سرورِ عالم ﷺ نے انھیں اس حالت میں دیکھ کر پوچھا کہ جابر تم اتنے دل گرفتہ کیوں ہو؟ عرض کیا، ''یا رسول اللہ باپ شہید ہو گئے اور بہت سا قرض اور بچے چھوڑ گئے انھی کے فکر میں مبتلا ہوں۔''

حضورؐ نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ نے تیرے باپ سے بلا واسطہ اور بے حجاب گفتگو فرمائی حالاں کہ اللہ تعالیٰ کسی سے بے پردہ بات نہیں کرتا۔ اس نے تیرے باپ کو اپنے سامنے بلا کر فرمایا، اے میرے بندے! جو تمنا ہو بیان کر انھوں نے عرض کیا، اے پروردگار مجھے پھر دنیا میں بھیج دے تا کہ دوبارہ تیرے دشمنوں سے جا کر لڑوں اور شہادت پاؤں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ میرا قطعی فیصلہ ہے کہ جو دنیا سے آئے گا وہ واپس نہیں بھیجا جائے گا —— عبد اللہ نے عرض کیا کہ الٰہی میرے حال کی خبر میرے پس ماندوں کو پہنچا دے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ... الخ (آل عمران ۱۶۹)

''جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ان کو مردہ نہ سمجھو بلکہ وہ زندہ ہیں۔''

رحمتِ عالمؐ کا ارشاد سن کر حضرت جابرؓ کو تسکین ہو گئی۔ اس کے بعد ان کے باغوں کی کھجوروں میں اللہ تعالیٰ نے اتنی برکت دی کہ سارا قرض ادا ہونے کے بعد بھی بہت کچھ بچ گئیں۔ صحیح بخاری اور مسند احمد حنبلؒ میں اس واقعہ کو حضورؐ کے معجزات میں شمار کیا گیا ہے کیوں کہ حضورؐ نے ان کھجوروں میں برکت کے لیے دُعا مانگی تھی اور خود اپنے دستِ مبارک سے انہیں تقسیم فرمایا تھا۔

حضرت عبد اللہؓ کے صاحب زادے حضرت جابرؓ کا شمار کثیر الروایت اور جلیل القدر صحابہ میں ہوتا ہے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت سماک بن خرشہ ساعدیؓ

(۱)

یوم الجمعہ سترہ رمضان المبارک ۲ھ کو بدر کے میدان میں حق و باطل کے درمیان معرکۂ رزم برپا ہوا اور لڑائی کی آگ پوری شدّت سے بھڑک اٹھی تو یکا یک مشرکین کی صفوں سے بنو سہم کا نامور جنگجو عاصم بن ابی عوف بن جبیرہ بنکارتا ہوا نکلا۔ یہ شخص نہایت قوی ہیکل اور درندہ صفت تھا۔ اس وقت فرطِ غضب سے اس کا منہ کف آلود تھا اور وہ نہایت متکبرانہ انداز میں اپنی تلوار ہلاتے ہوئے چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا:

''اے گروہِ قریش! اس شخص سے ہرگز ہاتھ نہ روکنا جو قاطع رحم اور قبیلوں میں پھوٹ ڈالنے والا ہے۔ آج میں اس کو مار ڈالوں گا یا خود اپنی جان دے دوں گا۔''

اس بدبخت کا اشارہ واضح طور پر رحمتِ عالم ﷺ کی طرف تھا۔ اس کی لاف وگزاف سُن کر پرستارانِ حق بے تاب ہو گئے، معاً ان کی صفوں سے ایک صاحب، جنھوں نے اپنے سر پر سرخ کپڑے کی ایک پٹی باندھ رکھی تھی باہر نکلے اور نہایت تیزی سے عاصم بن ابی عوف کی طرف جھپٹے۔ اگرچہ قد وقامت کے لحاظ سے عاصم کے ساتھ ان کا کوئی مقابلہ نہ تھا لیکن جوشِ ایمان نے ان کے بازوؤں میں غضب کی قوت بھر دی تھی۔ عاصم کے قریب پہنچ کر انھوں نے اس پر اپنی تلوار کی ایسی بھرپور ضرب لگائی کہ وہ اسی ایک وار سے آناً فاناً خاک وخون میں لوٹ گیا۔ ابھی وہ اس کا سامان لینے کا ارادہ ہی کر رہے تھے کہ ایک دوسرا مشرک معبد بن وہب کلبی اپنی تلوار ہلاتا ہوا ان پر جھپٹ پڑا، وہ صاحب فوراً دوزانو بیٹھ گئے اور معبد کا وار خالی گیا۔ اب انھوں نے اس پر تلوار کے پے در پے کئی وار کیے لیکن کوئی وار کارگر ثابت نہ ہوا تاہم معبد حواس باختہ ہو کر بھاگ

کھڑا ہوا اور ایک گڑھے میں چھلانگ لگا دی، ان صاحب نے اس کا پیچھا کیا اور گڑھے میں مردانہ وار اس پر کود پڑے اس سے پہلے کہ وہ اپنا دفاع کرتا انھوں نے اس کو دبوچ کر بکرے کی طرح ذبح کر دیا —— معرکۂ بدر کے یہ مردِ شجاع حضرت سماکؓ بن خرشہ انصاری تھے۔ جو تاریخ میں اپنی کنیت ''ابو دجانہ'' سے مشہور ہیں۔

(۲)

سیدنا حضرت ابو دجانہ سماکؓ بن خرشہ (بن لوذان بن عبد ود بن زید بن ثعلبہ بن طریف بن خزرج بن ساعدہ بن کعب بن خزرج الاکبر) خزرج کے خاندانِ ساعدہ سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ خاندان مدینہ منوّرہ میں ممتاز حیثیت کا مالک تھا۔ رئیس الخزرج حضرت سعدؓ بن عبادہ بھی اسی خاندان کے فرزند تھے اور حضرت ابو دجانہؓ کے ابنِ عم (یک جدی) تھے۔ حضرت ابو دجانہ سماکؓ کا شمار مدینہ کے نامور بہادروں میں ہوتا تھا۔ ابھی سرورِ کائنات ﷺ ہجرت فرما کر مدینہ منوّرہ تشریف نہیں لائے تھے کہ ابو دجانہؓ نے بعض یثربیوں سے ہادیِ اکرمؐ اور آپؐ کی دعوت کا حال سنا۔ حق تعالیٰ نے قلبِ گداز عطا فرمایا تھا۔ اسی وقت خدائے واحد اور رسول برحقؐ پر غائبانہ ایمان لے آئے۔ جب حضورؐ نے ہجرت کے بعد مدینہ منوّرہ میں نزولِ اجلال فرمایا تو ابو دجانہؓ کی مسرت وابتہاج کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ وہ رسول ہاشمی کے دل وجان سے فدائی بن گئے اور سید الانامؐ کی جاں نثاری اور رفاقت کو اپنی زندگی کا شعار بنالیا۔ سریۂ رابغ (شوال ۱ھ) کے موقع پر مشہور صحابی حضرت عتبہؓ بن غزوان مشرکینِ قریش سے جان چھڑا کر مدینہ آئے تو سرورِ کونینؐ نے حضرت ابو دجانہؓ اور ان کے مابین مواخاۃ کرادی۔ ان دونوں دینی بھائیوں کا مشترکہ وصف ان کا بے مثال جوشِ ایمان اور جذبۂ فدویت تھا۔

حضرت ابو دجانہؓ میدانِ رزم کے شہسوار تھے اور تیغ زنی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ غزواتِ نبوی کا سلسلہ شروع ہوا تو انھوں نے ہر معرکے میں اپنی شجاعت اور جرأت و بسالت کی دھاک بٹھادی۔ ان کی عادت تھی کہ لڑائی کے لیے نکلتے تو اپنے سر کے گرد سرخ کپڑے کی ایک پٹی لپیٹ لیتے تھے اور ایسے ناز وتبختر سے چلتے تھے کہ گویا اپنے حریف کو پیس کر رکھ دیں گے۔ غزوۂ بدر میں انھوں نے جس شجاعت کا مظاہرہ کیا، اس کی ایک جھلک اوپر پیش کی جا چکی ہے۔ اس دن انھوں نے قریش کے چار نامور بہادروں ربیعہ بن اسد، ابو مسافع اشعری،

عاصم بن ابی عوف بن جبیرہ سہمی اور معبد بن وہب کلبی کو جہنم واصل کیا اور بہت سے مشرکین کو زخمی کیا۔ اس طرح اصحابِ بدر میں انہیں ایک خاص امتیاز حاصل ہو گیا۔

(۳)

۳ھ میں غزوۂ اُحد پیش آیا تو حضرت ابو دجانہؓ نے اس لڑائی میں بھی اس شان سے دادِ شجاعت دی کہ یومِ احد کے خاص بہادروں میں شمار ہوئے۔ صحیح مسلم اور مسند احمد بن حنبلؒ میں حضرت انسؓ بن مالک سے روایت ہے کہ غزوۂ احد میں رسول اللہ ﷺ نے ایک تلوار اپنے دستِ مبارک میں لے کر ارشاد فرمایا کہ یہ تلوار کون لے گا؟ سب لوگ بڑے اشتیاق سے حضورؐ کی طرف دیکھنے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان میں سے ہر ایک یہ تلوار لینے کا متمنی ہے لیکن جب حضورؐ نے یہ فرمایا کہ اس کا حق کون ادا کرے گا تو سب لوگ ٹھٹک گئے البتہ حضرت ابو دجانہ سماکؓ کھڑے ہو گئے اور عرض کیا ''یا رسول اللہ اس تلوار کا حق میں ادا کروں گا۔'' رسولِ اکرمؐ نے یہ تلوار انہیں عطا فرمائی اور وہ اسی کے ساتھ لڑے۔

اس روایت میں تلوار کے حق کی تصریح نہیں کی گئی۔ البتہ مستدرک حاکم میں حضرت زبیرؓ سے مروی ہے کہ انھوں نے بھی یہ تلوار لینے کی خواہش کی لیکن حضورؐ نے ان سے اعراض فرمایا۔ جب ابو دجانہؓ نے عرض کیا کہ میں اس کو اس کے حق کے ساتھ لینا چاہتا ہوں آپ فرمائیں اس کا حق کیا ہے، تو حضورؐ نے فرمایا:

''اس تلوار سے کسی مسلمان کو نہ مارنا اور اسے لے کر کسی کافر سے مت بھاگنا۔''

اس کے بعد آپؐ نے یہ تلوار ابو دجانہؓ کو مرحمت فرمائی۔

علامہ ابنِ اثیرؒ نے اسدُ الغابہ میں بیان کیا ہے کہ حضرت ابوُ دجانہؓ نے (سرورِ عالمؐ سے تلوار پانے کے بعد) اپنے معمول کے مطابق سر پر سرخ رومال باندھا اور تنتے اکڑتے میدانِ جنگ کی طرف چلے۔ اس موقع پر رحمتِ عالمؐ نے ارشاد فرمایا:

''اگرچہ (متکبرانہ) چال اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے لیکن ایسے موقعے پر کچھ ہرج نہیں۔''

حافظ ابنِ کثیرؒ نے البدایہ والنہایہ میں ابنِ ہشامؒ کے حوالہ سے اس روایت میں یہ اضافہ کیا ہے کہ جب ابو دجانہؓ نے اپنے سر پر سرخ رومال باندھا تو انصار نے کہا ''ابو دجانہؓ نے

موت کی پٹی باندھ لی ہے۔" اس سے پہلے بھی جب وہ سر پر سرخ پٹی باندھا کرتے تھے تو انصار اسی طرح کہا کرتے تھے۔ اس کے بعد ابو دجانہؓ یہ رجز پڑھتے ہوئے میدانِ جنگ کی طرف لپکے۔

انا الذی عاھدنی خلیلی و نحن بالسفح لدی النخیل

"میں وہ ہوں جس سے میرے خلیلؐ نے عہد لیا ہے اس حال میں کہ ہم لوگ پہاڑ کے دامن میں نخلستان کے قریب ہیں۔"

ان لا اقوم الدھر فی الکیول اضرب بسیف اللہ و الرسول

"یہ کہ میں زندگی بھر آخری صف میں نہ کھڑا ہوں گا، اللہ اور اس کے رسولؐ کی تلوار سے وار کرتا ہی رہوں گا۔"

حضرت ابو دجانہؓ عرصۂ رزم میں یوں داخل ہوئے جیسے شیر اپنے شکار پر جست لگاتا ہے جو مشرک ان کے سامنے آیا اپنی تلوار سے اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا یا سخت زخمی کر دیا۔ حضرت کعبؓ بن مالک انصاری سے روایت ہے کہ میں نے غزوۂ احد میں دیکھا کہ مشرکین کا ایک زبردست جنگجو جو سر سے پاؤں تک زرہ پوش تھا اور ہر قسم کے ہتھیاروں سے لیس تھا، مسلمانوں پر بڑھ چڑھ کر حملے کر رہا ہے اور اپنے آدمیوں سے کہہ رہا ہے کہ ان لوگوں (مسلمانوں) کو گھیر کر بکریوں کے ریوڑ کی طرح ایک جگہ جمع کر دو۔ یکایک مسلمانوں کی صفوں سے ایک زرہ پوش تیر کی طرح اس پر جھپٹا۔ مشرک جنگجو اگرچہ اپنے تن و توش اور اسلحہ کے اعتبار سے مسلمان زرہ پوش پر نمایاں برتری رکھتا تھا لیکن مسلمان مجاہد نے مشرک کے قریب پہنچ کر اس کے کندھے پر تلوار کی ایسی کاری ضرب لگائی کہ وہ دو ٹکڑے ہو کر زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ اس وقت میں اس مسلمان کے پیچھے کھڑا تھا۔ مشرک کو جہنم واصل کرنے کے بعد اس نے اپنے چہرے سے آہنی خود اٹھایا اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہا:

"کعب تم دیکھ رہے ہو میں ہوں ابو دجانہ۔"

حضرت زبیرؓ بن العوام سے بھی اسی قسم کی روایت مروی ہے البتہ اس میں اتنا اضافہ ہے کہ حضرت ابو دجانہؓ جدال و قتال کرتے مشرکین قریش کی ان عورتوں تک پہنچ گئے جو ایک چٹان پر بیٹھی تھیں اور ہند بنت عتبہ کی سرکردگی میں یہ شعر پڑھ پڑھ کر اپنے مردوں کو جنگ پر ابھار رہی تھیں۔

نحن بنات طارق نمشی علی النّمارق

''ہم ستاروں کی بیٹیاں ہیں، ہم گدوں پر چلتی ہیں۔

والمسک فی المفارق ان تقبلوا نعانق

ہمارے سر کی مانگیں مشک آلود ہیں اگر تم دشمن سے مقابلہ کرو گے تو ہم تم سے معانقہ کریں گی۔

او تدبروا نفارق فراق غیر وامق

اور اگر تم نے دشمن کو پیٹھ دکھادی تو ہم تمھیں اس طرح چھوڑ دیں گی جیسے اجنبی کو۔''

حضرت ابو دجانہؓ نے آگے بڑھ کر ہند کی گردن پر تلوار رکھ دی۔ اس نے چیخ ماری اور اپنے مددگاروں کو بلانا شروع کر دیا۔ لیکن ہنگامۂ کارزار میں کسی نے اس کی پکار کا جواب نہ دیا، اس پر حضرت ابو دجانہؓ نے تلوار اس کی گردن سے ہٹالی اور واپس آگئے۔ حضرت زبیرؓ فرماتے ہیں کہ بعد میں ابو دجانہؓ سے میری ملاقات ہوئی تو میں نے ان سے پوچھا کہ تم نے اس عورت کو کیوں قتل نہیں کیا؟

انھوں نے جواب دیا:

''مجھے اس بات سے شرم اور کراہیت محسوس ہوئی کہ میں رسول اللہؐ کی تلوار سے ایک عورت کو قتل کروں اور عورت بھی وہ کہ جس کی پکار پر کوئی اس کی مدد کے لیے نہیں پہنچا۔''

بعض روایتوں میں حضرت زبیرؓ بن العوام سے یہ بیان بھی منسوب ہے کہ سرورِ عالمؐ نے مجھ سے اعراض فرما کر اپنی تلوار ابو دجانہؓ کو دی تو میرے دل میں کچھ دل گرفتگی کے جذبات پیدا ہوئے کہ میں قریشی ہوں، رسول اللہؐ کی پھوپھی کا بیٹا ہوں اور تلوار لینے کے لیے سب سے پہلے کھڑا ہوا تھا لیکن آپؐ نے مجھے نظر انداز کر دیا۔ خدا کی قسم اب میں دیکھ لوں گا کہ ابو دجانہؓ اس تلوار سے کیا کریں گے ـــــ اس کے بعد جب میں نے لڑائی میں ابو دجانہؓ کے کارنامے دیکھے تو مجھے تسکین ہوگئی اور بے اختیار میری زبان پر یہ الفاظ جاری ہوگئے کہ بے شک اللہ اور اللہ کا رسولؐ ہر بات کو بہتر جانتے ہیں۔

غزوۂ اُحد میں جو مشرک حضرت ابو دجانہؓ کے ہاتھ سے جہنم رسید ہوئے اربابِ سِیَر

نے ان میں سے عبد اللہ بن حمید بن زہیر اسدی اور عبید بن عاجز عامری کا نام تخصیص کے ساتھ لیا ہے۔

جب ایک اتفاقی غلطی سے لڑائی کا پانسہ پلٹ گیا تو حضرت ابو دجانہؓ چند دوسرے ثابت قدم مہاجرین اور انصار کے ساتھ کوہِ گراں بن کر ذاتِ رسالت مآب ﷺ اور دشمن کے درمیان حائل ہو گئے۔ وہ شروع سے اخیر تک رحمتِ عالمؐ کی ڈھال بنے رہے۔ غنیم کے جو آدمی حضورؐ کی طرف بڑھتے، ابو دجانہؓ کی شمشیر خارا شگاف ان پر بجلی بن کر گرتی اور میدان صاف ہو جاتا۔ وہ زخم پر زخم کھاتے تھے لیکن کسی مشرک کو حضورؐ کے قریب نہیں پھٹکنے دیتے تھے۔ جب مشرکین پسپا ہو گئے تو حضرت ابو دجانہؓ کی یہ حالت تھی کہ جسم کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جو مجروح نہ ہوا ہو۔ سرورِ عالمؐ ان کی شجاعت اور استقامت سے بہت مسرور ہوئے اور فرمایا:

''ابو دجانہ خوب لڑے۔''

بدر و احد کے بعد دوسرے تمام غزواتِ نبویؐ میں بھی حضرت ابو دجانہؓ نے بے مثال شجاعت سے سرورِ کونینؐ کی جاں نثاری کا حق ادا کیا۔ علّامہ ابن سعدؒ کا بیان ہے کہ غزوۂ بنو نضیر میں حضورؐ نے خود اپنے مال سے حضرت ابو دجانہؓ کو حصہ دیا اور ان کی یہ جائداد ''مال ابن خرشہ'' کے نام سے مشہور ہوئی۔

(۴)

۱۱ھ میں سرورِ عالمؐ نے رحلت فرمائی تو حضرت ابو دجانہؓ پر کوہِ الم ٹوٹ پڑا لیکن ان کے شوقِ جہاد میں مطلق کوئی کمی نہ آئی۔ حضرت صدیقِ اکبرؓ کے عہدِ خلافت میں مسیلمہ کذّاب کے خلاف یمامہ کی مشہور جنگ پیش آئی تو وہ بڑے جوش و خروش سے شریک ہوئے۔ لڑائی میں ایک موقعہ ایسا آیا کہ مسلمانوں کے دباؤ سے مجبور ہو کر مسیلمہ اپنے باغ کے اندر چلا گیا اور اس کی چاردیواری کی آڑ لے کر مسلمانوں پر تیر برسانے شروع کر دیے۔ مسلمان باغ میں گھسنے کی بہتیری کوشش کرتے تھے لیکن تیروں کی بے پناہ بارش سے پیچھے ہٹ آتے تھے۔ آخر حضرت ابو دجانہؓ مردانہ وار آگے بڑھے اور دیوار پھاند کر باغ کے اندر کود گئے۔ پاؤں کی ہڈی ٹوٹ گئی لیکن ان کی جبینِ ہمت پر شکن تک نہ آئی۔ پاؤں کو گھسیٹتے اور دشمن کو مارتے کاٹتے باغ کے پھاٹک تک پہنچ گئے، اتنے میں حضرت براءؓ بن مالک بھی دیوار پھاند کر پھاٹک تک پہنچ گئے اور اسے کھول دیا۔

مجاہدینِ اسلام باہر منتظر تھے فوراً اندر گھسے اور مرتدین کو اپنی تلواروں پر رکھ لیا۔ حضرت ابو دجانہؓ دشمنِ اسلام مسیلمہ کو مارنے کی تاک میں تھے کہ مرتدین نے نرغہ کر کے برچھیوں اور تلواروں سے انہیں چھلنی کر دیا اور یوں اسلام کا یہ مردِ جان باز جامِ شہادت پی کر اپنے مولائے حقیقی سے جا ملا۔ انھوں نے اپنی ساری زندگی رضائے دوست کے حصول کے لیے گزاری تھی جنگِ یمامہ میں وہ اپنے مقصد میں کام یاب ہو گئے۔

(۵)

سیدنا حضرت ابو دجانہؓ کی امتیازی خصوصیت ان کی غیرتِ دینی، بے خوفی اور بے مثال شجاعت و بسالت تھی۔ حافظ ابنِ عبد البرؒ نے استیعاب میں لکھا ہے کہ وہ اپنے دَور کے شجاع ترین لوگوں میں شمار ہوتے تھے اور غزواتِ نبوی میں ان کو ممتاز درجہ حاصل ہے۔

حضرت ابو دجانہؓ کو ہجرتِ نبوی سے قبل ہی قبولِ اسلام کا شرف حاصل ہو گیا تھا اس لیے وہ انصار کے سابقون الاولون میں داخل ہیں۔ وہ فطری طور پر ایک سرفروش سپاہی اور مجاہد تھے اس لیے انہیں احادیث بیان کرنے کا موقع نہیں ملا۔ تاہم مسند ابو داؤد میں ایک مشہور حدیث ان سے مروی ہے۔ اس میں وہ کہتے ہیں کہ:

''رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں آپؐ کے صحابہ نے دنیا کا ذکر کیا، آپؐ نے فرمایا کہ سن رکھو پھر سن رکھو کہ سادہ زندگی بسر کرنا بھی ایمان داری میں داخل ہے۔''

علّامہ ابنِ اثیرؒ نے لکھا ہے کہ حضرت ابو دجانہؓ کا شمار فضلائے صحابہ میں ہوتا تھا اور اہلِ حق کے نزدیک وہ بڑے رتبے کے حامل تھے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت عبداللہ بن رواحہ انصاریؓ

(۱)

ہجرتِ نبوی کے چند سال بعد کا ذکر ہے کہ ایک دن ایک انصاری صاحبِ رسولؐ، جن کا چہرہ نورِ ایمان سے چمک رہا تھا، سرورِ عالم ﷺ کی خدمت میں حاضری کی نیت سے بڑے ذوق وشوق سے مسجدِ نبوی کی طرف روانہ ہوئے۔ اس وقت حضورؐ مسجد میں خطبہ دے رہے تھے۔ وہ صاحب ابھی مسجد کے باہر تھے کہ حضورؐ نے خطبہ کے دوران میں مسجد میں استادہ چند لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا ''اِجۡلِسُوۡا'' (اے لوگو بیٹھ جاؤ) ان صاحب نے حضورؐ کا ارشاد سنا تو معاً ان کے قدم زمین میں گڑ گئے اور وہ اسی جگہ بیٹھ گئے۔ حضورؐ خطبہ سے فارغ ہوئے تو کسی نے یہ واقعہ آپؐ کی خدمت میں عرض کیا۔ آپؐ کو ان صاحب کے جذبۂ اطاعتِ رسولؐ پر بڑی مسرّت ہوئی اور آپؐ نے ان سے مخاطب ہو کر فرمایا:

''اللہ تعالیٰ تمھارے دل میں اللہ اور رسول کی اطاعت کا جذبہ اور زیادہ کرے۔''

یہ صاحبِ رسولؐ جن کے جذبۂ اطاعت نے رحمتِ عالم ﷺ کو اس قدر مسرور کیا کہ لسانِ رسالت پر ان کے لیے دُعائے برکت جاری ہوگئی۔ سیّدنا حضرت عبداللہؓ بن رواحہ انصاریؓ تھے۔

(۲)

سیّدنا حضرت ابو محمد عبداللہؓ بن رواحہ انصاری کا شمار راہِ حق کے اُن سرفروشوں میں ہوتا ہے جن پر ملتِ اسلامیہ بجا طور پر ناز کرسکتی ہے۔ اُن کا تعلق خزرج کے خاندان حارث بن خزرج سے تھا۔ نسب نامہ یہ ہے:

عبد اللہ بن رواحہ بن ثعلبہ بن امرء القیس بن عمرو بن امراء القیس الاکبر بن مالک الاعز بن ثعلبہ بن کعب بن خزرج بن حارث بن خزرج الاکبر۔

والدہ کبشہ بنت واقد بھی اسی قبیلے سے تھیں۔ بعض روایتوں کے مطابق ان کو بھی شرفِ صحابیت حاصل ہے۔

حضرت عبد اللہؓ بن رواحہ کی مشہور کنیت ابو محمد ہے اگرچہ بعض روایتوں میں ابورواحہ اور ابوعمرو بھی بیان کی گئی ہے۔

حضرت عبد اللہؓ بن رواحہ اپنے قبیلہ کے ممتاز اور صاحبِ اثر لوگوں میں سے تھے، وہ نہ صرف لکھنا پڑھنا جانتے تھے، بلکہ ایک قادر الکلام شاعر بھی تھے۔ اربابِ سیَر نے لکھا ہے کہ وہ زمانۂ جاہلیت میں بھی بڑے ذی رتبہ تھے اور اسلام میں بھی۔ دنیوی عزّت اور مرتبے کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے انہیں فطرتِ سلیم سے بھی نوازا تھا، چناں چہ بیعت عقبہ اولیٰ کے بعد جب مدینہ کے گھر گھر میں اسلام کا چرچا پھیلا تو حضرت عبد اللہؓ بن رواحہ نے بھی بلا تامّل دعوتِ حق قبول کرلی۔ ۱۳ نبوّت میں انہیں بیعت عقبۂ کبیرہ میں شریک ہونے کی عظیم سعادت نصیب ہوئی۔ اس موقع پر سرورِ عالم ﷺ کے ایماء پر یثربی اہلِ ایمان نے جو بارہ نقباء منتخب کیے ان میں سے ایک حضرت عبد اللہؓ بن رواحہ تھے۔ وہ اور حضرت سعدؓ بن ربیع انصاری بنو حارثہ کے نقیب بنائے گئے۔ ہجرت کے بعد رحمتِ عالم ﷺ نے مدینہ منورہ کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے مشرف فرمایا تو حضرت عبد اللہؓ بن رواحہ ان رؤساء مدینہ میں سے تھے، جنھوں نے حضورؐ کا نہایت پُر تپاک خیر مقدم کیا اور آپؐ سے التجا کی کہ انہیں شرفِ میزبانی بخشیں، لیکن یہ شرف اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوایوب انصاریؓ کے مقدّر میں لکھ رکھا تھا اس لیے حضورؐ ان اصحاب کو اپنی دعاؤں سے نوازتے ہوئے حکمِ الٰہی کے مطابق آگے بڑھ گئے۔

چند ماہ بعد سرورِ عالم ﷺ نے مہاجرین اور انصار کے مابین مواخاۃ قائم کرائی تو حضرت عبد اللہؓ بن رواحہ کو جلیل القدر مہاجر صحابی حضرتِ مقدادؓ بن عمرو الاسود کندی کا دینی بھائی بنایا۔

صحیح بخاری میں ہے کہ مسجدِ نبوی کی تعمیر شروع ہوئی تو سرورِ کونین ﷺ صحابہؓ کے

ساتھ خود بھی گارا اور اینٹیں ڈھوتے تھے۔ اس وقت آپؐ کی زبانِ مبارک پر حضرت عبداللہؓ بن رواحہ کا یہ شعر ہوتا تھا:

اَللّٰھُمَّ اِنَّ الْاَجرَ اَجْرُ الْاٰخِرَۃِ فَارْحَمِ الْاَنْصَارَ وَالْمھَاجِرَۃ

''الٰہی اجر تو بس آخرت کا اجر ہے پس تو انصار اور مہاجرین پر رحم فرما۔''

(۳)

حضرت عبداللہؓ بن رواحہ اسلام قبول کرتے ہی دل و جان سے رسولِ عربیؐ کے شیدائی بن گئے تھے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ غزوۂ بدر سے پہلے ایک مرتبہ سیّد الخزرج حضرت سعدؓ بن عبادہ بیمار ہو گئے۔ سرورِ عالم ﷺ کو اطلاع ملی تو آپؐ ان کی عیادت کے لیے سواری پر تشریف لے گئے۔ راستے میں ایک مجلس میں کچھ مسلمان اور منافقین یکجا بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں حضرت عبداللہؓ بن رواحہ اور رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی بن سلول بھی موجود تھے۔ عبداللہ بن ابی وہ شخص تھا جس کو ہجرتِ نبوی سے پہلے تمام اہلِ مدینہ (اوس و خزرج) اپنا بادشاہ بنانے پر متفق ہو گئے تھے اور اس کے لیے تاج بھی تیار کر لیا تھا، لیکن رحمتِ عالم ﷺ کے مدینہ منوّرہ میں نزولِ اجلال کے بعد یہ ساری کارروائی کالعدم قرار پائی تھی اور تمام انصار نے اپنے ہاتھ حضورؐ کے دستِ مبارک میں دے دیئے تھے۔ یہ بات عبداللہ بن ابی پر سخت شاق گزری تھی اور وہ حضورؐ سے خار کھانے لگا تھا۔ حضورؐ کی سواری کی گرد اڑی، تو اس نے اپنے دل کا بخار یوں نکالا کہ اپنی چادر ناک پر رکھ لی اور بڑی ترش روئی سے بولا: ''گرد مت اڑاؤ۔'' ایک اور روایت کے مطابق جب حضورؐ قریب پہنچے تو اس نے ناک بھوں چڑھا کر کہا۔ ''محمدؐ اپنا گدھا پرے کرو، اس کی بدبو نے میرا دماغ پریشان کر دیا۔''

اس کے جواب میں حضورؐ نے سب حاضرینِ مجلس کو سلام کیا اور پھر سواری سے اتر کر خدا کی وحدانیت پر ایک مختصر خطبہ دیا۔ عبداللہ بن ابی نے بڑی تنگ مزاجی سے کہا:

''اگر تمہاری باتیں سچ ہیں تو یہ ان لوگوں کو بتاؤ جو خود تمہارے پاس جائیں، یہاں آکر ہم کو پریشان نہ کرو۔''

حضرت عبداللہؓ بن رواحہ، ابن ابی کی گستاخانہ باتیں سُن کر تڑپ اٹھے اور بڑے جوش کے ساتھ بولے:

''یا رسول اللہ! آپ ضرور تشریف لائیں۔ ہم آپ کے ارشاداتِ کو دل و جان سے پسند کرتے ہیں(۱)''

حضرت عبداللہؓ بن رواحہ کا یہی جوشِ ایمان اور عشقِ رسولؐ تھا جس کی بہ دولت انہیں بارگاہِ نبوّت میں درجۂ تقرب حاصل ہو گیا تھا۔ قبولِ اسلام کے بعد ان کی شاعری یکسر حق کی تبلیغ اور کفّار کی مذمّت کے لیے وقف ہو کر رہ گئی تھی۔ عبداللہؓ اپنے اشعار میں کفار کی گم راہی اور ضلالت پر ایسی چوٹ کرتے تھے کہ وہ تلملا اٹھتے تھے۔ ان کے دل میں راہِ حق میں سر کٹانے کی آرزو ہر وقت مچلتی رہتی تھی، حافظ ابنِ حجر عسقلانیؒ نے ''الاصابہ'' میں لکھا ہے کہ ''حضرت عبداللہؓ بن رواحہ ہر غزوہ میں پیش پیش ہوتے تھے اور واپسی میں سب سے پیچھے ہوتے تھے۔''

اُن کے شوقِ جہاد کا اندازہ اس حقیقت سے کیا جا سکتا ہے کہ بدر سے لے کر موتہ تک (جس میں انھوں نے شہادت پائی) کوئی غزوہ ایسا نہیں تھا جس میں انھوں نے حضورؐ کے ہم رکاب ہو کر سر فروشی اور جان بازی کا حق ادا نہ کیا ہو۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت عبداللہؓ بن رواحہ ان تین جان بازوں میں سے ایک تھے جو میدانِ بدر میں عتبہ، شیبہ اور ولید (سردارانِ قریش) کے مقابلے میں نکلے تھے۔ دوسری روایتوں میں ان کی بہ جائے حضرت معوذؓ بن عفراء کا نام دیا گیا ہے۔ دوسرے دو انصاری جان باز بالاتفاق حضرت معاذؓ بن عفراء اور عوفؓ بن عفراء تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ قریش کے مبارزت خواہوں نے ان سے لڑنا پسند نہ کیا اور حضرت حمزہؓ، حضرت علیؓ اور حضرت عبیدہؓ بن الحارث ان سے نبرد آزما ہوئے۔

معرکۂ بدر الکبریٰ کے بعد سرورِ عالم ﷺ نے حضرت عبداللہؓ بن رواحہ اور حضرت

---

(۱) اس موقع پر بات اس قدر بڑھی کہ مسلمانوں اور منافقوں کے درمیان تلوار چل جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ رحمتِ عالم ﷺ نے فریقین کو ایسے پُر حکمت انداز سے سمجھایا کہ وہ ٹھنڈے پڑ گئے۔ اس کے بعد آپؐ حضرت سعدؓ بن عبادہ کے گھر تشریف لے گئے اور دورانِ گفتگو میں ان سے فرمایا۔ ''سعد تم نے سنا آج ابو حباب (عبداللہ بن ابی) نے مجھ سے یہ باتیں کہیں۔'' انھوں نے عرض کیا۔ ''یا رسول اللہ آپ اس کی باتوں کا کچھ خیال نہ فرمائیں یہ وہ شخص ہے جس کو آپؐ کی تشریف آوری سے قبل اہلِ مدینہ اپنا بادشاہ بنانا چاہتے تھے۔ اللہ نے آپؐ کو حق و صداقت کے ساتھ مبعوث کیا، تو ہم نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ ابنِ ابی کی باتیں بادشاہت سے محرومی کا نتیجہ ہیں۔''

زید بن حارثہ کو فتح کی خوش خبری سنانے مدینہ منورہ بھیجا۔ حضرت عبداللہؓ بن رواحہ نے مدینہ منورہ کی شمالی آبادی کو اور حضرت زیدؓ بن حارثہ نے جنوبی حصۂ شہر کو مژدۂ فتح سنایا۔

ذوالقعدہ ۴ھ میں سرورِ عالم ﷺ غزوۂ بدر ثانیہ یا بدر الاخریٰ کے لیے تشریف لے گئے تو حضرت عبداللہؓ بن رواحہ کو مدینہ منورہ میں اپنا نائب بنا کر چھوڑ گئے۔

۵ھ میں غزوۂ احزاب پیش آیا۔ اس میں سارے مشرکینِ عرب ایکا کر کے مدینہ منورہ پر چڑھ آئے اور مسلمانوں کو خندق کھود کر اپنا دفاع کرنا پڑا۔ محاصرہ کے دوران میں مدینہ منورہ کے یہودِ بنوقریظہ نے غدّاری پر کمر باندھی، لیکن حضورؐ کی بروقت تدابیر نے انہیں کھل کھیلنے کا موقع نہ دیا۔ اس نازک موقع پر حضورؐ نے حضرت عبداللہؓ بن رواحہ کو دوسرے صاحبِ اثر مسلمانوں کے ساتھ یہود بنوقریظہ سے گفتگو کرنے کے لیے بھیجا انھوں نے واپس آ کر حضورؐ کو ان کے عزائمِ بد سے آگاہ کیا۔

۶ھ میں حدیبیہ کے مقام پر بیعتِ رضوان کا عظیم الشان واقعہ پیش آیا۔ اس موقع پر حضرت عبداللہؓ بن رواحہ کو ان چودہ سو سرفروشوں میں شریک ہونے کا شرف حاصل ہوا جنھوں نے حضورؐ کے دستِ مبارک پر موت کی بیعت کی اور جنھیں بارگاہِ الٰہی سے ''اصحاب الشجرہ'' کا لقب اور رضائے خداوندی کی سند عطا ہوئی۔

۷ھ میں خیبر فتح ہوا، تو وہاں کی پیداوار کی قیمت کا تخمینہ لگانے کے لیے حضورؐ نے حضرت عبداللہؓ بن رواحہ کو مامور فرمایا۔ انھوں نے یہ کام نہایت حسن وخوبی سے انجام دیا۔

(۴)

شوال ۶ھ میں رسولِ اکرم ﷺ نے حضرت عبداللہؓ بن رواحہ کو ایک خاص مہم پر مامور فرمایا جو ''سریۂ عبداللہؓ بن رواحہ'' کے نام سے مشہور ہے (یہ بیعت رضوان سے پہلے کا واقعہ ہے)۔ اس کا پس منظر یہ تھا کہ نواحِ خیبر کا ایک یہودی رئیس ابورافع سلّام بن ابی الحقیق اسلام کی مخالفت میں اس قدر بڑھ گیا تھا کہ بنوغطفان کو مدینہ منورہ پر حملہ آور ہونے کے لیے ابھار رہا تھا۔ حضورؐ کو اس کی ریشہ دوانیوں کا علم ہوا، تو آپؐ نے رمضان ۶ھ میں حضرت عبداللہ بن عتیک سلمی کی قیادت میں پانچ آدمیوں کی ایک مہم ابورافع کی گوشمالی کے لیے خیبر بھیجی، حضرت عبداللہؓ بن عتیک ابورافع کو جہنم واصل کر کے اپنے ساتھیوں سمیت بہ خیریت مدینہ منورہ واپس آئے، لیکن ابورافع

کے قتل سے معاملے سلجھ نہ سکے۔ کیوں کہ اس کا جانشین اُسیر بن رزام بھی بس کی گانٹھ ثابت ہوا اور اسلام دشمنی میں ابو رافع کے نقشِ قدم پر چلا۔ حضور ﷺ کو اس معاندانہ سرگرمیوں کی اطلاع ملی، تو آپ نے حضرت عبداللہؓ بن رواحہ کو تحقیق کے لیے بھیجا کہ کیا اُسیر واقعی لوگوں کو مسلمانوں کے خلاف جنگ کرنے پر آمادہ کر رہا ہے۔ حضرت عبداللہؓ نے خفیہ طور پر تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ حضورؐ کو جو اطلاعات پہنچی تھیں، وہ درست تھیں، چناں چہ انھوں نے واپس آ کر تمام حالات بلا کم و کاست حضورؐ کی خدمت میں عرض کر دیئے۔ آپؐ نے انھیں تیس سوار دے کر ہدایت فرمائی کہ خیبر جا کر اُسیر کو اپنے ساتھ مدینہ لے آئیں تا کہ اس کے ساتھ دوٹوک گفتگو کی جائے۔ حضرت عبداللہؓ خیبر جا کر اُسیر سے ملے اور اُس سے ایسے حکیمانہ انداز سے گفتگو کی کہ وہ تیس یہودی لے کر ان کے ساتھ ہو لیا۔ اثنائے راہ میں کوئی ایسی بات ہوئی کہ مسلمانوں اور یہودیوں میں تلوار چل گئی اور اُسیر سمیت سارے یہودی مسلمانوں کے ہاتھ سے مارے گئے۔

قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوریؒ نے ''رحمۃ للعالمین'' میں لکھا ہے کہ یہ کُشت وخون غلط فہمی کی بنا پر ہوا، یہودیوں نے سمجھا کہ مسلمان ان کو قتل کرنا چاہتے ہیں اور مسلمانوں نے خیال کیا کہ یہودیوں کی نیت میں فتور ہے۔ اسی بدگمانی کی بنا پر فریقین نے ایک دوسرے پر حملہ کر دیا۔'' مولوی سعید انصاری مرحوم نے سیرِ انصار میں بیان کیا ہے کہ حضرت عبداللہؓ بن رواحہ نے واپسی کے سفر میں ہر یہودی پر ایک مسلمان کو متعین کیا، اُسیر کو کچھ شک ہوا اور اس نے پلٹنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ مسلمانوں نے دھوکا بازی کے جرم میں سب کی گردنیں اڑا دیں۔

ایک اور روایت میں ہے کہ فی الواقع اُسیر کی نیت میں فتور آ گیا تھا وہ اور حضرت عبداللہؓ ایک اونٹ پر سوار تھے اُسیر نے حضرت عبداللہؓ کو قتل کرنے کے ارادے سے ان پر دو دفعہ تلوار چلائی لیکن وہ بچ گئے جب اس نے تیسرا وار کیا، تو حضرت عبداللہؓ بن رواحہ یا ان کے ایک ساتھی حضرت عبداللہؓ بن انیس نے جوابی وار کر کے اس کا سر اڑا دیا۔ اس پر اس کے ساتھی مسلمانوں سے الجھ پڑے، لیکن سب کے سب مارے گئے۔

(۵)

صلح حدیبیہ (٦ھ) میں قریش سے معاہدہ ہوا تھا کہ آئندہ سال مسلمان مکّہ میں آ کر عمرہ ادا کر سکیں گے اور تین دن قیام کر کے واپس چلے جائیں گے، چناں چہ ۷ھ میں سرورِ عالم ﷺ

نے اعلان کرا دیا کہ مسلمان ادائے عمرہ کی تیاری کریں۔ اس حکم کے صادر ہونے پر صحابہ کرامؓ سفر کی تیاری میں مشغول ہو گئے۔ ۲ ذو القعدہ ۷ ھ کو حضورؐ عمرۃ القضا کے لیے مدینے سے روانہ ہوئے۔ چوں کہ معاہدۂ صلح میں یہ شرط قرار پائی تھی کہ مسلمان غیر مسلح ہو کر مکہ میں داخل ہوں گے، اس لیے تمام ہتھیار قریۂ بطن میں چھوڑ دیے گئے۔ جب کہ کنبۂ نبوی مکہ میں داخل ہوا تو حضرت عبد اللہؓ بن رواحہ سرورِ کونین ﷺ کے اونٹ کی مہار تھامے ہوئے تھے اور بڑے جوش اور جذبے کے ساتھ یہ شعر پڑھ رہے تھے:

"اے کافرو! ان کے راستے سے ہٹ جاؤ۔ کیوں کہ تمام بھلائیاں رسول اللہ کے ساتھ ہیں ہم نے تم کو قرآن کی تاویل پر مارا ہے اور ہم نے قرآن کی تنزیل پر تم پر ضرب لگائی ہے جس سے سر دھڑ سے الگ ہو گئے ہیں اور دوستوں نے دوستی کو فراموش کر دیا ہے اے میرے رب میں رسول اللہ ﷺ کے ارشادات پر ایمان رکھتا ہوں۔"

حضرت عمر فاروقؓ کو یہ اشعار کچھ سخت محسوس ہوئے اور انھوں نے حضرت عبد اللہؓ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "ہائیں، ایسے اشعار حرمِ الٰہی میں اور رسول اللہ ﷺ کے سامنے پڑھتے ہو۔"

حضورؐ نے فرمایا۔ "عمر میں عبد اللہ کے اشعار سن رہا ہوں۔ خدا کی قسم! ان کے اشعار مشرکین پر تیر اور خنجر کا کام کرتے ہیں۔"

پھر آپؐ نے حضرت عبد اللہؓ سے فرمایا، تم یہ کہو:

لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہٗ و نصر عبدہٗ
واغر جندہ و ھزم الاحزاب وحدہٗ

"اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ اکیلا ہے۔ اس نے اپنے بندے کی مدد کی اور اس کے لشکر کو زور آور کر دیا اور دشمن کے لشکروں کو اکیلے ہی نے شکست دی۔"

حضرت عبد اللہؓ نے حضورؐ کے ارشاد کے مطابق تعمیل کی تو تمام صحابہؓ نے بھی آواز ملا کر یہ الفاظ دہرائے۔ اس سے ایسی گونج پیدا ہوئی کہ فضا میں ارتعاش پیدا ہو گیا اور کفّار کے دل دہل گئے۔

(۶)

صلح حدیبیہ کے بعد حضورِ اکرم ﷺ نے مختلف بادشاہوں اور حکمرانوں کے پاس تبلیغی دعوت نامے ارسال فرمائے تھے۔ ان میں ایک خط حارثؓ بن عمیر ازدی کے ہاتھ بصریٰ کے حاکم

حارث بن شمر غسانی کے نام بھی بھیجا تھا۔ جب حارثؓ بن عمیر موتہ کے مقام پر پہنچے، تو وہاں کے رومی حاکم شرحبیل بن عمرو غسانی نے اُن کو گرفتار کر کے شہید کر ڈالا۔ قاصد یا سفیر کا قتل کسی مذہب یا قانون میں جائز نہیں۔ حضورؐ کو اپنے قاصد کی مظلومانہ شہادت کی خبر ملی، تو آپؐ کو سخت صدمہ ہوا اور آپؐ نے جمادی الاولیٰ ۸ھ میں حارثؓ بن عمیر کے خون کا بدلہ لینے کے لیے تین ہزار مجاہدین حضرت زیدؓ بن حارثہ کی سرکردگی میں مدینہ سے روانہ فرمائے اور ارشاد فرمایا کہ اگر لڑائی میں زیدؓ بن حارثہ شہید ہو جائیں تو جعفرؓ بن ابی طالب امیر لشکر ہوں گے اور وہ بھی شہید ہو جائیں تو عبداللہؓ بن رواحہ لشکر کی قیادت کریں گے اور اگر وہ بھی شہید ہو جائیں تو مسلمان جس کو مناسب سمجھیں امیر بنا لیں۔

ایک یہودی بھی اس موقع پر موجود تھا اس نے حضورؐ کا ارشاد سنا تو کہا کہ یہ تینوں ضرور مارے جائیں گے، کیوں کہ پہلے انبیاءؑ کے اس قسم کے کلام کا یہی نتیجہ ہوتا تھا۔ تینوں بزرگوں نے کہا، حضورؐ سچے نبی ہیں اگر ہمارے مقدر میں شہادت لکھی ہے، تو زہے قسمت۔''

حضورؐ نے ایک سفید جھنڈا بنا کر حضرت زیدؓ کے حوالے کیا اور لشکر کے ساتھ مدینہ منورہ سے باہر تشریف لے گئے۔ حضرت عبداللہؓ بن رواحہ اہل مدینہ سے رخصت ہونے لگے تو ان کو پورا یقین تھا کہ اب اس دنیا میں دوبارہ ان لوگوں سے ملاقات نہ ہوگی۔ جب ان سب نے رخصتی سلام کیا اور دعا کی کہ اللہ تمھیں بہ خیریت وعافیت واپس لائے تو حضرت عبداللہؓ بن رواحہ نے یہ شعر پڑھے۔

لٰکِنَّنِی اَسْأَلُ الرَّحْمٰنَ مَغْفِرَةً   وَ ضَرْبَةً ذَاتَ فَرْغٍ تَقْذِفُ الزَّبَدَا

''یعنی میں خدا تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی مغفرت چاہتا ہوں اور تلوار کی ایک ایسی کاری ضرب جو جوش کو ٹھنڈا کر دے۔''

اَوْ طَعْنَةً بِیَدَیْ حَرَّانَ مُجْهِزَةً   بِحَرْبَةٍ تُنْفِذُ الْاَحْشَآءَ وَالْكَبِدَا

''جس سے جھاگ دار خون پانی کی طرح بہے یا برچھے کا ایسا وار جو آنتوں اور جگر کو چیرتا ہوا نکل جائے۔''

حَتّٰی یَقُوْلُوْا اِذَا مَرُّوْا عَلٰی جَدَثِی   اَرْشَدَهُ اللّٰهُ مِنْ غَازٍ وَّ قَدْ رَشَدَا

''یہاں تک کہ جب لوگ میری قبر پر گزریں، تو پکار اٹھیں کہ اللہ نے اس غازی کو ہدایت دی اور کامیاب کیا اور بے شک یہ ہدایت پر تھا۔''

سرورِ عالم ﷺ نے صحابہ کی ایک جماعت کے ساتھ اس مقدس لشکر کی ثنیۃ الوداع تک مشایعت فرمائی۔ مدینہ منوّرہ کو معاودت سے پہلے آپؐ نے اس لشکر کو تاکید فرمائی کہ بچوں بوڑھوں اور عورتوں کو نہ مارنا۔ ان کے درخت نہ کاٹنا۔ نہ ان کے گھر مسمار کرنا اور نہ ان لوگوں سے کوئی تعرض کرنا جو اپنی عبادت گاہوں میں گوشہ نشین ہیں۔

حضورؐ واپس تشریف لے گئے تو حضرت عبداللہؓ بن رواحہ کا جی بھر آیا اور ان کی زبان پر بے ساختہ یہ شعر آ گیا۔

خلف السّلامُ علی امرئٍ وَ دَعْتُهُ
فِی النَّخل خَیرَ مشیّعٍ وَّ خَلِیْلٖ

''اس ذاتؐ پر آخری سلام کہ میں نے جن کو کھجور کے درختوں میں رخصت کیا، جو مشایعت کرنے والوں میں سب سے بہتر ہیں اور جو سب سے بہتر دوست ہیں۔''

شرحبیل بن عمرو غسّانی کو مسلمانوں کی لشکر کشی کی خبر ملی تو اس نے زور شور سے مقابلے کی تیاری کی اور ساتھ ہی ہرقل سے مدد مانگ بھیجی جو اسی علاقے میں بلقاء کے مقام پر ایک زبردست لشکر کے ساتھ موجود تھا، اس نے تقریباً ایک لاکھ رومی جنگجو شرحبیل کی مدد کے لیے بھیج دیے۔ اسلامی لشکر نے حدودِ شام میں داخل ہو کر معان کے مقام پر پڑاؤ ڈالا تو انہیں غنیم کی کثیر تعداد اور جنگی تیاریوں کا علم ہوا۔ بعض اصحاب نے رائے دی کہ رسولِ اکرم ﷺ کو ان حالات کی اطلاع دی جائے۔ اس موقع پر حضرت عبداللہؓ بن رواحہ نے للکار فرمایا:

''اے لوگو! تم کس بات سے گھبرا رہے ہو، تمھارا مطلوب و مقصود تو راہِ حق میں اپنی جانیں قربان کرنا ہے۔ مسلمان کبھی مادّی قوت اور آدمیوں کی کثرت کے بل پر نہیں لڑتے وہ صرف دینِ حق کی خاطر لڑتے ہیں جس نے انھیں عزّت بخشی ہے۔ آگے بڑھو اور دو کام یابیوں میں سے ایک حاصل کر لو، شہادت یا فتح۔''

حضرت عبداللہؓ کی تقریر نے تمام مجاہدین کے دلوں میں شوقِ شہادت کے شعلے بھڑکا دیئے اور وہ موتہ پہنچ کر رومیوں کی مہیب طاغوتی قوّت سے بھڑ گئے۔ حضرت زیدؓ بن حارثہ مردانہ وار لڑتے ہوئے شہید ہو گئے تو حضرت جعفرؓ بن ابی طالب نے علَم سنبھالا، وہ بھی نوے زخم کھا کر خلدِ بریں کو سدھارے تو حضورؐ کے ارشاد کے مطابق اب حضرت عبداللہؓ بن رواحہ لشکر کے قائد بنے۔ کہا جاتا ہے انھوں نے تین دن سے کوئی غذا نہ کھائی تھی، شہادت سے کچھ دیر پہلے ان کے

سامنے گوشت رکھا گیا تاکہ کھا کر پوری قوت سے لڑنے کے قابل ہوسکیں، ابھی پہلا لقمہ ہی منہ میں رکھا تھا کہ حضرت جعفرؓ کی شہادت کی خبر سنی۔ انھوں نے وہ لقمہ فوراً اگل دیا اور اپنے نفس سے مخاطب ہو کر کہا، جعفرؓ دنیا سے کوچ کر گئے اور تو ابھی تک دنیا میں مشغول ہے ـــــ پھر شمشیر بہ دست علم سنبھال کر یہ رجز پڑھتے ہوئے صفِ جنگاہ میں گھس گئے۔

یا نفس! ان لا تقتلی تموتی هذا حمام الموت قد صلیت

''اے نفس اگر قتل نہ ہوگا تب بھی مرے گا کہ موت کا حمام گرم کر دیا گیا ہے۔''

وما تمنیت فقد اعطیت ان تفعلی فعلهما هدیت

''اور جو تیری تمنا تھی وہ پوری ہو رہی ہے اگر تو نے ان (شہیدوں) جیسے کام کیے تو ہدایت پا گیا۔''

لڑتے لڑتے انگلی میں شدید زخم آیا جس سے وہ لٹک گئی، حضرت عبداللہؓ گھوڑے سے اتر پڑے اور پاؤں سے اس انگلی کو دبا کر ہاتھ کھینچا۔ اس طرح وہ جسم سے الگ ہوگئی۔ خون زیادہ نکل جانے کی وجہ سے سخت ناتوانی محسوس کی اور دل میں کچھ تردّد سا پیدا ہوا کہ کیسے لڑوں، لیکن یہ تردّد فوراً ہی دُور ہو گیا اور انھوں نے اپنے نفس سے مخاطب ہو کر کہا کہ اے نفس یہ تردّد اگر بیوی کے لیے ہے تو اس کو طلاق، اگر غلاموں کی وجہ سے ہے، تو وہ سب آزاد، اگر باغ اور زراعت کی وجہ سے ہے تو وہ سب اللہ کے راستے میں صدقہ کرتا ہوں۔ اس کے بعد پھر مردانہ وار یہ رجز پڑھتے ہوئے دشمن کی صفوں میں گھس گئے۔

اقسمت یا نفس! لتنزلنه لتنزلن او لتكرهنه

''اے نفس میں تجھ کو قسم دیتا ہوں کہ تجھے میدان میں اترنا ہوگا خواہ خوشی سے اتر خواہ ناگواری سے۔''

ان اجلب الناس وشدوا الزنة مالی اراک تکرهین الجنة؟

''اگر لوگ جمع ہوے اور رونے کی آواز بلند کی، تو مجھے کیا ہوا کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ اے نفس تجھے جنت میں جانے سے کراہت ہے۔''

قد طال ما کنت مطمئنة هل انت الا نطفة فی شنّه

''تو نے اطمینان کا بہت طویل زمانہ گزارا ہے۔ تو وہی تو ہے جو رحم کے مشکیزے میں نجس پانی کا ایک قطرہ تھا۔''

دیر تک تلوار اور نیزے سے دادِ شجاعت دیتے رہے۔ اسی دوران میں دشمن کے کسی سپاہی نے برچھی کا ایسا سخت وار کیا کہ متحارب صفوں کے درمیان گر گئے۔ سینے سے خون کا فوّارہ چھوٹا تو اس کو اپنے ہاتھوں سے چہرے پر مَلا اور مسلمانوں سے مخاطب ہو کر کہا: ''مسلمانو اپنے بھائی کے گوشت کو بچاؤ۔'' (دشمن میری لاش کو خراب نہ کرنے پائیں) چناں چہ مسلمانوں نے ان کے گرد گھیرا ڈال لیا اور کفّار کو پیچھے ڈھکیل دیا۔ اسی اثنا میں ان کی روح روضۂ رضوان کو سدھار گئی۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک وخون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

حضرت عبد اللہؓ بن رواحہ کی شہادت کے بعد حضرت خالدؓ بن ولید امیر لشکر بنے۔ انھوں نے غازیانِ دین کو مجتمع کر کے ایسا بھرپور حملہ کیا کہ دشمن کے پاؤں اکھڑ گئے۔

صحیح بخاری میں حضرت انسؓ بن مالک سے روایت ہے کہ جس وقت موتہ کے میدان میں مسلمان موت اور زندگی کی جنگ لڑ رہے تھے، سینکڑوں میل دُور مدینہ منوّرہ میں سرورِ عالم ﷺ مسجد نبوی کے منبر پر تشریف فرما تھے۔ آپؐ کی آنکھوں سے سیل اشک رواں تھا اور زبانِ مبارک پر یہ الفاظ تھے۔

''نشان لیا زیدؓ نے اور وہ شہید ہوئے۔ نشان لیا اب جعفرؓ نے اور وہ شہید ہوئے۔ نشان لیا اب عبد اللہؓ بن رواحہ نے اور وہ بھی شہید ہوئے۔ اب نشان لیا خدا کی تلواروں میں سے ایک تلوار نے اور اس کو فتح دی گئی۔''

گویا میدانِ جنگ کا نقشہ حضورؐ کے بالکل سامنے تھا اور وحی کے ذریعہ آپؐ کو پَل پَل کی خبر مل رہی تھی۔ اسی واقعے کی بنا پر حضرت خالدؓ بن ولید سیف اللہ کے لقب سے مشہور ہوئے۔ اربابِ سِیَر نے اس واقعے کو حضورؐ کے معجزات میں شمار کیا ہے۔

طبقات ابنِ سعد میں حضرت ابو میسرہؓ سے روایت ہے کہ جب حضرت زیدؓ، جعفرؓ، اور عبد اللہ بن رواحہ شہید ہوئے تو حضورؐ نے (کھڑے ہو کر) ان تینوں کے لیے فرداً فرداً نام لے کر مغفرت کی دعا کی۔

(۷)

حضرت عبداللہؓ بن رواحہ دربارِ رسالت کے ان اراکین میں سے تھے جو حضوؐر پر فدا ہونے کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ اسی لیے سرورِ عالم ﷺ کو بھی ان سے دلی انس تھا اور آپؐ ان پر بھرپور اعتماد فرماتے تھے، چناں چہ حضوؐر نے حضرت عبداللہؓ بن رواحہ کو کتابت کی خدمت تفویض فرمائی تھی جسے وہ نہایت حسن و خوبی سے انجام دیتے تھے۔ اس کے علاوہ دربار رسالت کے تین مشہور شاعروں میں سے ایک تھے۔ دوسرے دو شاعر حضرت حسانؓ بن ثابت اور حضرت کعبؓ بن مالک تھے۔ حافظ ابنِ عبد البرؒ نے ''استیعاب'' میں لکھا ہے کہ ''مشرکین کی ہجو گوئی کی خدمت انصار کے تین آدمیوں نے قبول کی، حسانؓ بن ثابت، کعبؓ بن مالک اور عبداللہؓ بن رواحہ نے۔'' لیکن ان تینوں بزرگوں کی ہجو گوئی کا موضوع مختلف تھا، علّامہ ابن اثیرؒ نے ''اسد الغابہ'' میں بیان کیا ہے کہ حضرت حسانؓ بن ثابت اپنے اشعار میں مشرکین کے حسب و نسب پر چوٹ کرتے تھے، حضرت کعبؓ بن مالک ان کو لڑائی کی دھمکیاں دے کر دہشت زدہ کرتے تھے اور حضرت عبداللہؓ بن رواحہ ان پر کفر کا الزام لگاتے تھے یعنی اس بات پر ملامت کرتے تھے کہ وہ گم راہی میں مبتلا ہیں۔

ایک روایت میں ہے کہ سرورِ عالم ﷺ غزوۂ احزاب سے فارغ ہوئے تو صحابہ کرامؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

''آج کے بعد کفّار کو تم سے لڑنے کی جرأت نہ ہوگی، لیکن وہ تمہاری ہجو کہیں گے، تو مسلمانوں کی عزّت کو تم میں کون محفوظ رکھے گا۔''

حضرت عبداللہؓ بن رواحہ نے فوراً اُٹھ کر عرض کی: ''یارسول اللہؐ ـــــ میں۔'' چناں چہ اس کے بعد کفّار کی ہجو گوئی ان کا مخصوص مشغلہ ہوگیا۔ یہاں تک کہ ان کی ہجوؤں سے کفار سخت پریشان تھے۔ سرورِ عالم ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ عبداللہؓ بن رواحہ کے اشعار کفّار پر تیر و نشتر کا کام کرتے ہیں۔

حضرت عبداللہؓ بن رواحہ کو کفار کی ہجو گوئی کے علاوہ دوسری اصنافِ سخن پر بھی عبور حاصل تھا اور وہ فی البدیہہ شعر کہنے پر بھی قدرت رکھتے تھے۔ صحیح بخاری اور بعض دوسری کتابوں

میں ان کے متعدد نعتیہ اور رجزیہ اشعار بھی ملتے ہیں۔ رحمتِ عالم ﷺ کو حضرت عبداللہؓ کے اشعار اس قدر پسند تھے کہ آپؐ نے کئی موقعوں پر اپنی زبانِ مبارک سے ان کے بعض اشعار دہرائے۔ پیچھے ذکر آچکا ہے کہ مسجدِ نبوی کی تعمیر کے وقت سرورِ عالم ﷺ ان کا ایک شعر پڑھتے ہوئے مٹی اور گارا اٹھاتے تھے۔ صحیح بخاری میں حضرت انسؓ بن مالک سے روایت ہے کہ غزوۂ احزاب میں بھی حضورؐ خندق کھودنے پتھر توڑنے اور مٹی ہٹانے میں بہ نفسِ نفیس حصہ لیتے تھے، اس وقت آپؐ ابن رواحہ کے یہ اشعار بآواز بلند پڑھ رہے ہوتے تھے:

اللھم تولا انت ما اھتدینا

الٰہی تیری مدد نہ ہوتی تو ہم کو ہدایت کہاں ملتی

ولا تصدقنا ولا صلینا

نہ ہم زکوٰۃ دیتے اور نہ ہم نماز پڑھتے

فانزلن سکینۃ علینا

اے اللہ تو ہم پر اپنی تسکین نازل فرما

و ثبّت الاقدام ان لاقینا

اور لڑائی میں ہم کو ثابت قدم رکھ

ان الاعداء قد بغوا علینا

یہ دشمن ہم پر بلاوجہ ظلم سے چڑھ آئے ہیں

اذا ارادوا فتنۃً ابینا

جب وہ فتنہ کا ارادہ کریں گے تو ہم اس کا انکار کردیں گے

حضرت عروہؒ بن زبیرؓ سے روایت ہے کہ غزوۂ موتہ پر روانہ ہونے سے قبل حضرت عبداللہؓ بن رواحہ رسولِ اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپؐ سے رخصت ہوتے ہوئے یہ شعر پڑھے:

فثبت اللّٰہ ما آتاک من حسن تثبیت موسیٰ و نصرا کالذی نصروا

''اللہ تعالیٰ نے جو خوبیاں آپ کو عطا کی ہیں، وہ قائم و دائم رکھے، جس طرح کہ

موسیٰ علیہ السلام کی خوبیوں کو دوام بخشا گیا، اور اللہ تعالیٰ آپ کی مدد فرمائے جیسی کہ دوسرے رسولوں کی فرمائی۔

انی تفرست فیک الخیر نافلة والله یعلم ان ما خاننی البصر

اے برگزیدہ رسول میں نے آپ میں کمال درجے کی بھلائی دیکھی۔ اللہ جانتا ہے کہ میری نظر (یا فراست) نے مجھ سے خیانت نہیں کی۔

انت النبیّ و من یحرم شفاعته یوم الحساب فقد ازری به القدر (۱)

آپ اللہ کے نبی ہیں جو آپ کی شفاعت سے یومِ حساب میں محروم ہوا اس کی تقدیر پھوٹ گئی۔"

کئی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض مرتبہ سرورِ عالم ﷺ عبداللہؓ ابن رواحہ سے فرمائش کر کے اشعار سنتے تھے اور ان کی تحسین فرماتے تھے۔ ایک دفعہ انھوں نے حضورؐ کے حکم پر مشرکین کی ہجو میں کچھ فی البدیہہ اشعار کہے تو آپؐ متبسّم ہو گئے اور حضرت عبداللہؓ کو دعا دی کہ اللہ تم کو ثابت قدم رکھے۔

اربابِ سِیَر کا بیان ہے کہ اپنی شاعرانہ صلاحیتوں اور جذبۂ فدویت کی بنا پر حضرت عبداللہؓ بن رواحہ "شاعرِ رسول اللہ" کے لقب سے مشہور ہو گئے تھے۔

تاریخ میں حضرت عبداللہؓ بن رواحہ کے صرف پچاس اشعار محفوظ رہ گئے ہیں جن میں بیشتر سیرۃ ابنِ ہشام میں ملتے ہیں۔

(۸)

حضرت عبداللہؓ بن رواحہ کے صحیفۂ حیات میں سبقت فی الاسلام، محبت و اطاعتِ رسولؐ، غیرت دینی، شغفِ عبادت و ذکرِ الٰہی، خشیتِ الٰہی اور شوق جہاد و شہادت سب سے نمایاں ابواب ہیں۔ وہ ہجرتِ نبوی سے قبل اس وقت سعادت اندوزِ اسلام ہوئے جب اسلام کا نام لینا بھی سارے عرب کو دعوتِ جنگ دینے کے مترادف تھا۔ سرورِ عالم ﷺ سے محبت کی یہ کیفیت تھی کہ آپؐ کے جمالِ جہاں آرا کی زیارت سے کبھی طبیعت سیر نہیں ہوتی تھی۔ ایک دفعہ ایک شعر میں آپؐ سے مخاطب ہو کر اپنے دلی جذبات کا یوں اظہار کیا:

---

(۱) مختلف روایتوں میں ان اشعار کے الفاظ اور ترتیب میں اختلاف پایا جاتا ہے تاہم مفہوم میں کافی مطابقت پائی جاتی ہے۔

"یارسول اللہ اگر آپ میں کھلی ہوئی نشانیاں نہ بھی ہوتیں جب بھی آپ کا روئے انور
خبر رسالت دینے اور آپ کو اللہ کا رسول حق ثابت کرنے کے لیے کافی تھا۔"

ہجرت کے کچھ عرصہ بعد جب ایک مرتبہ عبداللہ بن ابی بن سلول نے حضورؐ کی شان میں گستاخانہ کلمات کہے اور حضورؐ کی دعوتِ حق پر ناک بھوں چڑھائی تو حضرت عبداللہؓ بن رواحہ تڑپ اٹھے اور حضورؐ کی حمایت میں لڑنے مرنے پر تیار ہو گئے۔

اطاعتِ رسولؐ میں اس قدر التزام تھا کہ لسانِ رسالتؐ سے جو کچھ سنتے تھے اس کو حرزِ جان بنا لیتے تھے اور اس بات کو اپنا جزوِ ایمان سمجھتے تھے کہ کسی تامّل اور چون و چرا کے بغیر حضورؐ کے احکام کی تعمیل کی جائے۔ ایک مرتبہ خود سرورِ کائنات ﷺ نے ان کے جذبۂ اطاعتِ رسول کی تحسین فرمائی اور اس میں زیادتی کے لیے دعا کی۔

قبولِ اسلام کے بعد حضرت عبداللہؓ بن رواحہ کی شاعری نے جو رنگ اختیار کیا وہ ان کی غیرتِ دینی کا مظہر تھا۔ اپنے اشعار میں کفار کو اسلام کے نورِ ہدایت کی طرف سے آنکھیں بند کرنے اور کفر و شرک کی نجاست سے آلودہ ہونے پر اس انداز سے عار اور شرم دلاتے تھے کہ وہ منہ چھپاتے پھرتے تھے۔

عبادتِ الٰہی میں انہماک کا یہ عالم تھا کہ پنج گانہ نمازوں کے علاوہ نفلی نمازیں بھی بہ کثرت پڑھتے تھے۔ حافظ ابنِ حجرؒ نے لکھا ہے کہ "وہ نہایت عابد و زاہد اور مُرتاض تھے۔" ان کا معمول تھا کہ گھر سے نکلتے وقت اور واپس آتے وقت دو دو رکعت نماز ضرور پڑھتے تھے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ عبداللہؓ بن رواحہ شدید سے شدید گرمی میں بھی روزہ ترک نہ کرتے تھے حتّٰی کہ سفر میں بھی صائم رہتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی سفر میں سرورِ عالم ﷺ کے ہم رکاب تھے۔ سفر میں روزے کی یوں بھی رخصت ہوتی ہے، لیکن اس سفر میں گرمی کی وہ شدّت تھی کہ روزہ رکھنے کا تصور بھی محال تھا۔ اس کے باوجود سرورِ عالمؐ اور حضرت عبداللہؓ بن رواحہ روزے سے تھے۔

حضرت عبداللہؓ کو ذکرِ الٰہی سے بھی بڑا شغف تھا اور مجالسِ وعظ و ذکر میں بیٹھ کر ان کو بے انتہا روحانی لذّت حاصل ہوتی تھی۔ مسند احمد بن حنبلؒ میں حضرت انسؓ بن مالک سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہؓ بن رواحہ، رسول اللہؐ کے صحابہ میں سے کسی سے ملتے تو ان سے کہتے آؤ تھوڑی دیر کے لیے اپنے رب پر ایمان لائیں۔ ایک دن یہی بات ایک صاحب سے کہی تو ان کو

ناگوار گزری اور انھوں نے حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر شکایت کی کہ یا رسول اللہ ابنِ رواحہ کو دیکھیے کہ وہ ہمیں تھوڑی دیر کے لیے اپنے رب پر ایمان لانے کی دعوت دیتے ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا:

"اللہ ابنِ رواحہ پر رحم کرے بے شک وہ ایسی مجالس کو پسند کرتا ہے جن پر ملائکہ بھی فخر کرتے ہیں۔

مسند بیہقی میں یہ روایت اس طرح بیان کی گئی ہے کہ حضرت عبداللہؓ بن رواحہ نے ایک دوسرے صاحبِؓ رسول سے کہا کہ آؤ تھوڑی دیر کے لیے ایمان لائیں، انھوں نے کہا۔ "کیا ہم مؤمن نہیں ہیں؟"

حضرت عبداللہؓ نے فرمایا۔ "بے شک ہم مومن ہیں، لیکن ہم اللہ کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جو ہمارے ایمان میں زیادتی کا باعث ہوگا۔"

ایک اور روایت میں حضرت شریح بن عبیدؓ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہؓ بن رواحہ اپنے ساتھیوں میں سے کسی کا ہاتھ پکڑ لیتے اور ان سے کہتے کہ آؤ تھوڑی دیر کے لیے ایمان لائیں یعنی ایمان تازہ کریں۔ پھر وہ ان کو ساتھ لے کر مجلسِ ذکر میں بیٹھ جاتے۔ حضرت ابوالدرداءؓ انصاری سے بھی ایسی ہی روایت مروی ہے۔

حضرت عبداللہؓ بن رواحہ پر خشیتِ الٰہی کا ہر وقت غلبہ رہتا تھا اور وہ آخرت کے خوف سے ہر وقت لرزاں و ترساں رہتے تھے۔ حافظ ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ حضرت عبداللہؓ بن رواحہ علیل تھے اور اپنی اہلیہ کی گود میں سر رکھے ہوئے تھے، یکا یک ان پر گریہ طاری ہو گیا، ان کی اہلیہ بھی رونے لگیں۔ حضرت عبداللہؓ نے پوچھا، تم کیوں روتی ہو؟ انھوں نے کہا، آپ کو روتے دیکھ کر مجھے بھی رونا آ گیا، حضرت عبداللہؓ نے فرمایا کہ مجھے تو اللہ تعالیٰ کا یہ قول یاد آ گیا:

وَ اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ۝

(مریم:۷۱)

"تم میں سے کوئی نہیں بچے گا مگر جہنم پر سے اس کا گزر ضرور ہوگا۔ یہ بات تیرے رب کے نزدیک ضروری اور فیصلہ شدہ ہے۔"

اب میں نہیں جانتا کہ میں اس سے نجات پاؤں گا یا نہیں۔

بعض روایتوں میں ہے کہ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب وہ غزوۂ موتہ پر روانہ ہونے

سے پہلے لوگوں سے رخصت ہو رہے تھے۔ ان کو روتے دیکھ کر لوگوں نے پوچھا کہ آپ کو کس بات نے رلایا، تو انھوں نے جواب دیا کہ میرے رونے کا سبب نہ دنیا کی محبت ہے اور نہ تم لوگوں سے جدائی کا صدمہ، بلکہ مجھے تو روزِ آخرت کا خوف رُلا رہا ہے پھر انھوں نے مذکورہ آیت پڑھی:

ایک روایت میں ہے کہ جب سورۂ الشُّعَرَآء کی یہ آیت اتری وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُنَ ''اور شاعروں کی راہ تو گم راہ لوگ چلا کرتے ہیں۔'' تو حضرت عبداللہؓ بن رواحہ، حسانؓ بن ثابت اور کعبؓ بن مالک (جو تینوں دربارِ رسالت کے شاعر تھے) خوفِ الٰہی سے لرز اٹھے اور روتے ہوئے حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان سب نے عرض کیا:

''یا رسول اللہ جس وقت اللہ نے یہ آیت نازل کی، تو اسے علم تھا کہ ہم سب شاعر ہیں۔''

حضورؐ نے انھیں تسکین دیتے ہوئے فرمایا کہ تم وہ لوگ ہو جن کے بارے میں اسی سورۃ میں فرمایا گیا ہے:

اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ ذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْراً وَّانْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ط (الشعراء:۲۲۷)

''جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے اور اللہ کا ذکر کثرت سے کیا اور انھوں نے بعد اس کے کہ ان پر ظلم ہو چکا ہے، بدلہ لے لیا۔''

اس طرح سیّد المرسلینؐ نے ان پر واضح کر دیا کہ تم ان شعراء میں سے نہیں ہو جن کی پیروی گم راہ لوگ کرتے ہیں۔

حضورؐ کا ارشاد سن کر ان اصحاب کو اطمینان ہو گیا اور وہ خوش خوش گھروں کو لوٹے۔

حضرت عبداللہؓ بن رواحہ کے شوقِ جہاد کا یہ حال تھا کہ بدر سے لے کر غزوۂ موتہ تک ہر غزوے میں بڑے ذوق وشوق سے شریک ہوئے اور سرفروشی کا پورا پورا حق ادا کیا۔ وہ ہر غزوے میں سب مجاہدین سے آگے آگے ہوتے تھے اور جب غزوہ ختم ہوتا تو سب کے بعد میدانِ جہاد سے واپس ہوتے تھے۔ ان کی دلی تمنّا تھی کہ اللہ تعالیٰ انھیں راہِ حق میں شہادت نصیب کرے۔

مشہور صحابی حضرت زیدؓ بن ارقم جو دُور کے رشتہ سے ان کے بھتیجے ہوتے تھے، کم سنی میں یتیم ہو گئے تھے اور حضرت عبداللہؓ نے ان کی پرورش کی تھی۔ غزوۂ موتہ میں ابنِ رواحہؓ کے ہم راہ تھے، ان سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہؓ بن رواحہ غزوۂ موتہ کے لیے روانہ ہوئے تو مجھے اپنے پیچھے کجاوہ کی پالان میں بٹھالیا تھا، ہم ساری رات سفر کرتے رہے اور میں نے سُنا کہ وہ (بڑے درد اور سوز کے ساتھ) اپنے یہ اشعار پڑھ رہے تھے:

اذا ادّیتنی و حملت رحلی مسیرۃ اربع بعد الحساء

"اے میری اونٹنی جب تو نے مجھے میدانی علاقے سے چار دن کی مسافت کے فاصلے پر پہنچادیا، تو تو نے اپنا فرض ادا کر دیا۔

فشأنک انعم و خلاک ذم ولا ارجع الی اھلی و رائی

اے اللہ! تیری شان انعام کرنا ہے اور تو ہر عیب سے پاک ہے مجھ کو اپنے اہل و عیال میں واپس نہ لانا۔

و جاء المسلمون و غادرونی بارض الشام مشتھی الثواء

اور مسلمان آگئے اور مجھے سرزمینِ شام میں چھوڑ دیا جہاں میں ٹھہرنا چاہتا تھا۔

و ردک کل ذی نسب قریب الی الرحمن منقطع الاخاء

تجھ کو ہر قریبی نسب والے نے اللہ کی طرف جاتے ہوئے چھوڑ دیا اور بھائی بندی ختم کر دی۔

ھنالک لا ابالی طلع بعل ولا نخل اسافلھا رواء

اس وقت میں تر اور خشک کھجوروں کے خوشہ سے بے نیاز ہوں کہ اپنی سیرابی کے لیے اسے جھاڑوں۔"

میں یہ اشعار سن کر رونے لگا۔ اس پر حضرت عبداللہؓ نے اپنا دُرّہ اٹھایا اور کہا کہ "اے بے [illegible] تیرا کیا حرج ہے اگر اللہ تعالیٰ مجھے شہادت نصیب کرے اور تو میرے خاندان میں میرے کجاوے کو واپس لے جائے۔"

اللہ تعالیٰ نے حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کی دلی تمنا پوری کر دی اور انھیں غزوۂ موتہ میں خلعتِ شہادت سے سرفراز فرمایا۔

علامہ ابنِ اثیرؒ نے ''اسد الغابہ'' میں لکھا ہے کہ حضورؐ کو غزوۂ موتہ میں حضرت زیدؓ، جعفرؓ اور عبداللہؓ بن رواحہ کی شہادت کی خبر ملی، تو آپؐ نے اشک بار ہو کر فرمایا:

اخوانی و مونسائی و محدثانی

''یہ میرے بھائی، میرے غم خوار اور مجھ سے بات چیت کرنے والے تھے۔''

تمام اہلِ سِیَر نے یہ بات تواتر سے بیان کی ہے کہ سیدِ وُلدِ آدم ﷺ کو حضرت عبداللہؓ بن رواحہ سے بڑی محبت تھی اور آپؐ ان پر بے حد شفقت فرماتے تھے۔ حافظ ابن حجرؒ نے ''اصابہ'' میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ سخت بیمار ہوئے یہاں تک کہ غشی طاری ہو گئی۔ حضور ﷺ کو معلوم ہوا، تو آپؐ عیادت کے لیے تشریف لے گئے اور ان کے پاس کھڑے ہو کر دعا کی:

''الٰہی اگر ان کی موت آئی ہو تو آسانی کر ورنہ شفا دے۔''

چوں کہ ان کے مقدّر میں شہادت لکھی ہوئی تھی اس لیے اس سخت بیماری سے شفایاب ہو گئے۔

ایک روایت میں ہے کہ سرورِ عالم ﷺ نے ایک مرتبہ ان کے حق میں فرمایا:

نعم الرجل عبد اللّٰہ بن رواحہ

''عبداللہ بن رواحہ بہت اچھے (بہترین) آدمی ہیں۔''

اہلِ سِیَر نے حضرت عبداللہؓ بن رواحہ کے اہل و عیال کی تفصیل نہیں دی، البتہ ابنِ اثیرؒ نے لکھا ہے کہ شہادت کے وقت ان کے بیوی بچے موجود تھے لیکن ان سے نسل نہیں چلی۔ حضرت عبداللہؓ سے چند احادیث بھی حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت انسؓ بن مالک، حضرت اسامہؓ بن زید، حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور نعمانؓ بن بشیر کے واسطہ سے مروی ہیں۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت عمرو بن جموح سلمیؓ

سیّد الانصار

(۱)

۶ رشوال ۳ھ کو سرورِ عالم ﷺ غزوۂ احد پر جانے کی تیاری کر رہے تھے کہ بنو سلمہ کے چار نوجوان آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی:

> ''یارسول اللہ ہم چاروں بھائی لڑائی میں شریک ہو رہے ہیں۔ ہمارے والد ضعیف العمر شیخ کبیر ہیں اور ان کے ایک پیر میں لنگ بھی ہے، لیکن ہمارے ساتھ وہ بھی لڑائی میں شامل ہونے پر بہ ضد ہیں اُن کے بارے میں کیا ارشاد ہے۔''

حضورؐ نے فرمایا: تمھارے والد اپنی معذوری کی بنا پر فریضۂ جہاد ادا کرنے کے مکلّف نہیں ہیں۔ تم نے ان کو سمجھایا ہوتا۔

نوجوانوں نے عرض کی: یارسول اللہ! ہم نے انھیں بہتیرا سمجھایا، لیکن وہ کسی صورت نہیں مانتے۔

سرورِ عالمؐ نے فرمایا اچھا، تو انہیں ذرا میرے پاس بُلا لاؤ۔

نوجوان اپنے گھر گئے۔ تھوڑی دیر بعد وہاں سے پلٹے تو ان کے ساتھ گھنگھریالے بالوں والے گورے رنگ کے ایک سفید ریش بزرگ بھی لنگڑاتے ہوئے آئے یہ اُن کے والد تھے۔ انھوں نے بڑی عقیدت و احترام کے ساتھ سرورِ عالم ﷺ کو سلام کیا اور عرض کی: ''یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان، اس عاجز کے لیے کیا حکم ہے؟''

حضورؐ نے متبسّم ہو کر نہایت شیریں لہجے میں فرمایا:

''بھائی! میں نے سنا ہے کہ آپ بھی ہمارے ساتھ لڑائی پر جانا چاہتے ہیں۔ آپ کا اخلاص اور جذبۂ فدویت اللہ کے نزدیک بہت پسندیدہ ہے، لیکن آپ کی عمر اب لڑائی میں حصہ لینے کی نہیں اور پھر آپ ایک پاؤں سے معذور بھی ہیں اس لیے آپ جہاد پر جانے کے مکلّف نہیں ہیں۔ اُمید ہے حق تعالیٰ آپ کو اپنی نیت کے بدلے جہاد کا ثواب عطا فرمائے گا۔''

وہ بزرگ بڑے جوش کے ساتھ عرض پیرا ہوئے: ''یا رسول اللہ! یہ لڑکے بھی مجھ کو میدانِ جہاد میں جانے سے روک رہے ہیں، لیکن خدا کی قسم مجھے امید ہے کہ اگر میں راہِ حق میں لڑ کر مارا جاؤں تو اسی پاؤں کو گھسیٹتا ہوا جنت میں پہنچ جاؤں گا۔ للہ! مجھے اپنی ہم رکابی کی اجازت مرحمت فرمائیں۔''

حضورؐ ان کے جوشِ اخلاص سے بہت متاثر ہوئے اور ان کے فرزندوں سے مخاطب ہو کر فرمایا: ''بیٹو! اب ان کو نہ روکو، شاید ان کے مقدر میں رتبہ شہادت پر فائز ہونا ہی لکھا ہو۔

حضورؐ کا ارشاد سُن کر یہ بزرگ بیٹوں کے ساتھ خوش خوش گھر لوٹے، ہتھیار سنبھالے اور پھر بڑے عجز و الحاح کے ساتھ بارگاہِ رب العزت میں دعا مانگی:

اَللّٰهُمَّ ارزقنی الشهادة ولا تردنی الٰی اهلی خائباً

''الٰہی! مجھ کو شہادت نصیب فرمانا اور مجھ کو نا امید گھر واپس نہ لانا۔''

اس کے بعد وہ سیدھے سرورِ عالمؐ کی خدمت میں پہنچے اور دوسرے مسلمانوں کے ساتھ آپؐ کی ہم رکابی میں میدان جنگ کی طرف روانہ ہو گئے۔

یہ بزرگ جن کے جوشِ ایمان اور شوقِ شہادت نے رحمتِ عالم ﷺ کو اس قدر متاثر کیا کہ آپؐ نے ان کی کبرسنی اور معذوری کے باوجود انھیں لڑائی میں شریک ہونے کی اجازت مرحمت فرمائی، سیّد الانصار حضرت عمرو بن جموح سلمیؓ تھے۔

(۲)

سیّدنا حضرت عمروؓ بن جموح (بن زید بن حرام بن کعب بن غنم بن کعب بن سلمہ) خزرج کی شاخ بنو سلمہ کے رئیس تھے۔ ایک روایت میں ہے کہ عہدِ جہالت میں خاندان کے بُت خانے کی تولیت بھی ان کے سپرد تھی۔ بت پرستی سے اُن کا شغف جنون کی حد تک پہنچا ہوا

تھا۔ لکڑی کا ایک بت بنا کر گھر میں رکھ لیا تھا جس کی صبح شام پرستش کیا کرتے تھے اور بڑے اہتمام کے ساتھ اس کو بنا سنوار کر رکھتے تھے۔ ان کی زندگی کے بے شمار لیل ونہار اسی حالت میں گزر گئے یہاں تک کہ بڑھاپے نے آلیا۔ اسی زمانے میں فاران کی چوٹیوں سے خورشیدِ رسالت طلوع ہوا۔ اس کی ضیا باری نے یثرب کے بہت سے گھرانوں کو بھی منور کر دیا۔ سنہ ۱۱ بعثت میں ۶ سنہ ۱۲ بعثت میں ۱۲ اور سنہ ۱۳ بعثت میں ۷۵ یثربی مکّہ گئے۔ اور رحمتِ عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر ایمان کی نعمت اور حضوؐر کی بیعت سے سعادت اندوز ہوئے۔ سنہ ۱۳ بعثت کی بیعت عقبۂ کبیرہ میں شامل ہونے والے پچھتر نفوس قدسی میں حضرت عمروؓ بن جموح کے نوجوان صاحب زادے معاذؓ بھی تھے۔ یہ لوگ دولتِ اسلام سے بہرہ یاب ہو کر یثرب واپس آئے تو گھر گھر اسلام کا چرچا ہونے لگا، لیکن بوڑھے عمرو اپنے بت (مناۃ) پر دیوانہ وار فدا تھے، اس کو چھوڑنا انہیں کسی صورت میں گوارا نہیں تھا۔

معاذؓ بن عمرو اور بنو سلمہ کے کچھ دوسرے نو مسلم نوجوانوں نے عمرو کو اپنے بُت سے برگشتہ کرنے کی ایک پُر لطف ترکیب سوچی، وہ رات کو عمرو کا بت باہر لے جاتے اور اسے نجاست سے بھرے ہوئے کسی گڑھے میں اوندھا کر کے ڈال دیتے۔ علی الصباح بیدار ہو کر عمرو بت کو اپنی جگہ پر نہ پاتے تو بہت سٹپٹاتے اور چلّاتے ''تم لوگوں کا ناس ہو، معلوم نہیں ہمارے معبود کو کون لے گیا ہے۔'' پھر اس کی تلاش میں نکلتے۔ جب مل جاتا تو اس کو صاف کرتے، نہلاتے اور خوش بو لگا کر اسے اپنی جگہ رکھتے وقت کہتے: ''خدا کی قسم اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ تیرے ساتھ یہ سلوک کس نے کیا، تو اس کی ایسی درگت بناؤں کہ دنیا دیکھے۔

جب یہ قصّہ ہر روز ہونے لگا تو ایک دن تنگ آ کر بت کے گلے میں تلوار لٹکائی اور کہنے لگے:

> ''واللہ مجھے تو یہ علم نہیں کہ کون تیرے ساتھ یہ گستاخی کرتا ہے۔ اب یہ تلوار تیرے پاس ہے خود اس سے اپنا حفظ ودفاع کرنا۔''

لڑکوں نے بُت کی گردن میں تلوار لٹکی دیکھی، تو وہ بہت ہنسے۔ انھوں نے تلوار تو اتار کر اپنے پاس رکھ لی اور بُت کو ایک مرے ہوئے کتّے کے ساتھ رسّی میں باندھ کر بنو سلمہ کے ایک ایسے کنویں میں لٹکا دیا جس میں لوگ نجاست پھینکا کرتے تھے۔ صبح کو عمرو نے بت اور تلوار دونوں

کو غائب دیکھا تو پھر تلاش میں نکلے۔ جب بت کو مردہ کتے کے ساتھ غلاظت کے کنویں میں لٹکا دیکھا تو ان کی چشمِ بصیرت وا ہوگئی اور بت پرستی سے نفرت ہوگئی۔ علامہ سمہودیؒ نے ''وفاء الوفا'' میں لکھا ہے کہ اس واقعے کے معاً بعد سرِ راہ ان کی ملاقات ایک مسلمان سے ہوئی، اس کے سامنے اپنے دکھڑا رونے لگے۔ مسلمان نے ملامت کی کہ تم نے اپنے آپ کو خواہ مخواہ تضحیک کا نشانہ بنا رکھا ہے۔ یہ بُت بھی بھلا کسی کو نفع یا نقصان پہنچا سکتے ہیں میری مانو تو ان بتوں پر تین حرف بھیجو اور خدائے واحد اور اس کے رسولِ برحق پر ایمان لے آؤ۔ عمروؓ کے دل میں ان کی باتیں اتر گئیں اور وہ اسی وقت مشرف بہ اسلام ہو گئے۔

علّامہ ابنِ اسحاقؒ کا بیان ہے کہ حضرت عمروؓ بن جموح ایک خوش گو شاعر تھے انھوں نے اپنے بُت کی ہجو میں یہ شعر کہے:

تاللّٰہ لو کنت الٰھا لم تکن ۔۔۔ انت و کلب وسط بئر فی قرن

''خدا کی قسم اگر تو الہٰ ہوتا تو، تو اور (مرا ہوا) کتا کنوئیں کے اندر ایک رسّی کے ساتھ بندھے ہوئے نہ ہوتے۔

اف لمصرعک الٰھا مستدن ۔۔۔ الا فتشناک عن سواء الغبن

لعنت ہو تیرے اس جگہ پڑے ہونے پر، وہ کیسی ذلیل جگہ تھی اگر میں تجھے اس ذلیل جگہ سے تلاش کر کے نہ لاتا تو تو وہیں اوندھا پڑا ہوتا۔

ھو الذی انقذ فی من قبل ان ۔۔۔ اکسون فی ظلمۃ قبر مرتھن

اللہ پاک نے مجھے اس سے پہلے بچالیا کہ میں قبر کی تاریکی میں رہن رکھا جاتا۔

الحمد للّٰہ العلی ذی المنن ۔۔۔ الواھب الرزاق ویان الدین

ساری تعریف اس خدائے بزرگ و برتر کی جو احسان کرنے والا، رزق دینے والا اور بدلہ کے دن کا مالک ہے۔''

ایک دوسری روایت میں حضرت عمروؓ بن جموح کے قبول اسلام کا واقعہ اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ جب حضرت معاذؓ بن عمروؓ بیعت عقبۂ کبیرہ کے بعد یثرب واپس آئے تو ان کی والدہ ہندؓ بنت عمرو بن حرام نے بھی اسلام قبول کرلیا۔ حضرت عمروؓ بن جموح کے کانوں میں بیٹے کے قبول اسلام کی بھنک پڑی تو انھوں نے اپنی اہلیہ سے کہا کہ شاید معاذ بے دین ہوگیا ہے۔ اہلیہ

نے کہا، ”ایسا تو نہیں ہے، البتہ یہ درست ہے کہ وہ اپنی قوم کے لوگوں کے ساتھ مکّہ گیا تھا۔“ عمروؓ نے صاحب زادے کو بلا بھیجا اور ان سے پوچھا کہ میں نے سنا ہے تم نے مکّہ جا کر اس آدمی سے ملاقات کی ہے جو نبی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ مجھے بتاؤ کہ وہ آدمی کیا دعوت دیتا ہے۔“ معاذؓ نے ان کے جواب میں سورۂ فاتحہ ”الصراط المستقیم“ تک پڑھ کر سنائی۔ عمروؓ پر بڑا اثر ہوا۔ کہنے لگے:

”یہ تو بہت ہی اعلیٰ کلام ہے کیا اس کا دوسرا کلام بھی اسی قسم کا ہے۔“

معاذؓ نے کہا: ”بے شک ابا جان۔ کیا ہی خوب ہو کہ آپ ان کی بیعت لیں۔ آپ کی قوم کے بیشتر افراد پہلے ہی ان کی بیعت کر چکے ہیں۔“

عمروؓ نے جواب میں کہا: ”نہیں نہیں۔ پہلے میں منات سے مشورہ کروں گا اور جو حکم وہ دے گا اسی کے مطابق عمل کروں گا۔“

راوی کا بیان ہے کہ منات سے ان کے سوال و جواب کی صورت یہ ہوتی تھی کہ پردہ کی اوٹ میں ایک مکّار عورت کھڑی ہو جاتی تھی اور وہی منات کی طرف سے جواب دیا کرتی تھی۔ حضرت عمروؓ کی اہلیہ ہندؓ نے اس عورت کو وہاں سے بھگا دیا۔ حضرت عمروؓ بُت کے سامنے پہنچے۔ اس کی تعظیم کی اور پھر پوچھنے لگے:

”اے میرے معبود! کیا تجھے علم نہیں کہ ایک آدمی تیرا دشمن پیدا ہو گیا ہے، وہ ہمیں تیری عبادت سے روکتا ہے اور تجھ کو برباد کرنے کا حکم دیتا ہے۔ اب تو ہی بتا میں کیا کروں؟“

غرض اسی طرح دیر تک باتیں کرتے رہے، لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ نتیجہ یہ کہ وہ اس سے بے زار ہو گئے اور وہیں کھڑے کھڑے اس کو توڑ دیا۔ اس کے بعد وہ مشرف بہ اسلام ہو گئے۔

علّامہ ابن اسحاقؒ نے لکھا ہے کہ حضرت عمروؓ بن جموح نے اپنے ہدایت پانے پر ان اشعار میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا:

اتوب الی اللّٰہ مما مضی   واستنقذ اللّٰہ من نارہ

یعنی میں اپنی گزشتہ زندگی کے لیے اللہ کے سامنے توبہ کرتا ہوں اور اللہ کی آگ (دوزخ) سے نجات طلب کرتا ہوں۔

واثنی علیہ بنعمائہٖ الٰہ الحرام داستارہ

اللہ کے انعام پر میں اس کی حمد وثنا کرتا ہوں۔ وہی بیت الحرام اور اس کے پردوں کا معبود ہے۔

فسبحانہٗ عدد الخاطبین و قطر السماءِ و مدرارہ

میں اللہ ہی کی تسبیح و تقدیس کرتا ہوں آسمان سے اترنے والے قطروں اور مسلسل برسنے والی بوندوں کی تعداد کے برابر۔

ھدانی و قد کنت فی ظلمۃ حلیفٍ مناۃ واحجارہ

میں گم راہی میں مبتلا تھا۔ منات اور دوسرے پتھروں کی عبادت کرتا تھا۔ اس اللہ پاک نے مجھے ہدایت دی۔

وانقذنی بعد ثبیب القذال من شین ذاک و من عارہ

بڑھاپے میں جب میرے سر کے بال سفید ہوگئے، اللہ نے مجھ کو بت پرستی کے شرمناک عیب سے نجات دی۔

فقد کدت اھلک فی ظلمۃ تدارک ذاک بمقدارہ

قریب تھا کہ گم راہی کی تاریکی مجھے ہلاک کر ڈالے، حق تعالیٰ نے اپنے دستِ قدرت سے مجھے بچالیا۔

مخمدا و شکرا لہ ما بقیت الٰہ الانام و جبارہ

جب تک میرے دم میں دم ہے میں اسی اللہ کی حمد اور شکر کرتا رہونگا جو تمام مخلوق اور جابر لوگوں کا مالک ہے۔

ارید بذالک اذ قلتہ مجاورۃ اللّٰہ فی وارہ

یہ اشعار میں نے اس لیے کہے ہیں کہ میں اللہ کے گھر میں اسی کا پڑوسی ہو جاؤں۔

(۳)

رمضان ۲ھ میں غزوۂ بدر پیش آیا۔ حضرت عمروؓ اپنے فرزندوں کے ہم راہ اس میں بڑے جوش اور جذبہ کے ساتھ شریک ہوئے اور بڑی پامردی سے دادِ شجاعت دی۔ صحیح مسلم میں ہے کہ اس غزوہ میں جن دو نوجوانوں نے ابو جہل کو قتل کیا ان میں سے ایک حضرت معاذؓ بن عمرو

جموح تھے۔(۱) بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت عمروؓ بن جموح غزوۂ بدر میں شریک نہ ہو سکے۔ کیوں کہ ان کے پیر کے لنگ اور ضعیف العمری کی وجہ سے ان کے فرزندوں نے انھیں میدان جنگ میں جانے سے روک دیا۔ غزوۂ احد کے موقع پر بھی یہی صورت پیش آئی، لیکن اس مرتبہ حضرت عمروؓ نے لڑائی میں حصہ لینے پر اس قدر اصرار کیا کہ سرورِ عالمؐ نے انھیں لڑنے کی اجازت دے دی۔

حضرت عمروؓ بیٹوں کے ساتھ شاداں وفرحاں میدانِ جنگ میں پہنچے جب ایک اتفاقی غلطی سے جنگ کا پانسہ پلٹ گیا اور مسلمانوں میں انتشار پھیل گیا تو حضرت عمروؓ اپنے بیٹے خلّاد کو ساتھ لے کر شمشیر بکف مشرکین کی صفوں میں گھس گئے۔ دونوں باپ بیٹے بڑی پامردی سے لڑے لیکن آخر مشرکین کے جمِ غفیر نے انھیں گھیرے میں لے کر شہید کر ڈالا۔

ایک روایت میں ہے، کہ حضرت عمروؓ بن جموح کے ساتھ ان کے ایک وفادار غلام سلیمؓ بھی تھے۔ وہ بھی اپنے آقا کی معیت میں بڑی بہادری سے لڑے اور بالآخر رتبۂ شہادت پر فائز ہوئے۔ مشرکین کی پسپائی کے بعد سرورِ کونینؐ ادھر سے گزرے تو عمروؓ بن جموح کو خاک وخون میں غلطاں دیکھ کر فرمایا:

”خدا کے بعض بندے کوئی قسم کھاتے ہیں تو خدا اس کو پورا کر دیتا ہے۔ عمروؓ بھی ایسے ہی بندوں میں سے ہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ وہ جنت میں چل پھر رہے اور اُن کا لنگڑا پاؤں درست ہو گیا ہے۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: ”میں عمروؓ کو جنت میں اپنے لنگڑے پاؤں کے ساتھ چلتے پھرتے دیکھ رہا ہوں۔“

اس غزوہ میں حضرت عمروؓ کے برادرِ نسبتی (ان کی اہلیہ ہندؓ کے بھائی) حضرت عبداللہؓ بن عمرو بن حرام بھی رتبۂ شہادت پر فائز ہوئے۔ حضرت ہندؓ نے اپنے شوہر، فرزند اور بھائی کی شہادت کی خبر سُنی تو پوچھا:

رسول اللہ ﷺ تو بہ خیریت ہیں؟ جب لوگوں نے اثبات میں جواب دیا تو کشاں کشاں

---

(۱) بیشتر اربابِ سیَر نے اس روایت سے اختلاف کیا ہے اور لکھا ہے کہ ابوجہل کو مارنے والے نوجوان معاذؓ بن عفراء تھے۔

آپؐ کی خدمت میں پہنچیں اور عرض کی:

کل مصیبة بعدک جلل

''آپ سلامت ہیں تو سب مصیبتیں ہیچ ہیں۔''

حضرت ہندؓ ایک اونٹ اپنے ساتھ لے گئی تھیں۔ اس پر اپنے شوہر فرزند اور بھائی کی لاشیں لاد کر مدینہ کی طرف روانہ ہوئیں۔ راستے میں اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ ملیں جو چند دوسری خواتین کے ہم راہ حضورؐ کی خبر گیری کے لیے میدانِ اُحد کی طرف آ رہی تھیں۔ (اس وقت آیت حجاب نازل نہیں ہوئی تھی) اُمّ المومنینؓ نے ہندؓ سے حضورؐ کی خیریت دریافت کی۔ انھوں نے کہا: الحمدللہ حضورؐ بہ خیریت ہیں اور یہ لاشیں میرے شوہر، بھائی اور فرزند کی ہیں جنھوں نے لڑائی میں شہادت پائی۔ اتنے میں وہ اونٹ زمین پر بیٹھ گیا۔ ہر چند اس کو ہانکا گیا، لیکن اس نے مدینہ کی طرف قدم نہ اٹھایا۔ اُمّ المومنینؓ نے فرمایا: ''شاید بوجھ زیادہ ہے۔''

ہندؓ نے عرض کیا: ''نہیں اُمّ المومنینؓ اس پر تو اس سے زیادہ بوجھ لادا جاتا ہے۔'' بالآخر انھوں نے اونٹ کو اٹھا کر اُس کا رُخ اُحد کی طرف کیا تو وہ فوراً چل پڑا۔

ہندؓ تینوں شہیدوں کی لاشیں سرورِ عالمؐ کی خدمت میں لے گئیں۔ اس وقت آپؐ دوسرے شہیدوں کی لاشیں دفن کرا رہے تھے۔ آپؐ نے ہندؓ سے پوچھا: ''کیا ان میں سے کسی نے گھر سے چلتے وقت کچھ کہا تھا؟''

ہندؓ نے عرض کیا: ہاں یا رسول اللہ میرے شوہر نے گھر سے چلتے وقت یہ دُعا مانگی تھی کہ الٰہی مجھ کو شہادت نصیب فرمائیو اور مجھ کو نا امید اپنے اہل و عیال میں واپس نہ لائیو۔

ایک روایت میں ہے کہ اسی موقع پر حضورؐ نے یہ الفاظ ارشاد فرمائے کہ انصار میں وہ لوگ ہیں جو کسی بات پر قسم کھائیں تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم کو پورا کر دے۔ عمرو بن جموح ایسے ہی لوگوں میں سے تھے۔

اس کے بعد حضورؐ نے تینوں شہیدوں کو اُحد کے گنجِ شہیداں میں اپنے سامنے دفن کرایا اور ان کے لیے دُعائے مغفرت کی۔ علاّمہ ابن اثیرؒ کا بیان ہے کہ حضرت عمروؓ بن جموح اور حضرت عبداللہؓ بن عمرو بن حرام ایک ہی قبر میں دفن کیے گئے۔ ایک روایت میں ہے کہ چھ ماہ بعد حضرت عبداللہؓ کے فرزند حضرت جابرؓ نے اپنے والد کی لاش کو دوسری جگہ منتقل کرنے کے لیے قبر کھودی تو

حضرت عمروؓ بن جموح اور حضرت عبداللہؓ کی لاشوں کو بالکل تروتازہ پایا اور ان پر ایک ایک کھجور پڑی پائی۔ اس واقعہ کے ۴۶ برس بعد ایک مرتبہ پھر احد کی قبروں کو کھودنے کی نوبت آئی تو تمام شہداء کی لاشوں کو تروتازہ پایا گیا۔

(۴)

حضرت عمروؓ بن جموح اگرچہ آخری عمر میں مسلمان ہوئے اور صرف تین سال کے قریب اسلام کا زمانہ پایا، لیکن اپنے جوشِ اخلاص کی بہ دولت وہ اکابر صحابہ کرامؓ میں شمار ہوتے ہیں۔ اکثر اہل سِیَر کا بیان ہے کہ وہ بڑے سادہ مزاج اور فیاض طبع بزرگ تھے۔ ان کی جود وسخا کا حضورؐ کو بھی اعتراف تھا۔ چناں چہ ایک روایت میں ہے کہ ایک مرتبہ بنوسلمہ کے کچھ لوگ سرورِ عالمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپؐ نے ان سے پوچھا کہ "تمہارا سردار کون ہے؟" انھوں نے عرض کیا: "یارسول اللہؐ ہمارا سردار جد بن قیس ہے جو ایک بخیل آدمی ہے۔"

حضورؐ نے فرمایا:

"بُخل سے بدتر تو کوئی شے نہیں۔ آج سے تمھارے سردار الجعد الابیض (سفید گھنگھریالی زلفوں والے) عمروؓ بن جموح ہیں۔"

اسی دن سے وہ بنوسلمہ کے رئیس بن گئے۔ اور لوگ انھیں سیّد الانصار کہنے لگے۔ بنوسلمہ کو ان کے سردار بننے پر اس قدر مسرّت ہوئی کہ انھوں نے اس واقعہ کے بارے میں فخریہ اشعار کہے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت معاذ بن جبل انصاریؓ

(۱)

ایک دن بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں طویل قامت، روشن چہرے اور بڑی بڑی سُرمگیں آنکھوں والے ایک گورے چٹے نوجوان حاضر تھے اور بڑی توجہ اور انہماک کے ساتھ رحمتِ عالم ﷺ کے ارشادات سُن رہے تھے۔ جب وہ حضورؐ کے کسی ارشاد کے جواب میں کچھ عرض کرتے، تو یوں معلوم ہوتا کہ درِّ دندان سے نور کی شعاعیں پھوٹ رہی ہیں۔ یکایک حضورؐ نے ان کا ہاتھ اپنے دستِ مبارک میں پکڑ لیا اور فرمایا:

"میں تم سے بہت محبت رکھتا ہوں۔"

نوجوان نے فرطِ مسرّت سے بے خود ہو کر عرض کیا:

"یا رسول اللہ، میرے ماں باپ آپ پر قربان، مجھے بھی آپ سے غایت درجہ محبت ہے اور آپ مجھے دنیا کی ہر شے سے بڑھ کر محبوب ہیں۔"

سیّد المرسلینؐ نے متبسم ہو کر فرمایا:

"اچھا تو تمام نمازوں کے بعد یہ دعا پڑھنا کبھی نہ بھولنا،

رَبِّ اَعِنِّیْ عَلٰی ذِکْرِکَ وَ شُکْرِکَ وَ حُسْنِ عِبَادَتِکَ۔

"اے اللہ اپنا ذکر و شکر اور اپنی عبادت اچھی طرح کرنے کے لیے میری مدد فرما۔"

انھوں نے عرض کیا:

"یا رسول اللہ، میں آپ کے ارشاد پر ہمیشہ عمل کروں گا اور دوسروں کو بھی اس پر عمل کرنے کی وصیت کروں گا۔"

یہ سعادت مند نوجوان سیّدنا حضرت معاذؓ بن جبل انصاری تھے۔

(۲)

سیّدنا ابوعبدالرحمٰن معاذؓ بن جبل کا شمار خیر البشر ﷺ کے ان عظیم المرتبت جاں نثاروں میں ہوتا ہے جو ایک طرف تو راہِ حق کے ایک پُر جوش مجاہد اور گونا گوں محاسنِ اخلاق کا پیکرِ جمیل تھے، تو دوسری طرف علم وفضل کا ایسا مجمع البحرین تھے کہ ایک دنیا ان کے فیوضِ علمی سے بہرہ یاب ہوتی تھی اور ان کو عالمِ ربانی، کنز العلماء اور امام الفقہاء کے القاب سے یاد کرتی تھی۔

حضرت معاذؓ بن جبل کا تعلق انصار کے قبیلہ خزرج سے تھا اور وہ اس کی ایک شاخ اُدیّ بن سعد کے چشم وچراغ تھے۔ سلسلۂ نسب یہ ہے:

معاذ بن جبل بن عمرو بن اوس بن عائذ بن عدی بن کعب بن عمرو بن اوی بن سعد بن علی بن اسد بن ساردۃ بن یزید بن جشم بن خزرج اکبر۔

حضرت معاذؓ کا عنفوانِ شباب تھا کہ بعض یثربیوں سے کچھ عجیب باتیں سنیں۔ انھوں نے معاذؓ کو بتایا کہ مکّہ میں ایک نبی مبعوث ہوئے ہیں جو شرک اور بُت پرستی کی مذمّت کرتے ہیں اور لوگوں کو خدائے واحد کی پرستش کرنے کی تعلیم دیتے ہیں۔ نوجوان معاذؓ کو اللہ تعالیٰ نے فطرتِ سلیم عطا کی تھی، وہ ان باتوں سے بڑے متاثر ہوئے۔ نبوّت کے بارہویں سال جب حضرت مصعبؓ بن عمیر اسلام کے داعیِ اوّل کی حیثیت سے یثرب تشریف لائے اور لوگوں کو دعوتِ توحید دینی شروع کی، تو حضرت معاذؓ فوراً ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام کی سعادتِ عظمیٰ سے بہرہ یاب ہوگئے۔ اس وقت ان کی عمر صرف اٹھارہ برس کی تھی۔

اگلے سال (۱۳ نبوّت میں) پانچ سو یثربیوں کا ایک قافلہ حج کے لیے عازمِ مکّہ ہوا۔ اس قافلے میں پچھتر ایسے اصحاب بھی تھے (۷۳ مرد اور ۲ خواتین) جو سعادت اندوزِ اسلام ہو چکے تھے، تاہم دوسرے اہل قافلہ کو ان کے مسلمان ہونے کا علم نہیں تھا۔ ان مردانِ حق میں ایک حضرت معاذؓ بن جبل تھے۔ مکّہ پہنچ کر یہ پچھتر نفوسِ قدسی ایک رات کو پوشیدہ طور پر عقبہ کی گھاٹی میں جمع ہوئے۔ رحمتِ عالم ﷺ حضرت عباسؓ کے ہم راہ ان لوگوں کے پاس تشریف لائے۔ کچھ دیر سوال وجواب ہوتے رہے۔ اس کے بعد یہ سب کے سب حضورؐ کی بیعت سے مشرّف ہوئے اور اس عہد کے ساتھ حضورؐ کو یثرب تشریف لانے کی دعوت دی کہ وہ اپنی جانوں، مالوں اور اولادوں کے ساتھ آپؐ کی حفاظت اور اعانت کریں گے —— یہ ایک ایسا عہد تھا کہ جس

کو نباہنا سارے عرب سے دشمنی مول لینے کے مترادف تھا، لیکن آفرین ہے یثرب کے ان جانبازوں پر کہ انھوں نے بیعتِ لیلۃ العقبہ میں مکہ کے دُرِ یتیم ﷺ سے جو پیمانِ وفا باندھا، مرتے دم تک اس کو اس شانِ استقامت و عزیمت سے نباہا کہ آج تک تاریخِ اسلام کے اوراق اس کی آب و تاب سے جگ مگا رہے ہیں۔

(۳)

حضرت معاذؓ بن جبل دوسرے یثربی اہلِ حق کے ساتھ سرورِ عالم ﷺ کی بیعت سے مشرف ہو کر یثرب واپس آئے، تو ان کے جوشِ ایمان کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ یہ اُن کی بھرپور جوانی کا زمانہ تھا، اُمنگوں اور مرادوں کے دن تھے لیکن ان کے دل میں اگر کوئی اُمنگ تھی، تو یہی کہ مشرکینِ یثرب کے بتوں کو پاش پاش کر ڈالیں اور یثرب کے بچے بچے کا سر آستانِ اسلام پر جھکا دیں، چناں چہ جب ان کے پڑوسی اور یک جدّی خاندان بنوسلمہ کے مسلمان نوجوان اپنے قبیلہ کے بتوں کو توڑنے کے لیے نکلے تو حضرت معاذؓ بن جبل ان میں پیش پیش تھے خاندانِ بنوسلمہ کے رئیس عمرو بن جموح کو بُت پرستی سے بے انتہا شغف تھا۔ انھوں نے لکڑی کا ایک بُت بنا کر اپنے گھر میں رکھا ہوا تھا اور صبح و شام اس کی پرستش کیا کرتے تھے۔ حضرت معاذؓ بن جبل اور خاندانِ بنوسلمہ کے نومسلم نوجوانوں نے عمرو بن جموح کو اپنے بُت سے متنفر کرنے کے لیے ایک پُرلطف ترکیب سوچی، وہ رات کو عمرو کا بت باہر لے جاتے اور گندگی سے بھرے ہوئے کسی گڑھے میں پھینک دیتے، عمرو صبح بیدار ہوتے اور بُت کو اپنی جگہ نہ پاتے تو سخت پریشان ہوتے اور اس کی تلاش کے لیے گھر سے نکل کھڑے ہوتے، جب مل جاتا تو اس سے نجاست دُور کرتے، نہلاتے اور خوش بو لگا کر پھر اپنی جگہ پر لا کر رکھ دیتے۔ جب آئے دن یہی قصہ ہونے لگا تو وہ تنگ آ گئے۔ ایک رات سونے سے پہلے بُت کے گلے میں تلوار لٹکائی اور کہنے لگے:

”واللہ میں نہیں جانتا کون تیرے ساتھ یہ گستاخی کرتا ہے، اب تلوار تیرے پاس ہے اپنی حفاظت آپ کرنا۔“

نوجوانوں نے بُت کی گردن میں تلوار لٹکی دیکھی، تو بہت لطف اندوز ہوئے تلوار کو اتار کر اپنے قبضے میں کر لیا اور بُت کو ایک مردہ کتّے کے ساتھ باندھ کر نجاست سے بھرے ہوئے ایک کنویں میں لٹکا دیا۔ صبح کو عمرو نے بت کو تلوار سمیت غائب پایا تو سٹپٹا کر اس کی تلاش میں

نکلے۔ جب بُت کو مرے ہوئے کتے کے ساتھ گندگی کے کنوئیں میں لٹکا دیکھا تو معاً ان کی چشمِ بصیرت وا ہوگئی اور بت پرستی سے سخت نفرت ہوگئی۔ گھر کی طرف واپس آ رہے تھے کہ ایک مسلمان سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے ملامت کی کہ آپ نے خواہ مخواہ اپنے آپ کو نشانۂ تمسخر بنا رکھا ہے۔ بھلا یہ بُت جو اپنی حفاظت بھی نہیں کر سکتے کسی کو کیا نفع یا ضرر پہنچا سکتے ہیں۔ عمرو بن جموح کے پاس کوئی جواب نہ تھا، اُسی وقت قبول اسلام کا اعلان کر دیا۔

حضرت معاذؓ بن جبل اور ان کے سعادت مند ساتھیوں کے لیل و نہار ایسے ہی کاموں میں گزر رہے تھے کہ چند ماہ بعد رحمتِ عالم ﷺ نے ارضِ مکّہ کو الوداع کہہ کر یثرب میں نزولِ اجلال فرمایا۔ حضورؐ کے قدومِ میمنت لزوم سے اس دو ہزار سالہ قدیم شہر کی قسمت جاگ اٹھی۔ اس کی گلیاں اور کوچے شمیمِ رسالت سے مہکنے لگے اور یہ یثرب سے مدینۃ النبی بن گیا۔ حضرت معاذؓ بن جبل کی مسرّت و ابتہاج کا یہ عالم تھا کہ قدم زمین پر نہ ٹکتے تھے۔ دل و جان لیلۃ العقبہ میں ہی رسولِ ہاشمی ﷺ پر نثار کر بیٹھے تھے، اب وہ تھے اور سرکارِ دو جہاںؐ کا آستانۂ اقدس، تھوڑی دیر کے لیے بھی اس سے جدا ہونا ان پر شاق گزرتا تھا۔ ان کی بے پناہ عقیدت اور محبت کا حضورؐ سے بڑھ کر کون قدر دان ہوسکتا تھا۔ آپؐ کا سحابِ لطف و کرم ان پر جھوم جھوم کر برستا رہتا تھا اور وہ دن رات فیضانِ نبویؐ سے خوب خوب بہرہ یاب ہوتے رہتے تھے، یہاں تک کہ ان کا سینہ کلامِ الٰہی (قرآنِ حکیم) اور ارشاداتِ نبویؐ کا مخزن بن گیا اور ایک دنیا ان کے تبحرِ علمی کی معترف اور مدّاح ہوگئی۔

ہجرت کے چند ماہ بعد حضورؐ نے مہاجرین اور انصار کے مابین مواخاۃ قائم کی، تو حضرت معاذؓ بن جبل کو حضرت عبداللہؓ بن مسعود کا دینی بھائی بنایا۔ حضرت عبداللہؓ جب مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آئے تھے تو انہیں حضرت معاذؓ ہی نے اپنے ہاں ٹھہرایا تھا۔ خدا کی قدرت ان دونوں بھائیوں کو تفقہ فی الدین میں ایسا کمال حاصل ہوا کہ ایک امام الفقہاء کے لقب سے مشہور ہوئے اور دوسرے فقیہ الامّت کے لقب سے۔

صحیح بخاری میں ہے کہ حضورؐ نے نوجوان معاذؓ بن جبل کو بنوسلمہ کی مسجد کا امام مقرر فرما دیا تھا۔ علامہ شبلی نعمانیؒ نے سیرۃ النبیؐ میں صحیح مسلم کے حوالہ سے لکھا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے (بہ روایت حضرت ابو مسعود انصاریؓ) امام کے انتخاب کے لیے یہ اصول مقرر فرمائے تھے:

''جماعت کی امامت وہ کرے جو سب سے زیادہ کتاب اللہ پڑھا ہو، اگر اس میں سب برابر ہوں، تو جو سنّت میں سب سے زیادہ واقف ہو، اگر اس میں بھی مساوات ہو، تو جس نے پہلے ہجرت کی تھی اور اس میں بھی سب برابر ہوں تو جس کی عمر زیادہ ہو۔''

بنو سلمہ سے تعلق رکھنے والے صحابہ کی فہرست پر نظر ڈالی جائے، تو ان میں بہت سے معمر صحابہ کے نام بھی ملتے ہیں۔ اس کے برعکس حضرت معاذؓ بالکل نوجوان تھے اور مہاجر بھی نہیں تھے، اس لیے عہدۂ امامت کے لیے ان کو یقیناً اس بنا پر منتخب کیا گیا ہوگا کہ وہ قرآنِ کریم سب سے زیادہ پڑھے ہوئے تھے یا سنّت سے سب سے زیادہ واقف تھے۔ ان کی کتاب سیرت کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ قرآن و سنت کے متبحر عالم تھے اور یہ نتیجہ تھا فیضانِ نبویؐ سے ان کے مسلسل فیضیاب ہونے کا۔ فی الحقیقت حضرت معاذؓ بن جبل ان عظیم المرتبت صحابہ میں سے ہیں جنھوں نے بارگاہِ نبوّت سے اکتسابِ علم میں اپنی جانیں کھپا دیں اور سفر ہو یا حضر، مہبطِ وحی و رسالتؐ کے فیوض و برکات سے متمتع ہونے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا۔

(۴)

غزوات کا سلسلہ ہوا، تو بدر سے لے کر تبوک تک کوئی غزوہ ایسا نہیں تھا جس میں حضرت معاذؓ بن جبل کو سرورِ عالم ﷺ کی ہم رکابی کا شرف حاصل نہ ہوا ہو، وہ ایک جید عالم ہی نہیں راہِ حق کے ایک سرفروش مجاہد بھی تھے ہر معرکے میں کمال درجے کی جراءت و بسالت اور شجاعت و استقامت کا مظاہرہ کیا اور ثابت کر دیا کہ علم و فضل کے ساتھ وہ میدانِ رزم کے بھی شہسوار ہیں۔ ان کی فضیلت کے لیے بیعتِ عقبۂ کبیرہ میں شریک ہونا ہی کچھ کم نہ تھا، بدر، بیعتِ رضوان تبوک، اور دوسرے غزوات میں شرکت نے ان کے پایۂ عظمت کو اور بھی بلند کر دیا۔ علامہ ابن سعدؒ کا بیان ہے کہ فتح مکّہ (۸ھ) کے بعد سرورِ عالم ﷺ حنین کے لیے روانہ ہوئے تو آپؐ نے حضرت معاذؓ بن جبل کو مکّہ کا امیر (عامل) بنایا۔ وہ اہلِ مکّہ کو دینی مسائل سکھاتے اور قرآن کی تعلیم دیتے تھے۔ حنین اور طائف سے فارغ ہو کر حضورؐ مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو آپؐ نے حضرت معاذؓ کو اپنے پاس بلا لیا اور اُن کی جگہ حضرت عتابؓ بن اَسِید کو مکہ کی امارت پر مامور فرمایا۔

حضرت معاذؓ بن جبل کے کچھ عرصہ اَمارتِ مکہ پر فائز رہنے کی تصدیق مستدرک حاکم

کی ایک روایت سے بھی ہوتی ہے چوں کہ وہ حضورؐ کے حکم کے مطابق پیچھے (مکہ میں) ٹھہرے تھے، اس لیے یہ قیاس کرنا غلط نہ ہوگا کہ انھیں غزوۂ حنین و طائف میں شرکت کا ثواب اور مال غنیمت کا حصہ بھی ضرور ملا ہوگا۔

غزوۂ تبوک عہدِ رسالت کا آخری غزوہ تھا جس میں سرورِ عالم ﷺ تیس ہزار جاں نثاروں کی معیت میں تین سو میل کا پُر صعوبت سفر طے کر کے تبوک تشریف لے گئے۔ بنو سلمہ کے ایک اہم رُکن حضرت کعبؓ بن مالک انصاری (جو حضرت معاذؓ بن جبل کے یک جدی تھے) محض تساہل کی بنا پر حضورؐ کی ہم رکابی کا شرف حاصل نہیں کر سکے تھے۔ تبوک پہنچ کر حضورؐ نے ان کے متعلق دریافت کیا، بنو سلمہ کے ایک صاحب نے عرض کیا:

"یا رسول اللہ ان کو اپنے مال و جمال کی اکڑ نے روکا۔ (یا یہ کہ ان کو اپنے کپڑے دیکھنے سے فرصت ہوتی، تو آتے)۔"

حضرت معاذؓ بن جبل بھی قریب ہی موجود تھے، انھوں نے یہ بات سنی تو آگے بڑھ کر عرض پیرا ہوئے:

"یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان، جہاں تک ہم جانتے ہیں کعب بھلا آدمی ہے۔ ہم نے کبھی کوئی بُری بات اس میں نہیں پائی۔"

حضرت معاذؓ کی بات سُن کر حضورؐ خاموش ہوگئے اور کعبؓ کے بارے میں اور کچھ ارشاد نہ فرمایا۔

یہ واقعہ حضرت معاذؓ کی نیک نفسی اور حق گوئی پر دال ہے۔ حضرت کعبؓ فی الواقع بھلے آدمی تھے اور حضورؐ سے کچھ کم عقیدت اور محبت نہیں رکھتے تھے صرف تساہل نے انھیں تبوک میں آنے سے روکا تھا۔ اسی کی پاداش میں انھیں پچاس دن کے مقاطعہ کی سزا بھگتنی پڑی۔ اس کے دوران میں انھوں نے جس صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا، اس کی توقع ایک بھلے آدمی ہی سے کی جا سکتی تھی۔

مسند احمد بن حنبلؒ میں حضرت معاذؓ بن جبل سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ لوگوں کو غزوۂ تبوک کے لیے لے کر نکلے، جب صبح ہوئی تو آپؐ نے اُن کو فجر کی نماز پڑھائی، لوگ نماز پڑھ کر سوار ہوگئے۔ جب سورج طلوع ہوا، تو سب لوگ رات کو جاگنے کی وجہ سے اونگھ رہے تھے، البتہ میں نے اپنی سواری برابر رسول اللہ ﷺ کی سواری کے پیچھے لگائے رکھی۔ دوسرے لوگوں کی سواریاں چرتی رہیں اور چلتی رہیں اور اِدھر اُدھر کے راستوں پر انھیں لے کر منتشر ہوگئیں۔ اسی

دوران میں میری اونٹنی نے جو حضورؐ کی سواری کے پیچھے کبھی چرتی اور کبھی چلتی جارہی تھی، یکا یک ٹھوکر کھائی۔ میں نے اس کو لگام کھینچ کر سنبھالنا چاہا تو وہ اور تیز ہوگئی، یہاں تک کہ اس کی وجہ سے آپؐ کی اونٹنی بھی بدک گئی۔ آپؐ نے اپنے چہرۂ اقدس سے کپڑا اٹھایا، تو دیکھا کہ سارے لشکر میں مجھ سے زیادہ کوئی اور شخص آپؐ کے قریب نہ تھا۔ آپؐ نے آواز دی: ''اے معاذ!''

میں نے عرض کیا: ''یا نبی اللہ! میں حاضر ہوں۔''

آپؐ نے فرمایا، ''اور قریب آجاؤ۔''

میں آپؐ کے اور قریب ہوگیا۔ یہاں تک کہ میری سواری آپؐ کی سواری سے بالکل مل گئی۔ آپؐ نے فرمایا میرا یہ خیال نہیں تھا کہ لوگ مجھ سے اس قدر دور ہوں گے۔ میں نے عرض کیا یارسول اللہ لوگ کچھ اونگھ رہے تھے (اس لیے) ان کی سواریاں چرتی رہیں اور چلتی رہیں اور انھیں لے کر اِدھر اُدھر منتشر ہوگئیں۔ آپؐ نے فرمایا، میں بھی اونگھ رہا تھا —— میں نے جب دیکھا کہ آپؐ مجھ سے خوش ہیں اور موقع بھی تنہائی کا ہے، تو عرض کیا یارسول اللہ اگر اجازت ہو تو ایک بات پوچھوں جس نے مجھے بیمار ڈال دیا ہے اور غم میں مبتلا کر رکھا ہے۔

آپؐ نے فرمایا، ''اچھا جو چاہتے ہو پوچھو۔''

میں نے عرض کیا، ''یارسول اللہ کوئی ایسا کام بتادیجیے جو مجھے جنت میں لے جائے، اس کے علاوہ میں آپ سے کچھ نہیں پوچھوں گا۔''

آپؐ نے فرمایا، ''واہ واہ تم نے بڑی بات پوچھی۔'' اس فقرہ کی آپؐ نے تین بار تکرار کی اور پھر فرمایا، ہاں جس کے لیے اللہ بھلائی کا ارادہ کرے اس کے لیے کچھ اتنی مشکل بھی نہیں۔ کوئی بات آپؐ نے مجھ سے نہیں فرمائی جو تین بار نہ دہرائی ہو، اس خیال سے کہ میں آپ کے ارشاد کو اچھی طرح یاد کرلوں۔ آپؐ نے فرمایا اللہ اور یومِ آخرت پر یقین رکھو، نماز پڑھا کرو، اللہ کی عبادت کیا کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ، یہاں تک کہ اسی حال میں تمھاری موت آجائے۔

میں نے عرض کیا، یارسول اللہ پھر ارشاد فرمائیے، آپ نے میری خاطر تین بار فرمایا۔ اس کے بعد آپؐ نے فرمایا، اگر چاہو تو دین کا سب سے بڑا عمل بتاؤں اور وہ عمل بھی جو اس کی جڑ ہے۔ میں نے عرض کیا، میرے ماں باپ آپ پر قربان، بتایئے —— آپؐ نے فرمایا، دین کی جڑ یہ ہے کہ تو اس بات کی گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور وہ وحدہٗ لاشریک ہے اور محمدؐ اس

کے بندے اور رسول ہیں اور جس عمل سے دین کی بندش مضبوط رہتی ہے وہ نماز پڑھنا اور زکوٰۃ دینا ہے اور اعمالِ دین میں سب سے افضل عمل جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ مجھے اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ میں اس وقت تک جنگ کرتا رہوں جب تک کہ لوگ نماز نہ پڑھیں، زکوٰۃ نہ دیں اور اس بات کی شہادت نہ دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ واحد ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں۔ جب انھوں نے ان باتوں پر عمل کر لیا، تو خود بھی بچ گئے اور اپنی جان و مال کو بھی بچا لیا۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمدؐ کی جان ہے کوئی چہرہ (عمل کرتے کرتے) متغیر نہیں ہوا اور کوئی قدم (سفر کرتے کرتے) غبار آلود نہیں ہوا کسی ایسے عمل میں جس کا مقصد درجاتِ جنت ہوں، فرض نماز کے بعد جہادِ فی سبیل اللہ کے برابر اور نہ بندہ کے میزانِ عمل میں کوئی نیکی اتنی وزنی ثابت ہوئی کہ اس کا جانور جہاد فی سبیل اللہ میں مر گیا یا یہ کہ اس نے کسی کو راہِ خدا میں دے ڈالا۔

رحمتِ عالم ﷺ غزوۂ تبوک سے واپس مدینہ منوّرہ تشریف لائے تو بعض نو مسلم رؤسائے یمن کی طرف سے (جن کا تعلق حمیر کے شاہی خاندان سے تھا) ایک سفارت حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور استدعا کی کہ اپنا کوئی نمائندہ یمن کی امارت پر مامور فرمائیے جو عام تبلیغ کے علاوہ لوگوں کو دینی مسائل بھی سکھائے اور ملک کا نظم و نسق بھی چلائے۔

اس اہم خدمت کے لیے حضورؐ کی نظرِ انتخاب حضرت معاذؓ بن جبل پر پڑی۔ آپؐ نے انھیں بلا بھیجا اور فرمایا کہ میرا ارادہ ہے کہ تمھیں اہلِ یمن پر حاکم بنا کر بھیجوں، وہاں تمھیں گوناگوں مسائل سے سابقہ پڑے گا، یہ بتاؤ جب تمھارے پاس کوئی جھگڑا آئے گا، تو کس طرح فیصلہ کرو گے؟

حضرت معاذؓ نے عرض کیا، کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کروں گا۔

حضورؐ نے پوچھا، اگر تمھیں کتاب اللہ میں کوئی نص صریح فیصلے کے لیے نہ ملے تو پھر کیا کرو گے؟

عرض کیا، سنت رسول اللہ کے مطابق کروں گا۔

حضورؐ نے فرمایا، اگر سنتِ نبوی میں بھی تمھیں کوئی چیز نہ ملے؟

عرض کیا: ''پھر میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور ذرا بھی کوتاہی نہ کروں گا۔''

حضرت معاذؓ کے جوابات سُن کر حضورؐ بہت خوش ہوئے اور ان کے سینے پر اپنا

دستِ مبارک مار کر فرمایا:

''اللہ کا شکر ہے اس نے اللہ کے رسول کے قاصد کو اس چیز کی توفیق دی جس سے اللہ کا رسول راضی ہے۔''

اس کے بعد حضورِ اکرم ﷺ نے اہلِ یمن کے نام ایک فرمان لکھوایا جس میں تحریر تھا کہ میں اپنے لوگوں میں سے بہترین شخص کو تمھارے پاس بھیج رہا ہوں۔ معاذؓ بن جبل اور ان کے ساتھیوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا، صدقات اور جزیہ کی رقمیں ان کے پاس جمع کرنا اور ان کو راضی رکھنا، دیکھنا وہ کہیں تم سے ناخوش نہ ہو جائیں۔

پھر آپؐ نے حضرت معاذؓ بن جبل کو یہ نصیحت فرمائی:

''ملک والوں سے نرم سلوک کرنا سختی نہ کرنا، لوگوں کو خوش رکھنا متنفر نہ کر دینا، باہم مل کر کام کرنا، تم وہاں ایسے لوگ بھی پاؤ گے جو پہلے سے کسی مذہب کے پیرو ہیں، جب ان کے پاس پہنچو تو پہلے ان کو توحید اور رسالت کی دعوت دینا جب وہ اس کو قبول کر لیں تو کہنا اللہ نے تم پر دن رات میں پانچ نمازیں بھی فرض کی ہیں۔ جب وہ ان کو تسلیم کر لیں، تو انھیں بتانا کہ تم پر زکوٰۃ بھی واجب ہے۔ یہ تمھارے امیروں سے لے کر تمھارے غریبوں کو دی جائے گی۔ جب وہ زکوٰۃ بھی منظور کر لیں، تو چن چن کر اچھی چیزیں نہ لے لینا، مظلوموں کی بددُعا سے ڈرتے رہنا کہ اس کے اور اللہ کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں ہے۔''

بعض روایتوں میں ہے کہ حضورؐ نے حضرت معاذؓ بن جبل کو اقصائے یمن کا امیر بنایا۔ اس کا صدر مقام جند تھا اور یمن ادنیٰ یا یمن زیریں کی امارت پر حضرت ابوموسیٰؓ اشعری کو مقرر فرمایا۔ اس میں زبید اور ساحل کے علاقے شامل تھے۔ ایک اور روایت کے مطابق حضورؐ نے یمن کو پانچ حصوں (قسمتوں) پر تقسیم فرمایا تھا اور ان پر پانچ امیر مقرر کیے تھے۔

یہ سب اصحاب اپنے اپنے علاقوں میں خود مختار تھے یا حضرت معاذؓ بن جبل کے ماتحت تھے؟ اس میں اختلاف ہے۔ مولانا سعید انصاری مرحوم نے سیَر انصار میں لکھا ہے کہ حضرت معاذؓ کا مستقر ''جند'' یمن کا صدر مقام تھا اور دوسرے علاقوں کے عمال حضرت معاذؓ کے ماتحت تھے۔ وہ اپنے اپنے علاقوں سے صدقہ اور جزیہ کی رقم وصول کر کے حضرت معاذؓ کے پاس بھیجا کرتے تھے جو خزانہ یا بیت المال کے نگران تھے اور دوسرے علاقوں کے عمال کے فیصلوں کی جانچ پڑتال

بھی کیا کرتے تھے۔ قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوریؒ نے بدر البدور میں لکھا ہے کہ شرائع اسلام کی تعلیم اور قرآن مجید کی عام تدریس، مقدماتِ عامہ کی نگرانی اور جملہ عمّال یمن کے اموال کی فراہمی بھی معاذؓ بن جبل ہی کے متعلق تھی۔

مختلف روایات کو پیشِ نظر رکھ کر یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ جہاں تک تحصیلِ صدقات، خزانہ (بیت المال) اور قضا کا تعلق ہے حضرت معاذؓ بن جبل سارے ملک (یمن) کے حاکمِ اعلیٰ تھے۔ ان کے علاوہ باقی امور میں دوسرے عمّال خود مختار تھے۔ حضورؐ نے ان کو وہی نصیحتیں فرمائی تھیں جن سے حضرت معاذؓ کو سرفراز فرمایا تھا۔

متعدد اربابِ سِیَر نے لکھا ہے کہ حضرت معاذؓ یمن کے لیے تیار ہو کر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؐ نے کچھ دور تک ان کی مشایعت فرمائی۔ ایک روایت میں ہے حضرت معاذؓ اونٹ پر سوار تھے اور حضورؐ پیادہ پا ساتھ چل رہے تھے اور حضرت معاذؓ سے گفتگو کرتے جاتے تھے۔ قیاسِ غالب یہ ہے کہ حضرت معاذؓ حضورؐ کی خواہش اور حکم کے مطابق سواری سے نہیں اترے ہوں گے۔ اثنائے گفتگو میں آپؐ نے فرمایا:

"معاذؓ تم پر قرض بہت ہے، اگر کوئی ہدیہ لائے، تو قبول کر لینا میری طرف سے اجازت ہے۔"

حضرت معاذؓ حضورؐ سے رخصت ہونے لگے، تو آپؐ نے فرمایا:

"شاید اس کے بعد تم مجھ سے نہ مل سکو اور جب مدینہ واپس آؤ تو میری قبر دیکھو۔"

حضرت معاذؓ عاشقِ صادق تھے، حضورؐ کا ارشاد سن کر بے تاب ہو گئے اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ حضورؐ نے فرمایا: "روؤ نہیں۔ اس طرح رونا اچھی بات نہیں۔"

سیّد الانامؐ کا ارشاد سُن کر حضرت معاذؓ خاموش ہو گئے اور بڑے ادب سے حضورؐ کو وداعی سلام کیا۔ آپؐ نے فرمایا: "جاؤ اللہ تمھیں اپنے حفظ و امن میں رکھے، ہر قسم کی مصیبتوں سے بچائے اور جن ّو انس کے شر سے محفوظ رکھے۔"

مسند احمد بن حنبل میں ہے کہ اس موقع پر حضرت معاذؓ نے بڑی حسرت سے مدینہ منوّرہ پر ایک نظر ڈالی اور کہا: "الٰہی میں اہل تقویٰ کو دوست رکھتا ہوں۔"

غرض حضورؐ سے رخصت ہو کر حضرت معاذؓ نہایت سادگی کے ساتھ یمن پہنچے اور پورے

دو برس وہاں مقیم رہ کر اپنے فرائض مفوضہ نہایت عمدگی سے انجام دیتے رہے۔ دوسرے تمام عمال بھی ان کے ساتھ خوش دلانہ تعاون کرتے رہے اور اپنے اپنے علاقوں سے صدقات اور جزیہ وصول کر کے باقاعدگی سے ان کے پاس بھیجتے رہے۔ مؤرخ طبری کا بیان ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے صدقات، جزیہ، غنیمت، خمس وغیرہ کے بارے میں مفصل ہدایات لکھوا کر حضرت معاذؓ کے سپرد کی تھیں اور وہ انھی کے مطابق عمل کرتے تھے۔

(۵)

حضرت معاذؓ ابھی یمن میں ہی تھے کہ ربیع الاوّل ۱۱ھ میں رحمتِ عالم ﷺ نے وصال فرمایا۔ حضرت معاذؓ نے اپنے مطاع اور محبوب ﷺ کی دائمی جدائی کی خبر سنی، تو اُن پر کوہِ الم ٹوٹ پڑا۔ یمن سے دل اچاٹ ہو گیا اور کچھ عرصے بعد امارت کی ذمّے داری سے سبک دوش ہو کر مدینہ منوّرہ واپس آ گئے۔ اس وقت ان کے ساتھ کچھ سامان اور جانور تھے جو انھیں اہلِ یمن نے ھدیتاً دیے تھے۔ حضرت معاذؓ نے ساری چیزیں خلیفۃ الرسولؐ حضرت ابو بکر صدیقؓ کی خدمت میں پیش کر دیں۔ چوں کہ ان کو خود ذاتِ رسالت مآب ﷺ نے ہدیہ لینے کی اجازت مرحمت فرمائی تھی، حضرت ابو بکر صدیقؓ نے یہ چیزیں لینے سے انکار کر دیا اور فرمایا، میں نے یہ سب چیزیں تم کو ہبہ کر دیں۔

حضرت معاذؓ نے مدینہ منوّرہ میں بھی زیادہ عرصہ قیام نہ کیا۔ انھوں نے رحمتِ عالم ﷺ کا یہ ارشاد حرزِ جان بنا رکھا تھا کہ سب سے افضل عمل جہاد فی سبیل اللہ ہے، حضورؐ کی ہم رکابی میں تقریباً سارے غزوات میں شرکت کا شرف حاصل کر چکے تھے، اب سوچا کہ حضورؐ کے وصال کے بعد گھر میں بیٹھ رہنا جوان مردی نہیں ہے، باقی زندگی میدان جہاد میں ہی گزرنی چاہیے، اس وقت شام سے معرکہ آرائی کا آغاز ہو چکا تھا، چناں چہ وہ بھی شام جانے والے مجاہدین میں شامل ہو گئے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ اہل وعیال سمیت اردن (فلسطین) کی سکونت اختیار کر لی اور وہیں سے شام میں داخل ہونے والے اسلامی لشکر میں شامل ہوئے۔ مورّخ واقدی کا بیان ہے کہ سب سے پہلے حضرت معاذؓ نے حضرت عمروؓ بن العاص کی قیادت میں فلسطین کے بعض معرکوں میں دادِ شجاعت دی۔ (فلسطین اس زمانے میں شام ہی کا ایک حصہ تھا اور اس پر ہرقل کا قبضہ تھا) جب رومی فوجوں کو کئی لڑائیوں میں پے بہ پے شکستیں ہوئیں، تو ہرقل نے ایک جرار لشکر بزعمِ خود

مسلمانوں کا قلع قمع کرنے کے لیے روانہ کیا۔ اس لشکر نے اجنادین کے مقام پر پڑاو ڈالا۔ مسلمان فوجیں اس وقت مختلف مقامات پر منتشر تھیں۔ حضرت ابو عبیدہؓ اور خالدؓ بن ولید دمشق میں، حضرت عمروؓ بن العاص فلسطین میں، حضرت یزیدؓ بن ابوسفیانؓ بلقاء میں اور حضرت شرحبیلؓ بن حسنہ بصریٰ میں تھے۔ وہ سب اپنی اپنی فوجیں لے کر اجنادین پہنچ گئے اور متحد ہو کر عیسائیوں کے مقابل ہوئے اس لڑائی میں حضرت معاذؓ بن جبل میمنہ کے افسر تھے۔ انھوں نے لڑائی کے آغاز سے پہلے مسلمانوں سے مخاطب ہو کر کہا:

"مسلمانو! آج اپنی جانوں کو اللہ کے ہاتھ میں بیچ ڈالو، اگر تم نے رومیوں کو مغلوب کرلیا، تو اس ملک کو دارالاسلام بنانے کی داغ بیل پڑ جائے گی اور تم اللہ کی خوش نودی اور اجر عظیم کے مستحق ٹھہرو گے۔"

میدانِ رزم گرم ہوا، تو حضرت معاذؓ نے شروع سے اخیر تک نہایت پا مردی اور شجاعت کا مظاہرہ کیا، یہاں تک کہ دشمن کو عبرت ناک شکست ہوئی اور کثیر مال غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔

جنگِ اجنادین کے بعد مسلمانوں نے دمشق کا محاصرہ کرلیا۔ اثنائے محاصرہ میں ایک دن مسلمانوں کو خبر ملی کہ ہرقل شاہِ روم نے اپنے ایک فوجی افسر ورنجار کو ایک بڑی فوج دے کر دمشق والوں کی مدد کے لیے روانہ کیا ہے۔ حضرت خالدؓ بن ولید نے کچھ فوج دمشق کے باہر چھوڑی اور باقی کو ساتھ لے کر ورنجار کے مقابلے کے لیے بڑھے۔ حضرت معاذؓ بن جبل بھی اسی فوج میں تھے، حضرت خالدؓ نے اس موقع پر بھی انھیں میمنہ کا افسر بنایا۔ لڑائی شروع ہوئی، تو حضرت معاذؓ نے رومیوں کے میمنے پر اس زور کا حملہ کیا کہ اس کو اُلٹ کر رکھ دیا۔ دوسری طرف حضرت خالدؓ بن ولید، ہاشمؓ بن عتبہ، سعیدؓ بن زید اور حضرت ابوعبیدہؓ نے رومی لشکر میں تہلکہ ڈال دیا اور بہت جلد دشمن کے قدم اکھاڑ دیے۔ یہ لڑائی "یومِ مرج الصفر" کے نام سے مشہور ہے۔ اس سے فارغ ہو کر مسلمان پھر دمشق واپس آ گئے اور اس کے محاصرے کو اور سخت کر دیا۔

یہ محاصرہ ابھی جاری تھا کہ ۲۲ر جمادی الاخریٰ ۱۳ھ کو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے سفرِ آخرت اختیار کیا اور حضرت عمرِ فاروقؓ سریر آرائے خلافت ہوئے۔ انھوں نے ایک خط لکھ کر حضرت ابوعبیدہؓ کو صدیق اکبرؓ کی رحلت کی اطلاع دی۔ حضرت ابوعبیدہؓ نے خط لانے والے

قاصد کے سامنے حضرت معاذؓ کو بلا بھیجا۔ انھوں نے صدیقِ اکبرؓ کی وفات کی خبر سن کر انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا اور پھر قاصد سے پوچھا:

''ابوبکرؓ پر اللہ کی رحمت ہو، ان کے بعد مسلمانوں نے کیا فیصلہ کیا؟''

قاصد نے کہا: ''ابوبکرؓ نے عمر (فاروقؓ) کو اپنا جانشین نامزد کیا اور سب مسلمانوں نے ان کی بیعت کرلی۔''

حضرت معاذؓ کے چہرے پر بشاشت پھیل گئی اور انھوں نے فرمایا:

''الحمد للہ مسلمانوں نے بہت اچھا کیا کہ عمرِ فاروقؓ کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔''

اس کے بعد قاصد نے حضرت عمرِ فاروقؓ کی طرف سے چند اکابر صحابہؓ کا حال دریافت کیا۔ ان میں حضرت خالدؓ بن ولید، یزیدؓ بن ابوسفیانؓ اور سعیدؓ بن زید کے علاوہ حضرت معاذؓ بن جبل بھی تھے۔ حضرت ابوعبیدہؓ نے معاذؓ کے بارے میں فرمایا، یہ ویسے ہی ہیں جیسے تم انھیں دیکھ رہے ہو، بلکہ جیسے جیسے ان کی عمر زیادہ ہوتی جاتی ہے، دنیا سے ان کی بے رغبتی بڑھتی جارہی ہے اور آخرت کا اشتیاق زیادہ ہورہا ہے۔

یہ گفتگو ہوچکی، تو حضرت ابوعبیدہؓ نے اپنی اور حضرت معاذؓ بن جبل کی جانب سے حضرت عمرؓ کو ایک خط لکھا جس میں اُمید ظاہر کی کہ وہ (عمرؓ) دوست، دشمن، معزز، حقیر، کم زور اور قوی سب کے ساتھ یکساں سلوک اور انصاف کریں گے اور ہمیشہ خوفِ خدا سے کام لیں گے۔ قاصد کے جانے کے بعد مسلمانوں نے دمشق کے محاصرے کو اور شدید کردیا اور بالآخر ایک خون ریز معرکے کے بعد اس پر پرچم اسلام بلند کردیا۔

دمشق کی شکست نے رومیوں کو سخت برہم کردیا۔ انھوں نے اردن کے شہر بیسان میں جمع ہوکر زور شور سے مقابلے کی تیاری شروع کردی۔ عرب مورّخین کا بیان ہے رومی لشکر کی تعداد چالیس ہزار تھی اور وہ پوری طرح کیل کانٹے سے لیس تھا۔ مسلمانوں نے بھی دمشق پر اپنا قبضہ مستحکم کرکے بیسان کا رُخ کیا اور اس کے سامنے فحل کے مقام پر پڑاؤ ڈالا۔ اس اثنا میں رومیوں نے اس علاقے کے تمام ندی نالوں اور نہروں کے بند توڑ دیے اور فحل اور بیسان کے درمیانی علاقے میں پانی ہی پانی ہوگیا۔ اس طرح بیسان میں جمع ہونے والی رومی فوجیں اپنے آپ کو محفوظ سمجھنے لگیں۔ ایک دن رومیوں نے حضرت ابوعبیدہؓ کے پاس پیغام بھیجا کہ تم لوگ خود

ہی ہمارے ملک سے چلے جاؤ، ورنہ ہم اتنی کثیر فوجوں کے ساتھ تم پر حملہ آور ہوں گے کہ تم میں سے کوئی بچ کر نہ جانے پائے گا۔

اس کے جواب میں حضرت ابو عبیدہؓ نے کہلا بھیجا کہ ملک خدا کا ہے اور عزت ذلت بھی اسی کے ہاتھ میں ہے۔ اگر تم ہم سے لڑو گے، تو ہم بھی ان شاء اللہ آخری دم تک مقابلہ کریں گے۔

مسلمانوں کا استقلال دیکھ کر رومی صلح پر آمادہ ہوئے اور حضرت ابو عبیدہؓ کو کہلا بھیجا کہ اپنا کوئی سفیر ہمارے پاس بھیجو۔ حضرت ابو عبیدہؓ نے حضرت معاذؓ بن جبل کو اس کام کے لیے منتخب کیا۔ ادھر رومیوں نے اسلامی سفیر کو مرعوب کرنے کے لیے ایک زرّیں خیمے میں بڑی شان و شوکت سے دربار آراستہ کیا۔ اس میں ایسے مکلّف اور زرق برق فرش بچھائے کہ ان کو دیکھ کر آنکھیں خیرہ ہوتی تھیں۔ حضرت معاذؓ سپاہیانہ شان سے گھوڑے پر سوار وہاں پہنچے۔ دربار کے قریب پہنچ کر گھوڑے سے اترے اور لبِ فرش پہنچ کر اس کی باگ تھام کر رُک گئے۔ ایک رومی نے آگے بڑھ کر کہا، گھوڑا میں تھام لیتا ہوں آپ ہمارے سرداروں کے پاس دربار کے اندر تشریف رکھیں۔ حضرت معاذؓ نے فرمایا:

''میں ان قیمتی قالینوں اور مکلّف فرشوں پر بیٹھنا گناہ سمجھتا ہوں جو غریبوں پر ظلم کر کے حاصل کیے گئے ہیں۔ یہ چیزیں دنیا کی زیب و زینت ہیں۔ خدا نے ہمیں دنیا سے بے رغبت رہنے کا حکم دیا ہے اور اسراف اور تکبر سے منع کیا ہے، اس لیے میں زمین پر ہی بیٹھوں گا۔''

یہ کہہ کر گھوڑے کی باگ تھامے ہوئے زمین پر بیٹھ گئے۔ رومیوں نے کہا:

''اگر آپ دربار میں بیٹھتے تو یہ آپ کے لیے عزّت و شرف کا باعث ہوتا، لیکن افسوس آپ کو خود اپنی عزّت کا خیال نہیں ہے اور آپ غلاموں کی طرح زمین پر بیٹھ گئے۔''

یہ سن کر حضرت معاذؓ کو جلال آ گیا، وہ گھٹنوں کے بل کھڑے ہو گئے اور بڑے پُر جوش لہجے میں فرمایا:

''تم جس اعزاز اور شرف کی طرف مجھے بلا رہے ہو، وہ تم نے اپنی قوم پر ظلم کر کے حاصل کیا ہے۔ یہ عزّت اور شرف تمھیں ہی مبارک ہو، مجھے اس کی پروا نہیں۔ تم کہتے ہو میں غلاموں کی طرح زمین پر بیٹھ گیا تو فی الواقع میں اللہ تعالیٰ کا ایک ناچیز بندہ اور غلام ہوں۔ میرا رب ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو اس کی رضا کے لیے تواضع اور انکسار اختیار کرتے ہیں۔''

رومی ان کی باتیں سُن کر حیران رہ گئے اور پوچھا: ''کیا مسلمانوں میں سب سے افضل آپ ہی ہیں؟'' حضرت معاذؓ نے جواب دیا: ''معاذ اللہ میرے لیے یہی کافی ہے کہ سب سے بروں میں نہ شمار کیا جاؤں۔'' ایک دوسری روایت میں ہے کہ انھوں نے فرمایا: ''یہی بہت ہے کہ میں سب سے بدتر ہوں۔'' رومیوں نے اب ان سے سوال کیا: ''تم ہمارے ملک میں کیوں آئے ہو اور ہم سے کیا چاہتے ہو۔ حبش کا ملک تم سے قریب ہے تم نے اس پر حملہ نہیں کیا، ایران پر ایک عورت حکمران ہے تم نے اُدھر کا رُخ بھی نہیں کیا، لیکن ہمارے ملک پر چڑھ دوڑے، تمھیں معلوم نہیں کہ ہمارے شہنشاہ کے پاس لاتعداد فوجیں اور وسائل ہیں اور وہ تمھیں پیس کر رکھ سکتا ہے۔ ہمارے کسی شہر یا قلعہ پر قبضہ کر کے تم یہ سمجھتے ہو کہ شہنشاہ کو مغلوب کر لو گے، تو یہ تمہاری خام خیالی ہے۔ پھر جب تم ہمارے نبی اور کتاب پر ایمان رکھتے ہو، تو تمھارا ہم سے لڑنا کیوں کر روا ہے؟''

حضرت معاذؓ نے ان کے جواب میں فرمایا: ''سب سے پہلے میں تمھیں اسلام کی طرف بلاتا ہوں تم اس کو قبول کر لو، ہماری طرح قبلہ رُو ہو کر نماز پڑھو، شراب پینا چھوڑ دو، خنزیر کے گوشت سے پرہیز کرو اور ہمارے رسولؐ کے طریقوں پر چلو، پھر ہم تم دینی بھائی بن جائیں گے۔ اگر تم کو یہ دعوت قبول کرنے سے انکار ہے، تو جزیہ دینا قبول کرو۔ اگر یہ بھی منظور نہیں، تو پھر ہمارے تمھارے درمیان تلوار فیصلہ کرے گی۔ تم نے جو یہ کہا ہے کہ تمھارے شہنشاہ کی فوجوں کی تعداد زمین کے ذرّوں کے برابر ہے، تو ہم کو قلّت اور کثرت کی پروا نہیں۔ ہم اپنی تعداد اور طاقت پر بھروسا نہیں رکھتے بلکہ ہمارا بھروسا صرف اللہ عزّ وجل پر ہے۔ اس کے حکم سے کتنی ہی چھوٹی جماعتوں نے اپنے سے کئی گنا بڑی فوجوں پر فتح حاصل کی، اللہ تعالیٰ نے ہمیں بتایا ہے:

كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِإِذْنِ اللّٰهِ

''بارہا بہت سی چھوٹی جماعتیں بڑی بڑی جماعتوں پر خدا کے حکم سے غالب آ گئیں۔''

تم کہتے ہو تمھارا شہنشاہ تمھاری جان اور مال کا مالک ہے، لیکن ہم نے جس کو امیر بنایا ہے وہ ہمارے جیسا ہی ایک آدمی ہے، وہ جب تک ہماری دینی کتاب پر عمل کرتا ہے اور ہمارے نبیؐ کے طریقوں پر چلتا ہے، ہم اسے اپنا حاکم مانتے ہیں، لیکن اگر وہ اپنا طریقہ بدل دے تو ہم اس کو معزول کر دیں، اگر چوری کرے تو اس کا ہاتھ کاٹ ڈالیں، زنا کرے تو اُس کے دُرّے لگائیں۔ اگر وہ کسی کو ناحق چوٹ لگائے تو اس کو بھی ویسی ہی چوٹ لگائی جائے۔ نہ وہ ہم سے

چھپ کر رہتا ہے نہ اپنے آپ کو ہم سے بڑھ کر سمجھتا ہے اور نہ وہ مالِ غنیمت میں ہم سے زیادہ حصہ پاتا ہے۔ بے شک ہم تمھارے نبی کو برحق مانتے ہیں، لیکن تمھاری طرح ان کو خدا کا بیٹا نہیں کہتے۔ تم خدا کے بارے میں جو ناگفتنی کہتے ہو، وہ اس سے پاک ہے، نہ اس کو کسی نے جنا اور نہ اس نے کسی کو جنا۔"

رومیوں نے حضرت معاذ کی باتیں سن کر کہا:

"بلقاء کا علاقہ اور اردن کا وہ حصہ جو تمھارے ملک سے متصل ہے، وہ لے لو اور ہمارے ملک سے نکل کر ایران کا رُخ کرو۔"

حضرت معاذؓ نے ان کی پیش کش ردّ کر دی اور اٹھ کر چلے آئے۔ اس کے بعد رومیوں نے حضرت ابو عبیدہؓ سے براہِ راست رابطہ قائم کیا اور پہلی پیش کش پر یہ اضافہ کیا کہ اسلامی فوج کے ہر فرد کو دو دو اشرفیاں دی جائیں گی۔ حضرت ابو عبیدہؓ نے یہ پیش کش بھی ٹھکرا دی۔ اب فریقین نے لڑائی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ذو قعدہ ۱۴ھ میں دونوں فوجوں کے درمیان گھمسان کا رن پڑا جس میں عیسائیوں کو سخت ہزیمت ہوئی۔ یہ لڑائی "معرکۂ فحل" کے نام سے مشہور ہے۔ حضرت معاذؓ بن جبل اس موقع پر بھی میمنہ کے افسر تھے۔ معمول کے مطابق وہ خود بھی کمال بہادری سے لڑے اور اپنی ماتحت فوج کو بھی بڑی چابک دستی سے لڑایا۔ اس معرکہ کے بعد اردن کے تمام اہم شہر اور مقامات بآسانی فتح ہو گئے۔

(۶)

اردن کی تسخیر کے بعد مسلمانوں نے حمص، حماۃ شیزر، معرۃ النعمان، لاذقیہ اور کئی دوسرے شہر یکے بعد دیگرے فتح کر لیے۔ اُن کی مسلسل پیش قدمی نے ہرقل کو سخت غضب ناک کر دیا اور اس نے تہیّہ کر لیا کہ اپنے سارے وسائل بہ روئے کار لا کر مسلمانوں کو شام سے باہر ڈھکیل دے گا۔ چناں چہ اس نے کثیر التعداد فوجیں جمع کیں اور ان کو ہر قسم کا سامانِ حرب وضرب دے کر مسلمانوں پر کاری ضرب لگانے کے لیے روانہ کیا۔ رومی لشکر نے دریائے یرموک کے کنارے وقوصہ کے میدان میں پڑاؤ ڈالا اور مسلمانوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے پَر تولنے لگا۔ باختلافِ روایت رومی لشکر کی تعداد دو لاکھ سے دس لاکھ کے درمیان تھی۔ حضرت ابو عبیدہؓ نے بھی مقابلے کی تیاری کی اور شام میں مختلف مقامات پر بکھری ہوئی تمام فوجوں کو جمع کر کے وادیِ یرموک

میں پہنچ گئے۔ ساتھ ہی حضرت عمرؓ کو خط لکھ کر دار الخلافہ سے بھی کمک طلب کر لی۔ بعض روایتوں میں ہے کہ رومیوں کے اجتماع کی خبر سُن کر حضرت ابوعبیدہؓ نے اہل الرائے صحابہؓ سے مشورہ کیا تو کچھ نے خیال ظاہر کیا کہ تمام اسلامی فوجیں شام خالی کر کے عرب کی سرحد پر چلی جائیں اور جب دار الخلافہ سے کمک پہنچ جائے، اس وقت دشمن کے مقابل ہوں۔ حضرت معاذؓ بن جبل نے اس رائے کی سخت مخالفت کی اور کہا کہ جن علاقوں کو اللہ نے ہمارے لیے فتح کر دیا ہے ان کو خالی کرنا تباہی کے مترادف ہوگا اور ان کو دوبارہ فتح کرنے میں سخت دشواری کا سامنا کرنا پڑے گا۔ حضرت ابوعبیدہؓ نے ان کی رائے سے اتفاق کیا اور صرف تیس چالیس ہزار مجاہدین کے ساتھ دشمن کے ٹڈی دل سے پنجہ آزمائی کے لیے تیار ہو گئے۔ رجب ۱۵ھ میں یرموک (یا وقوصہ) کے میدان میں رومیوں اور مسلمانوں کے درمیان ایسی خون ریز جنگ ہوئی کہ اس سے پہلے کبھی پیش نہ آئی تھی۔ اس جنگ نے بڑی حد تک شام کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ حضرت معاذؓ بن جبل نے (جو پورے میمنہ یا اس کے ایک حصہ کے سالار تھے) اس لڑائی میں شروع سے اخیر تک نہایت استقلال اور ہمت کے ساتھ دادِ شجاعت دی۔ ان کے نوجوان فرزند عبدالرحمٰنؓ باپ کے پہلو بہ پہلو جان بازی کا حق ادا کرتے رہے۔

علامہ شبلی نعمانیؒ نے ''الفاروق'' میں لکھا ہے کہ ایک موقع پر عیسائیوں نے اس زور شور سے حملہ کیا کہ مسلمانوں کا میمنہ ٹوٹ کر فوج سے علیحدہ ہو گیا اور نہایت بے ترتیبی سے پیچھے ہٹا۔ ہزیمت یافتہ افراد ہٹتے ہٹتے عورتوں کے خیمہ گاہ تک آ گئے۔ عورتوں کو یہ حالت دیکھ کر سخت غصہ آ گیا، خیمہ کی چوبیں اُکھاڑ لیں اور پکاریں کہ مردو ادھر آئے تو چوبوں سے تمھارا سر توڑ دیں گے۔

حضرت معاذ بنؓ جبل نے یہ کیفیت دیکھی، تو گھوڑے سے کود پڑے اور کہا میں تو پیدل لڑتا ہوں، لیکن کوئی بہادر اس گھوڑے کا حق ادا کر سکے، تو گھوڑا حاضر ہے۔ ان کے بیٹے نے کہا، یہ حق میں ادا کروں گا، کیوں کہ میں سوار ہو کر اچھا لڑ سکتا ہوں غرض دونوں باپ بیٹے فوج میں گھسے اور اس دلیری سے جنگ کی کہ مسلمانوں کے اُکھڑے ہوئے پاؤں سنبھل گئے۔

حضرت معاذؓ بن جبل اور دوسرے مجاہدین کی سرفروشی کا نتیجہ یہ نکلا کہ عیسائیوں کو کمر توڑ شکست ہوئی اور وہ تقریباً ایک لاکھ آدمی میدانِ جنگ میں کٹوا کر بھاگ نکلے۔

جنگِ یرموک کے بعد مسلمانوں کی فتوحات کا سیلاب قنسرین، حلب، انطاکیہ وغیرہ

میں سے گزرتا ہوا بیت المقدس (یروشلم) کے سامنے جا کر رُکا۔ اہلِ شہر محصور ہو کر بیٹھ گئے۔ کچھ مدت بعد انھوں نے حضرت ابو عبیدہؓ کو پیغام بھیجا کہ ہم صلح کرنا چاہتے ہیں، لیکن شرط یہ ہے کہ مسلمانوں کا خلیفہ خود یہاں آ کر ہم سے شرائط صلح طے کرے۔ حضرت ابو عبیدہؓ نے مشورہ کے لیے حضرت معاذؓ کو اردن سے بلا بھیجا۔ انھوں نے رائے دی کہ پہلے اہلِ شہر سے صلح کا پختہ عہد کریں، ورنہ امیر المومنین یہاں تشریف لائیں اور یہ لوگ مکر گئے، تو یہ بہت بری بات ہوگی اس مشورہ کے مطابق حضرت ابو عبیدہؓ نے اہلِ شہر سے صلح کا پختہ عہد لیا اور پھر حضرت عمر فاروقؓ کو خط لکھ کر بیت المقدس تشریف لانے کی درخواست کی۔ امیر المومنین نے یہ درخواست قبول کر لی اور چند مہاجرین اور انصار کی معیت میں نہایت سادگی کے ساتھ بیت المقدس تشریف لائے۔ شہر کے اکابر بلا تامّل ان کی خدمت میں حاضر ہو گئے اور فریقین کے مابین معاہدۂ صلح طے پا گیا۔

بیت المقدس کے اثنائے قیام میں ایک دن نماز کے وقت حضرت عمر فاروقؓ نے سیدنا بلالؓ سے اذان دینے کی خواہش ظاہر کی۔ انھوں نے کہا:

> ’’میں نے عہد کر لیا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد اذان نہیں دوں گا، لیکن آج صرف اس وقت کی نماز کے لیے آپ کا ارشاد بجا لاتا ہوں۔‘‘

حضرت بلالؓ نے اذان دینی شروع کی، تو صحابہؓ کو حضورؐ کا عہدِ مبارک یاد آ گیا اور وہ زار زار رونے لگے۔ حضرت معاذؓ کو بھی اپنے آقا و مولاؐ کی یاد نے بے تاب کر دیا اور روتے روتے ان کی ہچکی بندھ گئی۔

(۷)

۱۸ھ میں مصر، عراق اور شام میں طاعون (پلیگ) کی خوف ناک وبا پھوٹ پڑی جو ’’طاعونِ عمواس‘‘ کے نام سے مشہور ہے۔ حضرت معاذؓ بن جبل اس زمانے میں سپہ سالارِ شام حضرت ابو عبیدہؓ بن الجراح کے ساتھ شام میں مقیم تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت ابو عبیدہؓ کو وبا زدہ علاقے سے ہٹ آنے کی ترغیب دی۔ لیکن انھوں نے اس بنا پر معذرت کر دی کہ یہ تقدیرِ الٰہی سے بھاگنے کے مترادف ہوگا۔ ہزاروں مجاہدین اس وبا میں مبتلا ہو کر فوت ہو گئے۔ یہاں تک کہ خود حضرت ابو عبیدہؓ بھی اس میں مبتلا ہو گئے۔ جب مرض نے شدّت اختیار کی تو انھوں نے حضرت معاذؓ بن جبل کو بلا کر اپنا جانشین مقرر فرمایا۔ مسند احمد بن حنبل میں ہے کہ اس

موقعے پر حضرت ابو عبیدہؓ نے مسلمانوں کو بلا کر فرمایا کہ لوگو! یہ وبا تمہارے پروردگار کی رحمت، تمہارے نبیؐ کی دعوت اور تم سے قبل کے نیکوں کی موت ہے اور اب ابو عبیدہ بھی اپنے رب سے اس سعادت میں حصہ پانے کا متمنی ہے...

ابھی ان کا خطبہ جاری تھا کہ نماز کا وقت آ گیا۔ حضرت ابو عبیدہؓ نے حضرت معاذؓ کو حکم دیا کہ وہی نماز پڑھائیں۔ اِدھر نماز ختم ہوئی، اُدھر حضرت ابو عبیدہؓ کی روح ملاءِ اعلیٰ کی طرف پرواز کر گئی۔ حضرت معاذؓ اور حضرت ابو عبیدہؓ میں بہت محبت تھی، اس لیے حضرت معاذؓ اپنے مشفق اور محبوب دوست کی وفات پر غم سے نڈھال ہو گئے۔ انھوں نے مسلمانوں کو جمع کر کے یہ خطبہ دیا:

> ''لوگو! گناہوں سے توبہ کرو۔ جو بندہ سچے دل سے توبہ کرتا ہے۔ اللہ اس کو بخش دیتا ہے، جو شخص مقروض ہو وہ قرض کا بار اپنے سر سے اتار دے، کیوں کہ قرض آخرت میں مصیبت کا باعث بنے گا، جو مسلمان اپنے کسی بھائی سے خفا ہے، وہ اس سے صلح کر لے، کیوں کہ کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے بھائی سے تین دن سے زیادہ سلام و کلام بند رکھے۔ یہ اللہ کے نزدیک بڑا گناہ ہے۔ مسلمانو! ایک ایسا شخص تم سے جدا ہو گیا ہے جو اخلاق و محاسن کے لحاظ سے اپنی نظیر آپ تھا، وہ سب سے زیادہ درگزر کرنے والا تھا، مسلمان کا سب سے زیادہ خیر خواہ تھا، سب سے بڑھ کر غل و غش سے پاک تھا، اس کے لیے رحمت کی دعائیں کرو، اب اس جیسا کوئی سردار تمھیں نہیں ملے گا۔''

اس کے بعد حضرت معاذؓ نے جنازہ کی نماز پڑھائی اور حضرت عمروؓ بن العاص اور ضحاکؓ بن قیس کے ساتھ مِل کر امین الامّت کو سپردِ خاک کر دیا۔ اب حضرت معاذؓ سپہ سالار تھے۔ حضرت عمروؓ بن العاص نے انھیں مشورہ دیا کہ یہاں سے کسی دوسری جگہ منتقل ہونا بہتر ہوگا۔ حضرت معاذؓ اس پر برہم ہو گئے اور منبر پر چڑھ کر خطبہ دیا جس میں وہی الفاظ دُہرائے جو حضرت ابو عبیدہؓ نے اپنی ذات سے پہلے کہے تھے۔ مسند احمد بن حنبل کے مطابق انھوں نے ان الفاظ پر یہ اضافہ بھی کیا کہ لوگوں میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ مسلمان شام کو فتح کر لیں گے، پھر ایک بیماری پیدا ہوگی جو پھوڑے کی طرح جسم کو زخمی کرے گی جو اس میں مرے گا وہ شہید ہوگا اور اس کا نامۂ اعمال پاک ہو جائے گا۔ خداوندا اگر میں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ حدیث سنی ہے تو یہ رحمت میرے گھر میں بھیج اور مجھ کو اس میں کافی حصہ دے۔

خطبہ کے بعد خیمہ میں آئے، تو اکلوتے فرزند (عبدالرحمٰنؓ) کو بیمار پایا۔ بڑے ضبط اور حوصلے سے انھیں نصیحت کی:

”اے بیٹے یہ خدا کی طرف سے ہے، دیکھنا اس میں کوئی شک تمھارے دل میں نہ آئے۔“

بیٹے نے جواب دیا: ”اللہ نے چاہا تو آپ مجھے صابروں میں پائیں گے۔“ یہ کہہ کر پیکِ اجل کو لبیک کہا۔ اس سے پہلے حضرت معاذؓ کی دو بیویاں بھی اسی بیماری میں فوت ہو چکی تھیں، اب اکلوتے فرزند کی وفات کے بعد بالکل تنہا رہ گئے، لیکن انھیں بھی بہت جلد خالقِ حقیقی کی طرف سے بلاوا آ پہنچا، داہنے ہاتھ کی انگشتِ شہادت میں پھوڑا نکلا۔ شدّت کی تکلیف تھی، لیکن وہ خوش تھے اور فرماتے تھے کہ تمام دنیا کی دولت اس تکلیف کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ جب درد حد سے بڑھ جاتا تو بے ہوش ہو جاتے۔ ہوش آتا، تو فرماتے الٰہی تو جانتا ہے کہ میں تجھ سے نہایت محبت رکھتا ہوں، اس لیے مجھ کو اپنے غم میں غمگین کر، پھر غش آ جاتا۔ جب افاقہ ہوتا تو ایسے ہی کلمات زبان سے نکلتے۔ وفات کی رات کو بہت بے چین تھے اور بار بار پوچھتے تھے، دیکھو کیا صبح ہو گئی، لوگ کہتے تھے ابھی نہیں ہوئی۔ جب رات گزر گئی اور انھیں بتایا گیا کہ اب صبح ہو گئی ہے تو فرمایا، میں اس رات سے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں جس کی صبح جہنم کی طرف لے جائے۔ مرحبا ہو موت کے لیے، مرحبا ہو اس زیارت کرنے والے کے لیے جو کچھ مدّت کے لیے اپنے حبیب سے جدا تھا اور اب فاقہ کی حالت میں اس کے پاس آ رہا ہے۔ الٰہی بے شک میں تجھ سے ڈرا کرتا تھا، آج میں تجھ سے مغفرت اور رحمت کی اُمید رکھتا ہوں۔ الٰہی تو خوب جانتا ہے کہ میں نہ تو دنیا کو دوست رکھتا تھا اور نہ اس لیے دنیا میں زیادہ ٹھہرنے کو کہ درخت بوؤں اور نہریں کھودوں، لیکن دوپہر کی پیاس کو دوست رکھتا تھا اور اس بات کو کہ ذکر کے حلقوں میں علماء کے پاس بیٹھوں۔

حضرت معاذؓ کے دو شاگرد عمرو بن میمونؒ اور یزید بن عمیرہؒ بیان کرتے ہیں کہ حضرت معاذؓ کی وفات کا وقت قریب آیا تو ہم رونے لگے۔ حضرت معاذؓ نے پوچھا، تم کیوں رو رہے ہو، ہم نے عرض کیا اس علم پر روتے ہیں جو آپ کے ساتھ چلا جائے گا۔ حضرت معاذؓ نے فرمایا، روؤ نہیں، علم اور ایمان قیامت تک موجود رہیں گے۔ جو ان کی جستجو کرے گا، پا لے گا۔ میرے بعد ان چار آدمیوں کے پاس علم تلاش کرنا، عبداللہؓ بن مسعود، ابوالدرداءؓ، سلمان فارسیؓ اور عبداللہؓ بن سلام۔

وفات کا وقت بالکل قریب پہنچا تو حضرت معاذؓ پر سخت گریہ طاری تھا، لوگوں نے عرض کیا، آپ رسول اللہ ﷺ کے محبوب صحابی ہیں، مجاہد فی سبیل اللہ ہیں، آپ کا سینہ قرآن حکیم کا مخزن ہے، آپ کیوں روتے ہیں؟ فرمایا، میں نہ موت کے ڈر سے روتا ہوں اور نہ دنیا چھوڑنے کا مجھے کوئی غم ہے۔ اس خیال سے روتا ہوں کہ معلوم نہیں آخرت میں میرا کیا حال ہوگا۔ اسی حالت میں روحِ مطہرّ عالمِ بالا کو پرواز کرگئی۔ اس وقت صرف چھتیس برس کی عمر تھی۔ ان کے ایک ہی فرزند تھے جو ان کے سامنے وفات پا گئے تھے، اس لیے اُن کے اُٹھ جانے سے خاندانِ اُوسؔی کا خاتمہ ہوگیا۔ ان کی تدفین دریائے اردن کے کنارے مشہور شہر بیسان میں ہوئی۔ بیان کیا جاتا ہے اسی شہر کے قریب وہ مقام واقع ہے جہاں سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر اُٹھائے گئے تھے۔ حضرت معاذؓ کے علاوہ اس شہر کو اور بھی بہت سے جلیل القدر صحابہ کا مدفن ہونے کا شرف حاصل ہے۔

اہلِ سِیَر نے حضرت معاذؓ کے حسنِ ظاہری کی بے حد تعریف کی ہے، میدہ وشہاب رنگ، طویل قامت، روشن سیاہ آنکھیں، ابرو پیوستہ، گھونگھریالے بال، دانت ایسے صاف اور چمکدار کہ بات کرتے وقت منہ سے نور کی شعاعیں پھوٹتی معلوم ہوتی تھیں، آواز میں شہد سے زیادہ شیرینی تھی، جو ان کی مجلس میں بیٹھتا ان ہی کا ہوکر رہ جاتا تھا۔

(۸)

سیدنا حضرت معاذؓ بن جبل کا شمار اُن عظیم المرتبت صحابہ کرامؓ میں ہوتا ہے جن کو علم و فضل کے اعتبار سے اساطینِ اُمت تسلیم کیا جاتا ہے۔ وہ سالہا سال تک نبوّت کے سرچشمۂ فیض سے سفر و حضر اور خلوت و جلوت میں براہِ راست سیراب ہوئے تھے۔ خود حضور نبی کریم ﷺ ان کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ میرے صحابہ میں حلال و حرام کے سب سے بڑے عالم معاذؓ بن جبل ہیں، وہ حضورؐ کے سامنے ہی مسندِ ارشاد پر متمکن ہو چکے تھے۔ اور خود دانائے کونین ﷺ نے ان کے تفقہ فی الدین اور معرفتِ الٰہی پر اظہارِ خوشنودی فرمایا تھا۔ حضرت انسؓ بن مالک سے روایت ہے کہ ایک دن حضرت معاذؓ بن جبل رسولِ اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؐ نے ان سے دریافت کیا، اے معاذ، صبح کیسی گزری؟ عرض کیا، یارسول اللہ میری صبح ایمان کے ساتھ ہوئی۔ آپؐ نے فرمایا، ہر قول کا ایک مصداق ہوتا ہے، تمہارے اس قول کا کیا مصداق ہے؟

حضرت معاذؓ نے کہا، اے اللہ کے رسولؐ میری کوئی صبح ایسی نہیں گزری جس میں مجھے یہ خیال نہ ہوا ہو کہ میں شام نہ کرسکوں گا۔ اور میری کوئی شام ایسی نہیں گزری جس میں مجھے یہ خیال نہ ہوا ہو کہ میں صبح نہ کرسکوں گا اور کوئی قدم میں نے ایسا نہیں رکھا جس میں مجھے یہ خیال نہ ہوا ہو کہ دوسرا قدم نہ رکھ سکوں گا اور گویا کہ میں ان تمام امتوں کی طرف دیکھ رہا ہوں جو گھٹنوں کے بل بیٹھی ہوئی ہیں اور جنھیں ان کے اعمال نامے کی طرف بلایا جا رہا ہے اور ان کے ساتھ ان کے نبی ہیں اور اُن اُمتوں کے ساتھ اُن کے وہ بُت ہیں جن کی وہ اللہ کے سوا عبادت کرتے تھے گویا میں اہل جنت کے ثواب کی طرف دیکھ رہا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، ''تو معرفت کو پہنچ گیا، بس اسی پر جما رہ۔''

حضرت معاذؓ عہدِ رسالت میں ہی قرآن حفظ کر چکے تھے اور علومِ قرآن میں ان کو کمال درجے کی دسترس حاصل ہوگئی تھی۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضورؐ فرمایا کرتے تھے کہ قرآن چار آدمیوں سے حاصل کرو۔ عبد اللہؓ بن مسعود، سالمؓ مولیٰ ابی حذیفہؓ، ابی بنؓ کعب اور معاذؓ بن جبل سے۔ ایک اور حدیث میں وارد ہوا ہے کہ قیامت کے دن معاذؓ بن جبل علماء کے امام ہوں گے۔ چناں چہ اسی بنا پر انھیں امام العلماء کہا جاتا ہے۔

حضرت عمرِ فاروقؓ فرمایا کرتے تھے معاذؓ جیسا شخص پیدا کرنے سے عورتیں عاجز ہیں۔ سفر شام میں جابیہ میں خطبہ دیتے ہوئے فرمایا: ''جسے فقہ سیکھنا ہو وہ معاذؓ کے پاس جائے۔'' ایک اور موقع پر فرمایا ''اگر معاذؓ نہ ہوں تو عمر ہلاک ہو جائے۔'' ایک روایت میں ہے کہ وفات سے پہلے حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا کہ اگر اس وقت معاذؓ زندہ ہوتے تو میں ان کو خلیفہ بناتا۔ فقیہہ الامت حضرت عبد اللہؓ بن مسعود فرمایا کرتے تھے کہ معاذؓ بن جبل ان معنوں میں ایک امت تھے کہ وہ لوگوں کو بھلائی سکھاتے تھے اور ان معنوں میں قانت کہ ہمیشہ اللہ اور اللہ کے رسول کی اطاعت کرتے تھے۔ حضرت عبد اللہؓ بن عمرؓ کے نزدیک حضرت معاذؓ عقلائے امت میں سے تھے۔

اس علم وفضل کے باوجود حضرت معاذؓ بن جبل سے صرف ۱۵۷ احادیث مروی ہیں اس کا سبب یہ ہے کہ وہ روایتِ حدیث میں بے حد احتیاط سے کام لیتے تھے۔ ان کے رواۃ میں حضرت عمر فاروقؓ، حضرت انسؓ بن مالک، حضرت جابرؓ بن عبد اللہ، حضرت عبد اللہ بن عباسؓ، حضرت عبد اللہ بن عمرؓ، حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ، حضرت ابو امامہ باہلیؓ اور حضرت ابو قتادہؓ جیسے اکابر شامل ہیں۔

مشہور تلامذہ میں سے چند کے نام یہ ہیں۔ ابوثعلبہ خشنیؓ، ابومسلم خولانیؒ، اسود بن ہلالؒ، ابن ابی اوفیؓ، ابوعبداللہ صنابحیؒ، مسروقؒ، ابوادریس خولانیؒ، خبادہ بن ابی امیہ، اسلم مولیٰ حضرت عمرؓ۔

بہت سی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ رحمتِ عالم ﷺ حضرتِ معاذؓ کو لطف خاص کا مستحق جانتے تھے۔ حضورؐ خود بھی انھیں تعلیم دیتے رہتے تھے اور وہ بھی حضورؐ سے اکتسابِ فیض کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔

صحیحین میں حضرت معاذؓ سے روایت ہے کہ میں ایک دن گدھے پر رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سوار تھا اور آپ کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا، میرے اور آپؐ کے درمیان صرف زین کی لکڑی تھی۔ آپؐ نے فرمایا: ''معاذ، تو جانتا ہے کہ بندوں پر خدا کا اور خدا کا بندوں پر کیا حق ہے؟'' میں نے عرض کیا: اللہ اور اس کا رسولؐ ہی اس سے واقف ہیں۔'' آپؐ نے فرمایا: بندوں پر خدا کا یہ حق ہے کہ وہ صرف اسی کی عبادت کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں اور خدا پر بندوں کا یہ حق ہے کہ جو شخص اس کی ذات میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائے، وہ اس کو عذاب نہ دے۔'' میں نے عرض کیا: ''یارسول اللہ! کیا میں لوگوں کو یہ بشارت سُنا دوں کہ وہ سُن کر خوش ہو جائیں؟'' آپؐ نے فرمایا: ''نہیں، ایسا کرنے سے وہ سُست ہو جائیں گے اور عمل کرنا چھوڑ دیں گے۔'' امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ کہتے ہیں کہ حضرتِ معاذؓ نے وفات سے کچھ دیر پہلے اس حدیث کو بیان کیا۔

حضرت معاذؓ عہدِ رسالت میں ایک مرتبہ باختلافِ روایت کچھ دن کے لیے شام یا یمن تشریف لے گئے۔ وہاں دیکھا کہ نصاریٰ اپنے بزرگوں کو سجدے کرتے ہیں۔ ان سے پوچھا کہ ایسا کیوں کرتے ہو؟ انھوں نے کہا: ''ہم سے پہلے نبیوں کو سلام کرنے کا یہی طریقہ تھا۔'' واپس آکر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یہ واقعہ بیان کر کے پوچھا: ''یارسول اللہ! کیا ہم بھی آپ کو سجدہ نہ کریں؟''

حضورؐ نے فرمایا: ''نہیں، ان لوگوں نے جس طرح اپنی کتابوں میں تحریف کی ہے، اسی طرح اپنے نبیوں پر تہمت لگائی ہے۔ اگر کسی انسان کو سجدہ کرنا روا ہوتا، تو میں عورت سے کہتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔ اللہ تعالیٰ نے ہم کو اس سے بہتر سلام کا طریقہ تعلیم فرمایا ہے۔ یہ ایک دوسرے کو السّلام علیکم کہنا ہے جو اہلِ جنت کا طریقہ ہے۔''

صحیح بخاری میں حضرت جابرؓ بن عبداللہ سے روایت ہے کہ حضرتِ معاذؓ اپنے محلے کی

مسجد میں بنو سلمہ کے لوگوں کو نماز پڑھایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے عشاء کی نماز میں سورۂ بقرہ پڑھی۔ ایک صاحب نے (جو دن بھر کام کرنے کی وجہ سے سخت تھکے ہوئے تھے، ان کی لمبی قرأت کی وجہ سے) علیحدہ ہو کر ہلکی سی نماز پڑھ لی۔ حضرت معاذؓ کو اطلاع ملی، تو انھوں نے فرمایا کہ یہ شخص منافق ہے۔ ان صاحب کو حضرتِ معاذؓ کی بات سخت ناگوار گزری۔ وہ فوراً حضورؐ کی خدمت میں پہنچے اور عرض کی:

> ''یارسول اللہ! ہم محنت کش ہیں، اپنے ہاتھوں سے مزدوری کرتے ہیں اور اونٹوں کے ذریعے سے پانی بھرتے ہیں۔ آج معاذؓ نے ہمیں نماز پڑھائی اور اس میں سورۂ بقرہ شروع کردی، اس لیے میں نے اپنی نماز علیحدہ پڑھ لی۔ اس پر معاذؓ خیال کرتے ہیں کہ میں منافق ہو گیا۔''

حضرت معاذؓ بارگاہِ نبوی میں حاضر تھے۔ حضورؐ نے ان سے مخاطب ہو کر تین بار فرمایا: یَا مُعَاذ اَفَتَافٌ اَنتَ ۔ اے معاذ! کیا فتنہ برپا کروگے؟ اس کے بعد فرمایا صرف وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا اور سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلٰی جیسی (چھوٹی) سورتیں پڑھ لیا کرو (کیوں کہ مقتدیوں میں بوڑھے، ضعیف اور اربابِ حاجت سبھی قسم کے لوگ ہوتے ہیں)۔

ایک مرتبہ حضورؐ لوگوں کو نماز پڑھا رہے تھے۔ حضرت معاذؓ اس وقت پہنچے جب لوگ قعدہ میں تھے۔ حضرت معاذؓ قعدہ میں جماعت کے ساتھ شریک ہو گئے۔ حضورؐ نے سلام پھیرا، تو معاذؓ نے اٹھ کر چھوٹی ہوئی رکعتیں پوری کیں۔ اس سے پہلے دستور تھا کہ لوگ اشارہ سے نمازیوں سے پوچھا کرتے تھے کہ کتنی رکعتیں ہو گئیں اور پھر وہ پوری کر کے جماعت میں شریک ہوا کرتے تھے۔ اُس دن حضورؐ کو حضرت معاذؓ کا طریقہ بہت پسند آیا اور آپؐ نے لوگوں کو حکم دیا کہ آئندہ تم بھی ایسا ہی کیا کرو، چناں چہ یہی طریقہ حضورؐ کی سنت قرار پایا۔

ایک دن حضرت معاذؓ نے رسول اکرم ﷺ سے دریافت کیا یارسول اللہ! سب سے افضل ایمان کون سا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''اللہ کے لیے محبت رکھنا اور اللہ ہی کے لیے بُغض رکھنا اور اپنی زبان کو ہر وقت ذکرِ الٰہی میں مشغول رکھنا۔'' انھوں نے عرض کیا: ''یارسول اللہ! سب سے بہتر عمل کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''جو اپنے لیے پسند کرنا، وہی سب کے لیے پسند کرنا اور جو اپنے لیے برا سمجھنا، وہی سب کے لیے بُرا سمجھنا۔''

ایک مرتبہ حضرت معاذؓ سفر میں حضورؐ کے ساتھ تھے۔ اثنائے راہ میں حضورؐ نے

حضرتِ معاذؓ کو جہاں اور بہت سی نصیحتیں کیں، یہ بھی فرمایا کہ اے معاذ! صدقہ گناہوں کی آگ پر پانی کے چھینٹے کا کام دیتا ہے۔ اسی طرح پچھلی رات کی نماز (تہجد) گناہوں کو زائل کر دیتی ہے۔ پھر حضورؐ نے اپنی زبان مبارک کو پکڑ کر فرمایا: اس کو روکو۔ حضرت معاذؓ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! جو کچھ ہماری زبان سے نکلتا ہے، اس کا حساب ہوگا؟ حضورؐ نے فرمایا: اے معاذ! بہت سے لوگ اپنی زبان کی وجہ سے دوزخ میں جائیں گے۔ ایک موقع پر حضورؐ نے حضرت معاذؓ کو تبلیغِ اسلام کی اہمیت اس طرح سمجھائی کہ اے معاذ! اگر تم ایک مشرک کو بھی مسلمان کرلو، تو گویا دنیا کی سب سے بڑی نعمت حاصل کرلی۔

حضرت معاذؓ کو یمن بھیجتے وقت حضورؐ نے ان کو بہ طورِ خاص نصیحت فرمائی کہ اے معاذؓ! عیش و عشرت سے ہمیشہ اجتناب کرنا، کیوں کہ خدا کے بندے عیش و تنعّم کے دل دادہ نہیں ہوتے۔

حضرت معاذؓ کہتے ہیں ایک دن حضورؐ نے فرمایا: ''اے معاذ! شیطان آدمی کا بھیڑیا ہے۔ جس طرح بھیڑیا اس بکری کو اٹھالے جاتا ہے جو ریوڑ سے بھاگ نکلی ہو یا ریوڑ سے دور چلی گئی ہو یا ریوڑ کے کنارے پر ہو، اسی طرح شیطان اس انسان پر قابو پالیتا ہے جو جماعت سے الگ ہو جاتا ہے، اس لیے تم پہاڑ کی گھاٹیوں (گم راہیوں) سے بچو اور ہمیشہ جماعت کے ساتھ رہو۔''

مسندِ احمدؒ میں ہے کہ حضورؐ نے حضرت معاذؓ کو اِن آٹھ باتوں کی تاکید اور وصیت فرمائی تھی:

۱- شرک سے اپنے آپ کو کبھی آلودہ نہ کرنا، خواہ اس کے لیے کوئی تمھیں قتل ہی کر دے یا آگ میں جھونک دے۔
۲- والدین کو ہرگز نقصان اور گزند نہ پہنچانا، خواہ وہ تمھیں تمھارے اہل وعیال اور مال و متاع سے علیحدہ اور محروم ہی کیوں نہ کر دیں۔
۳- فرض نماز جان بوجھ کر کبھی ترک نہ کرنا، کیوں کہ جو شخص بالقصد نماز ترک کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی ذمہ داری اور کفالت سے بری ہو جاتا ہے۔
۴- شراب نہ پینا کہ یہ تمام بدکاریوں کی جڑ ہے۔

۵- گناہوں سے بچنا کہ گناہوں میں مبتلا انسان غضب الٰہی کا شکار ہو جاتا ہے۔

۶- میدانِ جہاد سے کبھی نہ بھاگنا، اگرچہ تمام لشکر آغشتۂ خاک وخون ہو اور موت سامنے کھڑی ہو۔

۷- علالت اور بیماری میں صبر اور استقلال سے کام لینا۔

۸- اپنی اولاد کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آنا، اس کو ادب سکھانا اور خدا کا خوف دلاتے رہنا۔

ایک مرتبہ رحمتِ عالم ﷺ نے فرمایا: ''اے معاذ! میں تمہیں جنت کا ایک دروازہ نہ بتاؤں؟'' انھوں نے بصد شوق عرض کیا: ''ضرور یا رسول اللہ!'' فرمایا: لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ (صدقِ دل سے) بہ کثرت پڑھا کرو۔''

حضرت معاذؓ کی عادت تھی کہ حضورؐ تنہا ہوتے، تو وہ آپ سے کچھ نہ کچھ سوال ضرور کرتے۔ اگر کبھی وہ کچھ نہ پوچھتے، تو حضورؐ فرماتے: معاذ! تم نے تنہائی ہونے کے باوجود مجھ سے کوئی سوال کیوں نہیں کیا؟

(۹)

سبقت فی الاسلام، حبِ رسولؐ، جوشِ ایمان، شغفِ قرآن و حدیث، شوقِ علم، جہاد فی سبیل اللہ، زہد و اتقا، پیرویِ سنت، صداقت شعاری، اصابتِ رائے، جود و سخا، تعلیم و تعلّم، تفقہ فی الدین اور شوقِ تبلیغ و نصیحت حضرت معاذؓ بن جبل کی کتابِ سیرت و اخلاق کے سب سے نمایاں ابواب ہیں۔ انھوں نے اس وقت اسلام قبول کیا جب ایسا کرنا سارے عرب سے دشمنی مول لینے کے مترادف تھا۔ حضورؐ نے مدینہ منوّرہ میں نزولِ اجلال فرمایا تو ان کا بیشتر وقت بارگاہِ رسالت میں گزرتا تھا اور کسی دن بھی حضورؐ کے جمالِ جہاں آرا کی زیارت کیے بغیر کل نہ پڑتی تھی۔ اسی عقیدت اور محبت نے انھیں بھی حضورؐ کا محبوب بنا دیا تھا۔

جوشِ ایمان کی یہ کیفیت تھی کہ بیعتِ عقبۂ کبیرہ سے واپس آئے، تو گھر گھر بتوں کا صفایا کرتے پھرتے تھے۔ قرآن اور حدیث سے شغف کا یہ عالم تھا کہ سرورِ عالم ﷺ کے سامنے ہی قرآن حفظ کر لیا اور حضورؐ کے دہنِ مبارک سے جو بات سنی، اس کو حرزِ جاں بنا لیا۔ تحصیلِ علم کے

شوق کی یہ فراوانی تھی کہ سفر و حضر اور خلوت و جلوت ہر حالت میں فیضانِ نبوی سے بہرہ یاب ہونے کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ جہاد فی سبیل اللہ کی ایسی تڑپ تھی کہ نہ صرف عہدِ رسالت کے تمام غزوات میں سرفروشانہ شریک ہوئے، بلکہ حضورؐ کے وصال کے بعد بھی قریب قریب ساری بقایا زندگی میدانِ جہاد میں گزاری۔ زہد و اتّقاء کا یہ حال تھا کہ رات کا بیشتر حصہ خصوصاً پچھلی رات عبادت اور ذکرِ الٰہی میں گزارتے یمن کی امارت سے واپس آئے، تو تمام مال و اسباب حتیٰ کہ اپنا کوڑا تک خلیفۃ الرسول کی خدمت میں پیش کر دیا، حالاں کہ حضورؐ نے ان کو ہدایا قبول کرنے کی (ان کے مقروض ہونے کی بنا پر بہ طورِ خاص) اجازت دے دی تھی۔

حضرت سعید بن مسیبؒ سے روایت ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں ایک مرتبہ حضرت معاذؓ کو بنی کلاب میں صدقات کی تحصیل کے لیے بھیجا۔ چناں چہ انھوں نے صدقات وصول کر کے شریعت کے مطابق انھیں تقسیم کر دیا اور کوئی چیز نہیں چھوڑی۔ جب واپس آئے، تو خالی ہاتھ —— جو ٹاٹ بیٹھنے کے لیے لے گئے تھے، وہی گردن پر رکھے ہوئے تھے۔ ان کی اہلیہ نے پوچھا: ''وہ مال کہاں ہے جو تم نے وہاں سے حاصل کیا؟ آخر دوسرے عامل بھی تو گھر والوں کے لیے کوئی نہ کوئی سوغات لاتے ہیں۔''

حضرت معاذؓ نے فرمایا: ''مجھ پر ایک نگراں تھا۔'' اہلیہ نے کہا: ''تم کو رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابو بکرؓ تو امین سمجھتے تھے، اب کیا ہوا جو حضرت عمرؓ نے تم پر ایک نگراں دباؤ ڈالنے کے لیے بھیج دیا۔''

ان کی اہلیہ نے (براہِ راست یا) اپنی رشتہ دار عورتوں کے ذریعے حضرت عمرؓ سے گِلہ کیا۔ حضرت عمرؓ نے حضرت معاذؓ کو بلا بھیجا اور فرمایا: ''اے معاذ! یہ تمھاری اہلیہ کیا کہتی ہے؟ میں نے تو تم پر کوئی نگراں مقرر نہیں کیا تھا۔''

حضرت معاذؓ نے عرض کیا: ''اے امیر المومنین! فی الواقع اللہ تعالیٰ میرا نگراں تھا۔ میں اپنی بیوی سے اور کیا معذرت کرتا۔'' حضرت عمرؓ ان کا جواب سُن کر بہت ہنسے اور ان کو کچھ مرحمت فرمایا کہ اسے دے کر اپنی بیوی کو راضی کرو۔

پیرویِ سنت میں اس قدر شدّت تھی کہ اپنے ہر قول و فعل میں حضورؐ کے اُسوۂ حسنہ کو

پیشِ نظر رکھتے تھے اور اس بات کا اطمینان کر لیتے تھے کہ ان کا کوئی عمل حضورؐ کے ارشاد یا مرضی کے خلاف تو نہیں ہے۔ امارتِ یمن پر بھیجتے وقت حضورؐ نے ان کو حکم دیا تھا کہ تیس جانوروں پر ایک بچہ لینا۔ ایک دن ایک شخص گایوں کا ایک گلہ لے کر آیا۔ اس میں تیس سے کم گائیں تھیں۔ حضرت معاذؓ نے فرمایا: ''میں جب تک رسول اللہ ﷺ سے پوچھ نہ لوں، اس گلّے پر کچھ نہیں لے سکتا۔

ان کی صداقت شعاری کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس وقت حضورؐ کی صداقت کی گواہی دی جب نشۂ شباب نے انسان کو مدہوش کر رکھا ہوتا ہے۔ قبولِ اسلام کے وقت وہ صرف اٹھارہ برس کے تھے۔ فیضانِ نبوی نے ان کی صداقت شعاری کو اور جلا بخش دی اور خود حضورؐ نے ان کی صداقت کی تصدیق فرمائی۔ ایک مرتبہ حضرت انسؓ بن مالک کے سامنے ایک حدیث بیان کی۔ حضرت انسؓ کو اس میں کچھ شک تھا۔ انھوں نے حضورؐ سے جا کر پوچھا: ''یا رسول اللہ! کیا آپ نے یہ بات معاذؓ بن جبل سے فرمائی تھی؟'' حضورؐ نے فرمایا ''صَدَقَ مُعَاذ، صَدَقَ مُعَاذ، صَدَقَ مُعَاذ!'' معاذ نے سچ کہا، معاذؓ نے سچ کہا، معاذ نے سچ کہا۔

حضرت معاذؓ کی ذہانت وفطانت اور اصابت رائے کا ایک عالَم معترف تھا۔ خود سرورِ عالمؐ نے بعض موقعوں پر اُن کی رائے کو پسند فرمایا۔ علّامہ ابن سعدؒ کا بیان ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کاروبار خلافت میں جن صحابہ کرامؓ سے مشورہ کرتے تھے، ان میں حضرت معاذؓ بن جبل بھی شامل تھے، حالاں کہ اس وقت ان کی عمر صرف تیس برس کے قریب تھی۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کی وفات کے بعد حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں مجلسِ شوریٰ کا باقاعدہ انعقاد کیا، تو اس کا ایک رُکن حضرت معاذؓ بن جبل کو نامزد کیا۔ سپہ سالارِ شام حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراح نے حضرت معاذؓ بن جبل کو اپنا مشیر خاص بنا رکھا تھا اور ہر اہم معاملے میں ان سے ضرور مشورہ لیتے تھے۔ حضرت معاذؓ کے مشوروں کا حال پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک انتہائی صاحب الرائے اور زیرک انسان تھے۔

اربابِ سِیَر کا بیان ہے کہ حضرت معاذؓ بڑے کشادہ دست اور فیاض تھے۔ کسی سوالی کو کبھی خالی ہاتھ واپس نہیں جانے دیتے تھے۔ اس سخاوت کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سی جائداد بِک گئی اور مقروض ہو گئے۔ جب قرض خواہوں نے تنگ کیا، تو انھوں نے گھر سے نکلنا چھوڑ دیا۔ ان لوگوں نے حضورؐ کے پاس شکایت کی تو حضورؐ نے حضرت معاذؓ کو بلا بھیجا۔ انھوں نے اپنا حال بلاکم و

کا ست حضورؐ کی خدمت میں عرض کر دیا۔ رحمتِ عالمؐ نے فرمایا: جو شخص اپنا قرض معاف کر دے گا، اللہ تعالیٰ اس پر رحم کرے گا۔ چند لوگوں نے اپنا مطالبہ چھوڑ دیا، لیکن کچھ لوگ ذاتی وجوہ کی بنا پر اپنے مطالبے پر قائم رہے۔ حضورؐ نے حضرت معاذؓ کی باقی جائداد ان لوگوں میں تقسیم کر دی، لیکن کچھ قرض پھر بھی رہ گیا۔ حضورؐ نے اُن لوگوں سے فرمایا کہ جو کچھ تم کو مل چکا ہے، اسی پر اکتفا کرو اور حضرت معاذؓ کو تسلّی دی کہ گھبراؤ نہیں اللہ تعالیٰ جلد تمہارے لیے کوئی بہتر صورت پیدا کر دے گا۔ کچھ عرصے بعد حضورؐ نے حضرت معاذؓ کو امارتِ یمن پر بھیجا، تو اُن کو بہ طورِ خاص اجازت دے دی کہ اگر کوئی شخص بہ رضا و رغبت ہدیہ پیش کرے، تو قبول کر لیں۔ قیاس یہ ہے کہ یہ اجازت حضورؐ نے حضرت معاذؓ کے مقروض ہونے کی بنا پر مرحمت فرمائی، کیوں کہ وہ راہِ خدا میں اپنا مال لٹانے کی بنا پر مقروض ہوئے تھے۔

حضرت معاذؓ نے دانائے کونین ﷺ سے قرآن، حدیث اور فقہ کی براہِ راست تعلیم حاصل کی تھی اور حضورؐ کے سامنے ہی مسندِ درس و افتاء پر فائز ہو گئے تھے۔ فتح مکہ کے بعد سرورِ عالم ﷺ نے انھیں محض اس خیال سے مکہ کا عامل بنا دیا کہ وہ لوگوں کو قرآن و سنت کی تعلیم دیں۔ حضورؐ نے جب انھیں یمن بھیجا، تو اہل یمن کی تعلیم کا فرض بھی انھیں سونپا، حضرت ابو بکر صدیقؓ نے بھی انھیں منصبِ افتاء پر فائز کیا۔ حضرت عمر فاروقؓ کے عہدِ خلافت میں اگرچہ ان کا بیشتر وقت میدانِ جہاد میں گزرا، تاہم وہ تعلیم اور تعلّم سے بھی غافل نہ رہے اور دمشق، حمص اور فلسطین کے کئی شہروں میں درس کے حلقے قائم کیے جہاں وقتاً فوقتاً جا کر درس دیتے اور اپنے فیوضِ علمی سے عامۃ الناس کو بہرہ یاب کرتے۔ ان شہروں کے علاوہ وہ متعدد دوسرے شہروں میں بھی دورہ کر کے وہاں کے تشنگانِ علم کو سیراب کرتے تھے۔

مشہور تابعی ابو مسلم خولانیؒ کا بیان ہے کہ میں ایک دفعہ حمص کی جامع مسجد میں گیا۔ وہاں دیکھا بتیس صحابۂ کرامؓ ایک حلقے میں بیٹھے ہیں اور دینی مسائل پر گفتگو کر رہے ہیں، ایک نوجوان کے سوا باقی سب صحابہ معمّر تھے۔ جب کسی مسئلے میں وہ متفق نہ ہوتے، تو اس نوجوان کی طرف رجوع کرتے جو آناً فاناً فیصلہ کر دیتا۔ میں نے پوچھا: یہ نوجوان کون ہے؟ لوگوں نے بتایا یہ معاذؓ بن جبل ہیں۔

ان کی تعلیم و تعلّم کے سلسلے میں اسی قسم کی اور بھی بہت سی روایتیں کتابوں میں ملتی ہیں۔

فقہ میں حضرت معاذؓ کی جلالتِ قدر پر خود نبیِ اکرم ﷺ نے یہ فرما کر مہر تصدیق ثبت کی کہ معاذؓ بن جبل ہمارے صحابہؓ میں حلال وحرام کے سب سے بڑے عالم ہیں۔

احادیث اور سِیَر کی کتابوں میں حضرت معاذؓ کے متعدد فقہی فیصلے تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ اُن کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دینی مسائل میں انھیں کمال درجے کا ذہن رسا عطا کیا تھا اور ان کی بصیرت اور ژرف نگاہی بڑے بڑے پیچیدہ مسائل کو آنِ واحد میں سلجھا دیتی تھی۔ مبدا فیض نے حضرت معاذؓ کو تبلیغ ونصیحت کا جذبہ بھی فراوانی کے ساتھ عطا کیا تھا۔ اُن کے پُر تاثیر ارشادات سننے والوں کے لیے ممکن نہ تھا کہ وہ اپنی اصلاح کی طرف متوجہ نہ ہوں۔ ایک دفعہ اپنے بیٹے سے فرمایا: بیٹا، جب تو کوئی نماز پڑھے، تو اس طرح پڑھ جیسے تو رخصت ہو رہا ہے اور اس کے بعد کبھی یہاں نہیں آئے گا۔ بیٹا، اچھی طرح سمجھ لے کہ مومن دو نیکیوں کے درمیان مرتا ہے، ایک وہ جس کو موت سے پہلے کیا ہے دوسری وہ جس کو مؤخر کیا ہے (صدقۂ جاریہ)۔

ایک مرتبہ کسی شخص نے کہا مجھے کوئی نصیحت کیجیے۔ فرمایا: اگر تو میرا کہا مانے، تو روزہ بھی رکھ اور افطار بھی کر، نماز بھی پڑھ اور سو بھی، رزق بھی کما اور گناہ سے بھی بچ، کوشش کر اسلام پر تیرا خاتمہ ہو اور اپنے آپ کو مظلوم کی بددُعا سے بچا۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت قتادہ بن نعمان انصاریؓ

(۱)

عہدِ رسالتؐ کی ایک شب کا ذکر ہے ــــ آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے اور مدینہ منورہ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ رحمتِ عالم ﷺ نمازِ عشاء کے لیے مسجد پہنچے، تو ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ اس تیرہ و تار رات میں لوگوں نے گھروں ہی میں نماز پڑھ لی تھی، البتہ ایک صاحب مسجد کے ایک گوشے میں موجود تھے۔ بجلی چمکی، تو حضورؐ نے فرمایا: ''قتادہ! کیا تم ہو؟''

عرض کی! ''ہاں یا رسول اللہ، میرا خیال تھا کہ اس تاریکی میں جب کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا، بہت کم لوگ نماز کے لیے مسجد پہنچ سکیں گے، اس لیے ہمت کر کے قصداً حاضر ہوا ہوں۔''

سرورِ عالم ﷺ ان کے جذبۂ اخلاص پر بہت مسرور ہوئے اور فرمایا: ''جب تم نماز سے فارغ ہو جاؤ، تو مجھ سے مل کر گھر واپس جانا۔''

جب وہ گھر جانے لگے، تو رحمتِ عالمؐ نے انھیں کھجور کی ایک ٹیڑھی ٹہنی دی اور فرمایا: ''یہ لو، یہ ٹہنی تیرے آگے اور پیچھے دس دس ہاتھ تک روشنی ڈالے گی۔''

وہ گھر کی طرف چلے، تو حضورؐ کی عطا کی ہوئی کھجور کی ٹہنی ایک روشن قندیل بن گئی اور وہ اس کی روشنی میں نہایت اطمینان اور سہولت کے ساتھ گھر پہنچے۔

یہ قتادہؓ جن کے جذبۂ اخلاص نے سید الانام خیر الخلائق ﷺ کو مسرور کیا، قبیلہ اوس کی شاخ بنو ظفر کے چشم و چراغ تھے اور نعمان بن زید (بن عامر بن سواد بن ظفر بن خزرج بن عمرو بن مالک بن اوس) کے فرزندِ ارجمند تھے۔ حضرت قتادہؓ ابھی سنِ شعور کو نہیں پہنچے تھے کہ سایۂ پدری سے

محروم ہوگئے۔ ان کی والدہ انیسہؓ بنت قیس نے (جو قبیلۂ عدی بن نجّار سے تھیں) خزرج کے خاندان خدرہ کے ایک مردِ شریف مالک بن سنان سے نکاح کرلیا۔ اُن کے صُلب سے مشہور صحابی حضرت ابوسعید خدریؓ پیدا ہوئے، اس لحاظ سے حضرت قتادہؓ بن نعمان اور حضرت ابوسعید خدریؓ اخیافی بھائی تھے۔ حضرت قتادہؓ کی کنیت ابوعمر بھی تھی اور ابوعبداللہ بھی۔ وہ انصار کے سابقون الاوّلون میں سے تھے۔ علامہ ابن اثیرؒ نے ''اسدُ الغابہ'' میں لکھا ہے کہ حضرت قتادہؓ بیعتِ عقبہ ثانیہ میں مشرّف بہ اسلام ہوئے، لیکن سیرت کی اکثر دوسری کتابوں میں بیعت عقبہ ثانیہ کے شرکاء میں حضرت قتادہؓ کا نام شامل نہیں ہے۔ قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بیعتِ عقبہ ثانیہ سے کچھ پہلے یا بعد مسلمان ہوئے، بہرصورت وہ انصار کے سابقینِ اسلام میں سے تھے۔

(۲)

رمضان المبارک ۲ھ میں بدر کے میدان میں حق اور باطل کی پہلی ٹکّر ہوئی، تو حضرت قتادہؓ بن نعمان کو ان تین سو تیرہ نفوس قدسی (اصحابِ بدر) میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہوا جن کو اللہ اور اللہ کے رسولؐ نے کھلے لفظوں میں جنت کی بشارت دی۔ وہ شروع سے اخیر تک میدانِ رزم میں دادِ شجاعت دیتے رہے۔ اگلے سال شوال ۳ھ میں حضرت قتادہ غزوۂ اُحد میں بھی بڑے جوش اور جذبے کے ساتھ شریک ہوئے۔ معرکۂ کارزار میں کسی مشرک نے ان کی آنکھ پر ایسا سخت وار کیا کہ ڈھیلا باہر لٹک پڑا۔ لوگوں نے اس کو قطع کرنا چاہا، تو انھوں نے کہا: ''رسول اللہؐ سے مشورہ کرلو۔''

حضورؐ کے سامنے معاملہ پیش ہوا، تو آپؐ نے فرمایا: ''نہیں۔'' پھر اپنے دست مبارک سے قتادہؓ کی آنکھ کے ڈھیلے کو ٹھیک جگہ پر بٹھا کر دعا کی:

اَللّٰھُمَّ اَکْسِھَا جَمَالاً

''الٰہی! اس آنکھ کو صاحبِ جمال بنادے یا اسے زیبائی بخش۔''

اللہ کی شان، یہ آنکھ پہلے سے زیادہ خوب صورت اور روشن ہوگئی اور عمر بھر کبھی نہ دُکھی۔

بعض روایتوں میں اسے جنگِ بدر کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ لیکن امام مالکؒ، دار قطنیؒ، ابن عبد البرؒ اور بعض دوسرے مستند اہلِ سیَر نے اسے جنگِ اُحد کا واقعہ قرار دیا ہے اور یہی صحیح ہے۔ طبرانی کی روایت کے مطابق خود حضرت قتادہؓ نے یہ واقعہ اس طرح بیان کیا ہے:

''رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں کسی شخص نے ایک کمان مجھے مرحمت فرمائی۔ میں نے اس کمان سے رسول اللہ ﷺ کے سامنے کھڑے ہو کر اس قدر تیر چلائے کہ اس کا ایک کنارہ ٹوٹ گیا (اور وہ تیر چلانے کے قابل نہ رہی) تاہم میں برابر (حضورؐ کے بچاؤ کی خاطر) آپؐ کے سامنے اسی جگہ کھڑا رہا۔ جب مشرکوں کا کوئی تیر آپؐ کے چہرۂ مبارک کی طرف آتا، تو میں اپنا سر (چہرہ) سامنے کر دیتا۔ ان میں سے ایک تیر میری آنکھ میں لگا اور ڈھیلا حلقۂ چشم سے نکل کر میری ہتھیلی پر آپڑا۔ میں اسے ہتھیلی پر رکھے ہوئے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا، تو میری حالت دیکھ کر آپؐ اشک بار ہو گئے اور فرمایا، الٰہی قتادہؓ نے تیرے نبی کا اعزاز اپنے چہرے سے کیا، تو اس کی آنکھ کو اچھا اور اس کی نظر تیز کر دے، چناں چہ یہ آنکھ نہایت اچھی اور تیز ہو گئی۔''

امام ہیثمیؒ نے حضرت قتادہؓ سے روایت کی ہے کہ میں غزوۂ اُحد میں رسول اللہ ﷺ کے بالکل سامنے کھڑا تھا اور آپؐ کے چہرۂ مبارک کو اپنے چہرہ کے ذریعے بچاتا تھا اور ابودجانہؓ حضورؐ کی پُشت کو اپنی پُشت سے بچا رہے تھے، یہاں تک کہ ان کی تمام پُشت تیروں سے چھلنی ہو گئی تھی۔

علّامہ ابنِ سعدؒ نے اس واقعہ کو ایک دوسرے انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ غزوۂ اُحد میں حضرت قتادہؓ کی آنکھ ان کے رخسار پر لٹک آئی، تو وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: ''یا رسول اللہ، میری ایک بیوی ہے جس سے مجھے بہت محبت ہے، اگر اس نے میری آنکھ کی یہ حالت دیکھی تو مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ مجھ سے کراہت نہ کرنے لگے۔''

رسول اللہ ﷺ نے ان کی بات سنی، تو اپنے دستِ مبارک سے لٹکے ہوئے ڈھیلے کو حلقۂ چشم میں اپنی جگہ پر رکھ دیا۔ آنکھ اصلی حالت پر آگئی اور دوسری سے بھی خوشنما ہو گئی۔ اربابِ سِیَر کا بیان ہے کہ حضرت قتادہؓ بن نعمان کے خاندان اور اولاد کے لیے یہ واقعہ نہایت عزّت اور فخر کا باعث بن گیا۔ علّامہ اثیرؒ نے لکھا ہے کہ حضرت قتادہؓ کی اولاد میں سے کسی شخص نے ان دو شعروں میں اس واقعہ پر فخر کا اظہار کیا ہے:

انا ابن الذی سالت علی الخذعینہ　　فرُدّت بکف المصطفیٰ احسن الردّ

میں اس شخص کا فرزند ہوں جس کی آنکھ رخسار پر ڈھلک آئی تھی پس نہایت خوب صورتی سے محمد مصطفیٰ کے دستِ مبارک سے اپنی جگہ لوٹا دی گئی

فعادت کما کانت لِاوّل امرھا   فیا حسن ما عین و باحسن

پس یہ آنکھ جیسی پہلے تھی، ویسی ہی ہوگئی کیا اچھی تھی وہ آنکھ اور کیا اچھا تھا اس کا دوبارہ روشن ہونا

ایک روایت میں ہے کہ یہ شعر حضرت قتادہؓ کے پوتے عاصمؒ بن عمر نے اس وقت پڑھے تھے جب وہ عمرؒ بن عبدالعزیز کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انھوں نے دریافت کیا تھا: ''آپ کون ہیں؟'' عاصمؒ نے یہ شعر پڑھ کر اپنا تعارف کرایا، تو حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز نے ان کا بے حد اعزاز و اکرام کیا۔

(۴)

جنگِ اُحد کے بعد حضرت قتادہؓ نے غزوۂ احزاب (خندق) اور دوسرے غزواتِ نبویؐ میں جاں بازانہ شرکت کی۔ رمضان المبارک ۸ ھ میں حضرت قتادہؓ کو ان دس ہزار سرفروشوں میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہوا جو فتح مکہ کے موقع پر رحمتِ عالم ﷺ کے ہم رکاب تھے۔ علّامہ ابن اثیرؒ کا بیان ہے کہ جیوشِ اسلام میں مکہ میں داخل ہوئے، تو بنی ظفر کا علم حضرت قتادہؓ کے پاس تھا۔

فتح مکہ کے بعد شوال ۸ ھ میں حنین کی خوں ریز جنگ پیش آئی۔ اس کا سبب بڑا عجیب تھا۔ مکہ پر پرچم اسلام بلند ہونے سے جہاں عرب کے دوسرے معبودانِ باطل پر ہیبتِ حق طاری ہوگئی وہاں بنو ثقیف اور بنو ہوازن کے جنگجو قبائل پر اس کا الٹا اثر ہوا۔ انھوں نے حق کے سامنے سرِ خم کرنے کے بہ جائے سرکشی پر کمر باندھی اور مسلمانوں کو ختم کر کے طائف میں واقع اہلِ مکّہ کی جاگیروں اور باغوں پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ ان بدبختوں نے بنو نصر، بنو ہلال اور کچھ دوسرے قبیلوں کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا اور ایک بڑے لشکر کی صورت میں مکہ کی طرف بڑھے۔ ابھی وہ اوطاس کے مقام پر پہنچے تھے کہ سرورِ عالم ﷺ کو ان کے فاسد عزائم اور نقل و حرکت کی اطلاع مل گئی۔ حضورؐ ان کے مقابلہ کے لیے بارہ ہزار جاں بازوں کے ساتھ مکہ سے اوطاس کی جانب روانہ ہوئے۔ اپنے لشکر کی کثیر تعداد دیکھ کر بعض مسلمانوں کی زبان سے نکل گیا: ''اب ہم پر کون غالب آسکتا ہے۔''

اللہ تعالیٰ کو یہ نازش پسند نہ آئی اور اس نے مسلمانوں کو ایک سخت امتحان میں ڈال دیا۔ لشکرِ اسلام جونہی وادیِ حنین میں داخل ہوا، وادی کے دونوں جانب کمین گاہوں میں بیٹھے ہوئے دشمن نے اس پر تیروں کا مینہ برسا دیا۔ بنو ہوازن بلا کے قدر انداز تھے۔ ان کے تیروں نے قیامت ڈھادی، پھر وہ کمین گاہوں سے نکل کر نیزوں اور تلواروں کے ساتھ مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے۔ ہراول دستوں میں زیادہ تعداد مکہ کے نومسلموں کی تھی۔ وہ سراسیمہ ہوکر پیچھے کی طرف بھاگے اور دوسرے مسلمانوں میں بھی انتشار پھیل گیا۔ اس نازک وقت میں رحمتِ عالم ﷺ، عزم و استقلال کا کوہِ گراں بن کر میدانِ جنگ میں کھڑے تھے اور صحابۂ کرامؓ کی ایک مختصر جماعت آپ کے گرد سرفروشی اور جاں نثاری کا حق ادا کر رہی تھی۔ اہل سِیَر نے صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ اس ثابت قدم جماعت میں حضرت قتادہؓ بن نعمان بھی شامل تھے۔ اس افراتفری کے عالم میں سرورِ عالم بڑے جوش کے ساتھ یہ رجز پڑھ رہے تھے:

اَنَـا النَّبِیُّ لا کَذِب

اَنَـا ابـنُ عَبد الْمُطَّلِب

(میں نبی ہوں، اس میں اصلا جھوٹ نہیں۔ میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں)

حضرت عباسؓ (عمِ رسول) حضورؐ کے قریب تھے۔ آپ نے ان کو حکم دیا کہ مہاجرین و انصار کو آواز دیں، انھوں نے نعرہ مارا:

یـا مـعشر الانـصـار	یـا اصـحـاب الشجره
اے جماعت انصار	اے اصحاب الشجرہ

(درخت کے نیچے بیعت (رضوان) کرنے والو)

اس پُر اسرار آواز کا کانوں میں پڑنا تھا کہ تمام اسلامی لشکر دفعتاً پلٹ پڑا اور آناً فاناً مشرکین کی صفوں کو درہم برہم کر دیا۔ مشرکین کے بے شمار آدمی مقتول و مجروح اور اسیر ہوئے اور بے حساب مالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ غزوۂ اُحد کی طرح جو مسلمان غزوۂ حنین میں ثابت قدم رہے، اربابِ سِیَر نے ان کا ذکر بھی خصوصیت کے ساتھ کیا ہے اور ان کی شجاعت و استقامت کو زبردست خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ حضرت قتادہؓ کا ان سرفروشوں میں شامل ہونا اُن کی حبِ رسول اور شیر دلی پر دال ہے۔

(۴)

عہدِ رسالتؐ کے آخری ایام (صفر ۱۱ھ) میں رحمتِ عالم ﷺ نے جنگِ موتہ کا بدلہ لینے کے لیے آزمودہ کار مجاہدین کا ایک لشکر تیار فرمایا جس میں حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ فاروق، حضرت سعدؓ بن ابی وقاص، حضرت ابو عبیدہؓ بن الجراح اور حضرت سعیدؓ بن زید کے ساتھ حضرت قتادہؓ بھی شامل تھے۔ یہ تمام صحابہؓ بڑے رتبے اور عظمت کے حامل تھے۔ حضورؐ نے امیرِ لشکر اپنے محبوب صحابی حضرت زیدؓ بن حارثہ ''شہیدِ موتہ'' کے فرزند حضرت اسامہؓ کو مقرر فرمایا۔ اس وقت حضورؐ کی علالت کا آغاز ہو چکا تھا۔ تاہم آپ نے اس لشکر کو کوچ کا حکم دیا۔ اس نے مدینہ منوّرہ سے چل کر جرف کے مقام پر پڑاؤ ڈالا، یہیں حضرت اسامہؓ کو حضورؐ کی شدید علالت کی اطلاع ملی اور وہ چند دوسرے صحابہؓ کرام کے ہم راہ فوراً جرف سے مدینہ واپس آ گئے۔ حضرت اسامہؓ کے ورودِ مدینہ کے فوراً بعد حضورؐ نے وصال فرمایا اور وہ آپؐ کی تجہیز و تکفین میں شریک ہوئے اس کے ساتھ ہی ان کا سارا لشکر بھی جرف سے مدینہ واپس آ گیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ سریر آرائے خلافت ہوئے، تو انھوں نے حضرت اسامہؓ کو دوبارہ اپنی مہم پر روانہ ہونے کا حکم دیا اور حضرت بریدہؓ بن حصیب علَم لے کر جرف پہنچ گئے۔ اسی اثناء میں سارے عرب میں فتنۂ ارتداد کی آگ بھڑک اٹھی۔ بعض لوگوں نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو مشورہ دیا کہ ملک کے نازک حالات کے پیشِ نظر یہ مہم ملتوی کر دیجیے۔ عزم و ثبات کے اس پیکرِ عظیم نے فرمایا: ''ہرگز نہیں، خواہ مجھے پرندے نوچ کر (یا درندے پھاڑ کر) کھا جائیں، میں اس مہم کو نہیں روکوں گا جس کو خود رسول اللہ ﷺ نے روانہ فرمایا تھا۔''

چناں چہ حضرت اسامہؓ بن زیدؓ سات سو صحابۂ کرام کی معیت میں اپنی منزلِ مقصود پر پہنچے اور دشمن کو عبرت ناک شکست دے کر جنگِ موتہ کا بدلہ لے لیا۔ اس مہم میں حضرت قتادہؓ بھی حضرت اسامہؓ کے ساتھ تھے۔ جیشِ اسامہؓ نے مظفر و منصور ہو کر مدینہ منوّرہ کی مراجعت کی، تو حضرت ابوبکرؓ بہت مسرور ہوئے اور مہاجرین و انصار کو لے کر مدینہ کے باہر اس کا استقبال کیا۔

سرورِ کائنات ﷺ کی رحلت کے بعد حضرت قتادہؓ گیارہ بارہ برس حیات رہے، لیکن کتبِ سیَر میں ان کی زندگی کے اس دَور کے بارے میں کوئی تفصیل نہیں ملتی۔ علاّمہ ابنِ سعدؒ کاتب الواقدی کے بیان کے مطابق حضرت قتادہؓ نے خلافتِ فاروقی کے آخری سال ۲۳ھ میں

وفات پائی۔ امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔ ان کی جلالتِ قدر کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ خود خلیفۂ عرب و عجم حضرت عمر فاروقؓ، حضرت ابو سعید خدریؓ اور حضرت محمدؓ بن مسلمہ انصاری جیسے اکابرِ امت نے انھیں آغوشِ لحد میں اتارا۔ وفات کے بعد وہ ۶۵ برس کے لپیٹے میں تھے۔

حضرت قتادہؓ نے اپنے پیچھے دو لڑکے چھوڑے جن کے نام عمر اور عبد اللہ تھے۔ عمر بن قتادہؓ کی اولاد میں سے بعض اصحاب نے علم و فضل کے اعتبار سے بڑا نام پایا۔

حضرت قتادہؓ فضیلتِ علمی کے لحاظ سے بڑے بلند مقام پر فائز تھے، لیکن وہ روایتِ حدیث میں بہت محتاط تھے، اس لیے ان سے صرف سات حدیثیں مروی ہیں۔ امام احمد بن حنبلؒ سے روایت ہے کہ اکثر صحابہ ان سے فتویٰ طلب کیا کرتے تھے۔ ان میں حضرت ابو قتادہؓ اور ابو سعیدؓ خدری جیسے عظیم المرتبت صحابہ بھی شامل تھے۔

ابنِ شاہینؒ نے ابنِ ابی داؤد سے روایت کی ہے کہ حضرت قتادہؓ نے سب سے پہلے مدینہ منورہ میں سورۂ مریم کے نزول سے لوگوں کو آگاہ کیا۔

سیّدنا حضرت قتادہؓ بن نعمان کی کتابِ سیرت کے نمایاں ابواب ان کا تقدّم فی الاسلام، جوشِ ایمان، زہد و ورع اور جذبۂ اخلاص ہیں۔ غزوۂ اُحد میں انھوں نے جس طرح سرورِ کونین ﷺ کی جاں نثاری کا حق ادا کیا وہ ان کے عشقِ رسولؐ کا مظہرِ اتم تھا۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت ابولبابہ رفاعہ بن عبدالمنذر انصاریؓ

(۱)

رمضان ۲ھ میں حق و باطل کے معرکۂ اوّل بدر الکبریٰ کے لیے رحمت عالم ﷺ مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے تو صرف تین سو تیرہ سرفروشانِ حق آپؐ کے ہم رکاب تھے اوران کے سازوسامان کا یہ عالم تھا، کہ سواری کے جانور بھی پورے نہیں تھے۔ کل ساٹھ اونٹ اور دو گھوڑے اُن کی کل متاع تھی، لیکن اس بے سروسامانی اور قلتِ تعداد کے باوجود ان کے جوشِ ایمان اور جذبۂ فدویت کی یہ کیفیت تھی کہ ملائکۂ آسمانی بھی ان پر رشک کررہے تھے۔ اَسّی میل کے طویل سفر کے لیے اونٹوں پر سواری کا یہ انتظام کیا گیا تھا کہ ایک ایک اونٹ پر تین آدمی باری باری چڑھتے اترتے تھے۔ اسی سفر میں چشمِ فلک نے ایک عجیب نظارہ دیکھا کہ کھلتے ہوئے گندمی رنگ کے ایک نورانی صورت آدمی ایک اونٹ پر سوار ہیں اوراس کے ساتھ ساتھ سیّد المرسلین خیر الخلائق آقائے نام دار ﷺ اور فاتح خیبر زوجِ بتول سیّدنا علی مرتضٰی پاپیادہ چل رہے ہیں۔ وہ صاحب بار بار عرض کرتے ہیں:

''یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان۔ آپ اونٹ پر سوار ہوجایئے میں پیدل چلوں گا۔''

حضورؐ فرماتے ہیں:

''نہیں بھائی! اب اونٹ پر سوار ہونے کی تمھاری باری ہے اور تم مجھ سے زیادہ پیدل نہیں چل سکتے اور پھر میں بھی توراہِ حق میں پیادہ پا چلنے کے ثواب سے بے نیاز نہیں ہوں۔''

یہ صاحب جن کو شہنشاہِ کون ومکاں فخرِ جن وانس رحمتِ دو عالم ﷺ نے اصرار کر کے اپنے مرکبِ اقدس پر بٹھایا اور خود اس کے ساتھ پیدل چلے سیدنا حضرت رفاعہؓ بن عبد المنذر انصاری تھے جو تاریخ میں اپنی کنیت ابولبابہؓ سے مشہور ہیں۔ ابنِ شہاب اور ابن ہشام نے ان کا نام بشیر لکھا ہے، مگر امام احمد حنبلؒ، ابنِ اسحاق اور کئی دوسرے اربابِ سِیَر سے ثابت ہے کہ ان کا نام رفاعہ تھا۔

(۲)

سیدنا ابولبابہ رفاعہؓ بن عبد المنذر قبیلہ اوس کے خاندان عمرو بن عوف سے تھے جس کا قیام قبا میں تھا۔ ان کا تعلق صحابہ کرامؓ کی اس مقدّس جماعت سے تھا جس کا درجہ (جمہور علماء کے نزدیک) اصحابِ بدر سے بھی بلند ہے۔ یہ مقدس جماعت تاریخ میں ''اہلِ عقبہ'' کہلاتی ہے۔ یعنی قبا اور مدینہ منورہ کے وہ لوگ جو ہجرت سے قبل مشرف بہ اسلام ہوئے اور مکہ جا کر عقبہ کی گھاٹی میں سرورِ کونین ﷺ کی بیعت سے سعادت اندوز ہوئے۔ یہ وہ نفوس قدسی تھے جنھوں نے ایسے پُر آشوب زمانے میں اپنی جانوں اور مالوں کو مکہ کے درِ یتیم ﷺ کے قدموں پر لا ڈالا جب سارا عرب مسلمانوں کے خون کا پیاسا تھا۔ حضرت ابولبابہ رفاعہؓ اسی مقدّس جماعت کے ایک گوہرِ تابندہ تھے۔

اکثر روایات میں ہے کہ وہ بیعت عقبۂ کبیرہ (یا بیعت لیلۃ العقبہ) میں سرورِ عالمؐ کی بیعت سے سرفراز ہوئے البتہ بعض روایتوں میں یہ بھی ہے کہ وہ بیعت عقبہ اولیٰ میں بھی شریک تھے اور اپنے قبیلہ کے نقیب بنائے گئے تھے۔ بہر صورت ان کا اہلِ عقبہ میں سے ہونا ثابت ہے۔ ہجرت کے بعد سرورِ عالمؐ قبا تشریف لائے تو انھوں نے دوسرے لوگوں کے ساتھ حضورؐ کا پُر جوش خیر مقدم کیا اور پھر حضورؐ کے قیامِ قبا و مدینہ کے دوران میں ایسے خلوص اور ایثار کا مظاہرہ کیا کہ بہت جلد انھیں حضورؐ کی شفقت اور اعتمادِ خاص حاصل ہو گیا۔ ابن ہشام کا بیان ہے کہ ہجرتِ نبوی سے پہلے جب حضورؐ کے ایماء پر بیشتر صحابہ کرامؓ نے مدینہ منوّرہ کی طرف ہجرت کی تو ان مہاجرین اوّلین میں سے متعدد حضرات نے قبا پہنچ کر حضرت ابولبابہ رفاعہؓ بن عبد المنذرؓ کے ہاں قیام کیا جنھوں نے بڑی خوش دلی اور شوق سے اپنے مہاجر بھائیوں کی میزبانی کی۔

غزوۂ بدر کے موقع پر حضرت ابولبابہؓ کو نہ صرف رحمتِ عالم ﷺ کے مرکبِ ہمایوں پر

بیٹھنے کی سعادت حاصل ہوئی بلکہ انھیں مدینہ منوّرہ میں حضوؐر کی نیابت کا شرف بھی حاصل ہوا۔ اہلِ سیَر کا بیان ہے کہ لشکرِ اسلام جب مدینہ منوّرہ سے دو دن کی مسافت پر روما کے مقام پر پہنچا، تو سرورِ عالمؐ نے حضرت ابولبابہؓ سے فرمایا کہ تم مدینہ واپس چلے جاؤ اور وہاں میری نیابت کا فرض ادا کرو۔ حضرت ابولبابہؓ نے تعمیلِ ارشاد کی۔ تاہم سرور عالمؐ نے ان کو مجاہدینِ بدر میں شمار فرمایا اور مالِ غنیمت میں دوسرے اصحاب کی طرح ان کا حصہ بھی لگایا چناں چہ تمام سیرت نگاروں نے ان کو بالاتفاق اصحاب بدر میں شمار کیا ہے۔ علّامہ ابنِ سعد نے لکھا ہے کہ غزوۂ بنی قینقاع اور غزوۂ سویق میں بھی حضرت ابولبابہؓ کو مدینہ منوّرہ میں حضوؐر کی نیابت کا شرف حاصل ہوا۔

(۳)

غزوۂ بدر کے بعد حضرت ابولبابہؓ نے اُحد، احزاب، خیبر اور دوسرے غزوات میں بھی رحمتِ عالمؐ کی ہم رکابی کا شرف حاصل کیا اور ہر معرکے میں بڑے جوش و خروش سے اپنی تلوار کے جوہر دکھائے۔ غزوۂ بنو قریظہ میں (جو ۵ ھ میں غزوۂ احزاب کے معاً بعد پیش آیا) ایک عجیب واقعہ ہوا جو تاریخ میں حضرت ابولبابہؓ کی غیر معمولی شہرت کا باعث بن گیا۔ کتبِ رجال میں اس واقعے کے بارے میں متعدد روایتیں ملتی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ یہودِ مدینہ کے طاقت ور قبیلہ بنی قریظہ نے بہ ظاہر مسلمانوں سے حلیفانہ تعلق قائم کر رکھا تھا، لیکن در پردہ وہ اسلام کے سخت دشمن تھے۔ ۵ ھ میں جنگ خندق کے موقع پر کفر اپنی پوری قوّت کے ساتھ اسلام پر حملہ آور ہوا، اور عرب کے سارے دشمنانِ حق نے ایکا کر کے مرکزِ اسلام مدینہ منورہ کا محاصرہ کر لیا۔ مسلمانوں پر یہ نازک ترین وقت تھا۔ حلیفانہ تعلق کی رُو سے بنو قریظہ پر لازم تھا کہ وہ مسلمانوں کا ساتھ دیتے یا کم از کم غیر جانب دار رہتے، لیکن اس نازک موقع پر ان بدبختوں نے غدّاری پر کمر باندھی اور حملہ آوروں سے ساز باز کر کے شہر کے امن و امان میں خلل ڈالنا شروع کر دیا۔ ان کا یہ اقدام مسلمانوں کی پشت میں خنجر گھونپنے کے مترادف تھا۔ سرورِ عالمؐ نے اندرونی اور بیرونی خطرے کے پیشِ نظر عورتوں بچوں اور معذوروں کو ایک محفوظ حصار میں منتقل کر دیا اور حضرت سعدؓ بن معاذ رئیس اوس اور حضرت سعدؓ بن عبادہ رئیسِ خزرج کو بنو قریظہ کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا کہ اس موقع پر شرارت نہ کرو۔ لیکن ان بدطینتوں نے حضوؐر کے پیغام کا یہ جواب دیا کہ ''ہم نہیں جانتے کہ محمدؐ کون ہے اور ہمارا اس کے ساتھ کوئی قول و اقرار ہے۔'' حضوؐر اس وقت تو خاموش ہو گئے،

لیکن جب حملہ آوروں کو اللہ تعالیٰ نے ہزیمت دی اور وہ خائب و خاسر مدینہ کا محاصرہ اٹھا کر بھاگ گئے تو آپ بنو قریظہ کے غدّاروں کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کے قلعے کا محاصرہ کرلیا۔

یہودیوں کو اپنے استحکامات پر بڑا غرور تھا، لیکن پچیس دن کے محاصرے کے بعد ان کی ہمتیں پست ہوگئیں اور انھوں نے سرورِ عالمؐ سے التجا کی کہ ابولبابہ رفاعہؓ بن المنذر کو ہمارے پاس آنے کی اجازت دیجیے، تاکہ ہم ان سے مشورہ کرسکیں۔ حضرت ابولبابہؓ کو خاص طور پر بُلانے کی وجہ یہ تھی کہ وہ قبیلہ اوس سے تعلق رکھتے تھے اور بنو قریظہ اور اوس کے درمیان قدیم سے بڑے گہرے مراسم اور حلیفانہ تعلقات تھے۔ سرورِ عالمؐ نے بنو قریظہ کی درخواست قبول فرمالی اور حضرت ابولبابہؓ کو ان کے پاس جانے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

حضرت ابولبابہؓ قلعہ کے اندر گئے تو یہودیوں نے ان کی بے حد عزت و تکریم کی۔ اثنائے مشورہ میں یہودیوں نے ان سے پوچھا کہ ہم ہتھیار ڈال کر قلعہ سے باہر نکلیں یا نہیں۔ حضرت ابولبابہؓ نے یہودیوں کو ہتھیار ڈالنے کا مشورہ دیا، لیکن ساتھ ہی اپنے حلق کی طرف اشارہ کیا جس کا مطلب ان کو یہ بتانا تھا کہ تم لوگ غدّاری کی پاداش میں قتل کیے جاؤ گے۔ یہ اشارہ کر تو دیا مگر معًا احساس ہوا کہ میں نے مسلمانوں کا ایک جنگی راز فاش کردیا۔ اب یہودی مایوسی کے عالم میں سر بکف ہوکر کوئی خطرناک قدم اٹھا بیٹھیں اور مسلمانوں کو کوئی ضرر پہنچ جائے تو اس کی ذمہ داری مجھ پر ہوگی۔ اس خیال سے کانپ اُٹھے۔ اپنے آپ کو خدا اور خدا کے رسولؐ کی خیانت کا مرتکب سمجھا، بے اختیار انا للہ و انا الیہ راجعون پڑھنے لگے، آنکھوں سے سیلِ اشک رواں ہوگیا جس نے ڈاڑھی کو تر کردیا۔ قلعہ سے باہر نکلے تو سرورِ عالم ﷺ کو منھ دکھانے کی ہمت نہ پڑی۔ سیدھے مسجدِ نبوی میں پہنچے اور ایک موٹی زنجیر لے کر اپنے آپ کو ایک ستون سے باندھ دیا۔ دن رات بارگاہِ الٰہی میں گڑگڑاتے تھے کہ اے غفور الرحیم میری خطا بخش دے۔ کھانا پینا بالکل ترک ہوگیا۔ صرف نماز اور حوائج ضروریہ کے لیے زنجیر کھول لیتے اور فارغ ہونے کے بعد اپنے آپ کو اپنی لڑکی سے بندھوا لیتے۔ سرورِ عالمؐ کو ان کا حال معلوم ہوا تو آپؐ نے فرمایا:

''اب تو جو ہوا سو ہوا اگر ابولبابہؓ پہلے ہی میرے پاس آجاتے تو میں اللہ تعالیٰ سے ان کی مغفرت کے لیے دعا کرتا۔''

اُدھر یہودیوں کو اللہ تعالیٰ نے خائب و خاسر کیا اور انھیں کوئی شرارت کرنے کی جرأت

نہ ہوئی۔ حضورؐ نے ان پر غلبہ پا کر مردوں کو قتل کرادیا اور عورتوں سے اسیرانِ جنگ کا سلوک کیا۔
حضرت ابولبابہؓ کو اپنے اوپر وارد کی ہوئی سزا بھگتتے کئی روز گزر گئے۔ اس دوران میں روتے روتے ان کی آنکھیں سوج گئیں، نظر کمزور ہوگئی اور کان بہرے ہوگئے۔ کبھی کبھی ان کی لڑکی ایک خرما ان کے منہ میں ڈال دیتی اور پانی کے دو گھونٹ پلادیتی، اس کے سوا ان کی کوئی خوراک نہیں تھی۔ ایک دن ضعف و ناتوانی کے عالم میں بے ہوش ہوکر گر گئے۔ اس وقت رحمتِ الٰہی کو جوش آگیا اور مہبطِ وحی و رسالتؐ پر طلوعِ فجر سے پیشتر آیاتِ توبہ کا نزول ہوا۔

''مسلمانو! تم اللہ رسول کے معاملہ اور اپنی امانتوں میں خیانت نہ کرو، حالاں کہ تم کو اس کا علم ہے اور اچھی طرح جان لو کہ بے شک تمھارا مال اور اولا دفتنہ ہیں، اور اللہ کے پاس بڑا اجر ہے۔ اے ایمان والو! تم اگر اللہ سے ڈرو گے تو وہ تم کو ممتاز کرے گا اور تمھاری برائیاں دُور کرے گا اور تمھاری مغفرت کرے گا اور اللہ بڑا فضل کرنے والا ہے۔''

حضورؐ اس وقت حضرت اُمِ سلمہؓ کے حجرے میں تھے۔ نزولِ وحی پر آپؐ متبسّم ہوگئے اور روئے انور پر بشاشت پھیل گئی۔ حضرت اُمِ سلمہؓ نے عرض کیا:

''یارسول اللہ! اللہ آپ کو ہمیشہ ہنسائے معاملہ کیا ہے؟''

حضورؐ نے فرمایا: ''ابولبابہ کی توبہ قبول ہوگئی۔''

حضرت اُمِ سلمہؓ نے عرض کی: ''میرے ماں باپ آپؐ پر قربان اگر اجازت ہو تو یہ مژدہ ابولبابہؓ کو سنادوں۔''

حضورؐ نے فرمایا: ''ہاں اگر تم چاہو۔''

حضرت اُمِ سلمہؓ کا حجرہ مسجدِ نبوی کے بالکل قریب تھا۔ انھوں نے وہیں سے پکار کر فرمایا: ''ابولبابہ مبارک ہو، تمھاری توبہ قبول ہوگئی۔'' کچھ اور لوگوں نے بھی اُمّ المومنینؓ کی بات سن لی اور ان کے ذریعے یہ خبر آناً فاناً سارے شہر میں پھیل گئی۔ لوگ جوق در جوق حضرت ابولبابہؓ کو مبارک باد دینے مسجدِ نبوی کی طرف لپکے۔ ادھر حضرت ابولبابہؓ کو بھی ہوش آگیا۔ لوگ انھیں کھولنے لگے تو سختی سے منع کردیا اور کہا:

''جب تک رسول اللہ ﷺ مجھ خطا کار کو خود نہ کھولیں گے میں اسی ستون سے بندھا رہوں گا۔''

رحمتِ عالم ﷺ نمازِ فجر کے لیے تشریف لائے تو اپنے دستِ مبارک سے حضرت ابولبابہؓ کو کھولا۔ وہ فرطِ مسرّت سے بے خود ہو گئے اور حضورؐ کے پائے اقدس سے لپٹ کر عرض کی:

"یا رسول اللہؐ! میں اپنا سب گھربار راہِ حق میں صدقہ کرتا ہوں۔ آپؐ مجھے ہمیشہ کے لیے اپنے قدموں میں رہنے کی اجازت مرحمت فرمائیں۔"

حضورؐ نے فرمایا: "صرف ایک تہائی مال کا صدقہ کرو۔"

حضرت ابولبابہؓ نے تعمیلِ ارشاد کی اور پھر زندگی بھر اپنے ہر قول و فعل میں غایت درجہ کا احتیاط سے کام لیتے رہے۔ یہاں تک کہ روایتِ حدیث سے بھی حتی الوسع احتراز کرتے تھے کہ مبادا ان کے منھ سے کوئی ایسا لفظ رسولِ اکرم ﷺ سے منسوب ہو جائے جو آپؐ نے فی الواقع ارشاد نہ فرمایا ہو۔ اس لیے ان کی مرویات کی تعداد بہت قلیل ہے۔

بعض روایتوں میں ہے کہ ستون سے باندھنے کا واقعہ غزوۂ تبوک کے موقع پر پیش آیا کیوں کہ حضرت ابولبابہؓ محض تساہل کی بنا پر اس غزوہ میں شریک نہیں ہو سکے تھے، لیکن یہ روایتیں اس لحاظ سے محلِ نظر ہیں کہ قرآنِ کریم کی رُو سے صرف تین سچے مسلمان غزوۂ تبوک میں بغیر کسی عذر کے، حضورؐ کی ہم رکابی کا شرف حاصل نہ کر سکے تھے۔ مفسرین نے بالاتفاق ان کے نام حضرت کعبؓ بن مالک، ہلالؓ بن اُمیہ اور مرارہؓ بن ربیع بتائے ہیں، اس لیے صحیح یہی ہے کہ حضرت ابولبابہؓ غزوۂ تبوک کے شرکاء میں سے تھے اور یہ واقعہ غزوۂ بنو قریظہ کے موقع پر ہی پیش آیا تھا۔

(۴)

ذی قعدہ ۶ھ میں حضرت ابولبابہؓ کو بیعتِ رضوان (خدا کی خوش نودی کی بیعت) میں شریک ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ اس طرح وہ ان چودہ سو "اصحاب الشجرۃ" کے مقدس گروہ میں شامل ہو گئے۔ جن کو اللہ تعالیٰ نے کھلے لفظوں میں اپنی خوش نودی کی بشارت دی۔

۸ھ میں وہ ان دس ہزار قدوسیوں میں سے ایک تھے جو فتح مکہ کے موقع پر رحمتِ عالم ﷺ کے ہم رکاب تھے۔ غزوۂ فتح میں ان کو یہ امتیاز حاصل ہوا کہ سرورِ عالمؐ نے انصار عمروؓ بن عوف کا علَم انھیں مرحمت فرمایا۔ اس کے بعد وہ غزوۂ حنین، طائف اور تبوک میں مجاہدانہ شریک ہوئے۔ سرورِ عالم ﷺ کے وصال کے بعد حضرت ابولبابہؓ کافی عرصہ حیات رہے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے عہدِ خلافت میں کسی وقت وفات پائی۔ (سالِ وفات کے بارے میں سخت اختلاف ہے)

اس دوران میں ان کی کسی سرگرمی کا سراغ نہیں ملتا۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے حضورؐ کے بعد اپنا بیشتر وقت خاموشی کے ساتھ یادِ الٰہی میں گزارا۔ بعض روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں رحمتِ دوعالم ﷺ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کرنے کا خاص التزام تھا۔ یہاں تک کہ معمولی معمولی باتوں میں بھی حضورؐ کا اتباع کرتے تھے اس طرح وہ اخلاق ومحامد کا ایک پیکرِ جمیل بن گئے تھے اور فقیہہ الامت حضرت عبداللہ بن عمرؓ جیسے جلیل القدر صحابی اور حضرت سعیدؒ بن مسیّب، عبدالرحمٰنؒ بن یزید بن جابر، ابوبکرؒ بن عمرو بن حزم، سالمؒ بن عبداللہ اور نافعؒ مولیٰ ابن عمرؓ جیسے سرآمدِ روزگار تابعین بھی ان سے استفاضہ کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت عبداللہ بن سلامؓ

(۱)

رحمتِ عالم ﷺ کے مدینہ منورہ میں نزول اجلال فرمانے کے کچھ عرصہ بعد کا ذکر ہے کہ ایک دن ادھیڑ عمر کے ایک وجیہ اور شکیل آدمی بارگاہِ نبویؐ میں حاضر ہوئے اور یوں عرض پیرا ہوئے:

> ''یارسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان۔ گزشتہ شب میں نے ایک عجیب و غریب خواب دیکھا ہے۔ میں نے دیکھا کہ میں کسی باغ میں ہوں، جس کی وسعت اور سرسبزی حدِ بیان سے باہر ہے۔ اس چمن کے بیچ میں ایک لوہے کا ستون ہے جس کا نیچے کا سرا زمین میں ہے اور اوپر کا آسمان تک پہنچا ہوا ہے۔ اوپر کی جانب ایک عروہ (حلقہ یا کڑا) ہے۔ مجھ سے کسی نے کہا کہ اس ستون پر چڑھ جاؤ۔ میں نے کہا، میں نہیں چڑھ سکتا۔ اتنے میں ایک خادم آ گیا۔ اس نے پیچھے کی طرف سے میرے کپڑے اٹھائے اور میں نے اس کے اوپر چڑھنا شروع کیا یہاں تک کہ میں ستون کے اوپر پہنچ گیا اور اس کا حلقہ پکڑ لیا۔ کسی نے کہا اس کو مضبوط پکڑ لے۔ اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی۔''

حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ''جو باغ تم نے دیکھا وہ اسلام کا باغ ہے اور ستون اس کے احکام وارکان ہیں اور وہ عروہ (حلقہ) عروۃ الوثقیٰ ہے جس کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے: فَقَدِ اسْتَمْسَکَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا (البقرہ:۲۵۶) پس تم تا دمِ واپسیں اسلام پر قائم رہو گے۔''

زبانِ رسالت سے اپنے خواب کی یہ تعبیر سن کر وہ صاحب فرطِ مسرت سے بے خود ہو گئے اور ان کی زبان پر تکبیر و تہلیل جاری ہو گئی۔ یہ صاحب جن کو سرکارِ دو عالم ﷺ نے مرتے دم تک اسلام پر قائم رہنے کی بشارت دی حضرت ابو یوسف عبداللہؓ بن سلام تھے۔

(۲)

سیّدنا ابو یوسف عبد اللہؓ بن سلام بن حارث کا شمار نہایت جلیل القدر ''اہلِ کتاب'' صحابہؓ میں ہوتا ہے۔ ان کا تعلق یہودِ مدینہ کے خاندان قینقاع سے تھا۔ اہل سِیَر نے لکھا ہے کہ وہ حضرت یوسف علیہ السلام کی نسل سے تھے۔ ان کے خاندان بنو قینقاع کے لوگ عام طور پر صناع اور زراعت پیشہ تھے آہن گری اور زرگری میں وہ خاص مہارت رکھتے تھے، ''قین'' عربی میں لوہار کو کہتے ہیں اور ''قاع'' اس نرم اور ہموار زمین کو جو قابلِ کاشت ہو۔ چناں چہ بنو قینقاع پیشہ کے لحاظ سے انھی خصوصیتوں کے حامل تھے۔ مدینہ کے دوسرے یہودی قبائل کے مقابلے میں وہ زیادہ مضبوط اور طاقت ور تھے اور خزرج کے خاندان بنی عوف کی شاخ قواقل کے حلیف تھے۔

حضرت عبد اللہؓ بن سلام جن کا اصل نام حصین تھا، بنو قینقاع کے رئیس تھے اور مدینہ میں تورات کے سب سے بڑے عالم تھے۔ اس کے علاوہ ان کو انجیل پر بھی عبور حاصل تھا۔ انھوں نے تورات میں نبیِ آخر الزماںؐ کی نشانیاں پڑھی تھیں اور ان کی آرزو تھی کہ کاش وہ اس خیر الرسلؐ کا زمانہ پائیں اور اس کے جمال جہاں آرا سے اپنی آنکھیں روشن کریں۔

۱۱ نبوّت کے موسمِ حج میں جب بنو خزرج کے چھ سعید الفطرت انسان مشرّف بہ اسلام ہونے کے بعد مکہ سے مدینہ واپس آئے تو انھوں نے حضرت عبد اللہؓ بن سلام سے ذکر کیا کہ آپ جس نبیِ آخر الزماںؐ کی آمد کا تذکرہ کیا کرتے تھے وہ مکہ میں مبعوث ہو چکے ہیں اور ہم لوگوں نے بہ رضا و رغبت ان کی اطاعت قبول کر لی ہے۔ حضرت عبد اللہؓ بن سلام نے ان سے مدعیِ رسالت کی علامتیں دریافت کیں تو ان کو عین ان علامات کے مطابق پایا جو وہ تورات میں پڑھ چکے تھے۔ چناں چہ ان کی کِشتِ دل میں اسی وقت اسلام کا بیج جڑ پکڑ گیا اور وہ سید الانام خیر الرُسل کی زیارت کے لیے دن رات بے چین رہنے لگے۔ بیعتِ عقبہ ثانیہ کے بعد جب اسلام کا چرچا اوس اور خزرج کے گھر گھر میں پھیل گیا تو حضرت عبد اللہؓ بن سلام کے اشتیاقِ دید میں اور شدّت پیدا ہو گئی۔ ۱۳ نبوّت میں جس وقت رحمتِ عالم ﷺ نے مدینہ منورہ کو اپنے قدومِ میمنت لزوم سے مشرف فرمایا، حضرت عبد اللہ بن سلام اپنے باغ میں تھے اور بچوں کے لیے پھل اتروا رہے تھے۔ ان کی پھوپھی خالدہ بنتِ حارث بھی ان کے پاس باغ میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ اتنے میں کسی نے آ کر حضور پُر نور ﷺ کی تشریف آوری کا ذکر کیا۔ حضرت عبد اللہ کے لیے یہ خبر مژدۂ جاں فزا

ثابت ہوئی انھوں نے فرطِ مسرت میں نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ ان کی پھوپھی کہنے لگیں:

''حصین ان صاحب کے آنے سے تمھیں اتنی خوشی ہوئی ہے کہ شاید موسیٰؑ بن عمران بھی تشریف لاتے تو تم اتنے مسرور نہ ہوتے۔''

انھوں نے کہا۔ ''پھوپھی جان، خدا کی قسم یہ بھی موسیٰ علیہ السلام کے بھائی ہیں اور اسی مقصد کے لیے دنیا میں تشریف لائے ہیں جس کے لیے موسیٰؑ تشریف لائے تھے۔''

پھوپھی نے کہا۔ ''برادر زادے کیا واقعی یہ ''وہ نبی'' ہیں جن کی توریت اور دوسری آسمانی کتابوں میں خبر دی گئی ہے؟''

حضرت عبداللہ نے کہا۔ ''بے شک یہ وہی نبی ہیں!''

پھوپھی بولیں۔ ''پھر تو ہماری بڑی خوش قسمتی ہے کہ نبیِ آخر الزماںؐ نے خود ہمارے شہر میں نزولِ اجلال فرمایا ہے۔''

علّامہ ابن ہشامؒ نے بیان کیا ہے کہ اس گفتگو کے بعد حضرت عبداللہؓ بن سلام بارگاہِ نبوت میں حاضر ہوئے۔ خالدہ بنتِ حارث بھی ان کے پیچھے پیچھے گئیں اور سعادت اندوزِ اسلام ہو کر گھر لوٹیں۔ اب ان کی یہ آرزو تھی کہ گھر کے دوسرے افراد بھی اسلام کی نعمتِ عظمیٰ سے محروم نہ رہیں۔ چناں چہ انھوں نے تمام اہلِ خانہ کو اسلام کی تلقین کی اور وہ سب مشرف بہ اسلام ہو گئے۔

خود حضرت عبداللہؓ بن سلام نے روایت کی ہے کہ جب سے میں نے رسول اللہ ﷺ کی بعثت کا چرچا سنا تھا میں آپؐ پر غائبانہ ایمان لا چکا تھا۔ لیکن میں نے اپنے ایمان کو یہود سے مخفی رکھا۔ جب حضورؐ مدینہ تشریف لائے تو میں آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپؐ کو دیکھ کر اور آپؐ کے ارشادات سن کر مجھے پختہ یقین ہو گیا کہ آپؐ ہی نبیِ آخر الزماں[1] ہیں تاہم مزید اطمینان کے لیے میں نے حضورؐ سے کچھ سوال پوچھنے کا قصد کیا۔ چناں چہ جب رسول اللہ ﷺ بنو نجّار کے محلے میں (حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے گھر) مقیم ہو گئے تو میں دوبارہ آپؐ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا اور آپؐ سے کچھ سوالات پوچھ کر مشرف بہ اسلام ہو گیا۔

---

(۱) بیان کیا جاتا ہے کہ حضور ﷺ کے یہ ارشادات حضرت عبداللہؓ بن سلام کو ساری عمر یاد رہے۔ ''لوگو اپنے بیگانے سب کو سلام کیا کرو، لوگوں کو کھانا کھلایا کرو۔ رشتہ داروں سے اچھا سلوک کیا کرو۔ رات کو جب لوگ سو رہے ہوں تو تم خدا کی عبادت کیا کرو۔''

صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عبد اللہؓ بن سلام نے حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں آپؐ سے تین باتیں دریافت کرتا ہوں جو نبیِ مرسل کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔

۱- علاماتِ قیامت میں پہلی علامت کون سی ہے؟

۲- اہلِ جنت کو پہلی چیز کھانے کو کیا ملے گی؟

۳- وہ کون سا سبب ہے جس کے باعث بچہ کبھی تو ماں کی شکل پر ہوتا ہے اور کبھی باپ کی شکل پر؟

حضور ﷺ نے ان تینوں سوالوں کے جواب دیے تو حضرت عبد اللہؓ بے اختیار پکار اٹھے:

اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اِنَّکَ رَسُوْلُ اللّٰهِ؟

''میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور آپؐ اللہ کے رسول ہیں۔''(۱)

قبولِ اسلام کے بعد حضرت عبد اللہؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ میں قومِ یہود کا سردار ہوں اور ان کے سردار کا بیٹا ہوں۔ میری قوم مجھے عالم بن عالم بھی تسلیم کرتی ہے اور میرا بے حد احترام کرتی ہے لیکن مجھے علم ہے کہ میری قوم کے لوگ سخت مفتری اور دروغ گو ہیں۔ آپ سر برآوردہ یہودیوں کو بلایئے میں پوشیدہ ہو جاؤں گا۔ آپ ان سے میرے قبول اسلام کا ذکر کیے بغیر ان سے میری بابت دریافت فرمایئے۔'' حضورؐ نے اسی وقت سر برآوردہ یہودیوں کو بلا بھیجا اور ان سے فرمایا:

''اے لوگو! میں تمھیں اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔ تم یقین کرو کہ اسلام دینِ حق ہے۔
میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں پس تم میری دعوت کو قبول کرو۔''

رؤسائے یہود نے کہا: ''ہم اسلام قبول نہیں کرنا چاہتے۔ ہم جس طریقے پر ہیں وہی ہمارے لیے بہتر ہے۔''

حضورؐ نے پوچھا ''اے صاحبو! یہ بتاؤ کہ حصین بن سلام تم میں کس پایہ کے آدمی ہیں؟''

انھوں نے کہا: ''وہ ہم میں سب سے اچھے ہیں اور سب سے اچھے کے فرزند ہیں۔ وہ ہمارے سردار اور مخدوم ہیں ان کے برابر کوئی عالم نہیں اور ان سے زیادہ کوئی محترم نہیں۔''

---

(۱) حضور ﷺ نے پہلے سوال کا جواب یہ دیا کہ وہ ایک آگ ہوگی جو لوگوں کو مشرق سے مغرب کی طرف ہنکا کر لے جائے گی۔ دوسرے سوال کے جواب میں آپؐ نے فرمایا کہ مچھلی کا جگر ہوگا۔ تیسرے سوال کا جواب آپؐ نے یہ دیا کہ ماں کا مادۂ تولید غالب ہو تو بچہ ماں کی شکل پر اور باپ کا مادۂ تولید غالب ہو تو بچہ باپ کی شکل پر پیدا ہوتا ہے۔

حضورؐ نے فرمایا: ''اچھا اگر وہ مسلمان ہو جائیں تو تم ان کی تقلید کرو گے؟''

کہنے لگے'' خدا نہ کرے کہ وہ مسلمان ہوں ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔''

اب حضورؐ نے حضرت عبد اللہؓ بن سلام کو آواز دی جو مکان کے ایک گوشہ میں پنہاں تھے۔ وہ بلند آواز سے کلمۂ شہادت پڑھتے ہوئے باہر نکل آئے اور یہودیوں سے کہا:

''اے لوگو! خدا سے ڈرو، تمھیں خوب معلوم ہے کہ یہ اللہ کے رسول ہیں اور ان کا دین بالکل سچا ہے۔ پھر بھی تم ایمان لانے سے گریز کرتے ہو۔''

یہ سُن کر یہود مشتعل ہو گئے اور چیخ چیخ کر کہنے لگے:

''تم جھوٹے ہو اور ہماری جماعت کے بدترین آدمی ہو اور بدترین آدمی کے بیٹے ہو۔''

حضرت عبد اللہؓ بن سلام نے حضورؐ کی خدمت میں عرض کیا۔ ''یا رسول اللہ آپ نے دیکھا مجھے ان کی اسی افترا پردازی کا کھٹکا تھا۔''

حضورؐ نے فرمایا کہ'' اب سے تم حصین کی بہ جائے عبد اللہ ہو۔'' چناں چہ انھوں نے اسی نام سے شہرت پائی۔

ابن عیینہؒ نے ''لباب النقول'' میں بیان کیا ہے کہ حضرت عبد اللہؓ بن سلام نے شرفِ اسلام سے بہرہ یاب ہونے کے بعد اپنے دو بھتیجوں سلمہ اور مہاجر کو بڑی دردمندی اور اخلاص کے ساتھ اسلام کی دعوت دی اور ان سے فرمایا، ''تم جانتے ہو کہ تورات میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ میں اسمٰعیلؑ کی نسل سے ایک نبی مبعوث کروں گا جس کا نام احمدؐ ہوگا۔ جو کوئی اس کو قبول کرے گا نجات پائے گا اور جو اس کا انکار کرے گا وہ لعنت کا سزاوار ہوگا۔''

یہ سن کر سلمہ نے تو فوراً اسلام قبول کر لیا لیکن مہاجر نے دعوتِ حق قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے متعلق قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی:

وَ مَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ط (البقرہ:۱۳۰)

''اور کون ہے جو ابراہیمؑ کے طریقے سے انحراف کرے مگر وہی جس کی عقل ماری گئی ہو۔''

(۳)

قبولِ اسلام کے بعد حضرت عبد اللہؓ بن سلام نے اطاعتِ خداوندی اور اتباعِ رسول کو اپنی زندگی کا مسلک بنا لیا۔ وہ حضورؐ کے ارشادات کو بہ غور سُنتے اور ان کو حرزِ جان بنا لیتے تھے۔ اسی

طرح نشست و برخاست، رفتار، گفتار ہر بات میں رحمتِ عالم ﷺ کی متابعت کرتے تھے۔ خشیتِ الٰہی اور عبادت سے شغف کا یہ عالم تھا کہ چہرے پر ہر وقت خشوع وخضوع کے آثار طاری رہتے تھے۔ اپنے علم وفضل، خوف خدا، کثرتِ عبادت اور اتباعِ سنت کی بنا پر انھوں نے بارگاہِ رسالتؐ میں درجۂ محبوبیت حاصل کرلیا تھا۔ اسی لیے حضورؐ فرمایا کرتے تھے کہ ''عبداللہؓ بن سلام اہلِ جنت سے ہیں۔'' اس کے باوجود ان کے مزاج میں انتہا درجے کا انکسار تھا۔

حضرت قیس بن عباد تابعیؒ کہتے ہیں کہ ''میں ایک دن مسجدِ نبویؐ میں بیٹھا تھا کہ اتنے میں ایک بزرگ وہاں آئے۔ ان کے چہرے پر خشوع وطاعت کے آثار نمایاں تھے۔ انھوں نے دو رکعت نماز ادا کی۔ اس اثنا میں لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ شخص جنتی ہے۔ وہ نماز پڑھ کر مسجد سے چلے تو میں ان کے پیچھے ہولیا۔ گھر پہنچ کر میں نے ان کی خدمت میں عرض کیا کہ مسجد میں لوگ آپ کی نسبت کہہ رہے تھے کہ یہ شخص جنتی ہے۔ انھوں نے فرمایا، کسی شخص کو ایسی بات منھ سے نکالنی نہیں چاہیے جس کا اسے حتمی طور پر علم نہ ہو۔ تاہم میں تمھیں بتاؤں کہ لوگوں کے اس خیال کی بنیاد کیا ہے، میں نے رسول اللہ ﷺ کے عہدِ سعادت میں ایک مرتبہ خواب دیکھا تھا جس کی تعبیر حضورؐ نے یہ بتائی تھی کہ تم مرتے دم تک اسلام پر قائم رہو گے۔'' یہ بزرگ حضرت عبداللہؓ بن سلام تھے اور انھوں نے یہ بات ازراہِ انکسار فرمائی۔''

ایک مرتبہ لوگوں نے دیکھا کہ حضرت عبداللہؓ بن سلام اپنی کمر پر لکڑیوں کا گٹھار کھے ہوئے بازار میں جا رہے ہیں۔ چوں کہ اپنے قبیلے کے رئیس تھے اور اللہ نے دولتِ دنیا سے نواز رکھا تھا، لوگ انھیں اس حالت میں دیکھ کر بہت حیران ہوئے۔ انھوں نے کہا۔ ''ابو یوسف اللہ تعالیٰ نے آپ کو سب کچھ دے رکھا ہے، آپ یہ لکڑیاں کسی مزدور سے بھی اٹھوا سکتے تھے۔''

فرمایا، ''میں اس طرح کبرِ نفس کا قلع قمع کرتا ہوں کیوں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ جس کے دل میں رائی کے برابر بھی تکبر ہوگا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔''

بیشتر اربابِ سِیَر نے غزوۂ بدر اور اُحد کے شرکاء میں حضرت عبداللہؓ بن سلام کا نام نہیں لیا۔ لیکن غزوۂ احزاب کے مجاہدینؓ میں ان کا نام صراحت کے ساتھ لیا ہے۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ وہ اس کے بعد کے غزوات میں شریک رہے۔ شمس الائمہ سرخسیؒ نے بنو نضیر کے محاصرے کا ذکر کرتے ہوئے حضرت عبداللہؓ بن سلام کا نام خصوصیت سے لیا ہے۔ یہ یہودی خاندان مدینہ میں

وادیِ بطحا کے قریب آباد تھا۔ انھوں نے حضورؐ سے معاہدۂ امن کر رکھا تھا لیکن بعد میں قریشِ مکہ کے اکسانے پر اس سے منحرف ہو گیا۔ ۴ھ میں حضورؐ ایک ضرورت سے ان کے محلے میں تشریف لے گئے تو انھوں نے آپؐ کو شہید کرنے کی ٹھانی اور ابن حجاش نامی ایک یہودی کو اس دیوار پر چڑھا دیا جس کے نیچے آپ تشریف فرما تھے۔ ابن حجاش ایک بھاری پتھر آپؐ پر گرانے لگا کہ اس کی شرارت کی خبر اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو دے دی اور آپ وہاں سے اٹھ کر بہ خیریت واپس تشریف لے آئے۔ اس کے بعد آپؐ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ بنونضیر کا محاصرہ کرلیں اور ان کے نخلستان صرف کر دیں۔ اس کام پر جو لوگ مامور ہوئے ان میں حضرت عبداللہؓ بن سلام بھی تھے۔ بنونضیر نے بہت جلد ہتھیار ڈال دیے لیکن حضورؐ نے انھیں مدینہ میں رہنے کی اجازت نہ دی اور خیبر کی طرف جلاوطن کر دیا۔ یہ لوگ چھ سو اونٹوں پر اپنا مال و اسباب لاد کر باجے بجاتے ہوئے مدینہ سے رخصت ہوئے۔ حافظ ابنِ عبدالبرؒ نے استیعاب میں حضرت عبداللہؓ بن سلام سے یہ قول منسوب کیا ہے کہ لوگو تم کو ایک مرتبہ قریش سے لڑائی پیش آئے گی اگر اس وقت مجھ میں طاقت نہ ہو تو تخت پر بٹھا کر مجھ کو فریقین کی صفوں کے درمیان رکھ دینا۔ معلوم نہیں حضرت عبداللہؓ بن سلام نے یہ بات کس موقع پر کہی۔ اگر غزوۂ بدر سے پہلے کہی تو وہ بدر اور اُحد میں ضرور شریک ہوئے ہوں گے ورنہ عدمِ شرکت کا کوئی خاص سبب ہوگا۔

(۴)

حضرت عبداللہؓ بن سلام کو بارگاہِ نبویؐ میں جو تقرب حاصل تھا اس کی بنا پر تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم ان کی بے حد تعظیم و تکریم کرتے تھے۔ حضورؐ کے وصال کے بعد وہ مدینہ منورہ میں اپنا بیشتر وقت عبادت اور درس و افتاء میں گزارتے تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ صلحِ بیت المقدس کے سلسلے میں مدینہ سے شام روانہ ہوئے تو چند مہاجرین و انصار کو اپنے ساتھ لے گئے ان میں سے ایک حضرت عبداللہؓ بن سلام تھے۔

سیدنا حضرت عثمانؓ کے عہدِ خلافت میں جب دورِ فتن کا آغاز ہوا اور باغیوں نے امیر المومنینؓ کے مکان کا محاصرہ کرلیا تو حضرت عبداللہؓ بن سلام امیر المومنینؓ کے گھر تشریف لے گئے اور ان سے کہا کہ "یہ لوگ آپ کو قتل کرنے پر تلے ہوئے ہیں، آپ فرمائیں کہ میں آپ کی کیا

مدد کر سکتا ہوں۔"

حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ باہر جا کر اس مجمع کو منتشر کرنے کی کوشش کریں حضرت عبداللہؓ بن سلام باہر تشریف لے گئے اور بپھرے ہوئے مجمع کے سامنے یہ خطبہ دیا:

"سب تعریفیں اللہ عزوجل کے لائق ہیں۔ وہی ذاتِ واحد معبودِ حقیقی ہے۔ نہ اس کو کسی نے جنا اور نہ اس نے کسی کو جنا۔ اما بعد اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ ﷺ کو بشیر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے کہ جو شخص آپؐ کی اطاعت کرے اس کو جنت کی بشارت دیں اور جو آپؐ کی نافرمانی کرے اس کو جہنم سے ڈرائیں اور اللہ نے ان لوگوں کو غالب کر دیا جنھوں نے پورے دین کا اتباع کیا۔ اگرچہ یہ بات مشرکین کو بُری لگی پھر حضورؐ نے مدینہ منورہ کو اپنا مسکن بنایا۔ اس کو دارِ ہجرت اور دارِ ایمان قرار دیا۔ پس خدا کی قسم جب سے آپؐ مدینہ منورہ میں تشریف لائے فرشتے اس شہر کو گھیرے رہے اور اسی وقت سے اللہ کی تلوار آج تک میان میں رکھی گئی۔ بے شک اللہ جل شانہٗ نے حضرت محمد ﷺ کو حق کے ساتھ بھیجا۔ پس جو شخص راہِ ہدایت پر گام زن ہوا اس نے اللہ کی ہدایت کے ساتھ راہ ہدایت اختیار کی اور جو شخص گم راہ ہوا وہ بیان اور حجت کے بعد گم راہ ہوا۔ اور سُن لو کہ گزشتہ زمانے میں اگر کوئی نبی قتل کیا گیا تو اس کے عوض ستر ہزار جنگجو قتل کیے گئے اور کبھی کوئی خلیفہ قتل کیا گیا تو اس کے عوض پینتیس ہزار لڑنے والے قتل کیے گئے۔ تم ان شیخِ کبیر (امیر المومنین حضرت عثمانؓ) کے قتل میں جلدی مت کرو۔ پس خدا کی قسم جو آدمی ان کے قتل میں شریک ہوگا وہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے سامنے اس طرح پیش ہوگا کہ اس کا ہاتھ کٹا ہوا اور شل ہوگا۔ اور تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ جو حق باپ کا اس کے بیٹے پر ہوتا ہے وہی حق امیر المؤمنین کا تمھارے اوپر ہے۔"

حضرت عبداللہؓ بن سلام کا خطبہ ابھی یہیں تک پہنچا تھا کہ باغی بھڑک اٹھے اور چلّانے لگے۔ "اس یہودی (نعوذ باللہ) نے جھوٹ کہا۔ اسے اور عثمان دونوں کو قتل کر ڈالو۔"

حضرت عبداللہؓ بن سلام نے ان پر نگاہِ خشم گیں ڈالتے ہوئے فرمایا:

"تم نے جھوٹ کہا، خدا کی قسم تم گنہ گار ہو، میں یہودی نہیں ہوں۔ میں تو مسلمانوں میں سے ایک ہوں۔ جاہلیت میں میرا نام حصین تھا، رسول اللہ ﷺ نے عبداللہ رکھا۔ میرے اسلام کو اللہ جانتا ہے اور اس کا رسول جانتا ہے مومنین جانتے ہیں۔ قرآنِ کریم کی یہ آیتیں

میرے ہی متعلق نازل ہوئی ہیں:

قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۢ بَيْنِيْ وَ بَيْنَكُمْ ۙ وَ مَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ ○ (الرعد:۴۳)

''کہہ دیجیے اللہ میرے اور تمھارے درمیان کافی ہے گواہی کے لیے اور وہ لوگ کافی ہیں جن کے پاس کتاب کا علم ہے۔''

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَ كَفَرْتُمْ بِهٖ وَ شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى مِثْلِهٖ فَاٰمَنَ وَاسْتَكْبَرْتُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ○ (الاحقاف:۱۰)

''کہہ دیجیے کیا تم نے دیکھا ہے اگر یہ اللہ کے نزدیک ہے اور تم نے اس کا انکار کیا حالاں کہ بنی اسرائیل میں سے بھی ایک گواہ نے اس جیسے پر گواہی دی اور ایمان لے آیا اور تم نے تکبر کیا تحقیق اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

پس یاد رکھو اگر تم نے امیر المومنینؓ کو قتل کیا تو خدا کی قسم فرشتے مدینے سے نکل جائیں گے اور اللہ کی وہ تلوار نیام سے باہر نکل آئے گی جو اس وقت تک نیام میں بند ہے اور پھر قیامت تک نیام میں واپس نہ جائے گی۔''

باغیوں پر حضرت عبداللہؓ بن سلام کی تقریر کا کچھ اثر نہ ہوا اور بالآخر انھوں نے حضرت عثمان ذوالنورینؓ کو شہید کر کے چھوڑا۔ حضرت عبداللہؓ بن سلام کو امیر المومنینؓ کی شہادت سے سخت صدمہ پہنچا اور ان کی زبان پر بے اختیار یہ الفاظ آ گئے: ''آہ آج عرب کی قوّت کا خاتمہ ہو گیا۔'' اس کے بعد وہ گھر میں گوشہ نشین ہو گئے۔

حافظ ابن حجرؒ نے اصابہ میں لکھا ہے کہ عہد مرتضوی میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ دارالخلافہ کو مدینے سے کوفہ منتقل کرنے لگے تو حضرت عبداللہؓ بن سلام ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی:

''امیر المؤمنین اگر آپ نے اس وقت رسول اللہ ﷺ کا منبر چھوڑ دیا تو پھر زندگی میں شاید ہی اس کی زیارت نصیب ہو۔''

حضرت علیؓ نے لوگوں سے فرمایا: ''عبداللہؓ بن سلام نہایت نیک آدمی ہیں اسی لیے وہ

ایسا کہتے ہیں۔" لیکن حضرت عبداللہؓ بن سلام کا خدشہ درست ثابت ہوا اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے چند سال بعد کوفہ میں ہی شہادت پائی۔

حضرت عبداللہؓ بن سلام نے ۴۳ھ میں (بہ عہدِ حکومت امیر معاویہؓ) مدینہ منورہ میں وفات پائی۔ انھوں نے اپنے پیچھے دو بیٹے چھوڑے یوسفؓ اور محمدؓ۔ دونوں شرفِ صحابیت سے بہرہ ور تھے۔ حضرت یوسفؓ کے بارے میں روایت ہے کہ وہ پیدا ہوئے تو حضرت عبداللہؓ بن سلام ان کو گود میں اٹھا کر دعا و برکت کے لیے حضورؐ کی خدمت میں لے گئے۔ حضورؐ نے ان کو اپنی گود میں بٹھایا، سر پر دستِ شفقت پھیرا اور یوسف نام تجویز فرمایا۔

(۵)

سیّدنا عبداللہؓ بن سلام اگرچہ طویل مدّت تک فیضانِ نبویؐ سے بہرہ یاب ہوئے تاہم وہ روایتِ حدیث میں بہت محتاط تھے۔ چناں چہ ان سے صرف پچیس احادیث مروی ہیں۔ ان کے راویوں میں حضرت انسؓ بن مالک، حضرت ابو ہریرہؓ، عبداللہؓ بن مغفل، زرارہؓ بن اوفی جیسے جلیل القدر صحابہ، ان کے صاحب زادے، پوتے اور کئی تابعین شامل ہیں۔ اپنے علم و فضل کی بہ دولت وہ مرجعِ انام بن گئے تھے اور بڑے بڑے عظیم المرتبت صحابہؓ ان سے مسائل اور احادیث دریافت کیا کرتے تھے۔ مسند امام احمدؒ بن حنبل میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے (جو صحابۂ مکثرین میں سرِفہرست ہیں) ایک مرتبہ حضرت عبداللہؓ بن سلام سے پوچھا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ جمعہ میں ایک گھڑی ایسی ہے کہ بندہ اگر اس میں خدا سے کچھ مانگے تو وہ ضرور اس کو دیتا ہے۔ مجھے بتائیے کہ وہ کون سی گھڑی۔ حضرت عبداللہؓ نے فرمایا، "عصر اور مغرب کے درمیان۔" حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا یہ کیسے ہوسکتا ہے، یہ ذکر تو خاص حالتِ نماز کا ہے اور عصر و مغرب کے درمیان کوئی نماز ہی نہیں۔ حضرت عبداللہؓ بن سلام نے فرمایا، کیا آپ کو وہ حدیثِ حضورؐ یاد نہیں جس میں آپؐ نے فرمایا ہے کہ جب تک کوئی شخص نماز کے انتظار میں ہوتا ہے وہ گویا نماز میں ہوتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا، آپ ٹھیک کہتے ہیں۔

جلیل القدر صحابی حضرت سلمان فارسیؓ کو حضرت عبداللہؓ سے بڑی محبت تھی۔ طبقات ابن سعد میں حضرت عبداللہؓ بن سلام سے روایت ہے کہ حضرت سلمانؓ نے مجھ سے کہا کہ اے میرے بھائی ہم میں سے جو اپنے ساتھی سے پہلے مرجائے تو وہ اپنے پیچھے رہنے والے ساتھی کو

دیکھنے ضرور آئے۔ میں نے کہا، ''ابو عبد اللہ کیا ایسا ہوسکتا ہے؟'' انھوں نے کہا، ''ہاں مؤمن کی روح آزاد کردی جاتی ہے وہ زمین پر جہاں چاہے جاسکتی ہے اور کافر کی روح قید میں رکھی جاتی ہے۔'' اس کے بعد حضرت سلمانؓ فوت ہوگئے۔ میں ان کی وفات کے بعد ایک دن دوپہر کو لیٹا ہوا تھا کہ نیند کا ایک جھٹکا سا لگا۔ میں نے دیکھا کہ سلمانؓ آئے اور السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہا۔ میں نے ان کے سلام کا جواب دے کر پوچھا، ''اے عبد اللہ کیا حال ہے؟'' انھوں نے کہا'' بہت بھلا'' پھر میں نے پوچھا۔ ''کس عمل کو آپ نے زیادہ افضل پایا۔'' انھوں نے فرمایا۔ ''توکل کو میں نے بڑا عجیب پایا اور تم توکل پر جمے رہنا توکل بہترین چیز ہے۔''

حافظ ذہبیؒ نے تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے کہ عبد اللہؓ بن سلام مدینہ میں اہل کتاب کے سب سے بڑے عالم تھے۔

دوسرے محدثین اور اہلِ سِیَر کے نزدیک حضرت عبد اللہؓ بن سلام قبولِ اسلام کے بعد قرآن کے بھی بہت بڑے عالم بن گئے تھے۔ ان کا مرتبۂ علمی کا اندازہ ترمذی کی اس روایت سے کیا جاسکتا ہے کہ امام الفقہاء حضرت معاذؓ بن جبل کے مرض الموت میں لوگوں نے ان سے وصیت کی درخواست کی تو انھوں نے فرمایا۔ ''میں رخصت ہوجاؤں گا مگر علم اپنی جگہ پر باقی رہے گا اور جو اس کی تلاش کرے گا خاص طور پر چار آدمیوں کے پاس پائے گا، ابو درداءؓ، سلمان فارسیؓ، عبد اللہؓ بن مسعود اور عبد اللہؓ بن سلام کے پاس۔ یہ عبد اللہؓ بن سلام پہلے یہودی تھے پھر مسلمان ہوئے۔ میں نے رسول اللہ ﷺ سے ان کے بارے میں یہ فرماتے سُنا ہے۔

انه عاشر عشرة الجنة۔''

جن صاحبِ رسولؐ کی شان خود اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بیان کی ہو اور جن کو فخر موجوداتؐ خیر الخلائق، سید المرسلین ﷺ نے جنّتی قرار دیا ہو، کون مسلمان ہے جو ان کی عظمت و شان کا معترف نہ ہوگا اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی آرزو نہ کرے گا؟

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت سعد بن ربیع انصاریؓ

(۱)

جنگِ احد کے بعد ایک دن ایک صحابی حضرت ابو بکر صدیقؓ سے ملنے گئے انھوں نے دیکھا کہ صدیقِ اکبرؓ لیٹے ہوئے ہیں اور ایک ننھی سی بچی کو اپنے سینے پر بٹھا رکھا ہے۔ نہایت محبت سے بار بار اس کو چوم رہے ہیں اور پیار کر رہے ہیں، انھوں نے حیران ہو کر پوچھا۔ اے ابو بکر یہ بچی کون ہے؟

فرمایا! ''یہ اس شخص کی لڑکی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے بہت بلند مرتبہ عطا کیا۔ اس نے رسول اللہ پر اپنی جان قربان کر دی اور قیامت کے دن وہ حضورؐ کے نقیبوں میں شمار کیا جائے گا۔''

صدیقِ اکبرؓ نے جس عظیم المرتبت شخص کی طرف اشارہ کیا وہ حضرت سعدؓ بن ربیع انصاری تھے۔

(۲)

حضرت سعدؓ بن ربیع مدینہ منوّرہ کے قبیلہ خزرج کے خاندان بنو حارث بن خزرج (بنو حارثہ) سے تعلق رکھتے تھے۔ طبقات ابن سعد میں ان کا شجرۂ نسب اس طرح درج ہے۔

سعد بن ربیع بن عمرو بن ابی زبیر بن مالک بن امراؤالقیس بن مالک اعز بن ثعلبہ بن کعب بن خزرج بن حارث بن خزرج اکبر۔ والدہ کا نام ہزیلہ تھا۔ حضرت سعدؓ کا شمار اپنے قبیلے کے نہایت متمول اور خوش حال لوگوں میں ہوتا تھا۔

علاّمہ ابنِ سعد نے لکھا ہے کہ وہ انصار کے ان چند لوگوں میں سے تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے اسے زمانۂ جاہلیت میں بڑا کمال سمجھا جاتا تھا۔

دولت اور ثروت کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے حضرت سعدؓ کو نہایت صالح فطرت بھی عطا کی تھی۔ ۱۰ نبوت میں جب چھ سعید الفطرت خزرجیوں کے ذریعے ہادیِ اکرم ﷺ کی دعوتِ حق اہلِ یثرب کو پہنچی تو سعد نے کسی تامّل کے بغیر اس دعوت کو قبول کرلیا اور یوں انصار کے سابقین الاوّلون میں شمار ہونے کی سعادتِ عظیم حاصل کی۔ بعض روایتوں میں ہے کہ وہ عقبۂ اولیٰ میں مسلمان ہوئے۔ اس کے بعد انھیں ان پچھتر نفوس قدسی میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہوا جنھوں نے بیعتِ عقبہ کبیرہ میں رحمتِ عالم ﷺ کے ساتھ یہ مقدس پیمان وفا باندھا کہ:

''یارسول اللہ! ربِ ذوالجلال کی قسم ہم ہر حال میں اپنی جانوں اور مالوں کے ساتھ آپ کی مدد اور حفاظت کریں گے۔''

اس کے صلہ میں حضورؐ نے ان سب کو جنت کی بشارت دی اور فرمایا:

''میرا خون تمھارا خون اور میرا ذمّہ تمھارا ذمّہ ہے۔ میں تم سے ہوں اور تم مجھ سے ہو۔ تم جس سے لڑو گے میں بھی اس سے لڑوں گا اور تم جس سے صلح کرو گے میں بھی اس سے صلح کروں گا۔''

گویا حضرت سعدؓ ان خوش نصیب ہستیوں میں سے تھے جن کے ساتھ حضورؐ نے عہد فرمایا کہ میرا مرنا جینا تمھارے ساتھ ہوگا۔

ع یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

بیعت عقبۂ کبیرہ کے بعد سرورِ عالمؐ نے اہلِ یثرب سے فرمایا کہ تم دینی امور کی حفاظت کے لیے اپنے بارہ نقیب منتخب کرلو۔ چناں چہ شرکائے بیعت نے بارہ نقباء اتفاق رائے سے منتخب کرلیے۔ ان میں سے نو قبیلہ خزرج اور تین قبیلہ اوس سے تعلق رکھتے تھے۔ خزرجی نقباء میں سے ایک حضرت سعدؓ بن ربیع تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے قبیلے میں بڑی قدر ومنزلت اور اثر و رسوخ کے مالک تھے۔ ان کو حضرت عبداللہؓ بن رواحہ کے ساتھ بنو حارثہ کا نقیب بنایا گیا۔

(۳)

ہجرتِ نبوی کے پانچ ماہ بعد سرورِ عالم ﷺ نے مہاجرین اور انصار کے درمیان رشتۂ مواخاۃ قائم فرمایا تو حضرت سعدؓ بن ربیع کو حضرت عبدالرحمانؓ بن عوف کا اسلامی بھائی بنایا۔

(صحیح بخاری میں حضرت انسؓ بن مالک سے روایت ہے کہ حضرت عبدالرحمٰنؓ نے ہجرت کے بعد حضرت سعدؓ بن ربیع کے ہاں قیام کیا تھا)

مواخاۃ کے بعد حضرت سعدؓ نے خلوص اور ایثار کا ایسا عظیم الشان مظاہرہ کیا کہ تاریخِ عالم اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ ان کی دو بیویاں تھیں۔ اپنے نصف مال و اسباب کے علاوہ انھوں نے حضرت عبد الرحمٰنؓ کو پیش کش کی کہ اگر وہ چاہیں تو ان کی بیوی سے نکاح کر سکتے ہیں جسے وہ طلاق دے دیں گے۔ حضرت عبد الرحمٰنؓ نے ان کی پیش کش قبول نہ کی تاہم ان کو بہت بہت دعائیں دیں۔ حضرت انسؓ نے اس واقعہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

''ہمارے ہاں عبد الرحمٰنؓ بن عوف آئے اور رسول اللہ ﷺ نے ان کی سعدؓ بن ربیع سے مواخات کی وہ (سعدؓ) دولت مند آدمی تھے۔ سعدؓ نے عبد الرحمٰنؓ سے کہا، تمام انصار جانتے ہیں کہ میں نہایت دولت مند آدمی ہوں۔ میں اپنا مال آدھا اونٹ بانٹ دوں گا۔ اور میری دو بیویاں ہیں آپ ان کو دیکھ لیں جو پسند آجائے اس کو طلاق دے دوں اور جب وہ حلال ہو جائے آپ اس سے نکاح کر لیں۔

عبد الرحمٰن نے کہا، اللہ آپ کے مال و متاع اور اہل و عیال میں برکت عطا فرمائے۔''

(صحیح بخاری۔ کتاب المناقب باب اخاء النبیؐ بین المہاجرین والانصار)

اس کے بعد انھوں نے حضرت سعدؓ بن ربیع سے پوچھا: ''کیا یہاں کوئی بازار ہے جہاں تجارت ہوتی ہو۔''

انھوں نے فرمایا۔ ''ہاں بازارِ قینقاع۔''

حضرت عبد الرحمٰنؓ نے ان سے درخواست کی کہ ''وہ انھیں بازار کا راستہ بتا دیں۔''

حضرت سعدؓ نے بازار تک ان کی رہ نمائی کی جہاں حضرت عبد الرحمٰنؓ نے تجارت شروع کی اور ایک دن آیا کہ مدینہ منورہ میں ان سے بڑا تاجر اور کوئی نہ تھا۔

(۴)

۲ھ میں حضرت سعدؓ بن ربیع کو اصحابِ بدر میں شامل ہونے کا عظیم شرف حاصل ہوا۔

مولانا سعید انصاری مرحوم نے اپنی کتاب سیر انصار حصہ دوم میں لکھا ہے:

''حضرت سعدؓ بن ربیع کی غزوۂ بدر کی شرکت سے تذکرے خاموش ہیں۔''

لیکن طبقات ابنِ سعد (جلد ۳) میں حضرت سعدؓ بن ربیع کو واضح طور پر اصحابِ بدر میں شامل کیا گیا ہے۔

مولانا ابوالقاسم رفیق دلاوری مرحوم نے اپنی مشہور کتاب سیرۃِ کبریٰ (جلد دوم) میں علامہ ابن سعدؒ کی روایت کو درست قرار دیا ہے۔ اور حضرت سعدؓ بن ربیع کو بدری صحابی لکھا ہے۔ قاضی محمد سلیمان منصور پوریؒ نے بھی "رحمۃ للعالمین" میں انھیں اصحابِ بدر میں شمار کیا ہے۔

بدر کے بعد حضرت سعدؓ جنگِ اُحد میں شریک ہوئے اور بڑی جان بازی سے لڑے یہاں تک کہ زخموں سے چور چور ہو کر گر پڑے۔ ایک روایت میں ہے کہ ان کو بارہ شدید زخم آئے۔ حضرت سعدؓ کو رسولِ اکرم ﷺ سے بے پناہ محبت تھی اور حضورؐ کو بھی ان سے بڑا تعلقِ خاطر تھا۔ جنگ کے بعد آپؐ کو سعدؓ نظر نہ آئے تو صحابہ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

"کوئی ہے جو سعدؓ بن ربیع کی خبر لائے؟"

حضرت ابیؓ بن کعب نے عرض کیا: "یارسول اللہ میں جاتا ہوں" یہ کہہ کر وہ میدانِ جنگ میں گئے اور لاشوں کے درمیان پھر کر سعدؓ بن ربیع کو تلاش کرنے لگے۔ بار بار ان کا نام لے کر پکارتے تھے، لیکن کوئی جواب نہ ملتا تھا، آخر انھوں نے بآوازِ بلند یہ الفاظ کہے —— "سعد اگر زندہ ہو تو جواب دو، مجھے رسول اللہ ﷺ نے تمھارے پاس بھیجا ہے۔"

اس وقت حضرت سعدؓ بن ربیع کا دمِ واپسیں تھا۔ رسول اللہ ﷺ کا اسمِ گرامی سُنا تو اپنے اندر ایک توانائی سی محسوس کی۔ روح اور جسم کی تمام قوتوں کو مجتمع کر کے نحیف سی آواز میں جواب دیا:

"رسولِ اکرم ﷺ کی خدمتِ اقدس میں میرا اسلام عرض کرنا اور میرے انصاری بھائیوں سے کہنا کہ اگر آج خدانخواستہ رسول اللہؐ شہید ہو گئے اور تم میں سے کوئی ایک بھی زندہ بچا تو اللہ کو ہرگز منہ نہ دکھا سکو گے اور اس کے سامنے تمھارا کوئی عذر قبول نہیں ہوگا۔ ہم نے لیلۃ العقبہ میں رسول اللہ پر فدا ہونے کا حلف اٹھایا تھا۔"

یہ کہا اور ہچکی لے کر ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئے۔ ایک دردمند شاعر نے اس واقعہ کو ان الفاظ میں نظم کیا ہے:

ارشادِ مصطفیٰ ہوا ہنگام ختم جنگ — کیا سعد بن ربیع سے کوئی باخبر ہے فرد
بے حد تلاش اور بہت جستجو کے بعد — زخمی سپاہیوں میں نظر آیا نیک مرد
دم توڑتا تھا خون میں نہایا ہوا تھا سعدؓ — دل میں مگر تھا عشق رسولِ خدا کا درد

فرمایا تھوڑی دیر کا بس مہمان ہوں / اے مہربان! حضورؐ کو پہنچا سلام جلد

پیغام قوم کو یہی بالاختصار ہے / باقی ہے روح جسم میں قائم ہے گر جسد

دشمن نہ آنے پائے رسولِ خدا کے پاس

روزِ حساب ہوگا ہر ایک عذر در نہ رد

حضرت ابی بن کعب نے حضرت سعدؓ کے آخری الفاظ حضورؐ کی خدمت میں عرض کیے تو آپ نے فرمایا:

"اللہ سعدؓ کو اپنے دامنِ رحمت میں جگہ دے۔ زندگی اور موت دونوں میں اللہ اور اللہ کے رسول کے بہی خواہ رہے۔"

اسی غزوہ میں حضرت خارجہؓ بن زید بن ابی زبیر بھی بڑی بہادری سے لڑ کر شہید ہوئے تھے۔ وہ حضرت سعدؓ بن ربیع کے دادا عمرو بن ابی زبیر کے بھائی تھے گویا اس رشتے سے حضرت سعدؓ ان کے پوتے ہوتے تھے۔ حضورؐ نے حکم دیا کہ دادا پوتے (حضرت خارجہؓ اور سعدؓ کو ایک ہی قبر میں دفن کیا جائے۔ اس طرح رحمتِ عالمؐ کے ان دونوں جاں نثاروں نے زندگی میں بھی ایک دوسرے کا ساتھ دیا اور آخرت میں بھی یکجا رہے۔

(۵)

حضرت سعدؓ نے اپنے پیچھے دو کمسن بچیاں چھوڑیں نرینہ اولاد کوئی نہیں تھی۔ اس لیے سعدؓ کے بھائی نے ان کی جائداد پر قبضہ کرلیا۔ ان بچیوں کی والدہ عمرہؓ بنت حرام انھیں ساتھ لے کر رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا:

"یارسول اللہ یہ شہیدِ احد بن ربیع کی بچیاں ہیں۔ ان کے چچا نے سعدؓ کی جائداد پر قبضہ کرلیا ہے۔ وہ انھیں باپ کے ترکے کا حق دار نہیں سمجھتا۔ خدا کی قسم اگر انھیں کچھ نہ ملا تو ان کی شادی نہ ہوسکے گی۔"

سرورِ عالمؐ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ خود اس معاملے کا فیصلہ کرے گا۔"

علامہ ابن سعدؒ اور ابن اثیرؒ کا بیان ہے کہ اس موقع پر آیتِ میراث نازل ہوئی:

فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ ط (النساء:۱۷۶)

"اگر دو عورتوں سے زیادہ ہوں تو ترکہ کا دو تہائی ان کا حصہ ہوگا۔"

چناں چہ حضورؐ نے لڑکیوں کے چچا کو بلوا بھیجا اور انھیں حکم دیا کہ فرمانِ الٰہی کے مطابق سعدؓ کے ترکہ کی تقسیم کریں۔ اور جو باقی بچے صرف اسی کو اپنے پاس رکھیں۔ انھوں نے تعمیلِ ارشاد کی۔

حضرت سعدؓ کی دوسری زوجہ کا نام معلوم نہیں ہے اور نہ ان کے بطن سے کسی اولاد کا پتہ چلتا ہے۔

(٦)

حضرت سعدؓ بن ربیع اپنے جوشِ ایمان، عشقِ رسولؐ اور جذبۂ ایثار و خلوص کی بہ دولت تمام صحابہ کرام میں بڑی عزت و احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ رحمتِ عالم ﷺ بھی ان سے محبت فرماتے تھے اور خاص خاص موقعوں پر ان سے مشورہ فرمایا کرتے تھے۔ ابنِ سعد کا بیان ہے کہ غزوۂ اُحد سے پہلے حضورؐ نے مشرکینِ مکہ کی جنگی تیاریوں کی خبر سنی تو آپ نے حضرت سعدؓ سے بہ طور خاص گفتگو فرمائی۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ رشتہ میں حضرت سعدؓ بن ربیع کے پھوپھا ہوتے تھے کیوں کہ ربیع کی چچازاد بہن حبیبہؓ بنتِ خارجہؓ بن زید حضرت ابوبکر صدیقؓ سے بیاہی گئی تھیں۔ وہ حضرت سعدؓ اور ان کی اولاد کو بہت مانتے تھے۔ ایک دفعہ ان کے عہدِ خلافت میں حضرت سعدؓ بن ربیع کی صاحب زادی امِ سعد (یا امِ سعید) جمیلہؓ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئیں، صدیقِ اکبرؓ نے از راہِ تعظیم اپنی چادر ان کے لیے بچھادی۔ اس موقع پر حضرت عمرؓ فاروق بھی موجود تھے۔ انھوں نے پوچھا اے خلیفۂ رسول یہ خاتون کون ہیں؟ فرمایا، ''یہ اس شخص کی بیٹی ہے جو ہم دونوں سے بہتر تھا۔'' حضرت عمر فاروقؓ نے حیران ہوکر پوچھا۔

''وہ کیسے؟''

صدیقِ اکبرؓ نے فرمایا۔ ''اس لیے کہ اس کے باپ سعدؓ بن ربیع نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے جنت الفردوس کی راہ لی اور ہم تم ابھی تک اس دنیا میں بیٹھے ہیں۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت حبیب بن زید انصاریؓ

(۱)

حضرت حبیبؓ بن زید انصاری اس جلیل القدر ماں کے فرزند تھے جس کے متعلق سید المرسلین خیر الخلائقؐ نے فرمایا تھا۔ ''میں جنگِ احد میں اُمِ عمارہؓ کو برابر اپنے دائیں بائیں لڑتے دیکھتا تھا۔'' اور جس کے حق میں خدا کے برگزیدہ رسولؐ نے دعا مانگی تھی۔ ''اے اللہ! اُمِ عمارہؓ کو جنت میں میرے ساتھ کیجیو۔'' حضرت حبیبؓ نے اسی شجاع ماں کا دودھ پیا تھا۔ وہ قبیلہ خزرج کے خاندان بنونجّار سے تعلق رکھتے تھے۔ باپ کا نام زید بن عاصم تھا جوان کے بچپن ہی میں فوت ہو گئے تھے۔ علّامہ ابن سعدؒ کا بیان ہے کہ ۳ھ میں حبیبؓ اپنی بہادر والدہ حضرت اُمِ عمارہؓ اور بھائی عبد اللہؓ کے ساتھ جنگِ احد میں شریک ہوئے اور آخر تک نہایت ثابت قدمی کے ساتھ لڑتے رہے۔ قیاس ہے کہ انھوں نے بعد کے غزوات میں بھی سرورِ عالم ﷺ کی ہم رکابی کا شرف حاصل کیا۔

سرورِ کائناتؐ کی حیاتِ پاک کے آخری دنوں میں یمامہ کے رئیس مسیلمہ کذّاب نے مرتد ہو کر نبوّت کا دعویٰ کیا۔ اس نے رسولِ کریمؐ کو یہ خط بھیجا:

''مسیلمہ رسول خدا کی طرف سے محمد رسول خدا کے نام

السلام علیک میں آپ کی رسالت میں شریک ہوا۔ نصف ملک میرا نصف قریش کا۔

لیکن قریش ایک زیادتی پسند قوم ہے۔''

حضورؐ نے اس کا یہ جواب لکھوایا:

''محمد رسول اللہ کا خط مسیلمہ کذّاب کے نام

جو شخص ہدایت کی پیروی کرے اس پر سلام ہو اس کے بعد تجھ کو معلوم ہو کہ ملک اللہ کا ہے اور وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہے اس کا وارث بنا دے اور آخرت کی بہتری پرہیز گار لوگوں کے لیے ہے۔"

(۲)

اس مکتوبِ مبارک کے بھیجنے کے چند دن بعد رسول کریم ﷺ نے رحلت فرمائی۔ اب مسیلمہ کذّاب کھل کھیلا۔ اس نے اپنی شعبدہ بازیوں اور ستم رانیوں کے بل پر لوگوں کو زبردستی اپنا معتقد بنانا شروع کیا۔ تقریباً چالیس ہزار جنگجو عرب مرتد ہو کر اس کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے جو شخص اس کی نبوت سے انکار کرتا اس پر سخت ظلم کرتا۔

اسی زمانے میں ایک دن حضرت حبیبؓ بن زید عمان سے مدینہ آ رہے تھے کہ اس ظالم کے ہاتھ پڑ گئے۔ اُس نے پوچھا:

"محمدؐ کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے؟"

حضرت حبیبؓ نے جواب دیا: "وہ خدا کے سچے رسول ہیں۔"

مسیلمہ بولا: "نہیں یہ کہو کہ مسیلمہ اللہ کا سچا رسول ہے۔"

حضرت حبیبؓ نے نہایت حقارت سے اس کی بات مسترد کر دی۔ ظالم مسیلمہ نے تلوار کے ایک وار سے ان کا ہاتھ شہید کر ڈالا اور ان سے کہا: "اب میری بات مانو گے یا نہیں؟ حضرت حبیبؓ نے جواب دیا۔ "ہرگز نہیں۔" مسیلمہ نے اب ان کا دوسرا ہاتھ بھی شہید کر ڈالا اور کہا اب بھی میری رسالت تسلیم کر لو۔

اس عاشقِ رسول نے امِ عمارہؓ جیسی ماں کا دودھ پیا تھا، بولے، ہرگز نہیں، ہرگز نہیں ـــــ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔

اب مسیلمہ فرطِ غضب سے دیوانہ ہو گیا اور اس نے حضرت حبیبؓ کا ایک ایک بند کاٹنا شروع کیا۔ ظالم راہِ حق میں ان کا رقصِ بسمل دیکھ کر قہقہے لگاتا تھا۔ حضرت حبیبؓ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے لیکن راہِ تسلیم و رضا سے ان کے قدم ایک لمحہ کے لیے بھی نہ ڈگمگائے۔ ؎

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

حضرت اُم عمارہؓ نے اپنے مجاہد فرزند کی مظلومانہ شہادت کی خبر سنی تو ان کی ثابت قدمی پر خدا کا شکر بجالائیں، لیکن دل میں عہد کرلیا کہ اللہ نے توفیق دی تو مسیلمہ سے اس ظلم کا بدلہ لے کر رہیں گی۔

(۳)

اس واقعے کے کچھ عرصے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت خالدؓ بن ولید کو مسیلمہ کذاب کی سرکوبی پر مامور کیا تو حضرت اُمِ عمارہؓ بھی اپنے دوسرے فرزند حضرت عبداللہؓ کے ساتھ حضرت خالدؓ کے لشکر میں شامل ہوگئیں۔ مسیلمہ نے مسلمانوں کے مقابلے کی زبردست تیاری کی اور چالیس ہزار جنگجوؤں کو میدانِ جنگ میں لا کھڑا کیا۔ عقرباء (یمامہ) کے مقام پر مرتدین اور اہلِ حق کے درمیان اس دَور کی خوں ریز ترین جنگ لڑی گئی۔ (مورّخ طبری کا بیان ہے کہ مسلمانوں کو اس سے زیادہ سخت معرکہ کبھی پیش نہیں آیا) کبھی مسلمان پیچھے ہٹ جاتے اور کبھی وہ مرتدین کو پیچھے ڈھکیل دیتے۔

حضرت خالدؓ نے لڑائی کا یہ رنگ دیکھا، تو انھوں نے مسلمانوں کے تمام قبائل کو الگ الگ کردیا اور اعلان کیا کہ ہر قبیلہ اپنے اپنے علم کے نیچے لڑے تاکہ پتہ چل جائے کہ آج کون راہِ حق میں ثابت قدمی دکھاتا ہے۔ اس تدبیر کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ ہر قبیلے نے شجاعت اور استقامت میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کی اور مسیلمہ کے لشکر کا منھ پھیر دیا۔ حضرت اُمِ عمارہؓ بھی شروع سے لے کر اب تک بڑے جوش اور جذبے کے ساتھ لڑ رہی تھیں، کئی بار مسیلمہ تک پہنچنے کی کوشش کی، لیکن ہر بار مرتدینِ بنوحنیفہ سدِ راہ بن گئے۔ اسی اثنا میں مرتدین میں ہزیمت کے آثار نمایاں ہوئے تو مسیلمہ نے ان سے پکار کر کہا کہ اپنا ننگ و ناموس بچانا ہے تو بچالو۔ اسی وقت اُمِ عمارہؓ نے اُسے تاک لیا اور زخم پر زخم کھاتی اور اپنے نیزے سے راستہ بناتی اس کی طرف بڑھیں۔ اس کوشش میں انھیں گیارہ زخم آئے اور ایک ہاتھ بھی کلائی سے کٹ گیا۔ مسیلمہ کے قریب پہنچ کر اپنے نیزے سے حملہ کیا ہی چاہتی تھیں کہ اتنے میں مسیلمہ پر دو ہتھیار ایک ساتھ پڑے اور وہ کٹ کر گھوڑے سے نیچے جا پڑا۔ اُمِ عمارہؓ نے نظر اٹھا کر دیکھا تو پہلو میں اپنے فرزند عبداللہؓ کو کھڑے پایا اور قریب ہی وحشیؓ بن حرب کھڑے تھے۔ وحشیؓ نے اپنا حربہ مسیلمہ پر

پھینکا تھا اور عبد اللہؓ نے اسی وقت اس پر اپنی تلوار کا وار کیا تھا۔ حضرت اُمِ عمارہؓ اپنے فرزند حبیبؓ کے قاتل اور مسلمانوں کے اس بدترین دشمن کی موت پر سجدۂ شکر بجالائیں۔ حضرت خالدؓ نے بڑی تندہی سے ان کا علاج کرایا یہاں تک کہ تھوڑے ہی عرصے میں ان کے تمام زخم مندمل ہو گئے۔

لاکھ لاکھ سلام اس مبارک ماں پر اور اس مبارک فرزند پر کہ جن کے نقوشِ پا کی تابانی ابدالاباد تک مسلمانوں کو راہِ حق دکھاتی رہے گی۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت بشیرؓ بن سعد انصاری

(۱)

ہجرتِ نبوی کے چند سال بعد کا ذکر ہے کہ ایک مدنی صاحبِ رسولؐ ایک پانچ چھ سالہ ننھے بچے کی انگلی پکڑے بارگاہِ رسالتؐ میں حاضر ہوئے اور عرض کی:

"یارسول اللہ میرے ماں باپ آپؐ پر قربان، یہ میرا نہایت ہی پیارا فرزند ہے اور اس کی ماں بھی اس سے والہانہ محبت کرتی ہے۔ ہم دونوں کی دلی خواہش ہے کہ یہ ہماری جائداد کا وارث بنے، آپ گواہ رہیں کہ میں فلاں زمین اپنے اس فرزند کو ہبہ کرتا ہوں۔ آج کے بعد یہی اس کا مالک ہوگا۔"

رحمتِ عالم ﷺ نے پوچھا: "کیا تم نے اپنے دوسرے بیٹوں کو بھی حصہ دیا ہے؟"

انھوں نے عرض کی۔ "نہیں۔"

حضورؐ نے فرمایا: "تو پھر میں ظلم کا گواہ نہیں بنتا (کیوں کہ ایک بیٹے کی خاطر دوسروں کو جائداد سے محروم کرنا صریح ناانصافی ہے)۔

رحمتِ عالمؐ کا ارشاد سن کر وہ صاحب بولے:

"اے اللہ کے رسولؐ، جو بات آپؐ کو ناپسند ہے میں بھی اس کو ناپسند کرتا ہوں، میں اب اس بچے کے ساتھ امتیازی سلوک ہرگز نہیں کروں گا۔"

یہ کہہ کر بچے کے ساتھ واپس تشریف لے گئے۔

یہ صاحبِؓ رسول جنھوں نے سید الانام ﷺ کے ارشاد کے سامنے بلا چون و چرا سرِ تسلیم خم کر دیا اور آپ کی خوش نودی کے لیے اپنے جذبات کو کچل دیا، سیّدنا حضرت بشیرؓ بن سعد انصاری تھے۔

(۲)

حضرت ابونعمان بشیرؓ بن سعد انصاری کا شمار بڑے رتبہ کے صحابہ میں ہوتا ہے۔ ان کا تعلق خزرج کی شاخ "حارث بن خزرج" سے تھا۔ نسب نامہ یہ ہے:

بشیرؓ بن سعد بن ثعلبہ بن خلاص بن زید بن مالک اعز بن ثعلبہ بن کعب بن خزرج بن حارث بن خزرج الاکبر۔

مشہور صحابی حضرت عبداللہؓ بن رواحہ، حضرت سعدؓ بن ربیع، حضرت ابو مسعود بدریؓ اور کئی دوسرے جلیل القدر صحابہ کا تعلق بھی اسی خاندان سے تھا۔ حضرت بشیرؓ بن سعد یثرب کے ان چند گنے چنے لوگوں میں سے تھے جو زمانۂ جاہلیت میں لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ ۱۲ بعثت میں بیعت عقبہ اولیٰ کے بعد حضرت مصعبؓ بن عمیر اسلام کے داعیِ اوّل کی حیثیت سے یثرب تشریف لائے تو ان کی مساعی کی بہ دولت چند ماہ کے اندر اندر اوس و خزرج کے بہت سے گھرانوں میں اسلام پھیل گیا۔ حضرت بشیرؓ بن سعد کو بھی اسی زمانے میں قبولِ اسلام کا شرف حاصل ہوا۔ ۱۳ بعثت میں بیعت لیلۃ العقبہ (عقبۂ ثانی یا عقبۂ کبیرہ) میں وہ یثرب کے ان ۷۵ نفوسِ قدسی میں شامل تھے۔ جنھوں نے اس عہد کے ساتھ رحمتِ عالم ﷺ کے دستِ مبارک پر بیعت کی کہ ''یارسول اللہ آپ یثرب میں قدم رنجہ فرمائیے ہم آپ کی جانوں، مالوں اور اولادوں کے ساتھ اعانت اور حفاظت کریں گے۔''

اس طرح ان کو اس مقدّس جماعت کا رکن بننے کا شرف حاصل ہو گیا جس نے تاریخ میں ''اہلِ عقبہ'' یا ''عقبی'' کے زندۂ جاوید لقب سے شہرت پائی۔ مہاجرینِ اوّلین (بشمول خلفائے راشدینؓ) اور ازواجِ مطہرات کے بعد اہلِ عقبہ کا درجہ تمام صحابہ سے افضل ہے۔ حتیٰ کہ اصحابِ بدر سے بھی۔ اس سے حضرت بشیرؓ بن سعد کے رتبہ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے لیکن انھیں صرف عقبی ہی نہیں ''بدری'' ہونے کا شرف بھی حاصل ہوا اور ان چودہ سو جاں نثارانِ رسولؐ میں شریک ہونے کی سعادت بھی نصیب ہوئی جنھیں بارگاہِ خداوندی سے ''اصحاب الشجرہ'' کا عظیم لقب مرحمت ہوا اور جنت کی بشارت دی گئی۔

اہلِ سِیَر نے لکھا ہے کہ رحمتِ عالم ﷺ کے مدینہ منوّرہ میں نزولِ اجلال فرمانے کے بعد غزوات کا سلسلہ شروع ہوا تو بدر سے لے کر تبوک تک کوئی غزوہ ایسا نہیں تھا جس میں حضرت بشیرؓ بن سعد کو سرورِ عالم ﷺ کی ہمرکابی کا شرف حاصل نہ ہوا ہو۔ ذی قعدہ ۷ھ میں رحمتِ عالم ﷺ عمرے کے لیے مکہ معظّمہ تشریف لے گئے تو حضرت بشیرؓ بن سعد مسلح دستے کے سالار تھے جو جناب رسالت مآب ﷺ کی حفاظت پر مامور تھا۔ ایک سال پہلے صلح نامۂ حدیبیہ میں یہ طے پایا تھا کہ اگلے سال مسلمان مکہ آ کر عمرہ ادا کر سکیں گے لیکن انھیں ہتھیار اتار کر مکہ میں

داخل ہونا ہوگا۔ یہ شرط خطرہ سے خالی نہ تھی مگر مسلمانوں نے اللہ کے بھروسے پر معاہدے کا پورا پورا احترام کیا اور یہ شرط یوں پوری کی کہ مکہ سے آٹھ میل ادھر ہی سارے ہتھیار اتار کر رکھ دیے اور ان کی حفاظت کے لیے سو مسلح سواروں کا ایک دستہ متعین کر دیا۔ اس دستے کے قائد حضرت بشیرؓ بن سعد تھے۔ ان جانبازوں نے کمال درجے کے ایثار سے کام لیا۔ وہ خود تو مسلح ہونے کی بنا پر مکہ معظّمہ میں داخل نہ ہوئے لیکن سرورِ عالم ﷺ اور دوسرے تمام مسلمانوں نے مکہ معظّمہ میں داخل ہو کر بڑے ذوق و شوق سے عمرہ ادا کیا۔

حضرت بشیرؓ بن سعد نے تمام غزواتِ نبوی میں شریک ہونے کے علاوہ دو مہموں (سرایا) کی قیادت بھی کی۔ یہ دونوں مہمیں سرورِ عالم ﷺ نے شعبان (اور ایک دوسری روایت کے مطابق شوال) ۷ھ میں روانہ کیں۔ پہلی مہم جو ''سریّہ بنی مرۃ'' کے نام سے مشہور ہے، بنی مرّۃ کے خلاف فدک کی طرف بھیجی گئی۔ یہ تیس جانبازوں پر مشتمل تھی اور حضرت بشیرؓ بن سعد ان کے امیر تھے۔ حضرت بشیرؓ اور ان کے ساتھی بڑی بہادری سے لڑے لیکن اس مہم میں چنداں کامیابی نہ ہوئی کیوں کہ سارے مجاہدین دشمن کے تیروں کی بوچھاڑ سے زخمی ہو گئے۔ حضرت بشیرؓ بھی سخت زخمی ہوئے۔ ایک روایت کے مطابق دشمن انھیں مردہ سمجھ کر چھوڑ گئے۔ رات کے وقت حضرت بشیرؓ کو ہوش آیا تو وہ جوں توں کر کے فدک کے گاؤں میں پہنچے وہاں ایک نیک دل یہودی نے انھیں پناہ دی اور ان کا علاج معالجہ کیا، وہاں سے چند دن بعد مدینہ منوّرہ واپس آئے تو حضورؐ نے انھیں تین سو آدمی دے کر بنو غطفان کی طرف بھیجا جو عیینہ بن حصن فزاری کی سرکردگی میں وادی القریٰ اور فدک کے درمیان جمع ہو کر مدینہ منوّرہ پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہے تھے۔ یہ مہم ''سریّہ بشیر بن سعد'' کے نام سے مشہور ہے حضرت بشیرؓ نے بنو غطفان پر ایسا طوفانی حملہ کیا کہ وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے اور مسلمان کثیر مالِ غنیمت کے ساتھ مظفر و منصور واپس آئے۔

بعض اہلِ سِیَر نے ''سریّہ بشیر بن سعد'' کا حال مختلف پیرائے میں بیان کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ یہ مہم بنو فزارہ اور بنو عذرہ کی طرف بھیجی گئی تھی یہ صرف تیس پیادہ مجاہدین پر مشتمل تھی اور حضرت بشیرؓ ان کے قائد تھے۔ لڑائی میں اگرچہ سارے مسلمان زخمی ہو گئے لیکن دشمن بھی منتشر ہو گیا اور اس کے دو آدمیوں کو مسلمانوں نے قیدی بنا لیا۔

ہمارا قیاس یہ ہے کہ ان دونوں مہموں کے حالات خلط ملط ہو گئے۔ صحیح یہی ہے کہ پہلی مہم صرف تیس مجاہدین پر مشتمل تھی اور دوسری میں تین سو جانباز شامل تھے۔ کیوں کہ بنو غطفان کے جتھے کی تعداد بہت کثیر تھی اور ان کی سرکوبی کے لیے ایک مضبوط فوج درکار تھی۔

(۳)

اا ھ میں سرورِ عالم ﷺ کے وصال کے بعد سقیفۂ بنی ساعدہ میں انصار کا ایک بڑا اجتماع ہوا۔ چوں کہ ان اصحاب نے شروع سے اخیر تک سرورِ عالم ﷺ اور مہاجرین کی دل و جان سے حمایت کی تھی اور راہِ حق میں اپنے بے شمار آدمی قربان کیے تھے اس لیے (ان قربانیوں کی بنا پر) قرآن مجید اور احادیث میں ان کو کثیر مناقب وفضائل کا مستحق ٹھہرایا گیا تھا۔ ان سب باتوں کے پیشِ نظر انصار کے دل میں خلافت کا خیال پیدا ہو گیا تھا۔ چناں چہ انھوں نے سید الخزرج حضرت سعدؓ بن عبادہ کو خلیفۃ الرسول منتخب کرنے کی کوشش کی، پھر خیال آیا کہ اگر مہاجرینِ قریش نے خلافت کا دعویٰ کیا تو ان کو کیا جواب دیا جائے گا۔ کسی نے تجویز پیش کی کہ ایک امیر ان کا ہو اور ایک ہمارا۔ حضرت سعدؓ بن عبادہ نے اس تجویز کو رد کر دیا۔ اتنے میں حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کچھ دوسرے مہاجرین کے ساتھ مجمع میں پہنچ گئے۔ فریقین میں کچھ دیر بحث و تمحیص ہوتی رہی، دونوں نے اپنے اپنے موقف کے حق میں دلائل دیے لیکن معاملہ سلجھ نہ سکا۔ بعض روایات میں ہے کہ اس موقع پر حضرت بشیرؓ بن سعد نے انصاری ہونے کے باوجود قریش کی دعوت کی حمایت کی۔ بالآخر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ایک اثر انگیز خطبہ دیا جس میں مہاجرینِ قریش کے فضائل نہایت بلیغ انداز میں بیان کیے۔ ان کے بعد حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت ابوبکرؓ صدیق کی فضیلت بیان کی تو حاضرین پکار اٹھے۔ ''ہم خدا سے پناہ مانگتے ہیں کہ ابوبکرؓ سے آگے بڑھیں۔'' اسی کے ساتھ ہی لوگ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بیعت کے لیے ٹوٹ پڑے۔ حضرت بشیرؓ بن سعد انصار میں سے پہلے شخص تھے یا پہلے اشخاص میں سے ایک تھے جنھوں نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بیعت کی۔ صحیح بخاری میں ہے کہ اس بیعت عامہ کے بعد حضرت سعدؓ بن عبادہ دل گرفتہ ہو کر اپنے گھر چلے گئے۔ چند دن بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ نے انھیں پیغام بھیجا کہ آپ یہاں آکر میری بیعت کر لیں۔ انھوں نے بیعت سے انکار کیا۔ حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو مشورہ دیا کہ آپ ان سے ضرور بیعت لیجیے۔ اس موقع پر حضرت بشیرؓ بن سعد بھی بیٹھے تھے انھوں نے خلیفۃ الرسولؐ کی خدمت میں عرض کیا کہ سعدؓ بن عبادہ اپنی دُھن کے بڑے پکے ہیں اب وہ انکار کر چکے ہیں تو کسی طرح بیعت پر آمادہ نہ ہوں گے۔ اگر ان پر سختی کی گئی تو شاید حالات ناخوش گوار صورت اختیار کر جائیں اور ان کے اہلِ خاندان کے علاوہ سارے خزرج ان کی حمایت میں کھڑے ہو جائیں۔ بہتر یہی ہے کہ سوئے ہوئے فتنے کو نہ جگایا جائے اور سعدؓ

بن عبادہ کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے، وہ اکیلے کیا کر سکتے ہیں؟ صدیقِ اکبرؓ اور دوسرے صحابہؓ نے حضرت بشیرؓ بن سعد کی رائے کو پسند کیا اور پھر کسی نے حضرت سعدؓ بن عبادہ سے تعرّض نہ کیا۔

ایک روایت میں ہے کہ چند دن بعد حضرت سعد بن عبادہؓ نے بھی بہ رضا و رغبت حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بیعت کر لی تھی ـــــ لیکن جمہور اہلِ سِیَر نے پہلی (بیعت نہ کرنے والی) روایت کو ترجیح دی ہے۔

صدیقِ اکبرؓ کے سریر آرائے خلافت ہونے کے بعد سارے عرب میں فتنۂ ارتداد کے شعلے بھڑک اٹھے۔ اس نازک موقع پر خلیفۃ الرسولؐ نے بے مثال استقامت اور حوصلہ مندی کا مظاہرہ کیا اور باوجود قلیل وسائل کے مرتدین کے سامنے جھکنے سے قطعاً انکار کر دیا۔ یہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی فراست، تدبّر اور قوتِ ایمانی ہی کا نتیجہ تھا کہ اہلِ حق نے قلیل التعداد ہونے کے باوجود چند ماہ کے اندر اندر مرتدین کے بڑے بڑے جنگجو لشکروں کو منتشر کر دیا اور بالآخر انھیں آستانۂ اسلام پر جھکا دیا۔ فتنۂ رِدّۃ کے فرو کرنے میں حضرت بشیرؓ بن سعد نے بھی سرفروشانہ کارنامے انجام دیئے وہ حضرت خالدؓ بن ولید کے لشکر میں شامل ہو کر مسیلمہ کذّاب کے خلاف جنگِ یمامہ میں شروع سے اخیر تک دادِ شجاعت دیتے رہے۔ اسی طرح فتنۂ ارتداد کی کئی دوسری لڑائیوں میں بھی اپنی تلوار کے جوہر دکھائے۔ جھوٹے مدعیانِ نبوت اور مرتدین کا قلع قمع ہو چکا تو حضرت ابوبکر صدیقؓ کے حکم کے مطابق حضرت خالدؓ بن ولید عراقِ عرب کی طرف بڑھے اور ایران کی طاقت ور سلطنت کے خلاف طویل کش مکش کا آغاز ہو گیا۔ حضرت بشیرؓ بن سعد بھی ایک مجاہد کی حیثیت سے حضرت خالدؓ بن ولید کے لشکر میں شریک تھے۔ عراق عرب میں داخل ہو کر حضرت خالدؓ نے اُبلّہ، مذار (الثنی) دلجہ، الیس، امغیشیا، حیرہ، انبار، عین التمر اور کئی دوسرے مقامات پر ایرانیوں کو پے در پے شکستیں دے کر ثابت کر دیا کہ عرب قوم پستی اور ذلّت سے اٹھ کر انتہائی بلند مقام پر پہنچ چکی ہے یہاں تک کہ تختِ کیانی کی شوکت و قوت بھی اس کے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتی۔ ان تمام معرکوں میں حضرت بشیرؓ بن سعد نے شجاعت اور جان بازی کا حق ادا کر دیا۔ عراقِ عرب کا آخری معرکہ جس میں وہ شریک ہوئے معرکہ عین التمر تھا۔ یہ معرکہ ۱۲ھ میں کسی وقت پیش آیا۔ کچھ روایات کے مطابق وہ عین التمر کی لڑائی میں بڑی بہادری سے لڑتے ہوئے رتبۂ شہادت پر فائز ہوئے۔ ایک روایت کے مطابق وہ اس لڑائی میں زخمی ہوئے اور بعد میں انتقال کیا۔ بہر صورت اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ انھوں نے ۱۲ھ میں سفرِ آخرت اختیار کیا۔

(۴)

اربابِ سِیَر نے حضرت بشیرؓ بن سعد کی ازدواجی زندگی اور اولاد کے بارے میں کچھ زیادہ معلومات فراہم نہیں کیں اور صرف ان کی (ایک) بیوی عمرۃؓ بنت رواحہ اور ایک صاحب زادے نعمانؓ کا نام صراحت کے ساتھ لیا ہے۔ مسند احمد بن حنبلؒ میں ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ نعمانؓ کے علاوہ ان کی اور اولاد بھی تھی۔

عمرۃؓ، شاعر رسول اللہ حضرت عبد اللہؓ بن رواحہ کی بہن تھیں اور شرفِ صحابیت سے بہرہ ور تھیں۔ ان کے صاحب زادے نعمانؓ بن بشیر کا شمار مشہور صحابہ میں ہوتا ہے۔ ہجرتِ نبوی کے بعد وہ پہلے بچے تھے جو ایک انصاری گھرانے میں پیدا ہوئے۔ حضرت بشیرؓ بن سعد ننھے نعمانؓ کو سرورِ کونین ﷺ کی خدمتِ اقدس میں بھیجا کرتے تھے۔ یہی نعمانؓ تھے جن کو ماں باپ فرطِ محبت میں اپنی ساری جائداد دینا چاہتے تھے لیکن حضورؐ نے منع فرما دیا۔

سرورِ عالم ﷺ ننھے نعمانؓ اور ان کی والدہ عمرۃؓ پر بڑی شفقت فرماتے تھے۔ حافظ ابن عبد البرؒ نے استیعاب میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ حضورؐ کے پاس طائف سے انگور آئے، اس وقت ننھے نعمانؓ بارگاہِ نبوی میں حاضر تھے۔ حضورؐ نے ان کو انگور کے دو خوشے عطا کیے اور فرمایا کہ ایک تمھارا ہے اور ایک تمھاری والدہ کا۔ نعمانؓ راستے میں دونوں خوشے کھا گئے اور ماں کو بتایا تک نہیں۔ چند دن بعد حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؐ نے پوچھا ”نعمانؓ انگور کا وہ خوشہ اپنی ماں کو دے دیا تھا؟“ بولے، ”یا رسول اللہؐ نہیں۔“ حضورؐ نے پیار سے ان کے کان اینٹھے اور فرمایا ”یا غدر“ کیوں مکّار؟

حضرت بشیرؓ بن سعد کے چمنِ اخلاق میں سبقت فی الاسلام، شوقِ جہاد، اطاعتِ رسولؐ اور سلامتیِ طبع سب سے خوش رنگ پھول ہیں۔ تعجب ہے کہ اہلِ سِیَر نے اتنے جلیل القدر صحابی کی سیرت پر بہت کم لکھا ہے۔ تاہم جو تھوڑی بہت روایات ان کے بارے میں ملتی ہیں وہ ان کی جلالتِ قدر اور عظمتِ کردار پر دال ہیں۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت خزیمہ بن ثابت خطمیؓ

ذوالشہادتین

(۱)

عہدِ رسالت کا ذکر ہے کہ ایک دن ایک صاحب، جن کی پیشانی نورِ سعادت سے چمک رہی تھی، رحمتِ دوعالم ﷺ کی خدمتِ اقدسؐ میں حاضر ہوئے اور عرض کی:

''یارسول اللہ میرے ماں باپ آپؐ پر قربان، گزشتہ شب میں نے خواب میں دیکھا کہ میں حضورؐ کی جبینِ مبارک کو چوم رہا ہوں۔''

آپؐ ان کی بات سُن کر متبسّم ہوگئے اور فرمایا: ''تم اپنے خواب کی تصدیق کر سکتے ہو۔''

وہ صاحب حضورؐ کا ارشاد سُن کر فرطِ محبت سے بے خود ہوگئے اور والہانہ انداز میں آگے بڑھ کر فخرِ موجوداتؐ کی جبینِ پاک کو چوم لیا۔ دیکھنے والوں کے لیے یہ ایک تحیّر خیز منظر تھا۔ وہ رشک کرتے تھے کہ کاش یہ سعادتِ عظمٰی ان کے حصے میں آئی ہوتی، لیکن اللہ کی دین ہے وہ جس کو چاہے اپنے فضل کے لیے چن لے ؎

یہ رتبہٗ بلند ملا جس کو مل گیا

کائناتِ ارضی وسماوی کی مقدّس ترین ہستی شہِ لولاک، فخرِ جن وانس، سید المرسلین، امام الانبیاء رحمتِ دوعالم ﷺ کی جبینِ اطہر پر بوسہ دینے کا شرفِ عظیم حاصل کرنے والے یہ صاحب حضرت خزیمہؓ بن ثابت خطمی انصاری تھے۔

(۲)

سیدنا حضرت خزیمہؓ بن ثابت کا شمار آسمانِ ہدایت کے ان درخشندہ ستاروں میں ہوتا

ہے کہ جن کی تابانی سے تاریخِ اسلام کے اوراق ابد تک جگ مگاتے رہیں گے۔ ان کا تعلق قبیلہ اوس کی شاخ بنو خطمہ سے تھا۔ سلسلہ نسب یہ ہے:

خزیمہؓ بن ثابت بن فاکہ بن ثعلبہ بن ساعدہ بن عامر بن عیاں بن عامر بن خطمہ (عبداللہ) بن جشم بن مالک بن اوس۔

والدہ کا نام کبشہ بنتِ اوس تھا۔ وہ خزرج کی شاخ بنو ساعدہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ حضرت خزیمہؓ کی کنیت ابوعمارہ تھی اور لقب ذوالشہادتین تھا جو انھیں بارگاہِ رسالتؐ سے عطا ہوا تھا۔

حضرت خزیمہؓ کو اللہ تعالیٰ نے نہایت صالح فطرت ودیعت کی تھی۔

سرورِ دو عالم ﷺ کے مدینہ منورہ میں نزولِ اجلال سے پہلے حضرت مصعبؓ بن عمیر اسلام کے داعیِ اوّل کی حیثیت سے مدینہ آئے تو ان کی تبلیغی مساعی کے نتیجہ میں اوس و خزرج کے بیشتر گھرانے سعادت اندوزِ اسلام ہو گئے۔ حضرت خزیمہؓ بھی اسی زمانے میں شرفِ اسلام سے بہرہ یاب ہوئے۔ قبولِ حق کے بعد انھیں بتوں سے ایسی سخت نفرت ہوئی کہ اپنے ایک پُر جوش ساتھی عمیر بن عدی کو ساتھ لے کر بنو خطمہ کے تمام بُت توڑ ڈالے۔

رحمتِ عالم ﷺ مدینہ منوّرہ تشریف لائے اور غزواتِ نبوی کا سلسلہ شروع ہوا تو حضرت خزیمہؓ نے تقریباً سبھی غزوات میں آقائے دوجہاںؐ کی ہم رکابی کا شرف حاصل کیا۔ مولوی سعید انصاری مرحوم نے سِیَر انصار میں حضرت خزیمہؓ کو اصحابِ بدر میں شمار کیا ہے لیکن سِیَر و مغازی کی بیشتر کتابوں میں بدری صحابہ کرامؓ کی فہرست میں ان کا نام شامل نہیں ہے۔ اگر فی الواقع وہ غزوۂ بدر میں شریک نہ ہو سکے تو اس کا کوئی خاص سبب ہوگا۔ ہو سکتا ہے مدینہ منوّرہ سے باہر ہوں یا علیل ہوں ورنہ ان کے جذبۂ فدویت سے بعید تھا کہ کسی عذر کے بغیر اس سعادت سے محروم رہے ہوں۔

فتح مکہ کے موقع پر وہ ان دس ہزار قدوسیوں میں شامل تھے جن کے بارے میں ''کتابِ استثنا'' میں پیشین گوئی کی گئی تھی کہ وہ نبیٔ آخر الزماںؐ کے ہم رکاب ہوں گے۔ اس وقت حضرت خزیمہؓ کو خاص امتیاز حاصل ہوا کہ سرورِ دو عالم ﷺ نے بنو خطمہ کا عَلَم انھیں مرحمت فرمایا اور یہ علم لہراتے ہوئے وہ اس شان سے مکہ میں داخل ہوئے کہ بنو خطمہ کے بیسیوں مسلح سرفروش ان کے جلو میں تھے اور ان کے ہتھیاروں کی چمک دھوپ میں نگاہوں کو خیرہ کر رہی تھی۔

(۳)

سرورِ کائنات ﷺ کے وصال کے بعد حضرت ابو بکر صدیقؓ حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عثمان ذوالنورینؓ کے زمانۂ خلافت میں حضرت خزیمہؓ بن ثابت کے ایامِ حیات کیسے بسر ہوئے؟ کتبِ سیر اس کے بارے میں خاموش ہیں۔ ان کا نام دوبارہ حضرت علیؓ کے عہدِ خلافت میں منظرِ عام پر آتا ہے۔ حضرت علیؓ نے دار الخلافہ مدینہ منورہ سے کوفہ منتقل کیا تو وہ بھی کوفہ جا کر مقیم ہو گئے۔

۳۶ھ میں جمل کی جنگ پیش آئی تو حضرت خزیمہؓ حضرت علیؓ کے ساتھ تھے۔ تاہم انھوں نے اس لڑائی میں عملی طور پر حصّہ نہیں لیا۔ اس کے بعد وہ جنگِ صفین ۳۷ھ میں بھی حضرت علیؓ کے حامی تھے۔ مسند احمد بن حنبل میں ہے کہ جب حضرت عمارؓ بن یاسر نے شامی فوج کے ہاتھ سے شہادت پائی تو حضرت خزیمہؓ کو جوش آ گیا اور وہ شمشیر بہ دست یہ رجز پڑھتے ہوئے دشمن کی صفوں میں گھس گئے۔

اذا نحن بایعنا علیا فحسبنا ابو حسن مما نخاف من الفتن

"جب ہم نے علیؓ سے بیعت کر لی تو یہ ہم کو کفایت کرتی ہے اور اب ہم کو کسی فتنے کا ڈر نہیں ہے۔

و فیه الذی فیهم من الخیر کله وَمَا فیهم بعض الَّذی فیه من حسن

علیؓ میں اہلِ شام کی تمام بھلائیاں موجود ہیں لیکن اہلِ شام علیؓ کی بعض خوبیوں سے بھی تہی دامن ہیں۔"

دیر تک نہایت شجاعت سے لڑتے رہے۔ آخر شامیوں نے نرغے میں لے کر تیروں اور تلواروں کا مینہ برسا دیا اور اللہ کا یہ شیر جامِ شہادت پی کر معبودِ حقیقی سے جا ملا۔

حضرت خزیمہؓ نے اپنے پیچھے دو لڑکے عمارہ اور عمر اور ایک لڑکی عمرہ چھوڑی۔

(۴)

حضرت خزیمہؓ کی زندگی کا سب سے تابناک واقعہ وہ ہے جس میں رحمتِ دو عالمؐ نے ان کی شہادت کو دو آدمیوں کی شہادت کے برابر قرار دیا اور "ذو الشہادتین" کے منفرد لقب سے مشہور ہوئے۔ مسند احمد بن حنبل، مسند ابو داؤد، نسائی اور طبقات ابنِ سعد وغیرہ میں روایت ہے

کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے ایک اعرابی سے (جس کا نام طبرانی اور ابنِ شاہین نے سوار بن الحرث لکھا ہے) ایک گھوڑا خریدا تو وہ اعرابی حضورؐ کے پیچھے پیچھے چلا۔ یہ سودا راستے میں کسی ایسی جگہ پر طے ہوا جو حضورؐ کے کاشانۂ اقدس سے کچھ دور تھی اور قیمت آپؐ کے پاس نہ تھی۔ چناں چہ آپ اس اعرابی کو قیمت دینے کے لیے اپنے ساتھ لے چلے۔ حضورؐ نے چلنے میں جلدی کی تاکہ گھر جلد پہنچ کر قیمت ادا کریں، لیکن اعرابی نے چلنے میں سستی کی (یہاں تک کہ بہت پیچھے رہ گیا) اسی اثنا میں اس سے کچھ لوگ ملے اور اس سے گھوڑے کا بھاؤ تاؤ کرنے لگے۔ انھیں علم نہیں تھا کہ حضورؐ نے یہ گھوڑا خرید لیا ہے۔ یہاں تک کہ بعض لوگوں نے اعرابی کو اس قیمت سے زیادہ کی پیش کش کی جو حضورؐ سے طے پا چکی تھی۔ اس پر اعرابی نے حضورؐ کو بآوازِ بلند پکارا (کیوں کہ آپؐ آگے بڑھ چکے تھے) ''آپ یہ گھوڑا خریدتے ہیں یا نہیں ورنہ میں اس کو دوسرے کے ہاتھ بیچتا ہوں۔'' آپؐ نے اعرابی کی آواز سنی تو کھڑے ہو گئے یہاں تک کہ اعرابی آپؐ کے قریب آ گیا۔ حضورؐ نے فرمایا:

''تم تو گھوڑا میرے ہاتھ بیچ چکے ہو۔''

اعرابی مُکر گیا اور بولا: ''واللہ میں نے اس کو آپ کے ہاتھ نہیں بیچا۔''

آپؐ نے فرمایا، ''ہاں تو اس کو میرے ہاتھ بیچ چکا ہے اور میں نے تجھ سے اس کو خریدا ہے۔''

حضورؐ نے بار بار یہ بات فرمائی اور اعرابی نے ہر مرتبہ انکار کیا اور کہا کہ اگر میں نے اسے آپ کے ہاتھ بیچا ہے تو اس کا کوئی گواہ لائیے۔ اسی دوران میں بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ انھوں نے اعرابی سے کہا کہ یہ اللہ کے رسول ہیں جھوٹ نہیں بول سکتے جو آپ فرما رہے ہیں یقیناً یہی سچ ہے۔ تو غلط کیوں اصرار کر رہا ہے لیکن وہ بار بار گواہ مانگے ہی جا رہا تھا۔

اتنے میں حضرت خزیمہؓ بن ثابت بھی وہاں پہنچ گئے۔ انھوں نے اعرابی کو مخاطب ہو کر کہا کہ میں اس بات کی شہادت دیتا ہوں کہ تو نے یہ گھوڑا ان کے ہاتھ بیچا ہے۔ اس پر رسولِ اکرم ﷺ نے حضرت خزیمہؓ سے پوچھا کہ تم تو اس وقت موجود نہ تھے۔ تم شہادت کس طرح دے رہے ہو۔ انھوں نے عرض کی:

بتصدیقک یا رسول اللہ۔ اے اللہ کے رسول میں آپؐ کی بات کی تصدیق

کرر ہا ہوں۔ (چوں کہ آپؐ جو کچھ فرماتے ہیں حق ہی فرماتے ہیں اس لیے میں نے یہ گواہی دی) (ان کا جوشِ اخلاص دیکھ کر) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ خزیمہؓ جس کے مخالف یا موافق گواہی دیں تو بس صرف ان کی تنہا گواہی کافی ہے یعنی ان کی شہادت دو آدمیوں کی شہادت کے برابر ہے۔ چناں چہ حضرت خزیمہؓ اسی دن سے ذوالشہادتین کے لقب سے مشہور ہو گئے۔

بعض لوگوں نے اس روایت کا اس بنا پر انکار کیا ہے کہ یہ صحیحین میں موجود نہیں ہے لیکن صحیح بخاری کی ایک حدیث میں اس واقعہ کا ضمناً ذکر آیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام بخاریؒ کو اس واقعے کی صحت پر یقین تھا۔ یہ حدیث کاتبِ وحی حبر الامت حضرت زیدؓ بن ثابت سے مروی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب ہم نے مصاحف نقل کیے تو سورۂ احزاب کی یہ آیت جس کو ہم نے رسول اللہ ﷺ سے سنا تھا نہیں پائی:

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ۝

(الاحزاب: ۲۳)

''ایمان لانے والوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جنھوں نے اللہ سے کیے ہوئے عہد کو سچا کر دکھایا ہے۔ ان میں سے کوئی اپنی نذر پوری کر چکا ہے اور کوئی وقت آنے کا منتظر ہے، انھوں نے اپنے رویّے میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔''

یہ آیت حضرت خزیمہؓ بن ثابت انصاری سے ملی جن کی شہادت کو رسول اللہ ﷺ نے دو آدمیوں کی شہادت کے برابر قرار دیا تھا۔

(۵)

حضرت خزیمہؓ بن ثابت کے گلشنِ اخلاق میں جوشِ ایمان اور حبِ رسول سب سے خوش رنگ پھول ہیں۔ اس کا اندازہ اوپر دیے گئے واقعات سے بہ خوبی کیا جا سکتا ہے۔ ایک روایت کے مطابق اگر ان کو خواجۂ کونین ﷺ کی جبینِ مبارک چومنے کا شرف حاصل ہوا تو ایک روایت کے مطابق انھوں نے خواب میں اپنے آپ کو حضورِ اقدسؐ کے سامنے سجدہ ریز پایا۔ بیدار ہو کر حضورؐ کی خدمتِ اقدسؐ میں یہ خواب بیان کیا تو سرورِ کائنات ﷺ نے اپنی جبینِ اطہر ان کی پیشانی سے مس فرمائی اور فرمایا یہی تیرے خواب کی تعبیر ہے۔

یہ نصیب اللہ اکبر، لوٹنے کی جائے ہے

قبیلہ اوس کے لوگ حضرت خزیمہؓ کے شرف اور عظمت پر فخر کیا کرتے تھے۔ حافظ ابنِ حجر عسقلانیؒ نے "الاصابہ فی تمییز الصحابہ" میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ اوس اور خزرج میں باہم مفاخرت ہوئی تو اوس نے اپنی جن جلیل القدر شخصیتوں کو خزرج کی شخصیتوں کے مقابلے میں پیش کیا ان میں ایک شخصیت حضرت خزیمہؓ بن ثابت کی تھی۔

حضرت خزیمہؓ سے ۳۸ احادیث مروی ہیں، ان کے راویوں میں حضرت جابرؓ بن عبداللہؓ، ابراہیم بن سعدؓ بن ابی وقاص، ابوعبداللہ جدلیؒ اور عطاء بن یسار کے اسماءِ گرامی قابلِ ذکر ہیں۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت عبدالرحمٰن بن ابوبکر صدیقؓ

(۱)

پہلی صدی ہجری کے چھٹے عشرے کے ایک موسمِ حج کا ذکر ہے اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ حج بیت اللہ کے لیے مدینہ منوّرہ سے مکہ معظّمہ آئیں۔ اپنے قیامِ مکہ کے دوران میں ایک دن وہ قبرستان تشریف لے گئیں۔ جونہی ایک قبر کے قریب پہنچیں، جوشِ گریہ سے بے تاب ہو گئیں اور زار زار رونے لگیں اس وقت ان کی زبان پر بے اختیار یہ شعر جاری ہو گئے۔

و کنا کندمانی جذیمة حقبة　　　من الدهر حتی قیل لن یتصدعا

''ہم دونوں جذیمہ (بادشاہ) کے مصاحبوں کی طرح مدت تک ایک ساتھ رہے یہاں تک کہ لوگ کہنے لگے یہ اب ہرگز ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے۔''

فلما تفرقنا کانی و مالکاً　　　لطول اجتماع لم نبت لیلة معا

''پھر جب ہم جدا ہو گئے تو گویا میں نے اور مالک نے عرصۂ رفاقت کی درازی کے باوجود ایک رات بھی ساتھ نہیں گزاری۔''(۱)

---

(۱) یہ عرب کے مشہور شاعر متمم بن نویرہ کے ایک مرثیہ کے شعر ہیں جو انھوں نے اپنے محبوب بھائی مالک بن نویرہ کے قتل پر کہے تھے۔ مالک حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہدِ خلافت میں فتنۂ ارتداد سے متاثر ہو گیا تھا، اگرچہ کچھ مدت بعد وہ پھر اسلام کا دم بھرنے لگا۔ لیکن حضرت خالدؓ بن ولید نے اسے ارتداد کے شبہ میں گرفتار کر لیا، حضرت خالدؓ کے دستے میں حضرت ضرارؓ بن ازور بھی شامل تھے، وہ مالک کی نگرانی پر مامور ہوئے، رات کو انھوں نے غلط فہمی کی بنا پر مالک کو قتل کر دیا۔ اس معاملے نے بڑا طول کھینچا اور حضرت خالدؓ کی خدمت میں پہنچ کر سارا واقعہ عرض کیا تو انھوں نے حضرت خالدؓ کا عذر قبول کر لیا۔ مالک کے بھائی متمم کو اس سے بڑی محبت تھی۔ انھوں نے اس واقعے پر ایسے دل دوز مرثیے کہے کہ جو سنتا رو دیتا۔ (باقی حاشیہ صفحۂ آئندہ پر)

پھر وہ رقت انگیز لہجے میں فرمانے لگیں:

''اے صاحبِ قبر! جب تم اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر رہے تھے اگر اس وقت میں تمھارے پاس موجود ہوتی تو واللہ اس قدر نہ روتی اور تمھیں اسی جگہ سپردِ خاک کرتی، جہاں تم نے وفات پائی تھی۔''

یہ صاحبِ قبر جن کی یاد نے اُمت کی جلیل القدر ماں صدّیقہ حمیراؓ بنت الصدیقؓ کو بے قرار کر دیا، حضرت عبدالرحمٰنؓ بن ابوبکر صدیقؓ تھے، اُم المومنینؓ کے حقیقی برادرِ بزرگ اور حق کے ایک سرفروش سپاہی۔

(۲)

سیّدنا ابوعبداللہ عبدالرحمٰنؓ کے حسب ونسب کے لیے یہی شرف کافی ہے کہ وہ افضل البشر بعد الانبیاء بالتحقیق سیّدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ کے فرزندِ ارجمند تھے۔ نسب نامہ یہ ہے:

عبدالرحمٰنؓ بن ابوبکر صدیقؓ بن ابوقحافہ عثمانؓ بن عامر بن عمرو بن کعب بن سعید بن تیم بن مرہ کعب لویّ القرشی۔

والدہ کا نام اُمِ رومانؓ تھا جو جلیل القدر صحابیہ تھیں، اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ بھی انھی کے بطن سے تھیں۔ اس لحاظ سے حضرت عبدالرحمٰنؓ اور اُمُّ المومنینؓ حقیقی بھائی بہن تھے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت عبدالرحمٰنؓ کا اصل نام عبدالکعبہ تھا جسے ان کے قبولِ اسلام کے بعد سرورِ عالم ﷺ نے بدل کر عبدالرحمٰن کر دیا۔

کاشانۂ صدیقِ اکبرؓ وہ برجِ سعادت تھا جسے آفتابِ اسلام کی ضیاءِ باری نے سب سے پہلے منوّر کیا لیکن خدا کی قدرت کہ حضرت عبدالرحمٰن سبقت فی الاسلام سے سعادت اندوز نہ ہو سکے اور صلح حدیبیہ تک کفر وشرک کی بھول بھلیوں میں بھٹکتے رہے۔ معلوم نہیں وہ کیا اسباب تھے کہ ان کے دل میں قریش کے آبائی مذہب کی محبت اس بری طرح جاگزیں ہوگئی تھی کہ انھیں اپنے جلیل القدر والدین کا تقدم فی الاسلام اور اخلاصِ عمل بھی متاثر نہ کر سکا۔ یہاں تک کہ غزوۂ بدر (۲ھ)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ایک مرتبہ وہ حضرت عمر فاروقؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے ان سے مرثیہ سننے کی خواہش کی جب متمم نے یہ شعر پڑھے تو حضرت عمرؓ آب دیدہ ہوگئے اور فرمایا'' کاش میں بھی مرثیہ کہہ سکتا تو اپنے بھائی زید بن خطاب کا مرثیہ کہتا۔'' متمم نے عرض کیا۔'' امیر المومنین اگر میرا بھائی زیدؓ کی طرح لڑ کر شہید ہو جاتا تو میں ہرگز اس پر مرثیہ خواں نہ ہوتا۔'' حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ متمم نے جس طرح میری تعزیت کی کسی نے نہیں کی۔

میں وہ لشکرِ باطل میں شامل ہو کر حق سے لڑنے گئے۔ صدیقِ اکبرؓ نے انھیں لشکرِ قریش کی طرف سے مسلمانوں کو دعوتِ مبارزت دیتے دیکھا تو فرطِ غضب سے بے تاب ہو گئے اور پکار کر کہا۔

''او پلید میرے حقوق کیا ہوئے۔''

وہ جواب کیا دیتے آئیں بائیں شائیں کر کے رہ گئے۔ مستدرک حاکم میں ہے کہ صدیقِ اکبرؓ نے خود ان کے مقابلے پر جانا چاہا لیکن رحمت عالم ﷺ نے باپ کو بیٹے سے نبرد آزما ہونے کی اجازت نہ دی۔ کہا جاتا ہے کہ اسلام لانے کے بعد ایک مرتبہ حضرت عبد الرحمٰنؓ نے والدِ گرامیؓ سے کہا کہ غزوۂ بدر میں ایک موقع پر آپ میری تلوار کی زد پر آ گئے تھے لیکن میں نے حقِ پدری کا لحاظ کر کے چھوڑ دیا، صدیقِ اکبرؓ نے فرمایا۔ ''بیٹے اگر اس دن تو میری تلوار کی زد پر آ جاتا تو خدا کی قسم میں تجھے کبھی نہ چھوڑتا۔'' یہ ایمان افروز واقعہ حافظ محمد اسلم جیراج پوری مرحوم نے اس طرح نظم کیا ہے:

پسرِ حضرت صدیقؓ وہ عبد الرحمانؓ — جو کہ تقویٰ میں تھے بے مثل شجاعت میں مثل
مصر اور شام کی جنگوں میں جو جو کیے کام — زینتِ صفحۂ تاریخ ہیں ان کے وہ عمل
ہاتھ میں تیغ تھی یا برق پئے خرمنِ کفر — دیکھ کے دل جسے کفّار کے جاتے تھے دہل
سطوتِ حق کا زمانہ پہ بٹھایا سکّہ — چمنِ دہر سے باطل کو کیا مستاصل
بدر تک ان کو نہ اسلام پہ آیا تھا یقیں — تھے شریکِ صفِ اعدا پئے جنگ و جدل
بعد ازاں لائے اسلام وہ والا گہر — نورِ توفیقِ الٰہی نے دکھائی مشعل
بزمِ اصحابِ رسولِ عربی میں اک روز — غزوۂ بدر کا کچھ تذکرہ آیا جو نکل
بولے یہ حضرتِ صدیقؓ سے عبد الرحمٰنؓ — حملہ آور جو ہوئی بدر میں صف اوّل
اک بار آپ وہاں آ گئے میری زد پر — سخت موقع تھا جو نیت میں کہیں آئے خَلل
پاسِ ناموسِ حقوقِ پدری نے ر — دوسری سمت کو رُخ اپنا لیا میں نے بدل
سُن کے یہ حضرتِ صدیقؓ نے ارشاد کیا — راہِ حق میں نہیں رشتہ کی رعایت کا مخل
تو مِری زَد پر جو آجاتا تو نہ بچ کر جاتا — یہ مری تیغ تھی تیرے لیے پیغامِ اجل

دشمن حق سے مسلماں کی قرابت کیسی
اس کا رشتہ ہے فقط حبِ خدا عزّ وجل

غزوۂ بدر کے بعد حضرت عبد الرحمٰنؓ غزوۂ احد میں بھی مشرکین مکہ کے ساتھ تھے۔ غرض سالہا سال تک ان کی زندگی کے یہی لیل ونہار رہے یہاں تک کہ صلح حدیبیہ (ذی قعدہ ۶ ھ) کے موقع پر ان کے نہاں خانۂ دل سے کفر وشرک کا زنگ یکسر کافور ہو گیا اور وہ مشرف بہ اسلام ہو کر حق کے ایک جان باز سپاہی بن گئے۔

(۳)

اپنے فرزندِ اکبر کے قبولِ اسلام سے صدیقِ اکبرؓ کو کمال درجے کی مسرّت ہوئی۔ انھوں نے حضرت عبد الرحمٰنؓ کو اپنے پاس مدینہ منورہ بُلا لیا اور اپنا ذاتی کاروبار اور گھر کا سارا انتظام ان کے سپرد کر دیا۔ وہ یہ تمام امور بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیتے تھے اور والدِ گرامی کی مرضی و منشا کو ہر معاملے میں پوری طرح ملحوظ رکھتے تھے، صدیقِ اکبرؓ کو کبھی کبھی غصّہ آ جاتا تھا لیکن حضرت عبد الرحمٰنؓ بڑے تحمل اور بردباری کے ساتھ والدِ گرامی کی جھڑکیاں سہتے تھے اور کبھی اُف نہ کرتے تھے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ ایک مرتبہ رات کو چند اصحابِؓ صفہ صدیقِ اکبرؓ کے ہاں مہمان تھے، کھانے سے کچھ دیر پہلے حضرت ابو بکر صدیقؓ کو بارگاہِ رسالتؐ میں کوئی ضروری کام پیش آ گیا۔ گھر سے چلنے لگے تو حضرت عبد الرحمٰنؓ کو ہدایت فرمائی کہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمتِ اقدس میں جا رہا ہوں، تم میرے واپس آنے سے پہلے مہمانانِ عزیز کو کھانا کھلا دینا مبادا میری واپسی میں دیر ہو جائے اور انھیں تکلیف ہو۔

حضرت عبد الرحمٰنؓ نے والدِ گرامی کے حکم کے مطابق مہمانوں کے سامنے کھانا رکھا تو انھوں نے اس بنا پر اس کے کھانے میں عذر کیا کہ صاحبِ خانہ موجود نہیں ہیں۔ صدیقِ اکبرؓ بڑی دیر کے بعد واپس تشریف لائے تو معلوم ہوا کہ مہمان ابھی تک بھوکے بیٹھے ہیں۔ انھوں نے خیال کیا کہ عبد الرحمٰن سے مہمانوں کو کھانا کھلانے میں کوتاہی ہوئی ہے۔ غضب ناک ہو کر انھیں بُرا بھلا کہنے لگے اور قسم کھائی کہ اب یہ بھی کھانے میں شریک نہ ہوگا، اور اسے بھوکا رہنا ہوگا، حضرت عبد الرحمٰنؓ والد گرامی کے غصّہ سے بہت ڈرتے تھے اس لیے ان کے سامنے سے ہٹ گئے تھے۔ جب معلوم ہوا کہ انھیں یونہی قصوروار ٹھہرایا جا رہا ہے تو سامنے آ کر نہایت ادب سے عرض کی۔ ''ابّا جان! میں نے آپ کے حکم کی تعمیل میں مہمانوں کے سامنے کھانا پیش کیا تھا لیکن میرے بے حد زور دینے کے باوجود انھوں نے آپ کی عدم موجودگی میں کھانے سے انکار کر دیا۔''

مہمانوں نے حضرت عبدالرحمٰنؓ کی تصدیق کی اور کہا ”خدا کی قسم ان کا مطلق کوئی قصور نہیں اس لیے جب تک یہ کھانا نہیں کھائیں گے ہم بھی نہیں کھائیں گے۔“ اب حضرتِ صدیق اکبر کا غصہ دور ہوا اور سب نے مل کر کھانا کھایا۔

حضرت عبدالرحمٰنؓ کا اپنا بیان ہے کہ اس روز کھانے میں اس قدر برکت ہوئی کہ ہم لوگوں نے خوب سیر ہو کر کھایا لیکن پھر بھی کافی بچ رہا۔ چناں چہ میں اس میں سے کچھ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بھی لے کر حاضر ہوا جسے آپؐ نے اور وہاں پر موجود بہت سے صحابہؓ نے بھی تناول فرمایا۔

رحمتِ عالم ﷺ اور عظیم المرتبت والدؓ کی سر پرستی اور فیضِ صحبت نے حضرت عبدالرحمٰنؓ کو ایک مثالی مسلمان بنا دیا اور وہ راست بازی، زہد و اتقا اور خلوص و ایثار جیسے اوصاف ومحاسن کا پیکرِ جمیل بن گئے۔ اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ اگرچہ عمر میں چھوٹی تھیں لیکن دینی لحاظ سے ان کا مرتبہ کہیں بلند تھا۔ چناں چہ دینی امور میں وہ ہمیشہ حضرت عبدالرحمٰنؓ کی رہ نمائی کرتی رہتی تھیں۔ مسند احمد حنبل میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عبدالرحمٰنؓ نے اُمّ المومنین کے سامنے جلدی جلدی وضو کیا، اُمّ المومنین کو شک گزرا کہ ان کے سارے اعضا نہیں بھیگے، فوراً ٹوکا ”عبدالرحمٰن اچھی طرح وضو کرو، میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ وضو میں جو عضو تر نہ ہوگا اس پر جہنم کی پھٹکار ہوگی۔“ چناں چہ اس کے بعد وہ وضو کرتے وقت ہمیشہ حضورؐ کا یہ ارشاد پیش نظر رکھتے تھے۔

(۴)

شجاعت و بسالت حضرت عبدالرحمٰنؓ کو اپنے جلیل القدر والدِ صدیق اکبرؓ سے ورثے میں ملی تھی، وہی صدیق اکبرؓ جنھیں اسد اللہ الغالب حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ان کی بے جگری اور دلاوری کی بنا پر ”اشجع الناس“ کا لقب دیا۔ وہ تیر اندازی اور شمشیر زنی میں کمال درجے کی مہارت رکھتے تھے اور میدانِ رزم میں بپھرے ہوئے شیر کی طرح لڑتے تھے۔ حدیبیہ کے بعد وہ تمام غزواتِ نبوی (فتح حنین، طائف اور تبوک) میں مجاہدانہ شریک ہوئے اور ہر معرکے میں اپنی شجاعت اور استقامت کے جوہر دکھائے۔ ۱۱ھ میں رحمتِ عالم ﷺ نے وصال فرمایا اور صدیق اکبرؓ سریر آرائے خلافت ہوئے تو سارے عرب میں فتنۂ ارتداد کے شعلے بھڑک اُٹھے اس سلسلے کی سب سے خوں ریز جنگ مسیلمہ کذّاب کے خلاف یمامہ میں لڑی گئی، حضرت عبدالرحمٰنؓ نے اس لڑائی میں حیرت انگیز شجاعت اور پامردی کا مظاہرہ کیا۔ دشمن کے سات زبردست جنگجو یکے بعد

دیگرے ان کے تیروں سے جہنم واصل ہوگئے۔ اثنائے جنگ میں یمامہ کے قلعے کی دیوار میں ایک جگہ شگاف پڑ گیا تھا اور مسلمانوں کے لیے قلعہ میں گھسنے کا راستہ بن گیا تھا لیکن دشمن کا ایک سرکردہ جاں باز محکم بن طفیل اپنے پیر جما کر اس شگاف میں کھڑا ہو گیا تھا اور کسی کو آگے نہیں بڑھنے دیتا تھا۔ حضرت عبد الرحمٰنؓ نے تاک کر اس کے سینے میں ایسا تیر مارا کہ آناً فاناً ہلاک ہو گیا اور مسلمان ہلّہ مار کر قلعے کے اندر داخل ہو گئے۔ بالآخر حضرت عبد الرحمٰنؓ جیسے جاں بازوں کی بہ دولت مسلمانوں کو فتحِ عظیم حاصل ہوئی۔

شام کی رومی سلطنت سے معرکہ آرائیوں کا سلسلہ شروع ہوا تو حضرت عبد الرحمٰنؓ شام جانے والے مجاہدین میں شامل ہو گئے اور کئی سال تک شام کی لڑائیوں میں بڑے جوش اور جذبہ کے ساتھ دادِ شجاعت دیتے رہے۔ انھوں نے ہر معرکے میں اپنی جرأت، بے جگری، بے خوفی اور بہادری کی دھاک بٹھا دی اور شجاعانِ عرب میں شمار کیے گئے۔ بعض مورخین نے لکھا ہے کہ وہ عرب کے ان چیدہ جنگجوؤں میں سے ایک تھے جنھیں ایک ہزار بہادروں کے برابر تسلیم کیا جاتا تھا۔

عہدِ فاروقی میں قنسرین کی خونیں جنگ میں حضرت عبد الرحمٰنؓ بھی شامل تھے اس جنگ میں ایک موقع پر ایک خطرناک مہم کے لیے حضرت خالدؓ بن ولید نے دس آزمودہ کار شہسوار منتخب کیے تو ان میں سے ایک حضرت عبد الرحمٰنؓ تھے، اس مہم کی انجام دہی کے دوران میں ان شہسواروں کا دشمن کی ایک کثیر تعداد سے مقابلہ ہوا، حضرت عبد الرحمٰنؓ نے اس معرکے میں دشمن کے پانچ آدمی قتل کیے یہاں تک کہ غسانیوں کا بادشاہ جبلہ بن ایہم خود ان کے مقابلے کے لیے نکلا، جبلہ ایک نامی جنگجو تھا اور بالکل تازہ دم تھا، حضرت عبد الرحمٰنؓ پانچ آدمیوں سے لڑ کر تھک چکے تھے لیکن اس کے باوجود جبلہ کے مقابلے پر ڈٹ گئے۔ بڑی دیر تک دونوں میں نیزے اور تلوار سے لڑائی ہوتی رہی یہاں تک کہ دونوں شدید زخمی ہو گئے اور اپنے ہم راہیوں سے جا ملے۔

یرموک کی ہول ناک جنگ کا شمار شام کی فیصلہ کن لڑائیوں میں ہوتا ہے۔ اس لڑائی میں حضرت عبد الرحمٰنؓ نے محیرّ العقول کارنامے انجام دیے۔ ایک موقع پر ساٹھ ہزار غسّانی عربوں کے مقابلے کے لیے حضرت خالدؓ بن ولید نے صرف ساٹھ شہسوار منتخب کیے، حضرت عبد الرحمٰنؓ بھی ان ساٹھ شہسواروں میں شامل تھے، ان ساٹھ مجاہدوں نے گروہ بنا کر چھاپہ مار انداز سے لڑائی شروع کی اور ساٹھ ہزار کے ٹڈی دل کو ایسا زچ کیا کہ وہ شام تک ان ساٹھ سرفروشوں

سے پناہ مانگ اٹھا، حضرت عبد الرحمٰنؓ، زبیرؓ بن العوام اور فضلؓ بن عباس تو دشمن کے ایک دستے کو مارتے رگیدتے اتنی دور نکل گئے کہ مسلمانوں کو ان کی شہادت کا خدشہ پیدا ہو گیا تاہم رات گئے وہ بہ خیریت اپنے لشکر میں واپس آ گئے۔

اسی جنگ میں ایک دوسرے موقع پر ایک مجاہد قیسؓ بن ہبیرہ کا مقابلہ ایک شہزور رومی جنگجو سے ہو گیا، دونوں بڑی دیر تک ایک دوسرے سے لڑتے رہے معاً قیسؓ نے اپنی تلوار کا ایک بھرپور وار اپنے مدِمقابل کیا جو اس کے خود پر پڑا اور ان کی تلوار دو ٹکڑے ہو گئی۔ اب ان کے پاس ایک چھوٹے سے خنجر کے سوا کچھ نہ تھا اور ان کی زندگی سخت خطرے میں تھی۔ اس نازک لمحے میں حضرت عبد الرحمٰنؓ بجلی کی طرح اپنی صفوں سے نکلے اور قیسؓ کے پاس پہنچ کر انھیں ایک نئی تلوار تھما دی۔ رومی کی مدد کے لیے بھی اس کا ایک ساتھی پہنچ گیا، عبد الرحمٰنؓ اور قیسؓ نے آناً فاناً اپنے حریفوں کو جہنم رسید کر دیا۔ اس کے بعد عبد الرحمٰنؓ میدانِ جنگ میں کھڑے ہو کر رومیوں کو للکارنے لگے کہ کسی کو مجھ سے مبارزت کی ہمت ہے تو سامنے آئے۔ جب کوئی ان کے سامنے نہ آیا تو وہ شیر کی طرح گرجتے ہوئے رومیوں کے دائیں بازو پر جا پڑے اور کئی رومیوں کو قتل کر کے اپنے لشکر میں واپس آئے۔ اسی طرح کئی اور موقعوں پر انھوں نے بدیع المثال سرفروشی کر کے اپنے آپ کو جنگِ یرموک کے ابطالِ خاص میں شمار ہونے کا مستحق ثابت کر دیا۔ اس کے بعد وہ بیت المقدس پر چڑھائی کرنے والے لشکر میں شامل ہوئے اور جب حضرت عمرؓ فاروقؓ کی تشریف آوری کے بعد سرزمین بیت المقدس نے اپنی آغوش مجاہدین اسلام کے لیے وا کر دی تو وہ تسخیر حلب کے لیے جانے والی مہم میں شریک ہو گئے۔ حلب کی فتح کے لیے مسلمانوں کو بڑی جدوجہد کرنی پڑی کیوں کہ اہلِ حلب قلعہ کے اندر محصور ہو کر عرصہ تک مسلمانوں کی مزاحمت کرتے رہے۔ اس دوران میں حضرت عبد الرحمٰنؓ نے کئی بار اپنے لشکر کی نگہبانی اور گشت کی خدمت انجام دی۔ حلب فتح ہونے کے بعد وہ شام کے کئی اور معرکوں میں دادِ شجاعت دیتے رہے۔ ایک روایت کے مطابق انھوں نے مصر کی جنگوں میں بھی شرکت کی لیکن تاریخوں میں ان کے جہادِ مصر کی تفصیل نہیں ملتی ——— حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت کے آغاز میں جمل کی افسوس ناک جنگ پیش آئی تو وہ اپنی ہمشیرہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے ساتھ تھے۔

(۵)

بعض روایتوں میں ہے کہ جب امیر معاویہؓ نے یزید کو ولی عہد نامزد کیا تو انھوں نے مروان بن الحکم والیِ مدینہ کو خط لکھا کہ اہل کوفہ و شام یزید کی ولی عہدی پر رضا مند ہیں۔ تم اہل مدینہ کو بھی اس کام پر آمادہ کرو، مروان نے یہ خط پہنچنے پر اہلِ مدینہ کے ایک اجتماع عام میں یزید کی ولی عہدی تسلیم کرنے کی دعوت دی۔ اہلِ مدینہ نے مروان کی باتیں پسند نہ کیں، سب سے پہلے حضرت عبدالرحمٰنؓ اٹھے اور کڑک کر کہا:

''تمھارا اور معاویہؓ کا ارادہ ہے کہ اُمتِ محمدیہ میں رسمِ قیصری جاری کی جائے کہ ایک قیصر مر جائے تو اس کا بیٹا قیصر بنے۔ خدا کی قسم اس طرح تو تم عامۃ المسلمین کو خلیفہ کے حقِ انتخاب سے محروم کر رہے ہو۔''

—— اس واقعہ سے پہلے امیر معاویہؓ اور حضرت عبدالرحمٰنؓ کے باہمی تعلقات نہایت خوش گوار تھے، اس لیے مروان ان کی بات سن کر سخت برہم ہوا اور ان کو گرفتار کرنا چاہا۔ وہ اپنی ہمشیرہ اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کے گھر میں داخل ہو گئے۔ مروان کو اندر گھسنے کی جرأت نہ ہوئی۔ دروازے کے باہر کھڑے ہو کر بآوازِ بلند کہا: ''یہی وہ شخص ہے جس کے بارے میں قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی:

وَالَّذِیْ قَالَ لِوَالِدَیْهِ اُفٍّ لَّكُمَآ۔

یعنی والدین کی اطاعت نہ کرنے پر خدا نے ان کی مذمت کی۔

اُمّ المومنینؓ، مروان کی بات سُن کر غضب ناک ہو گئیں اور پردے کے پیچھے سے فرمایا:

''ہم لوگوں کے بارے میں اللہ نے کوئی آیت نازل نہیں فرمائی بجز اس کے کہ میری برأت فرمائی۔'' (صحیح بخاری تفسیر سورۂ احقاف)

علامہ ابنِ اثیر نے ''اسد الغابہ'' میں لکھا ہے کہ اس موقع پر اُمّ المومنینؓ نے یہ الفاظ ارشاد فرمائے۔ ''خدا کی قسم —— نہیں —— یہ آیت عبدالرحمٰنؓ کے بارے میں نہیں ہے۔ اگر چاہو تو میں اس شخص کا نام بتا سکتی ہوں جس کی نسبت اس آیت میں اشارہ ہے۔'' مروان سے کوئی جواب بن نہ پڑا اور چپ چاپ چلا گیا۔

حضرت عبدالرحمٰنؓ کا ساتھ حضرت حسینؓ بن علیؓ، عبداللہؓ بن عباسؓ، عبداللہؓ بن زبیرؓ اور کئی دوسرے بزرگوں نے دیا۔ اس کے بعد امیر معاویہؓ خود مدینہ آئے اور مجمع عام میں بھی اور فرداً

فرداً بھی ان اصحاب کو یزید کی بیعت کی دعوت دی لیکن وہ کسی صورت میں اس پر آمادہ نہ ہوئے۔

حافظ ابن عبد البرؒ نے ''الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب'' میں لکھا ہے کہ امیر معاویہؓ نے حضرت عبد الرحمٰنؓ کی حمایت حاصل کرنے کے لیے انھیں ایک لاکھ درہم بھیجے لیکن حضرت عبد الرحمٰنؓ نے انھیں چھونا تک گوارا نہ کیا اور فرمایا:

''میں دین کو دنیا کے عوض نہیں بیچ سکتا۔''

اس واقعہ کے بعد حضرت عبد الرحمٰنؓ مدینہ منورہ کی سکونت ترک کر کے مکہ معظّمہ سے دس میل کے فاصلے پر ''حبشی یا حبیشی'' نام ایک پہاڑی مقام میں اقامت پذیر ہو گئے۔ وہیں ایک دن اچھے بھلے سوئے لیکن عالمِ خواب میں ہی پیغامِ اجل آ گیا۔ لوگوں نے مکہ معظّمہ لا کر سپردِ خاک کیا۔ صحیح بخاری کے مطابق یہ واقعہ ۵۸ھ میں پیش آیا لیکن بعض دوسری روایتوں میں ۵۳ھ یا بعض اور سنین بھی دیے گئے ہیں۔ اگر مروان والا واقعہ درست تسلیم کیا جائے تو پھر حضرت عبد الرحمٰنؓ کی وفات ۵۶ھ کے بعد ہی تسلیم کرنی پڑے گی کیوں کہ امیر معاویہؓ نے یزید کو ۵۶ھ میں ولی عہد نامزد کیا تھا۔ یہاں اس بات کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ خود حضرت عائشہ صدیقہؓ کی وفات رمضان ۵۸ھ میں ہوئی۔ اگر انھوں نے موسمِ حج میں مکہ معظّمہ جا کر بھائی کی قبر کی زیارت کی تو یہ حج یقیناً رمضان ۵۸ھ سے پہلے کا ہے۔ اس لیے قیاس غالب یہی ہے کہ حضرت عبد الرحمٰنؓ نے ۵۶ھ اور ۵۸ھ کے درمیانی عرصے میں وفات پائی۔

امُّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کو بھائی کی ناگہانی وفات کی خبر ملی تو سخت غم زدہ ہوئیں، انھیں حضرت عبد الرحمٰنؓ سے بے حد محبت تھی، شبہ گزرا کہ کسی نے زہر دے کر مار ڈالا۔ مستدرک حاکم میں ہے کہ اس واقعہ کے بعد ایک دن ایک خاتون حضرت عائشہ صدیقہؓ کے سامنے نماز پڑھ رہی تھیں کہ سجدہ میں یکا یک جاں بحق ہو گئیں، یہ دیکھ کر انھیں یقین آ گیا کہ حضرت عبد الرحمٰنؓ کی موت بھی طبعی تھی اور اس میں زہر خورانی کو دخل نہیں تھا۔ تاہم ان کے دل کا غبار اس وقت ہلکا ہوا جب حج کے موقع پر بھائی کی قبر پر جا کر خوب رولیں۔

حضرت عبد الرحمٰنؓ کی اولاد میں دو لڑکوں اور دو لڑکیوں کے نام ملتے ہیں۔ لڑکوں کے نام ابو عتیق محمدؒ اور عبد اللہؒ اور لڑکیوں کے حفصہؒ اور اسماءؒ یہ سب امّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کی آغوشِ تربیت کے پروردہ تھے، اُمّ المومنین ان سے بے حد محبت کرتی تھیں اور دینی امور میں قدم

قدم پر ان کی رہ نمائی فرماتی تھیں۔ مؤطا امام مالکؒ میں ہے کہ ایک مرتبہ حفصہؒ بنت عبد الرحمٰنؓ نہایت باریک دوپٹہ اوڑھ کر پھوپھی کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ امّ المومنینؓ ان کا دوپٹہ دیکھ کر سخت ناراض ہوئیں اور فرمایا:

''حفصہ تمھیں علم نہیں، سورۂ نور میں اللہ نے کیا احکام نازل فرمائے ہیں۔''

پھر انھوں نے وہ دوپٹہ پھاڑ ڈالا اور ایک گاڑھے کا دوپٹہ منگوا کر انھیں اوڑھایا۔

حضرت عبد الرحمٰن کے بیٹے ابو عتیق محمدؓ بھی شرفِ صحابیت سے بہرہ ور ہوئے گویا حضرت عبد الرحمٰنؓ کے گھر میں چار نسلیں صحابی تھیں یعنی ان کے دادا ابو قحافہؓ، والد حضرت ابو بکر صدیقؓ، وہ خود اور ان کے فرزند ابو عتیق محمدؓ۔

ابو عتیق محمدؓ کے بیٹے عتیقؒ اور پوتے عبد اللہؒ بن عتیقؒ نے بھی امُّ المومنین کے آغوشِ تربیت میں پرورش پائی۔ اُمّ المومنینؓ کی وفات کے بعد ان کے جن اعزّہ نے انھیں قبر میں اتارا ان میں حضرت عبد الرحمٰنؓ کے بیٹے عبد اللہ اور پڑپوتے عبد اللہؒ بن عتیقؒ بن محمدؓ بھی شامل تھے۔

(٦)

حضرت عبد الرحمٰنؓ بن ابی بکرؓ کے صحیفۂ اخلاق میں شجاعت و بسالت شوقِ جہاد اور حق گوئی و بے باکی سب سے نمایاں ابواب ہیں۔ حضرت سعیدؒ بن مسیّب سے مروی ہے کہ حضرت عبد الرحمٰنؓ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔

صحاح میں حضرت عبد الرحمٰنؓ سے کئی احادیث مروی ہیں لیکن یہ بات باعثِ حیرت ہے کہ محدثین کرامؒ نے قلّت یا کثرتِ روایت کی بنا پر صحابہ کرامؓ کے جو چار طبقے مقرر کیے ہیں ان میں سے کسی طبقے میں حضرت عبد الرحمٰنؓ کا نام شامل نہیں کیا۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم یہاں صحیح بخاری کی دو روایات کا خلاصہ (تبرکاً) بیان کر دیں جو حضرت عبد الرحمٰنؓ بن ابو بکرؓ سے مروی ہیں۔

ایک روایت میں بیان کرتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ (حضرت) عائشہ (صدیقہؓ) کے پیچھے سوار ہو کر مقام تنعیم سے ان کو عمرہ کرا دوں۔

اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عبد الرحمٰنؓ کو رسول اکرم ﷺ کی ہم رکابی اور اُمُّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کی معیت میں عمرہ کا شرف بھی حاصل ہوا تھا۔

دوسری روایت میں حضرت عبد الرحمٰنؓ نے حضور پُر نور ﷺ کے ایک معجزہ کا ذکر کیا ہے جو خود ان کے مشاہدے میں آیا۔ فرماتے ہیں کہ ایک دن ہم کل ایک سو تیس آدمی حضوؐر کے ہم رکاب تھے۔ آپؐ نے فرمایا، تم میں سے کسی کے پاس کچھ کھانا ہے۔ اتفاق سے اس وقت صرف ایک شخص کے پاس تقریباً تین سیر گندم کا آٹا تھا، حضوؐر نے اس کو گوندھنے کا حکم دیا، جب آٹا گوندھ لیا گیا تو ایک بڑے ڈیل ڈول والا مشرک اپنی بکریاں ہانکتا وہاں آنکلا۔ آپؐ نے اس سے پوچھا، فروخت کرنے کا ارادہ ہے یا ہدیہ دینے کا؟ اس نے کہا، فروخت کرنے کا۔ آپؐ نے ایک بکری خرید کر (ذبح کروائی اور) پکوائی اور کلیجی کو بھوننے کا حکم دیا۔ میں اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ایک سو تیس آدمیوں میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہ رہا جس کو حضوؐر نے کلیجی کا کوئی ٹکڑا نہ دیا ہو۔ جو کوئی وہاں موجود تھا اس کو تو (اسی وقت) دے دیا، جو موجود نہ تھا اس کا حصہ باقی رکھ چھوڑا۔ پھر آپؐ نے بکری کا سالن دو بڑے برتنوں میں ڈالا اور تمام لوگوں نے اس کو سیر ہو کر کھایا پھر بھی دو پیالے بچ رہے جن کو ہم نے اونٹ پر رکھ لیا۔

سیّدنا حضرت عبد الرحمٰنؓ نے بلا شبہ خاصی تاخیر سے اسلام قبول کیا تھا لیکن سعادت اندوزِ اسلام ہونے کے بعد انھوں نے اپنے اخلاصِ عمل سے گزشتہ دورِ حیات کی تلافی کر دی یہاں تک کہ بارگاہِ رسالتؐ میں تقرب حاصل کر لیا۔ یہی سبب تھا کہ اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ ان سے بے پناہ محبت کرتی تھیں اور ان کو صرف برادرِ بزرگ کی حیثیت نہیں دیتی تھیں بلکہ حضوؐر کا ایک مخلص جاں نثار اور اسلام کا ایک سرفروش مجاہد سمجھ کر بھی ان کی بے حد تکریم کرتی تھیں۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت ضحاک بن سفیانؓ

سیافِ رسولؐ

(۱)

فتحِ مکہ (رمضان ۸ ھ) کے چند دن بعد جب سرورِ عالم ﷺ مکہ سے حنین کی طرف روانہ ہوئے تو دوسرے قبائل کے علاوہ بنو کلاب کے مردانِ حق کی ایک جماعت بھی حضورؐ کی خدمت میں اس مقصد کے لیے حاضر ہوئی کہ بنو ہوازن کے سرکشوں کے خلاف لڑائی میں آپؐ کی ہم رکابی کا شرف حاصل کرے۔ جوشِ شجاعت سے سرشارانِ جنگ جو اور جفاکش بدویوں کو دیکھ کر رحمتِ عالم ﷺ کے روئے انور پر بشاشت پھیل گئی اور آپؐ نے ان سے پوچھا: ''تمھاری جماعت میں کتنے آدمی ہیں؟''

انھوں نے عرض کیا۔ ''یارسول اللہؐ ہم نو سو ہیں۔''

حضورؐ نے فرمایا: ''اگر تم پسند کرو تو میں تمھیں ایک ایسا شہسوار دے دوں جو تمھاری تعداد کو ایک ہزار کے برابر کر دے اور تمھاری قیادت بھی کرے۔''

انھوں نے بیک زبان عرض کیا۔ ''بہ سروچشم یارسول اللہؐ''

حضورؐ نے ایک شمشیر بہ دست قوی الجثہ اور وجیہ صاحب کو آگے بڑھنے کا اشارہ فرمایا۔ انھوں نے فوراً تعمیل ارشاد کی۔

سرورِ عالم ﷺ نے بنو کلاب کا علمِ امارت انھیں مرحمت فرمایا اور بنو کلاب سے مخاطب ہو کر فرمایا:

''اب تم پورے ایک ہزار ہو۔ جاؤ اور اپنے امیر کی اطاعت کرو۔''

یہ صاحب جنھیں سید المرسلین فخرِ موجودات ﷺ نے پورے ایک سو شہسواروں کے برابر قرار دیا، حضرت ضحاکؓ بن سفیان تھے جو تاریخ میں ''سیافِ رسول اللہؐ'' (رسول اللہؐ کے شمشیر بردار محافظ) کے لقب سے مشہور ہیں۔

(۲)

سیدنا حضرت ضحاکؓ بن سفیان کا شمار اپنے عہد کے نامور بہادروں اور سرورِ عالم ﷺ کے نہایت مخلص جاں نثاروں میں ہوتا ہے۔ ان کی کنیت بہ اختلاف روایت ابو سعد یا ابو سعید تھی اور وہ بنو کلاب سے تعلق رکھتے تھے جو مشہور نجدی قبیلے ''بنو عامر'' کی ایک شاخ تھا۔ نسب نامہ یہ ہے۔

ضحاکؓ بن سفیان بن عوف بن کعب بن ابی بکر بن کلاب بن ربیعہ بن عامر بن صعصعہ عامری کلابی۔

یہی نسب نامہ سیرت کی تمام کتابوں میں مذکور ہے البتہ حافظ ابن عبد البرؒ نے ''الاستیعاب'' میں حضرت ضحاکؓ کے نام کے ساتھ ''الکلبی'' لکھا ہے۔ جمہور اہل سِیَر کے نزدیک صحیح یہی ہے کہ وہ بنو کلاب سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لیے کلابی تھے۔

بہت سے اہل سِیَر نے تواتر کے ساتھ لکھا ہے کہ وہ اکثر تلوار اٹھائے حفاظت کی غرض سے رسول اکرم ﷺ کے پاس کھڑے رہتے تھے۔ اسی لیے ''سیافِ رسول اللہؐ'' یعنی رسول اللہ ﷺ کے شمشیر بردار محافظ کے لقب سے مشہور ہو گئے تھے۔

حافظ ابنِ حجر عسقلانیؒ اور حافظ ابنِ عبد البرؒ کا بیان ہے کہ ضحاکؓ بن سفیان کا مسکن مدینہ کے نواحی دیہات میں تھا اس لیے وہ اہل مدینہ میں شمار ہوتے ہیں لیکن جمہور اربابِ سِیَر نے ان کو مہاجرین میں شامل کیا ہے اور قرینِ قیاس بھی یہی ہے۔ کیوں کہ نجدی قبائل کو مدینہ کے باشندے نہیں قرار دیا جا سکتا۔

حضرت ضحاکؓ زمانۂ جاہلیت میں اپنے قبیلہ کے سر برآوردہ اور بہادر لوگوں میں شمار ہوتے تھے اور شعر و شاعری میں بھی درک رکھتے تھے۔ جب وہ سعادت اندوز اسلام ہوئے تو سرورِ عالم ﷺ نے انھیں اپنے قبیلے کا امیر اور ایک دوسری روایت کے مطابق عاملِ صدقات مقرر فرمایا۔

اس بات پر سب اہلِ سِیَر کا اتفاق ہے کہ حضرت ضحاکؓ فتح مکہ سے پہلے مشرف بہ اسلام ہوئے لیکن کسی نے ان کے قبولِ اسلام کے صحیح زمانے کی صراحت نہیں کی البتہ واقدی کی ایک روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سانحہ بیرٔ معونہ (صفر ۴ھ) سے پہلے مسلمان ہو چکے تھے اور حضورؐ نے انھیں بنو کلاب کے صدقات وصول کرنے کی ذمہ داری سونپی تھی یا انھیں بنو کلاب کا عامل (محصّل) صدقات مقرر فرمایا تھا۔

باختلافِ روایت سانحہ بیرٔ معونہ میں بنو عامر کے سردار عامر بن طفیل کی غدّاری کی وجہ سے انتالیس یا انہتر صحابہ کرامؓ کو مشرکینِ نجد کے ہاتھوں جامِ شہادت پینا پڑا تھا۔ ان صحابہ (قرّاء) کو حضورؐ نے ابو براء عامر بن مالک بن جعفر کلابی کی درخواست پر بنو عامر میں تبلیغ اسلام کے لیے بھیجا تھا۔ عامر بن طفیل نے قبائل رعل و ذکوان وغیرہ کی مدد سے ایک (حضرت عمروؓ بن امیہ ضمری) کے سوا ان سب کو نہایت بے دردی سے شہید کر ڈالا۔ شہداء میں حضرت عامرؓ بن فہیرہ بھی شامل تھے۔ انھیں ان کے قاتل جبّار بن سلمٰی کلابی نے نیزہ مارا تو بے اختیار ان کے منہ سے نکلا:

فُزْتُ وَاللّٰه

''خدا کی قسم میں کام یاب ہو گیا۔''

حضرت ضحاکؓ بن سفیان اس موقع پر موجود نہیں تھے۔ جبار اپنے قبیلہ (بنو کلاب) میں واپس گیا اور حضرت ضحاکؓ کو یہ واقعہ سنایا تو انھیں بے حد صدمہ ہوا، جبار نے ان سے پوچھا کہ ''فُزْتُ وَاللّٰه'' سے مقتول کی کیا مراد تھی؟ حضرت ضحاکؓ نے اسے بتایا کہ ہر مسلمان کا عقیدہ ہے کہ اگر وہ اللہ کے راستے میں مارا جائے تو جنت میں جاتا ہے۔ عامرؓ بن فہیرہ نے شہادت سے پہلے یہ الفاظ کہہ کر اپنے اس یقین اور ایمان کا اظہار کیا کہ اللہ نے انھیں جنت عطا کی اور اس طرح وہ اپنے مقصدِ زندگی میں کام یاب ہو گئے۔ جبار حضرت ضحاکؓ کی باتوں سے اتنا متاثر ہوا کہ اسی وقت مشرف بہ اسلام ہو گیا۔

حضرت ضحاکؓ نے سانحہ بیرٔ معونہ، حضرت عامرؓ بن فہیرہ کی شہادت اور جبار بن سلمٰی کے قبولِ اسلام کے حالات تفصیل کے ساتھ سرورِ عالم ﷺ کی خدمت میں لکھ بھیجے۔ علاّمہ ابنِ اثیر کا بیان ہے کہ حضورؐ کو اس واقعے کا اس قدر صدمہ ہوا کہ آپؐ چالیس دن تک صبح کی نماز کے بعد غدّار قاتلوں کے لیے بددعا کرتے رہے۔

(۳)

حضرت ضحاکؓ بن سفیان نے کن کن غزوات وسرایا میں شرکت کی؟ اہلِ سِیَر نے اس کی صراحت نہیں کی اور صرف تین چار غزوات وسرایا کے سلسلے میں ان کا نام خصوصیت سے لیا ہے۔ چوں کہ حضرت ضحاکؓ کی شجاعت اور بہادری سب کے نزدیک مسلّم ہے اس لیے قیاس ہے کہ قبولِ اسلام کے بعد وہ کسی غزوے میں پیچھے نہیں رہے ہوں گے۔ مورخ واقدی کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ سرورِ عالم ﷺ نے بنوالقرطاء (قرط یا قریط) کے خلاف ایک مہم روانہ فرمائی تو اس کی قیادت پر حضرت ضحاکؓ بن سفیان کو مامور فرمایا۔ یہ قبیلہ بنوبکر کی ایک شاخ تھا اور اس نے سرکشی پر کمر باندھی تھی۔ حضرت ضحاکؓ نے ان کو قرار واقعی سزا دی اور مظفر ومنصور مدینہ منوّرہ کو معاودت کی۔

حافظ ابنِ عبد البرؒ اور کئی دوسرے اہلِ سِیَر نے لکھا ہے کہ غزوۂ حنین میں بنوسلیم کے مجاہدین کی کمان حضرت ضحاکؓ کے سپرد تھی اور یہ بنوسلیم ہی تھے جن کا علم حضرت ضحاکؓ کو دیتے وقت حضورؐ نے فرمایا تھا کہ یہ تمھاری (نوسوکی) تعداد کو ایک ہزار کے برابر کر دیں گے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ یہ واقعہ فتح مکہ سے قبل اس وقت پیش آیا جب بنوسلیم قدید کے مقام پر بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر اسلامی لشکر میں شامل ہوئے تھے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حافظ ابنِ حجرؒ اور علامہ بلاذریؒ کا بیان ہے کہ جعرانہ سے واپسی پر رسولِ اکرم ﷺ نے ضحاکؓ بن سفیان کو بنوکلاب سے زکوٰۃ وصول کرنے کی خدمت سپرد فرمائی۔ اگر واقدی کی اس روایت کو درست تسلیم کیا جائے کہ حضرت ضحاکؓ ۴ھ میں بھی حضورؐ کی طرف سے بنوکلاب کے عامل مقرر کیے گئے تھے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کچھ مدت بعد حضرت ضحاکؓ اس عہدہ سے سبک دوش ہو کر حضورؐ کے پاس مدینہ منوّرہ آگئے ہوں گے اور ۸ھ میں غزوۂ حنین کے بعد ان کا اس عہدہ پر دوبارہ تقرر ہوا ہوگا۔

ربیع الاول ۹ھ میں سرورِ عالم ﷺ نے خود حضرت ضحاکؓ کے قبیلے بنوکلاب کی طرف ایک مہم روانہ فرمائی جس کا مقصد بنوکلاب کے مشرکین کی تادیب کرنا اور ان کو تعلیم دینا تھا۔ حضورؐ نے اس مہم کا قائد حضرت ضحاکؓ بن سفیان ہی کو بنایا اور یہ مہم انھی کے نام پر ''سریّہ ضحاک بن

سفیان کلابی'' سے مشہور ہوئی۔ (بعض نے اسے سریہ بنوکلاب بھی لکھا ہے) مشرکینِ بنوکلاب نے مسلمانوں کی مزاحمت کی لیکن جلد ہی مغلوب ہو گئے۔

۱۱ھ میں سرورِ عالم ﷺ کے وصال کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ مسندِ خلافت پر بیٹھے تو سارے عرب میں فتنۂ ارتداد کے شعلے بھڑک اٹھے۔ قبیلہ بنوسلیم بھی ارتداد کی لپیٹ میں آ گیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ان کی سرکوبی کے لیے حضرت ضحاکؓ بن سفیان کو روانہ کیا۔ علامہ خیر الدین الزّرِکلی نے ''الاعلام'' میں لکھا ہے کہ حضرت ضحاکؓ بن سفیان نے بنوسلیم کے کثیر التعداد مرتدین کے خلاف بڑی بہادری سے لڑتے ہوئے شہادت پائی، لیکن حضرت ضحاکؓ کا خونِ شہادت رائیگاں نہیں گیا۔ طلیحہ بن خویلد اسدی کی شکست کے بعد بنوسلیم اور ان کے حواریوں کے حوصلے پست ہو گئے اور ان میں سے بیشتر نے حضرت خالدؓ بن ولید کے ہاتھ پر دوبارہ اسلام قبول کر لیا، البتہ جن لوگوں نے ارتداد کی حالت میں مسلمانوں کے خون سے ہاتھ رنگے تھے، وہ گرفتار کر کے قتل کیے گئے۔ حضرت ضحاکؓ کی ازواج و اولاد کے بارے میں کتبِ سِیَر خاموش ہیں۔

(۴)

حضرت ضحاکؓ بن سفیان بنیادی طور پر ایک سپاہی آدمی تھے اس لیے انھیں حدیث بیان کرنے کا موقع بہت کم ملا۔ ان سے صرف چار حدیثیں مروی ہیں اور رواۃ میں حسن بصریؒ اور سعید بن المسیبؒ جیسے جلیل القدر بزرگ شامل ہیں۔

حافظ ابن عبد البرؒ نے الاستیعاب میں لکھا ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ، حضرت ضحاکؓ کی رائے کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ اس کے ثبوت میں انھوں نے یہ واقعہ پیش کیا ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ مقتول کی دیت میں بیوی کو حصہ دینے کے حق میں نہیں تھے لیکن حضرت ضحاکؓ نے انھیں بتایا کہ میں جس قبیلے کا عامل تھا اس کا ایک شخص اشیم الضبابی غلطی سے قتل ہو گیا تھا، رسول اللہ ﷺ کو اطلاع ہوئی تو آپ نے مجھے تحریری حکم بھیجا تھا کہ اشیم مقتول کی دیت میں سے اس کی بیوی کو بھی حصہ دیا جائے۔ چناں چہ میں نے اسی کے مطابق عمل کیا تھا۔ حضرت ضحاکؓ کی اس شہادت پر حضرت عمر فاروقؓ نے اپنی رائے تبدیل کر لی۔ اگر یہ واقعہ حضرت عمر فاروقؓ کے عہدِ خلافت میں پیش آیا ہے۔ تو الزرِکلی کی یہ روایت مشتبہ ٹھہرتی ہے کہ حضرت ضحاکؓ نے فتنۂ ردّہ میں شہادت

پائی۔ اس صورت میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت ضحاکؓ نے کب وفات پائی؟ اس کا جواب سیرت اور تاریخ کی کسی کتاب سے نہیں ملتا۔

حضرت ضحاکؓ کو سرورِ عالم ﷺ سے غایت درجہ محبت تھی۔ علاّمہ بلاذریؒ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ انھوں نے حضورؐ کی خدمت میں ایک شیر دار اونٹنی ہدیتاً پیش کی جو کثرتِ دودھ کے لیے مشہور تھی۔ حضرت ضحاکؓ ذاتِ رسالت مآب ﷺ کی حفاظت وصیانت کو اپنے لیے باعثِ افتخار جانتے تھے۔ چناں چہ انھوں نے کئی موقعوں پر حضورؐ کے پیچھے کھڑے ہو کر آپؐ کی حفاظت کی خدمت انجام دی۔ اس وقت شمشیر برہنہ ان کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ حافظ ابنِ عبد البرؒ کہتے ہیں کہ اسی خدمت کے صلہ میں انھیں بارگاہِ رسالت سے ''سیافِ رسول'' کا خطاب مرحمت ہوا اور اس خطاب میں کوئی دوسرا ان کا شریک وسہیم نہیں ہے۔ ان کی بہادری اور شہسواری کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ خود سرورِ کونین ﷺ انھیں ایک سو شہسواروں کے برابر سمجھتے تھے اور اس کا برملا اظہار فرماتے تھے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت عتّاب بن اسید اُمویؓ

(۱)

رمضان ۸ ھ میں فتح مکہ کے چند دن بعد رحمتِ عالم ﷺ کو اطلاع ملی کہ بنو ہوازن چنداور سرکش قبیلوں کو ساتھ ملا کر مکہ معظّمہ پر حملہ کی تیاری کر رہے ہیں۔ حضورؐ نے صحابہ کرامؓ سے فرمایا کہ بہتر یہ ہے کہ ان لوگوں کا آگے بڑھ کر مقابلہ کیا جائے اور ان کو مکہ معظّمہ کے قریب نہ پھٹکنے دیا جائے۔ چناں چہ اس مقصد کے لیے آپؐ بارہ ہزار سرفروشوں کے ہم راہ مکہ معظّمہ سے حنین کی جانب روانہ ہوئے۔ لشکرِ اسلام کی روانگی سے پہلے یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ مکہ معظّمہ کی امارت پر کسی قابلِ اعتماد آدمی کو مقرر کیا جائے۔ اگرچہ مکہ معظّمہ میں بہت سے معمر اصحاب موجود تھے۔ لیکن اس اہم منصب کے لیے سید المرسلین ﷺ کی نظرِ انتخاب مکہ کے ایک ایسے نوجوان پر پڑی جن کی عمر بیس اکیس برس کی تھی اور جو صرف چند دن پہلے شرفِ اسلام سے بہرہ ور ہوئے تھے۔ یہ سعادت مند نوجوان ابو عبد الرحمٰن عتابؓ بن اسیّد تھے۔ حضورؐ نے ان کو بلا بھیجا تو وہ دوڑے دوڑے بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے اور بڑے ادب سے سلام کر کے ارشادِ نبویؐ سننے کے لیے ہمہ تن گوش ہو گئے۔

سرورِ عالم ﷺ نے ان سے مخاطب ہو کر فرمایا:

"عتاب، میں یہاں سے جا رہا ہوں، میرے بعد تم مکہ کے عامل ہو گے۔ یہ بات یاد رکھنا کہ میں تم کو اہل اللہ پر عامل بنا رہا ہوں۔ اس لیے کہ میرے نزدیک تم اس کام کے لیے سب سے بڑھ کر موزوں ہو، اگر کسی دوسرے میں یہ منصب سنبھالنے کی اہلیت تم سے بڑھ کر ہوتی تو میں یہ ذمّے داری اس کو سونپتا۔"

حضرت عتابؓ نے ارشادِ نبوی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا اور پھر اپنے دورِ امارت میں حسن انتظام، فقر و استغناء، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ایسا مظاہرہ کیا کہ رحمتِ عالم ﷺ کی نیابت کا حق ادا کر دیا۔

(۲)

سیّدنا حضرت ابوعبدالرحمٰن عتابؓ بن اسید کا شمار بڑے عظیم المرتبت صحابہؓ میں ہوتا ہے۔ ان کا تعلق قریش کی نامور شاخ بنواُمیہ سے تھا۔ سلسلۂ نسب یہ ہے:

عتابؓ بن اسید بن ابی العیص بن امیہ بن عبد شمس بن عبد مناف بن قصی بن کلاب بن مرہ۔

اس طرح حضرت عتابؓ کا سلسلۂ نسب پانچویں پشت میں عبد مناف پر رسولِ اکرم ﷺ کے آبائی سلسلہ سے مل جاتا ہے۔ حضرت عثمان ذوالنورینؓ، ابوسفیانؓ اور امیر معاویہؓ بھی اسی خاندان (بنواُمیّہ یا بنوعبد شمس) کے ارکان تھے۔

اربابِ سِیَر نے حضرت عتابؓ کے سالِ ولادت کی تصریح نہیں کی لیکن اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ فتحِ مکہ (۸ھ) کے وقت ان کی عمر بیس اکیس برس سے زیادہ نہیں تھی۔ اس حساب سے ان کا سال ولادت ۱ھ بعثت قرار پاتا ہے گویا حضورؐ کی ہجرت (۱۳ بعثت) کے موقع پر وہ بارہ برس کے نابالغ لڑکے تھے۔ اگر چہ وہ ہجرتِ نبوی کے بعد بدوِشعور کو پہنچے، تاہم مبداءِ فیض کی طرف انھیں نہایت صالح فطرت ودیعت کی گئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ شروع ہی سے بت پرستی سے متنفر تھے اور مشرکانہ اعمال و رسوم سے حتی الوسع اجتناب کرتے تھے۔ سرورِ عالم ﷺ کو بھی ان کی سلامتیِ طبع کا علم ہو گیا تھا۔ چناں چہ مستدرک حاکم کی ایک روایت کے مطابق فتح مکہ سے ایک دو دن پہلے حضورؐ نے برسبیلِ تذکرہ صحابہؓ کے سامنے ارشاد فرمایا کہ قریش کے چار آدمی شرک سے دُور ہیں اور اسلام کی طرف رجحان رکھتے ہیں۔

صحابہؓ نے پوچھا، یارسول اللہ وہ کون سے آدمی ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا ''عتابؓ بن اسید، سہیلؓ بن عمرو، حکیمؓ بن حزام اور جبیرؓ بن مطعم'' خدا کی شان کہ یہ چاروں سعادت اندوزِ اسلام ہوئے اور جلیل القدر صحابہ میں شمار ہوئے۔ حضرت عتابؓ گو فتحِ مکہ کے دن مشرف بہ اسلام ہوئے لیکن سرورِ عالم ﷺ ان کی شجاعت اور عقل و دانش کے اس قدر مداح تھے کہ آپؐ نے

انھیں غزوۂ حنین پر روانہ ہونے سے پہلے (یا غزوۂ حنین کے دوران میں) مکے کا عامل مقرر فرمایا۔ بعض روایتوں میں ہے کہ حضورؐ نے پہلے حضرت معاذؓ بن جبل انصاری کو مکے کا امیر بنایا اور چند دن بعد ان کی جگہ حضرت عتابؓ کو اس منصب پر فائز کیا۔ کچھ اور روایتوں کے مطابق حضورؐ نے حضرت عتابؓ کو مکے کا امیر بنایا اور حضرت معاذؓ بن جبل کو ان کی مدد کے لیے اور لوگوں کو قرآن و سنت کی تعلیم دینے کے لیے مکہ میں چھوڑا۔ حضرت معاذؓ بن جبل کی امارتِ مکہ کے بارے میں تو اختلاف ہوسکتا ہے لیکن اس بات پر سب اہلِ سِیَر کا اتفاق ہے کہ حضرت عتابؓ بن اسید چار پانچ سال تک مکہ کے امیر رہے۔ علّامہ ابن اثیر نے اسد الغابہ میں اور ابن حزم نے "جوامع السیرۃ" میں بیان کیا ہے کہ ۸ھ کا حج حضرت عتابؓ بن اسیّد کی امارت میں ہوا، اس لحاظ سے وہ تاریخِ اسلام میں سب سے پہلے امیر الحج ٹھیرتے ہیں۔ حافظ ابنِ حجرؒ نے "اصابہ" میں لکھا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے حضرت عتابؓ کے لیے صرف دو درہم روزانہ مقرر کیے اور انھوں نے اپنے سارے زمانۂ امارت میں اسی روزینہ پر قناعت کی، نہ اس میں کبھی اضافہ کا مطالبہ کیا اور نہ آمدنی کا کوئی اور ذریعہ تلاش کیا یہاں تک کہ اگر کسی نے ہدیتاً بھی کوئی چیز پیش کی تو اس کو استعمال کرنے سے گریز کیا۔ امام حاکمؒ نے مستدرک میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ کسی شخص نے انھیں دو چادریں ہدیتاً پیش کیں، انھوں نے یہ چادریں قبول تو کرلیں لیکن فوراً اپنے غلام کیسان کو عطا کردیں۔ ان کا قول تھا کہ جو پیٹ دو درہم میں نہیں بھرتا۔ اللہ تعالیٰ اس کو کبھی آسودہ نہ کرے گا۔

حضرت عتابؓ احکامِ الٰہی کے نافذ کرنے میں بڑی سختی سے کام لیتے تھے اور کسی شخص کو اس بات کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ وہ کسی معقول عذر کے بغیر نماز باجماعت ترک کردے۔ حافظ ابنِ حجرؒ نے بیان کیا ہے کہ وہ اہلِ مکہ کے سامنے کہا کرتے تھے کہ خدا کی قسم ترکِ جماعت خالص منافقت ہے اور جو شخص جماعت کے ساتھ نماز ادا نہ کرے گا میں اس کو قتل کردوں گا۔ اس معاملہ میں ان کی سختی سے اہلِ مکہ عاجز آگئے۔ یہاں تک کہ انھوں نے مدینہ منورہ ایک وفد بھیج کر سرورِ عالم ﷺ سے شکایت کی کہ عتابؓ احکامِ شریعت نافذ کرنے میں حدِ اعتدال سے بڑھ گئے ہیں۔ اس پر حضورؐ نے حضرت عتابؓ کو حکم بھیجا کہ تمام امور میں اعتدال سب سے اچھی روش ہے۔ اس کے بعد ان کے تشدّد میں کمی آگئی۔

(۳)

صحیح بخاری میں حضرت مسورؓ بن مخرمہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ابو جہل کی بیٹی سے نکاح کا ارادہ کیا۔ ابو جہل کے اہلِ خاندان نے حضورؐ سے اجازت طلب کی تو آپؐ نے منبر پر چڑھ کر ارشاد فرمایا:

"آلِ ہشام علیؓ بن ابی طالب سے اپنی بیٹی کا عقد کرنا چاہتے ہیں اور مجھ سے اجازت مانگتے ہیں لیکن میں اجازت نہ دوں گا کبھی نہ دوں گا ـــــ میں حلال کو حرام اور حرام کو حلال کرنے نہیں کھڑا ہوا لیکن خدا کی قسم اللہ کے رسولؐ کی بیٹی اور ایک دشمنِ خدا کی بیٹی ایک شخص کے نکاح میں جمع نہیں ہوسکتیں۔"

چناں چہ حضرت علیؓ نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ مصعب الزبیری سے روایت ہے کہ اس موقع پر حضرت عتابؓ بن اسید ابو جہل کی بیٹی جویریہ سے شادی کرنے پر صرف اس لیے تیار ہو گئے کہ حضرت فاطمۃ الزہراؓ پر سوکن لانے کا کوئی امکان ہی باقی نہ رہ سکے۔ یہ بات اُن کی حبِ رسولؐ پر دال ہے کیوں کہ انھیں معلوم تھا کہ سرورِ عالم ﷺ اپنی لختِ جگر پر سوکن لائے جانے کو کبھی پسند نہیں فرمائیں گے۔

ابن حزم نے جمہرۃ انساب العرب میں لکھا ہے کہ حضرت عتابؓ نے ابو جہل کی بیٹی الحنفا سے نکاح کیا تھا۔ وہ پہلے حضرت سہیلؓ بن عمرو کے عقد میں تھیں لیکن انھوں نے کسی وجہ سے طلاق دے دی تھی۔

۱۱ھ میں سرورِ عالم ﷺ کا وصال ہوا تو حضرت عتابؓ حضورؐ کی وفات کی خبر سُن کر شدتِ غم سے نڈھال ہو گئے اور دل شکستگی کے عالم میں نواحِ مکہ کی کسی گھاٹی میں چلے گئے۔ علامہ ابنِ عساکرؒ نے حضرت عبید اللہ بن عمیرؓ سے روایت کی ہے کہ مکہ معظّمہ کے جہاں دیدہ بزرگ حضرت سہیلؓ بن عمرو کو حضرت عتابؓ کے مکہ چھوڑنے کا حال معلوم ہوا تو وہ ان کو ڈھونڈتے ہوئے ان کے پاس پہنچ گئے اور ان سے درخواست کی کہ آپ شہر میں واپس آیئے اور لوگوں سے بات کیجیے۔

حضرت عتابؓ نے جواب دیا کہ رسول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد میں اپنے اندر طاقتِ گویائی نہیں پاتا۔ حضرت سہیلؓ نے کہا، آپ میرے ساتھ چلیے میں آپ کی طرف سے لوگوں سے بات کروں گا۔

چناں چہ دونوں حضرات مسجد الحرام میں آئے جہاں اہلِ مکہ بڑی تعداد میں جمع تھے، حضرت سہیلؓ بن عمرو نے ان کے سامنے اسی طرح کا خطبہ دیا۔ جیسا حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اہلِ مدینہ کے سامنے دیا تھا۔ اس سے لوگوں کی ڈھارس بندھ گئی اور وہ اپنے کام کاج میں مشغول ہوگئے۔ امام بخاریؒ کا بیان ہے کہ اس موقع پر حضرت سہیلؓ نے وہ تمام فرائض انجام دیے جو امیرِ مکہ کی حیثیت سے حضرت عتابؓ کے ذمہ تھے۔ اس کا سبب بہ ظاہر یہ تھا کہ حضرت عتابؓ کو حضورؐ کی وفات سے اس قدر صدمہ پہنچا تھا کہ وہ اپنے آپ کو امارتِ مکہ کی گراں باری کا متحمل نہیں پاتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ کئی دن بعد اپنے فرائض ادا کرنے کے قابل ہوئے۔ خلیفۃ الرسولؐ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے بھی انھیں اپنے عہدہ پر بہ دستور قائم رکھا اور وہ خلافتِ صدیقی کے پورے دَور میں امارتِ مکہ کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ابنِ حزم کا بیان ہے کہ ۱۲ھ میں جس دن حضرت ابوبکر صدیقؓ کی وفات کی خبر مکے پہنچی اسی دن حضرت عتابؓ نے وفات پائی۔

علامہ ابن الاثیرؒ نے بھی ان کا سالِ وفات ۱۳ھ لکھا ہے۔ اس وقت ان کی عمر صرف پچیس چھبیس سال کی تھی، ان کی جوانا مرگی ''خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود'' کا مصداق تھی۔

بعض روایتوں کے مطابق ان کی وفات ۱۳ھ اور ۲۲ھ کے درمیان کسی سال واقع ہوئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ حضرت عمر فاروقؓ کے عہدِ خلافت میں بھی مکہ کے عامل تھے۔ علامہ شبلی نعمانیؒ نے ''الفاروق'' میں حضرت عمرؓ کے عمّال کی فہرست میں حضرت عتابؓ بن اسیّد کا نام صراحت کے ساتھ درج کیا ہے۔

علامہ ابنِ حجر عسقلانیؒ نے اصابہ میں یہ روایت درج کی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے ایک قیمتی حلّہ حضرت عتابؓ بن اسید کو پیش کیا کیوں کہ فتح مکہ کے بعد جب انھیں رسول اللہ ﷺ نے مکہ معظّمہ کا عامل مقرر فرمایا تو اس وقت ان کو دو چادروں کے سوا کچھ معاوضہ نہ دیا جاسکا تھا۔

اس روایت سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عتابؓ عہدِ فاروقی میں حیات تھے۔ بہرصورت اس بات پر سب اہلِ سِیَر کا اتفاق ہے کہ حضرت عتابؓ نے کچھ زیادہ عمر نہیں پائی اور جوانی میں ہی وفات پا گئے۔

(۴)

حضرت عتابؓ چوں کہ فتح مکہ کے دن حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے اس لیے انھیں

فیضانِ نبوی سے بہرہ یاب ہونے کا موقع بہت کم ملا، اس کے باوجود تمام اربابِ سیَر نے انھیں فضلائے صحابہ میں شمار کیا ہے اور ان کے علم وفضل اور زہد واتقا کی بڑی تعریف کی ہے۔ علامہ ابنِ اثیرؒ نے ''اُسد الغابہ'' میں ان کے بارے میں یہ رائے ظاہر کی ہے کہ عتابؓ ایک صالح، باخبر اور فاضل آدمی تھے۔

قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عتابؓ قبول اسلام سے پہلے ہی ایک سلیم الفطرت اور عاقل وشجاع نوجوان کی حیثیت سے مشہور ہو چکے تھے اور سرورِ عالم ﷺ کو بھی ان کے اوصافِ حمیدہ کا علم ہو گیا تھا۔ یہی سبب تھا کہ آپؐ نے انھیں امارتِ مکہ کے اہم منصب پر مقرر فرمایا۔ حضرت عتابؓ کو تاریخِ اسلام میں اس لحاظ سے منفرد مقام حاصل ہے کہ صحابہؓ متاخرین میں ہونے کے باوجود ان کا شمار اکابر صحابہؓ میں ہوا اور وہ بھی اس وقت جب کہ وہ بھرپور جوانی کی منزلوں سے گزر رہے تھے۔ جن صاحب کو خود سیّد المرسلین فخرِ موجودات ﷺ نے اہل اللہ پر عامل بننے کے لیے موزوں ترین شخص قرار دیا ہو ان کی جلالتِ قدر کا اندازہ کون کر سکتا ہے؟

حضرت عتابؓ سے چند احادیث بھی مروی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تفقہ فی الدین میں امتیازی حیثیت رکھتے تھے مثلاً ترمذی اور ابوداؤد نے روایت کی ہے کہ ایک مرتبہ کسی نے حضرت عتابؓ سے انگوروں کی زکوٰۃ کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ نبی ﷺ نے انگور کی زکوٰۃ کے متعلق یہ فرمایا ہے کہ انگوروں کا اندازہ کیا جائے (خشک ہونے کے بعد ان کا کیا وزن ہوگا) اور خشک انگوروں کے موافق زکوٰۃ ادا کی جائے جس طرح خشک کھجوروں کی ادا کی جاتی ہے۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عتابؓ نے زبانِ رسالت سے جو کچھ سنا اس کو بہ خوبی یاد رکھا اور اپنے دورِ امارت میں اسی کے مطابق فیصلے کیے۔ وہ کئی برس مکہ معظّمہ کے عامل رہے لیکن جب خالقِ حقیقی کی طرف سے بلاوا آیا تو عالمِ ناپائیدار سے اس طرح رخصت ہوئے کہ دنیا کی آلودگیوں نے انھیں چھوا تک نہیں تھا۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہؓ

(۱)

رمضان المبارک ۸ھ میں رحمتِ عالم ﷺ دس ہزار جاں نثاروں کے ہمراہ مکہ معظمہ میں فاتحانہ داخل ہوئے، تو چشمِ فلک نے ایک تحیر خیز منظر دیکھا ـــــ وہی لوگ جنھوں نے آٹھ سال پہلے اہلِ حق پر مکہ کی سرزمین تنگ کردی تھی اور انھیں مدینہ کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور کردیا تھا، عجیب بے بسی کے عالم میں حرمِ کعبہ میں رحمتِ عالم ﷺ کے سامنے سر جھکائے کھڑے تھے۔ حضورؐ نے اُن سے مخاطب ہوکر فرمایا:

''اے اربابِ قریش، تم کیا سمجھتے ہو کہ آج میں تمھارے ساتھ کیا معاملہ کرنے والا ہوں۔''

سب نے دبی زبان سے عرض کیا: ''آپ جوانوں کے شریف بھائی اور بوڑھوں کے شریف بھتیجے ہیں۔''

ارشاد ہوا:

''اے برادرانِ قریش، میں آپ لوگوں سے وہی کہتا ہوں جو یوسفؑ نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا ''لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ ''تم لوگوں پر کوئی مواخذہ نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو۔''

عام معافی کا یہ خلافِ توقع اعلان سُن کر قریشِ مکہ پر شادیٔ مرگ کی کیفیت طاری ہوگئی۔ اپنے کرتوتوں کے پیشِ نظر اُن کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ کسی باز پرس کے بغیر انھیں صاف معافی مل جائے گی، لیکن جب خیرالبشرؐ کا سحاب کرم اُن پر جھوم کر برسا تو اُن

کارواں رواں پکار اٹھا کہ انھوں نے بنو ہاشم کے درِ یتیم کو مکہ سے نکال کر جھک ماری تھی۔ آج ان پر اسلام کی حقانیت روزِ روشن کی طرح عیاں ہوگئی تھی۔ چناں چہ انھوں نے آناً فاناً خیر البشر ﷺ کا دامنِ رحمت تھام لیا اور سچے دل سے خدائے واحد پر ایمان لے آئے۔ اسی موقع پر گٹھے ہوئے جسم کے ایک جوانِ رعنا رحمتِ عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا:

''یارسول اللہ میں آپ کا ابن عم عبد الکعبہ ہوں۔''

حضورؐ نے بڑی شفقت اور محبت کے ساتھ فرمایا:

''نہیں بلکہ آج سے تم عبد الرحمٰن ہو۔''

بارگاہِ رسالتؐ سے عبد الرحمٰن نام پانے والے یہ نوجوان سمرہؓ بن حبیب (بن عبد شمس بن عبد مناف بن قصی) کے فرزندِ ارجمند تھے۔ ان کے پردادا عبد شمس اور حضورؐ کے پردادا ہاشم آپس میں سگے بھائی تھے۔ اسی لیے انھوں نے اپنے آپ کو حضورؐ کا ابن عم کہا تھا۔ اربابِ سِیَر نے حضرت عبد الرحمٰنؓ کے سالِ ولادت کی تصریح نہیں کی لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہجرتِ نبویؐ سے قبل وہ کمسن تھے اور اہلِ حق کی ایذا رسانیوں میں انھوں نے کبھی کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ فتح مکہ (۸ھ) کے وقت وہ بھرپور جوانی کے دَور سے گزر رہے تھے۔ اسی موقع پر وہ اسلام کی نعمتِ عظمیٰ سے بہرہ یاب ہوئے اور عبد الکعبہ سے عبد الرحمٰن بن کر شمعِ رسالتؐ کے پروانوں میں شامل ہوگئے۔ حافظ ابنِ حجر عسقلانیؒ کا بیان ہے کہ قبولِ اسلام کے بعد حضرت عبد الرحمٰن کو غزوۂ عسرت (تبوک) کے پُر صعوبت سفر میں رحمتِ عالم ﷺ کی ہم رکابی کا شرف حاصل ہوا۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ غزوۂ تبوک میں شرکت کے علاوہ بھی حضرت عبد الرحمٰنؓ بعض دوسرے موقعوں پر فیضانِ نبویؐ سے سعادت اندوز ہوئے، چناں چہ حدیث کی کتابوں میں ان سے مروی ۱۴ احادیث ملتی ہیں۔ ان میں سے دو متفق علیہ اور ایک میں امام مسلمؒ منفرد ہیں۔

علامہ ابن سعدؒ نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عبد الرحمٰنؓ بارگاہِ رسالتؐ میں حاضر ہوئے، تو سرورِ عالم ﷺ نے اُن سے مخاطب ہو کر فرمایا:

''عبد الرحمٰن خود کبھی امارت اور سیادت کے اُمیدوار نہ بننا، اگر تم نے اپنی خواہش پر کوئی ذمہ داری قبول کی، تو اس کی برائی اور بھلائی کا بوجھ تنہا تمھارے سر ہوگا، ہاں اگر

بلاخواہش تمھیں امارت مل جائے، تو اس کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے
اللہ تعالیٰ تمھاری مدد کرے گا۔"

حضرت عبدالرحمٰنؓ نے دانائے کونین علیہ وسلم کے اس ارشادِ مبارک کو حرزِ جاں بنالیا اور عمر بھر کبھی خود امارت کی خواہش نہ کی، البتہ کوئی خدمت یا امارت انھیں بلاخواہش تفویض کی گئی، تو قبول کر لی۔ اور پھر اُسے بہ طریق احسن نباہنے میں اپنی پوری توانائیاں صرف کر دیں۔

(۲)

عہدِ رسالتؐ کے بعد ایک طویل عرصہ تک عبدالرحمٰنؓ بن سمرہ کا نام کسی واقعہ میں نظر نہیں آتا، لیکن خلیفۂ ثالث حضرت عثمانؓ کے زمانۂ خلافت میں وہ یکا یک ایک ایسے عظیم جرنیل کی حیثیت سے نمودار ہوتے ہیں، جو بہترین عسکری صلاحیتوں سے بہرہ ور تھا۔ عہدِ شیخینؓ (حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانۂ خلافت) میں وہ کہاں رہے اور کیا کرتے رہے؟ کتبِ سِیَر سے اس کا کوئی جواب نہیں ملتا، لیکن ان کے جنگی کارناموں کا حال پڑھ کر یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ وہ ایک تجربہ کار فوجی افسر تھے اور انھوں نے عہدِ شیخینؓ کے معرکوں میں بھی کسی نہ کسی حیثیت سے ضرور حصہ لیا ہوگا، یہ الگ بات ہے کہ اُس دَور میں اُن کا نام کسی وجہ سے نمایاں نہ ہوسکا۔

حضرت عمر فاروقؓ کے عہدِ خلافت میں مسلمان ایران میں پیش قدمی کرتے ہوئے مکران اور سیستان (یا سجستان) تک پہنچ گئے تھے، جن کی سرحدیں پاکستان کے موجودہ بلوچستان سے ملتی تھیں (اس زمانے میں بلوچستان نام کا کوئی صوبہ نہ تھا) سیستان ایران کا نہایت اہم صوبہ تھا اور وہاں کے باشندے بڑے جنگجو تھے۔ وہ کچھ عرصے بعد شورش برپا کر کے مسلمانوں کے حلقۂ اطاعت سے نکل گئے۔ حضرت عثمانؓ مسندِ خلافت پر بیٹھے، تو انھوں نے پھر سیستان کی طرف توجہ کی اور والیِ بصرہ حضرت عبداللہؓ بن عامر کو حکم دیا کہ سیستان، کابل، مکران، کرمان وغیرہ کو باغیوں کے تسلّط سے نکالنے کے لیے مؤثر کارروائی کریں۔ ابنِ عامرؓ نے سیستان کی مہم پر ربیع بن زیاد کو مامور کیا۔ انھوں نے ۳۰ھ (۶۵۰ء) میں ایک زبردست یلغار کے بعد سیستان پر ازسرِنو پرچم اسلام بلند کر دیا۔ ربیع دو سال تک سیستان میں مقیم رہے۔ اس کے بعد وہ سیستان کے

دارالحکومت زرنج میں اپنا نائب مقرر کر کے ابن عامرؓ سے ملنے خراسان (یا بصرہ) چلے گئے۔ ان کی مراجعت کے بعد سیستانی اٹھ کھڑے ہوئے۔ ربیع بن زیاد کے نائب کو زرنج سے نکال باہر کیا اور اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔

عبداللہؓ بن عامر کو خبر ہوئی تو انھوں نے حضرت عبدالرحمٰنؓ بن سمرہ کو سیستان کی تسخیر پر مامور کیا اور ساتھ ہی انھیں سیستان کی امارت کا پروانہ لکھ دیا۔ ایک دوسری روایت کے مطابق خود امیر المومنین حضرت عثمانؓ نے حضرت عبدالرحمٰنؓ بن سمرہ کو سیستان کی مہم پر روانہ کیا۔ بہر صورت ۳۳ھ (۶۵۳ء) میں حضرت عبدالرحمٰنؓ تقریباً آٹھ ہزار سرفروشوں پر مشتمل ایک مضبوط لشکر کے ساتھ سیستان کے صدر مقام زرنج کی طرف بڑھے۔ اس لشکر میں حسن بصریؒ اور متعدد دوسرے فقہاء بھی شامل تھے۔ ان صلحاء اُمت کی موجودگی سے مجاہدین کے حوصلے بڑھ گئے۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ دشوار گزار راستے طے کرتے طوفانِ برق و باد کی طرح زرنج پہنچے۔ حاکم سیستان اَپرویز (یا ابران بن رستم) نے شہر کے دروازے بند کر لیے اور مقدور بھر مسلمانوں کا مقابلہ کیا، لیکن اُسے بہت جلد معلوم ہو گیا کہ ان کفن بردوش مجاہدوں کا مقابلہ اس کے بس کی بات نہیں۔ چناں چہ اس نے بیس لاکھ درہم اور دو ہزار غلام دے کر مسلمانوں کی اطاعت قبول کر لی۔

حضرت عبدالرحمٰنؓ کے ساتھ جو فقہاء آئے تھے انھوں نے اس علاقے میں اسلام کی ترویج و اشاعت کے لیے زبردست جدو جہد کی۔ ان کی تبلیغی جدو جہد کے نتیجے میں اگرچہ سیستانیوں کی ایک کثیر تعداد حلقہ بگوش اسلام ہو گئی، لیکن اس کے باوجود انھیں جب کبھی موقع ملتا اسلامی حکومت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیتے۔ زرنج کو مسخر کرنے کے بعد حضرت عبدالرحمٰنؓ نے ان تمام علاقوں کو فتح کر لیا جو زرنج اور کش کے درمیان تھے۔ عرب مؤرّخین کا بیان ہے کہ یہ تمام علاقے پاکستانی بلوچستان میں شامل ہیں۔

مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی اس سلسلے میں اپنی کتاب ''تاریخِ سندھ'' میں رقم طراز ہیں:

> ''عبدالرحمٰنؓ بن سمرہ ان تمام علاقوں پر قابض ہو گئے جو زرنج اور کش کے درمیان تھے۔ یہ علاقہ گو اِس وقت بلوچستان میں شامل ہے، مگر اُس عہد میں ہندستان کے ماتحت تھا، کیوں کہ اس وقت تک بلوچستان کے نام کا کوئی صوبہ نہ تھا بلکہ مکران اور

سیستان ہی سندھ سے ملے ہوئے تھے۔ اس لحاظ سے ہندستان کی سرزمین پر یہ پہلا حملہ خشکی کی طرف سے ہوا اور یہی پہلا علاقہ ہندستان کا ہے جو مسلمانوں کے قبضے میں آیا اور خود صحابۂ رسولؐ کے مقدس ہاتھوں سے مفتوح ہوا۔''

گویا حضرت عبد الرحمٰنؓ بن سمرہ بت کدۂ ہند میں سب سے پہلے اذان دینے والے مجاہدین کے قائد تھے اور ہندستان کے دوسرے تمام مسلم فاتحین (بشمول محمد بن قاسمؒ) کے پیش رو تھے۔

زرنج اور کش کے مابین واقع علاقوں کی تسخیر کے بعد حضرت عبد الرحمٰنؓ رخج کی طرف بڑھے اور پُر زور یلغار کرتے ہوئے دادن (یا دواء) کے اہم شہر تک پہنچ گئے اس شہر کے لوگ بھاگ کر اپنے مندر (بت خانہ) میں پناہ گزیں ہوئے۔ یہ مندر ایک نہایت مستحکم قلعہ کی صورت میں ایک پہاڑ پر بنایا گیا تھا، اس میں ''زور'' نامی ایک بُت نصب تھا جس کی نسبت سے اس پہاڑ کو ''جبل زور'' یا کوہِ زور کہا جاتا تھا۔ مختلف روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مندر بت پرستوں کے نزدیک بڑی اہمیت اور تقدّس کا حامل تھا۔ وہ دُور دور سے اس کی زیارت کو آتے اور بیش قیمت چڑھاوے ''بت'' کی نذر کرتے۔ ان چڑھاووں کی بہ دولت مندر کے پجاری اور دوسرے متعلقین نہایت دولت مند اور آسودہ حال ہو گئے تھے۔ حضرت عبد الرحمٰنؓ نے مندر کا محاصرہ کیا تو وہ چند دن کے اندر ہی ہمت ہار بیٹھے اور ایک خطیر رقم دے کر صلح کر لی۔ اس رقم کی مقدار کا اندازہ اس روایت سے کیا جا سکتا ہے کہ خمس نکال کر آٹھ ہزار مجاہدین میں سے ہر ایک کے حصے میں چار چار ہزار درہم آئے۔

علاّمہ ابن اثیرؒ کا بیان ہے کہ شہر کی فتح کے بعد حضرت عبد الرحمٰنؓ سیدھے بُت خانے میں پہنچے، دیکھا کہ وہاں خالص سونے کا ایک بہت بڑا بُت نصب ہے جس کی آنکھوں میں بیش قیمت یاقوت جڑے ہوئے ہیں۔ حضرت عبد الرحمٰنؓ نے پہلے اپنے نیزے کی نوک سے اس بُت کی آنکھیں نکالیں اور پھر اس کے ہاتھ توڑ ڈالے۔ اس کے بعد وہاں کے حاکم اور دوسرے لوگوں سے جو یہ تماشا دیکھ رہے تھے مخاطب ہو کر فرمایا:

''لوگو! یہ یاقوت اور اپنے بُت کے طلائی ہاتھ اٹھا لو مجھے زر و جواہر کی حاجت نہیں

ہے۔ میں نے یہ کام صرف یہ دکھانے کے لیے کیا ہے کہ بُت کسی کو نفع یا نقصان نہیں پہنچا سکتے اس لیے ان کی عبادت کرنا گویا اپنی زندگی برباد کرنا ہے۔ اے لوگو! عبادت کے لائق صرف ایک اللہ کی ذات ہے۔ وہی ہر شے کا مالک ہے اور وہی ہر ایک کے نفع اور نقصان پر قادر ہے۔ اگر تم خدائے برتر و بزرگ پر ایمان لے آؤ تو اُمید ہے اللہ تعالیٰ تمھارے سینے کھول دے گا اور تم دینِ اسلام کو اچھی طرح سمجھ جاؤ گے۔"

اس بت شکنی کے بعد حضرت عبدالرحمٰنؓ نے بست اور زابل (غزنہ) کی طرف پیش قدمی کی اور اپنی شجاعت اور تدبیر کی بدولت نہایت قلیل مدّت میں اُن کو فتح کرلیا۔ ان فتوحات کی تکمیل کے بعد انھوں نے زرنج کو مراجعت کی اور وہاں کے نظم و نسق میں مشغول ہوگئے۔ تھوڑی ہی مدّت گزری تھی کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کا واقعۂ ہائلہ پیش آیا۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ کو اطلاع ملی، تو انھوں نے امیر بن احمر کو زرنج میں اپنا قائم مقام بنایا اور خود بصرے کی طرف روانہ ہوگئے۔

(۳)

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ سریر آرائے خلافت ہوئے۔ اُن کے عہد میں جمل اور صفّین کی خوں ریز لڑائیاں پیش آئیں جن میں ہزاروں مسلمان اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اس پُر آشوب دَور میں حضرت عبدالرحمٰنؓ بن سمرہ بالکل گوشہ نشین رہے اور بعض دوسرے صحابہ کرامؓ کی طرح نہ کسی فریق کا ساتھ دیا اور نہ کسی کی مخالفت کی۔ حضرت سیّدنا حسنؓ کے عہدِ خلافت میں بھی حضرت عبدالرحمٰنؓ کی کسی سرگرمی کا سراغ نہیں ملتا۔

۴۱ھ ۶۶۱ء میں تمام عالمِ اسلام پر امیر معاویہؓ کا اقتدار قائم ہوگیا، تو انھوں نے سب سے پہلے اُن علاقوں کی طرف توجہ کی جو مسلمانوں کی خانہ جنگی سے فائدہ اٹھا کر باغی ہوگئے تھے چناں چہ عبداللہؓ بن عامر کو امیر معاویہؓ نے دوبارہ بصرہ کا والی مقرر کرکے سیستان وغیرہ کو مطیع کرنے کا کام اُن کے سپرد کیا۔ ابن عامرؓ سیستان میں حضرت عبدالرحمٰنؓ بن سمرہ کے مجاہدانہ کارنامہ کا تجربہ (عہدِ عثمانی میں) کرچکے تھے اس لیے انھیں گوشۂ عزلت سے بُلا بھیجا۔ اپنی طرف سے دوبارہ سیستان کا والی مقرر کیا اور باغیوں کی سرکوبی کا حکم دیا۔

حضرت عبدالرحمٰنؓ تازہ جوش اور ولولے کے ساتھ سیستان کی طرف بڑھے اور علاقے

پر علاقے فتح کرتے کابل تک پہنچ گئے۔ کابل کے لوگ بڑے شوریدہ سر تھے، انھوں نے ہتھیار ڈھالنے سے انکار کر دیا، اور قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئے۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ نے محاصرے میں نہایت سختی کی اور ایک رات شہر پناہ پر منجنیقوں سے ایسی شدید سنگ باری کی کہ ایک دیوار میں شگاف پڑ گیا۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ نے رات کے اندھیرے میں شہر کے اندر داخل ہونا مناسب نہ سمجھا اور عباد بن حصین کو فوج کا ایک دستہ دے کر شگاف کی نگرانی پر مامور کر دیا کہ دشمن اس کی مرمت نہ کر سکے۔

صبح ہوئی، تو کابلی بڑے جوش وخروش سے نعرے لگاتے شہر سے نکل آئے اور مسلمانوں پر پل پڑے۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ کو کابلیوں کے اس خلافِ توقع اقدام پر حیرت تو ہوئی، لیکن انھوں نے اپنی فوج کے چیدہ چیدہ دستوں کو ساتھ لے کر کابلیوں پر اس زور کا جوابی حملہ کیا کہ اُن کے قدم آناً فاناً اکھڑ گئے اور مسلمان دھاوا کرتے ہوئے شہر کے اندر داخل ہو گئے۔ کابلیوں نے اب بڑی لجاجت سے امان طلب کی اور اپنی اطاعت کا یقین دلایا۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ نے انھیں امان دے دی اور اپنی فوج کو کشت وخون سے ہاتھ روک لینے کا حکم دیا۔ یہ ابنِ اثیرؒ کا بیان ہے۔ اس کے برعکس مورّخ یعقوبی نے لکھا ہے کہ شہر پناہ کے کابلی محافظ نے مسلمانوں سے ساز باز کر لی تھی اور اس نے خود شہر کا دروازہ کھول دیا تھا، بہر صورت کابل پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ اس کے بعد حضرت عبدالرحمٰنؓ نے خواش اور بست (زاں بست) پر پرچم اسلام لہرایا اور پھر رزان کی طرف بڑھے۔ اہلِ رزان مسلمانوں کی آمد آمد کی خبر سن کر پہلے ہی شہر خالی کر گئے تھے۔ چناں چہ مسلمانوں نے کسی مزاحمت کے بغیر اس پر قبضہ کر لیا۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ اس شہر کا انتظام کر کے آگے بڑھے اور طخارستان کے علاقے میں داخل ہو گئے۔ سب سے پہلے ''خشک'' کا اہم شہر راستے میں آیا، اس شہر کے باشندوں کو لڑائی کی ہمت نہ پڑی اور انھوں نے مسلمانوں کی شرطیں قبول کر کے اطاعت قبول کر لی۔

خشک سے حضرت عبدالرحمٰنؓ رخج پہنچے۔ اہل رخج نے مقابلے کے لیے زبردست تیاری کر رکھی تھی۔ وہ مسلمانوں کے سامنے ڈٹ گئے اور دیر تک جم کر مقابلہ کیا۔ لیکن مسلمان سرفروشوں کے سامنے ان کی کچھ پیش نہ چلی اور چند ساعتوں کے بعد اُن کی قوتِ مقاومت

جواب دے گئی۔ ان لوگوں سے ہتھیار رکھوا کر حضرت عبد الرحمٰنؓ شہر میں داخل ہو گئے اور اس پر ایک بار پھر پرچم اسلام بلند کر دیا۔

رخج کے بعد حضرت عبد الرحمٰنؓ کی اگلی منزل غزنہ (زابلستان) تھی۔ غزنہ کے باشندے سخت جنگجو تھے اور اُن کے پاس سامان حرب اور ضرب کی کمی بھی نہیں تھی۔ انھوں نے بڑے منظّم طریقے سے مسلمانوں کی مزاحمت کی۔ غزنہ کے قریب فریقین میں گھمسان کا رَن پڑا۔ انھوں نے چند دستے محفوظ فوج کے طور پر رکھ لیے اور ہدایت کی کہ وہ ابتدا میں میدان جنگ سے دُور رہیں، جب لڑائی کی آگ خوب بھڑک اٹھے، تو ایک ایک دستہ تکبیر کے نعرے لگا تا دشمن پر ٹوٹ پڑے۔ یہ تدبیر ایسی کارگر ثابت ہوئی کہ اہلِ غزنہ کی کمرِ ہمت ٹوٹ گئی اور وہ امان طلب کرنے پر مجبور ہو گئے۔

جس زمانے میں حضرت عبد الرحمٰنؓ اہلِ غزنہ سے نبرد آزما تھے۔ اہل کابل کی باسی کڑھی میں پھر اُبال آیا اور انھوں نے میدان خالی پا کر علم بغاوت بلند کر دیا۔ فی الحقیقت یہ لوگ سخت شورش پسند تھے اور عہد اور اقرار کی پابندی اُن کے نزدیک چنداں ضروری نہ تھی۔ حضرت عبد الرحمٰنؓ نے اطلاع ملتے ہی انھیں سزا دینے کا پختہ ارادہ کر لیا تاہم کابل کا رُخ کرنے سے پہلے انھوں نے قندھار کو مسخر کیا اور غزنہ و قندھار کا تسلّی بخش انتظام کر کے کابل کی طرف پلٹے۔ کابلیوں نے پُر زور مقابلہ کیا، لیکن مجاہدینِ اسلام نے سخت غیظ و غضب کے عالم میں اُنھیں کچل کر رکھ دیا اور کابل میں بڑی مضبوطی سے اپنے قدم جما لیے۔ اس فتح کے ساتھ سیستان سے غزنہ اور قندھار تک کا تمام علاقہ مسلمانوں کے زیرِ نگیں ہو گیا۔ یہ تمام واقعات ۴۳-۴۴ ہجری میں پیش آئے اور ساری مہم کی تکمیل میں مجموعی طور پر صرف ایک سال کا عرصہ صرف ہوا۔ سیستان ایرانی بہادروں کی سرزمین تھی۔ شاہ نامہ فردوسی کے زندۂ جاوید کرداروں سام، زال، رستم وغیرہ کا تعلق اسی سرزمین سے تھا۔ اسی طرح خراسان و زابلستان (موجودہ افغانستان) کے باشندے بھی بڑے سخت جان اور جنگجو تھے۔ ایک سال کے قلیل عرصے میں اور دشوار گزار پہاڑی راستے طے کر کے ایسی جنگجو اقوام کو مطیع بنانا حضرت عبد الرحمٰنؓ بن سمرہ کا ایک ایسا کارنامہ ہے جو انھیں دنیا کے عظیم ترین جرنیلوں کی صف میں جگہ پانے کا مستحق بنا دیتا ہے۔

بعض مورخین نے لکھا ہے کہ بنواُمیہ کے نامور سپہ سالار مہلب بن ابی صفرہ، جنھوں نے خوارج کے خلاف لڑائیوں میں لازوال شہرت حاصل کی، پہلے حضرت عبد الرحمٰنؓ بن سمرہ ہی کی فوج کے ایک افسر تھے۔ جس زمانے میں حضرت عبد الرحمٰنؓ سیستان اور خراسان کی مہم میں مشغول تھے وہ حدود سندھ و ہند پر جہاد کر رہے تھے۔ ابنِ اثیرؒ نے ۴۴ ہجری کے واقعات میں تحریر کیا ہے۔

''مہلب نے سندھ کی سرحد پر جنگ کی، دشمن کے دانت کھٹے کر دیے اور ظفر مند واپس آئے۔''

سید ابوظفر ندوی نے ''تاریخِ سندھ'' میں لکھا ہے:

''مہلب عربوں میں پہلے شخص ہیں جو ہند کے اس دروازے سے داخل ہوئے جس سے آج تک قدیم قومیں آتی رہی ہیں۔''

یہ درّہ خیبر تھا۔ اس مہم میں مہلب ملتان اور پشاور کے درمیانی علاقوں کو فتح کرتے ہوئے قیقان (قلاّت) تک جا پہنچے اور وہاں سے کثیر مالِ غنیمت حاصل کر کے لَوٹے۔ مورخین نے یہ وضاحت نہیں کی کہ مہلب اس مہم پر حضرت عبد الرحمٰنؓ کی ہدایت پر روانہ ہوئے تھے یا انھیں مرکزِ خلافت سے بہ راہِ راست حکم موصول ہوا تھا۔ حقیقت خواہ کچھ بھی ہو یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ مہلّب کو اُن کی تائید وحمایت ضرور حاصل تھی۔

سیستان اور خراسان کی تسخیر سے پہلے حضرت عبد الرحمٰنؓ کو والیِ بصرہ حضرت عبد اللہؓ بن عامر نے اپنی طرف سے سیستان کا والی مقرر کیا تھا۔ مہم کی تکمیل پر خود امیر معاویہؓ نے انھیں باقاعدہ سندِ حکومت عطا کر دی۔ انھوں نے سیستان پر عجب انداز سے حکمرانی کی، اُن کے دروازے ہر امیر وغریب کے لیے ہر وقت کھلے رہتے تھے اور وہ ہر ایک کے ساتھ بِلا رُورعایت انصاف کرتے تھے۔ وہ ایک درویش منش اور منکسر المزاج آدمی تھے اور معمولی سے معمولی کام کرنے سے بھی اُن کو کوئی عار نہ تھی۔ اس کے ساتھ ہی طبیعت میں بے حد لطافت تھی۔ علامہ ابنِ اثیرؒ نے اُسد الغابہ میں لکھا ہے کہ بارش کے دنوں میں جب سیستان کے دار الحکومت (زرنج) کی گلیاں کیچڑ سے بھر جاتیں، تو حضرت عبد الرحمٰنؓ دوسرے لوگوں کے ساتھ خود بھی جھاڑو ہاتھ میں لے کر گلیاں صاف کرتے پھرتے۔

حضرت عبد الرحمٰنؓ نہایت حسن وخوبی کے ساتھ سیستان کا نظمِ حکومت چلا رہے تھے، لیکن معلوم نہیں کیا وجہ ہوئی ۴۶ ہجری میں والیِ خراسان زیاد نے انھیں اپنے عہدے سے سبک دوش کر دیا۔ ان کا دِل سیستان میں لگ گیا تھا، چناں چہ حکومت کی ذمّہ داریوں سے فارغ ہونے کے بعد وہ اپنے وطن مکہ واپس جانے کی بہ جائے سیستان ہی میں مستقل طور پر اقامت گزیں ہو گئے۔ حافظ ابنِ حجرؒ نے لکھا ہے کہ حضرت عبد الرحمٰنؓ نے اسی جگہ ۵۰ھ میں سفرِ آخرت اختیار کیا، لیکن ایک روایت یہ بھی ہے کہ وہ بصرہ چلے گئے تھے اور وہیں انھوں نے وفات پائی۔ اُن کی اولاد میں صرف ایک لڑکے عبید اللہ کا نام ملتا ہے۔

حضرت عبد الرحمٰنؓ بن سمرہ کے صحیفۂ حیات میں اخلاصِ عمل، تدبیر وشجاعت، عزم و ہمت، بے خوفی، سخت کوشی اور عجز وانکسار سب سے نمایاں ابواب ہیں۔ اُن کا شمار بلا تامل اسلام کے اُن عظیم جرنیلوں میں کیا جا سکتا ہے جنھوں نے سخت نا مساعد حالات میں دینِ حق کے پیغام کو دنیا کے دور دراز گوشوں تک پہنچانے کا شرف حاصل کیا۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت قیس بن عاصم منقریؓ

(۱)

سیّدنا حضرت عمر فاروقؓ کے عہدِ خلافت کا ذکر ہے کہ بصرہ کے نو آباد شہر کے ایک مکان میں ایک صحابیِ رسول بسترِ مرگ پر پڑے ہوئے تھے۔ ان کے چوڑے چکلے ہاڑ اور خدوخال سے ظاہر ہوتا تھا کہ کبھی بڑے وجیہ اور قوی الجثہ رہے ہوں گے۔ لیکن اب بیماری نے انھیں سخت ضعیف اور درماندہ کر دیا تھا۔ تاہم اس حالت میں بھی ان کے چہرے پر عجیب قسم کا جلال تھا اور اس سے نور کی شعاعیں پھوٹ پھوٹ کر نکل رہی تھیں۔ ان صاحبِ رسولؐ کو اللہ تعالیٰ نے اولادِ کثیر سے نواز رکھا تھا۔ چناں چہ اس وقت ان کے بسترِ مرگ کے گرد ان کے بتیس فرزند جمع تھے اور وہ اُکھڑی ہوئی آواز میں اُن سے مخاطب ہو کر کہہ رہے تھے:

''پیارے بیٹو! میں اب تم سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو رہا ہوں۔ میری باتیں غور سے سنو۔ جب میں مر جاؤں تو اپنے سب سے بڑے بھائی کو اپنا سردار بنانا۔ اگر چھوٹے کو بنایا تو جو لوگ تم سے ہمسری کا دعویٰ رکھتے ہیں وہ تم پر انگلیاں اٹھائیں گے۔ ہمیشہ اپنے اسلاف کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کرنا۔ میری موت پر رونے دھونے اور چیخنے چلّانے سے اجتناب کرنا کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا کرنے سے منع فرمایا ہے۔ اپنے مال کی اصلاح اور حفاظت سے غافل نہ ہونا اس سے شرفاء کی عزت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور کم ظرف لوگوں کا بارِ احسان نہیں اٹھانا پڑتا۔ اپنے اونٹوں کو نام و نمود کی خاطر بے محل صرف نہ کرنا۔ لیکن برمحل صرف کرنے میں بھی کبھی دریغ نہ کرنا۔ کم اصلوں میں رشتے ناتے نہ کرنا۔ ہوسکتا ہے اس سے تمھیں وقتی مسرت حاصل ہو جائے لیکن اس میں جو نقصانات مضمر ہیں، وقتی مسرت ان کے سامنے کچھ حقیقت

نہیں رکھتی۔ اپنے دشمن کی اولاد سے ہوشیار رہنا، کچھ تعجب نہیں کہ وہ اپنے بزرگوں کی طرح دل میں تم سے عناد رکھتی ہو۔ زمانۂ جاہلیت میں میری قبیلہ بکر بن وائل سے دشمنی رہ چکی ہے اس لیے میری قبر وہاں بنانا جہاں ان کی دسترس نہ ہو سکے۔ ورنہ خدشہ ہے کہ وہ جوشِ انتقام میں میری قبر کھود ڈالیں اور تم اس کا بدلہ لینے کے لیے ان کے خلاف وہ کچھ کر گزرو جو تمھاری آخرت برباد کر ڈالے۔''

اتنا کہتے کہتے وہ صاحب رسول تھک گئے اور سانس درست کرنے کے لیے تھوڑی دیر خاموش رہے۔ پھر انھوں نے اپنے کانپتے ہاتھوں سے ایک تیر نکالا اور اسے اپنے بڑے لڑکے کے ہاتھ میں دے کر کہا:

''اس کو توڑو۔''

اس نے فوراً توڑ دیا... پھر دو تیر ایک ساتھ دیے اور کہا۔ ''انھیں بھی توڑو۔'' اس نے بہت کوشش کی لیکن نہ توڑ سکا۔ دانا باپ اب پھر سارے بیٹوں سے مخاطب ہوئے اور فرمایا ''تم نے دیکھا کہ ایک تیر کتنی آسانی سے ٹوٹ گیا۔ لیکن جب دو تیر مل گئے، تو پوری طاقت صرف کرنے کے باوجود نہ ٹوٹ سکے۔ اگر تم آپس میں پیار و محبت اور اتفاق و اتحاد کے ساتھ نہ رہے اور متفرق ہو گئے تو تم میں سے ہر ایک کی مثال ''ایک تیر'' جیسی ہو گی جسے ہر شخص توڑ سکے گا اور اگر تم متحد رہے تو پھر کسی کی مجال نہ ہو گی کہ تمھیں توڑ سکے یا کوئی نقصان پہنچا سکے۔ یاد رکھو اتحاد میں ہی قوت اور برکت کا راز پنہاں ہے۔''

اتنا فرما کر ناصح مشفق نے ایک ہچکی لی اور اس کے ساتھ ہی ان کا طائرِ روح قفسِ عنصری سے نکل کر عالمِ بقا کی جانب پرواز کر گیا۔

دمِ آخر اپنی اولاد کو یہ پُرمغز اور زرّیں وصیتیں کرنے والے صاحبِ رسولؐ حضرت قیسؓ بن عاصم منقری تمیمی تھے۔

(۲)

سیدنا حضرت ابو علی قیسؓ بن عاصِم منقری کا شمار ان صحابۂ کرام میں ہوتا ہے جو سرورِ کونین ﷺ کے اس ارشاد کا مصداق تھے۔

خیار کم فی الجاھلیة خیار کم فی الاسلام۔''

''تم میں سے جو زمانۂ جاہلیت میں بلند مرتبہ تھے وہ اسلام میں بھی بلند مرتبہ ہیں۔''

حضرت قیسؓ عرب کے نامور قبیلہ بنوتمیم کی شاخ بنومنقر سے تعلق رکھتے تھے۔نسب نامہ یہ ہے:

قیسؓ بن عاصم بن خالد بن منقر بن عبید بن مقاعس بن عمر بن کعب بن سعد بن زید بن مناۃ بن تمیم۔

قیسؓ اپنے قبیلہ بنومنقر کے سردار تھے اور نہایت دولت مند اور رعب و دبدبہ کے آدمی تھے۔اُن کی شہسواری، فیاضی اور اصابتِ رائے کی سارے علاقے میں دھوم مچی ہوئی تھی۔لوگوں کے باہمی جھگڑے نپٹانے میں انھیں ید طولیٰ حاصل تھا۔ان کے قبیلہ کی بکر بن وائل سے قدیمی دشمنی تھی اور اکثر ان سے جنگ وجدال تک نوبت پہنچ جاتی تھی۔ان لڑائیوں میں قیسؓ ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے اور اپنی جنگی چالوں سے دشمن کوزچ کر دیتے تھے۔

شعروشاعری میں بھی درک رکھتے تھے اور جب طبیعت لہر پر آتی تو نہایت عمدہ اشعار کہہ لیتے تھے۔اگر چہ وہ فطری طور پر نہایت بُردبار اور حلیم الطبع تھے لیکن ایک دفعہ جاہلی حمیت کے زیرِ اثر اپنی ایک معصوم بچی کو زندہ زمین میں گاڑ دیا تھا۔اس حرکت پر ساری عمر افسوس رہا۔

زمانۂ جاہلیت میں شراب خواری کو لازمۂ امارت سمجھا جاتا تھا۔چناں چہ وہ بھی اس علّت میں مبتلا تھے۔پینے پہ آتے تو خم کے خم خالی کر دیتے۔ایک دفعہ شراب پی کر ایسے بدمست ہوئے کہ عقل وخرد جواب دے گئی۔اس حالت میں ایسی نازیبا حرکتیں کیں جو ان جیسے غیور اور فرزانہ سردارِ قبیلہ کے مرتبہ سے فروتر تھیں۔جب ہوش آیا اور لوگوں نے ان نازیبا حرکتوں سے آگاہ کیا تو فرطِ ندامت سے منھ چھپاتے پھرتے تھے۔حافظ ابنِ عبدالبرؒ نے لکھا ہے کہ انھوں نے اس دن شراب نوشی سے ہمیشہ کے لیے توبہ کر لی اور اس موقع پر یہ شعر کہے:

رأیت الخمر صالحة و فیها　　　خصال تفسد الرجل الجاما

''میرے نزدیک شراب اچھی چیز تھی لیکن یہ تو حلیم آدمی کے اخلاق بگاڑ دیتی ہے۔

فلا واللہ اشربها صحیحا　　　ولا اشفی بها ابدا سقیما

خدا کی قسم! اب میں اسے نہ کبھی تندرستی کی حالت میں پیوں گا اور نہ کبھی بیماری میں دوا کے طور پر استعمال کروں گا۔'' (الاستیعاب)

اور اس کے بعد انھوں نے فی الواقع زندگی کی آخری سانس تک اپنے عہد کو نباہا۔

حافظ ابنِ حجرؒ نے اصابہ میں حضرت قیسؓ کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ میں نے زمانۂ جاہلیت میں (دانستہ) کبھی کوئی برا کام نہیں کیا اور نہ کبھی کسی کو مجھ پر جھوٹی تہمت لگانے کا موقع ملا۔ اس زمانے میں میرا زیادہ تر وقت فوجی مہموں میں یا لوگوں کے جھگڑے نپٹانے میں صرف ہوتا تھا۔

(۳)

یوں تو بارگاہِ نبوّت میں وفودِ عرب کی حاضری کا سلسلہ ۵ھ ہی سے شروع ہو گیا تھا لیکن فتح مکہ (۸ھ) کے بعد ان وفود کی تعداد میں نمایاں اضافہ ہو گیا، ۹ھ میں تو اس کثرت سے وفود آئے کہ اس سال کا نام ہی ''عام الوفود'' پڑ گیا۔ اسی سال بنو تمیم کا وفد بھی بڑے کرّ وفر اور جاہلی ٹھاٹھ کے ساتھ مدینہ منورہ آیا۔ یہ وفد ستّر یا اسّی آدمیوں پر مشتمل تھا۔ ان میں حضرت قیسؓ بن عاصم بھی شامل تھے۔ بنو تمیم کے دماغوں میں خاندانی فخر و غرور اور جاہلی رعونت کا نشہ سمایا ہوا تھا۔ وہ اپنے ساتھ اپنے قبیلہ کے چوٹی کے خطیب اور شاعر لائے تھے تاکہ مسلمانوں پر اپنی خطابت اور شاعری کا سکہ جما سکیں۔ وہ اپنی سادگی اور جہالت کی بنا پر سید المرسلین ﷺ کی جلالتِ قدر کا اندازہ نہ کر سکے اور حضورؐ کے آستانۂ اقدس کے باہر کھڑے ہو کر بدویانہ انداز میں آوازیں دینی شروع کیں۔ ''محمدؐ، باہر آؤ اور ہماری بات سنو!'' حضور ﷺ کو ان کا اندازِ تخاطب ناگوار تو گزرا لیکن آپؐ کی شانِ رحیمی نے گوارا نہ کیا کہ ان لوگوں کو سرزنش کریں یا اُن سے بے رُخی برتیں۔ آپؐ باہر تشریف لائے اور ان سے نہایت خندہ پیشانی سے ملاقات فرمائی۔ وفد کے ایک رئیس اقرع بن حابس نے کہا ''محمد ہم بنو تمیم کے لوگ ہیں ہمارا دعویٰ ہے کہ کوئی قوم حسب و نسب، جاہ و حشمت، علم و حکمت، جود و سخا اور دوسرے فضائل میں ہمارے برابر نہیں ہے۔ ہم قبولِ اسلام سے پہلے آپ سے مفاخرت کرنا چاہتے ہیں۔''

قبولِ اسلام کے لیے یہ شرط بڑی نامعقول تھی لیکن حضورؐ چاہتے تھے کہ یہ لوگ کسی ہی ڈھب سے دعوتِ حق کو سمجھ جائیں۔ چناں چہ آپؐ نے فرمایا۔ ''میں فخاری اور شعر بازی کے لیے مبعوث نہیں ہوا، لیکن اگر تم اسی لیے آئے ہو تو ہم اس سے بھی باہر نہیں ہیں۔ تم اپنا کمال دکھاؤ، ہم جواب دیں گے۔''

اس پر بنو تمیم کے شعلہ بیان خطیب عطارد بن حاجب کھڑے ہو گئے اور ایک فصیح و بلیغ خطبہ دیا۔ جس میں اپنے قبیلے کی خوبیاں بیان کر کے دعویٰ کیا تھا کہ کوئی قوم بنو تمیم کی ہمسر نہیں ہے۔

ان کے جواب میں حضورؐ کے حکم سے حضرت ثابتؓ بن قیس انصاری کھڑے ہو گئے اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا، رسولِ پاک ﷺ کی شانِ رحمت اور مہاجرین و انصار کی فضیلت ایسے بلیغ اور احسن انداز میں بیان کی کہ مجلس پر سناٹا چھا گیا۔ تقریریں ہو چکیں تو اشعار کی باری آئی۔ بنو تمیم کے سحر البیان شاعر زبرقان بن بدر نے اپنی قوم کی شان میں ایک پُر زور قصیدہ پڑھا۔ اس میں انھوں نے خود ستائی، تعلّی اور نخوت کی انتہا کر دی تھی تاہم فنی لحاظ سے اس کے بلند پایہ ہونے میں کوئی کلام نہ تھا۔ وہ بیٹھے تو حضورؐ نے حضرت حسانؓ بن ثابت کو حکم دیا کہ وہ جواب دیں۔ حضرت حسانؓ اقلیمِ سخن کے بادشاہ تھے۔ انھوں نے حضورؐ کا اشارہ پاتے ہی زبرقان ہی کے بحر اور قافیہ میں فی البدیہہ ایسے فصیح و بلیغ اشعار سنائے کہ بنو تمیم انگشت بدنداں ہو گئے اور پکار اٹھے ''محمد! آپ کا خطیب ہمارے خطیب سے بہتر اور آپ کا شاعر ہمارے شاعر سے افضل ہے۔'' اس اعتراف کے بعد سب مشرف بہ اسلام ہو گئے اس موقع پر حضورؐ نے حضرت قیسؓ بن عاصم کی طرف اشارہ کر کے فرمایا:

''یہ صحرا نشینوں کے سردار ہیں۔''

علّامہ ابنِ سعدؒ نے طبقات میں لکھا ہے کہ کچھ عرصہ بعد حضورؐ نے حضرت قیسؓ کو تحصیلِ صدقات کی اہم خدمت تفویض فرمائی۔

علّامہ ابنِ ہشامؒ کا بیان ہے کہ قبولِ اسلام کے بعد حضرت قیسؓ بن عاصم غزوۂ حنین میں شریک ہوئے۔ لیکن یہ رائے مشکوک ہے کیوں کہ غزوۂ حنین فتح مکہ کے فوراً بعد شوال ۸ ھ میں ہوا جب کہ حضرت قیسؓ نے ۹ ھ میں اسلام قبول کیا۔ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے غزوۂ تبوک (۹ ھ) میں شرکت کی ہو۔ بہر صورت بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت قیسؓ نعمتِ اسلام سے بہرہ یاب ہونے کے بعد وقتاً فوقتاً رحمتِ عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور فیضانِ نبوی سے سعادت اندوز ہوتے تھے۔ مستدرک حاکم میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت قیسؓ کو کثیر مال و دولت سے نواز رکھا تھا۔ صرف اونٹ اور دوسرے مویشی ہزاروں کی تعداد میں تھے۔ ایک دفعہ انھوں نے اپنی دولت کے بارے میں حضورؐ سے کچھ سوالات پوچھے۔ آپؐ نے ان سے دریافت فرمایا، کیا تمھیں اپنا مال پسند ہے یا موالی کا؟ انھوں نے عرض کیا، ''اپنا یا رسول اللہ!''

حضورؐ نے فرمایا: تمھارا مال تو وہی ہے جس کو کھا پی لو، پہن اوڑھ لو اور بوسیدہ کر دو یا راہِ حق میں صرف کر کے برابر کر دو ورنہ وہ تمھارے موالی کا ہے۔''

حضرت قیسؓ نے عرض کیا۔ ''اگر زندگی نے مہلت دی تو اونٹوں کے گلّے جلد ہی ختم کر دوں گا۔''

چناں چہ انھوں نے ان کا بڑا حصہ اپنی وفات سے پہلے ختم کر دیا۔ اور جس لڑکی کو ایامِ جاہلیت میں قتل کیا تھا اس کا کفارہ بھی ادا کر دیا۔ طبیعت میں پہلے ہی حِلم تھا، اسلام نے اس وصف کو اور بھی چمکا دیا۔ علاّمہ ابنِ اثیرؒ نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ان کے بھتیجے نے ان کے ایک لڑکے کو قتل کر ڈالا۔ لوگوں نے قاتل کو پکڑ لیا اور اس کی مشکیں کس کر مقتول کی لاش کے ساتھ حضرت قیسؓ کے پاس لائے۔ انھوں نے کمال درجہ کے صبر وضبط سے کام لیا اور بھتیجے سے مخاطب ہو کر فرمایا: ''جانِ عم! تو نے کتنا بُرا کام کیا، اپنے مسلمان بھائی کو قتل کر کے اللہ اور اللہ کے رسول کی نافرمانی کی۔ وہ تمھارا چچازاد بھائی بھی تھا اس لیے قطعِ رحم کے مرتکب بھی ہوئے۔''

اس طرح دیر تک نصیحتیں کرتے رہے۔ پھر دوسرے بیٹے سے کہا۔ ''اس کی مشکیں کھول دو اور اپنے بھائی کے کفن دفن کا انتظام کرو۔'' مقتول بچے کی ماں سخت غم زدہ تھی اس کو تسلّی دی اور اپنے پاس سے خوں بہا ادا کر دیا۔

حضرت عمر فاروقؓ کے عہدِ خلافت میں بصرہ آباد ہوا تو حضرت قیسؓ اپنے صحرائی مسکن کو ترک کر کے بصرہ تشریف لے گئے اور وہیں مستقل اقامت اختیار فرمائی۔ اسی جگہ انھوں نے ۲۰ھ کے بعد کسی وقت پیکِ اجل کو لبیک کہا۔ اس وقت ان کے بتیس لڑکے زندہ موجود تھے۔ تہذیب الکمال میں ہے کہ ان کے دو لڑکوں حکیم اور احنف نے ان سے چند احادیث بھی روایت کی ہیں۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت تمیم بن اوس داریؓ

خَیرُ اھُلِ المدِیُنَـہ

(۱)

رحمتِ عالم سرورِ کونین ﷺ نے ارضِ مکہ کو الوداع کہہ کر یثرب کو اپنے قدومِ میمنت لزوم سے مشرف فرمایا تو اس تین ہزار سالہ قدیم لیکن گم نام شہر کی قسمت جاگ اٹھی، اس کے درو دیوار انوارِ رسالت سے جگ مگا اٹھے اور یہ یثرب سے ''مدینۃ النبی'' بن گیا۔

مدینہ منورہ میں نزولِ اجلال کے چند دن بعد سرورِ عالمؐ نے اس مقدس شہر میں خانۂ خدا بنانے کا ارادہ فرمایا۔ اس مقصد کے لیے حضورؐ نے اپنے میزبان سیّدنا ابو ایوب انصاریؓ کے گھر کے سامنے ایک افتادہ قطعۂ زمین کو منتخب فرمایا۔ اس زمین کے مالک بنو نجّار کے دو یتیم بچے حضرت سہلؓ اور سہیلؓ تھے، ان سعادت مند بچوں اور ان کی والدہ نے حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی: ''یا رسول اللہ ہم یہ زمین حق تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے آپ کی نذر کرتے ہیں۔'' سرورِ عالمؐ ان کے جذبۂ خیر سے بہت خوش ہوئے، لیکن آپؐ نے فرمایا، ''اللہ تعالیٰ تمھیں جزائے خیر دے، میں یہ زمین بلا قیمت نہیں لوں گا۔'' چناں چہ ان کو زمین کی قیمت (پونے چار تولے سونا) ادا کر دی گئی اور زمین ہموار کر کے مسجد کی تعمیر کا آغاز کر دیا گیا۔ تعمیر کے دوران میں چشمِ فلک نے ایک عجیب نظارہ دیکھا کہ معماروں اور مزدوروں میں صحابہ کرام (انصار و مہاجرین) کے ساتھ خود فخرِ جن وانس، خیر الخلائق سیّد المرسلین ﷺ بھی شامل ہیں۔ مزدوروں کے لباس میں پتھر اور گارا ڈھو رہے ہیں اور زبانِ مبارک پر یہ شعر جاری ہے:

اَللّٰھُمَّ اِنَّ الْاَجْرَ اَجْرُ الْاٰخِرَۃ فَارْحَمِ الْاَنْصَارَ وَالْمُھَاجِرَۃ

''الٰہی اجر تو بس آخرت کا اجر ہے پس تو انصار اور مہاجرین پر رحم فرما۔''

شمعِ نبوّت کے پروانے بصد تضرّع شہِ دوسراؐ سے التجائیں کرتے تھے کہ حضورؐ ہم غلاموں کے ہوتے ہوئے آپ تکلیف نہ فرمائیں لیکن حضورؐ متبسّم ہوکر برابر کام کیے جاتے تھے۔ سید الانامؐ کو پسینے میں شرابور اور گرد و غبار میں اٹا ہوا دیکھ کر صحابہ کرامؓ کے دلوں پر چھریاں چل جاتی تھیں، لیکن مجبور تھے۔ حضورؐ کو اس حال میں دیکھ کر وہ دو چند جوش کے ساتھ یہ رجز پڑھتے ہوئے تعمیرِ مسجد میں منہمک ہو جاتے تھے۔

لَئِنْ قَعِدْنَا وَالرَّسول یَعْمَلُ لِذَالِکَ فَالْعَمَلُ المضّلِلُ

''اگر ہم بیٹھ جائیں اور رسولِ اکرمؐ کام کرتے رہیں تو یہ سخت گم راہی کی حرکت ہوگی۔''

غرض اس طرح چند ماہ میں دنیا کی یہ مقدس ترین مسجد تعمیر ہوگئی۔ یہ مسجد ہر قسم کے تکلّفات سے خالی اور انتہائے سادگی کا مظہر تھی۔ کچی اینٹوں اور ناتراشیدہ پتھروں کی دیواریں، چوب خرما کے ستون، کھجور کے پتوں کا چھپّر اور زمین پر سنگریزوں کا فرش، لیکن اس کو جن مقدس ہاتھوں نے تعمیر کیا اور جن کے سجدوں سے یہ معمور ہوئی اُن کی عظمتوں کے سامنے فلک الافلاک کی رفعتیں ہیچ تھیں، سالہا سال تک مسجدِ نبویؐ میں روزِ اوّل کی سی سادگی قائم رہی، یہاں تک کہ رات کو روشنی کا بھی کوئی اہتمام نہیں تھا اور لوگ چاند یا تاروں کی روشنی میں نماز پڑھتے تھے البتہ کبھی کبھی صحابہ کرام کھجور کی شاخوں میں مشعلیں جلا کر لے آتے تھے۔

۹ھ کا ذکر ہے کہ ایک شب رحمتِ عالم ﷺ مسجد میں نماز کے لیے تشریف لائے تو آپ نے دیکھا کہ مسجد میں جا بجا قندیلیں لٹکی ہوئی ہیں اور ان کی روشنی نے مسجد کو بقعۂ نور بنا رکھا ہے۔ حضورؐ کے روئے انور پر بشاشت پھیل گئی اور آپ نے صحابہ کرامؓ سے پوچھا۔ ''آج مسجد میں روشنی کس نے کی ہے۔'' انھوں نے ایک نہایت پاکیزہ صورت اور خوش پوش صاحب کی طرف اشارہ کیا۔ سرورِ عالمؐ نے ان کے کام پر بے حد مسرت کا اظہار فرمایا۔ بہت دعائیں دیں اور فرمایا کہ اگر میری کوئی (ناکت خدا) لڑکی ہوتی تو میں اس کا نکاح (روشنی کرنے والے) اس شخص سے کر دیتا۔ اس وقت مسجد میں حضورؐ کے چچازاد بھائی نوفلؓ بن حارث بن عبدالمطلب بھی موجود تھے انھوں نے فوراً عرض کیا، ''یا رسول اللہ میری بیوہ لڑکی ام المغیرہ موجود ہے اگر آپ

چاہیں تو اس کا نکاح ان صاحب سے کر سکتے ہیں۔'' حضورؐ نے ان کی تجویز منظور فرمالی اور اسی مجلس میں ان صاحب سے ام المغیرہؓ کا نکاح کر دیا۔

یہ صاحب جنھوں نے سب سے پہلے مسجد میں باقاعدہ روشنی کا اہتمام کیا اور رحمتِ عالمؐ کو اس قدر مسرور کیا کہ آپؐ نے نہ صرف ان کو اپنی دعاؤں سے نوازا بلکہ اپنی بھتیجی کا نکاح بھی ان سے کر دیا۔ سیدنا حضرت تمیمؓ بن اوس داری تھے۔

(۲)

حضرت تمیمؓ بن اوس (بن خارجہ بن سود بن خزیمہ بن ذراع بن عدی بن الدار) شام کے رہنے والے تھے اور دینِ مسیحی کے پیرو تھے، نسبی تعلق مشہور قبیلہ لخم سے تھا۔ ان کے اجداد میں سے ایک مقتدر شخص کا نام دار تھا۔ اسی کی نسبت سے وہ داری مشہور ہوئے۔

اللہ تعالیٰ نے انھیں نہایت صالح اور سعید فطرت سے نوازا تھا۔ مکہ اور مدینہ کے لوگ تجارت کے سلسلے میں اکثر ان کے وطن جاتے رہتے تھے۔ ان سے ہادیِ اکرمؐ اور آپؐ کی دعوت کا حال سن کر ان کے دل اور ضمیر نے داعیِ حقؐ اور آپؐ کی دعوت کی صداقت کی گواہی دی اور وہ حق کی طرف مائل ہو گئے تاہم عرصہ تک انھیں آبائی وطن سے باہر نکلنے کا موقع نہ ملا۔ کُلُّ اَمرٍ مَرہُونٌ بِاَوقَاتِہٖ ۹ ھ میں اپنے بھائی نعیم کے ہم راہ مدینہ آئے اور رحمتِ عالمؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر قبولِ اسلام کی سعادت حاصل کی۔ متاخر الاسلام ہونے کے باوجود اُن کا شمار بڑے عظیم المرتبت صحابہ میں ہوتا ہے۔ علّامہ ابنِ سعدؒ کا بیان ہے کہ اسلام لانے کے بعد حضرت تمیمؓ نے مدینہ منوّرہ ہی میں اقامت اختیار کر لی۔

مورّخ ابنِ اثیرؒ نے لکھا ہے کہ شام سے مدینہ آتے وقت حضرت تمیمؓ اپنے ساتھ کچھ قندیلیں اور ان میں جلانے کا تیل اپنے ہمراہ لائے۔ قبولِ اسلام کے بعد انھوں نے قندیلیں تیل سے بھر کر مسجد میں لٹکا دیں اور شام کو انھیں جلا دیا۔ ان کا یہ کام رحمتِ عالم ﷺ کی خوش نودی کا باعث ہوا اور وہ حضورؐ کی بے پایاں شفقت و عنایت کا موردِ بن گئے۔ حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ تمیمؓ داری پہلے شخص ہیں جنھوں نے مسجد میں روشنی کرنے کی ابتدا کی۔ (ابن ماجہ)

علّامہ ابنِ سعدؒ اور ابنِ اثیرؒ کا بیان ہے کہ قبولِ اسلام کے بعد حضرت تمیمؓ نے تمام غزوات میں شرکت کی، لیکن انھوں نے ان غزوات کی تصریح نہیں کی جن میں حضرت تمیمؓ شریک

ہوئے۔ فی الحقیقت جس وقت حضرت تمیمؓ نعمتِ ایمان سے بہرہ یاب ہوئے، غزوۂ تبوک کے سوا سب غزواتِ نبوی گزر چکے تھے۔ اس لیے یوں کہنا صحیح ہوگا کہ انھوں نے غزوۂ تبوک میں شرکت کا شرف حاصل کیا۔ ۹ھ میں چند سرایا بھی پیش آئے یعنی سریّہ عینیہ بن حصین سریہ قطبہ بن عامر، سریہ ضحاک بن سفیان کلابی، سریّہ بنو طے اور سریّہ دومة الجندل ہوسکتا ہے کہ حضرت تمیمؓ ان میں سے کسی سریّہ (یا بعض سرایا) میں بھی شریک ہوئے ہوں۔

۹ھ میں اپنے قبولِ اسلام سے لے کر سرورِ عالمؐ کے وصال (ربیع الاول ۱۱ھ) تک حضرت تمیمؓ نے صحبت نبویؐ سے خوب خوب استفاضہ کیا اور قرآن حکیم کے علماء میں شمار ہونے لگے۔ علامہ ابن سعدؒ کہتے ہیں کہ جن صحابہ نے عہدِ رسالت میں قرآن جمع کیا، حضرت تمیمؓ بھی ان میں شامل تھے چوں کہ اسلام لانے سے پہلے عیسائی تھے اس لیے انجیل سے بھی پوری واقفیت تھی۔ سرورِ عالمؐ نے ان کے گزارے کے لیے شام کا ایک گاؤں عینون بہ طور جاگیر مرحمت فرمایا تھا، اور اس کا تحریری فرمان بھی لکھ دیا تھا۔ شام فتح ہونے سے بہت پہلے اس کی اراضی میں سے جاگیر عطا کرنا خصوصیات نبوّت سے ہے اور بعض محدثین نے اسے معجزاتِ نبوی میں شمار کیا ہے۔ حضرت تمیمؓ نہ صرف عہدِ رسالت بلکہ حضرت صدیقِ اکبرؓ، حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عثمانِ غنیؓ کے پورے دورِ خلافت میں بھی مدینہ منورہ ہی میں مقیم رہے۔ سیدنا حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد مسلمانوں میں خانہ جنگی کا آغاز ہوا تو انھوں نے اس سے بچنے کے لیے دل پر پتھر رکھ کر دیارِ حبیبؐ کو الوداع کہا اور اپنے وطن شام چلے گئے۔ شام میں انھوں نے اپنی زندگی کے آخری سال گوشہ نشینی میں گزارے۔ ان کے شب و روز عبادتِ الٰہی میں گزرتے تھے اور طرزِ معاشرت نہایت سادہ اور متوکلانہ تھا۔ حافظ ابنِ حجرؒ کا بیان ہے کہ حضرت تمیمؓ نے ۴۰ھ میں سفرِ آخرت اختیار کیا اور حبرون نامی ایک گاؤں میں سپردِ خاک کیے گئے۔ ان کی اولادِ نرینہ کوئی نہیں تھی صرف ایک لڑکی رقیہ تھی اور اسی کی نسبت سے ان کی کنیت ابو رقیہ تھی۔

(۳)

سیّدنا حضرت تمیمؓ داری کا شمار ان فضلائے صحابہ میں ہوتا ہے جو اپنے زہد و ورع، اتباعِ رسول، خشیتِ الٰہی، عبادت و ریاضت اور شغفِ قرآن کے لحاظ سے مثالی حیثیت رکھتے تھے۔ چوں کہ وہ عہدِ رسالت کے آخر میں اسلام لائے۔ اس لیے ان سے بہت کم حدیثیں مروی

ہیں۔ ان کی مرویات کی تعداد کے بارے میں اختلاف ہے تاہم اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ روایتِ حدیث کے لحاظ سے وہ صحابہ کے طبقۂ پنجم میں داخل ہیں یعنی وہ صحابہ جن کی مرویات کی تعداد چالیس یا چالیس سے کم ہے۔ ان کی جلالتِ قدر کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ حضرت انسؓ بن مالک، عبداللہؓ بن عمرؓ، عبداللہؓ بن عباسؓ اور ابوہریرہؓ جیسے اساطینِ اُمت نے ان سے روایتیں کی ہیں۔ ان کے علاوہ بہت سے اکابر تابعین نے بھی ان سے کسبِ فیض کیا اور روایتیں کیں۔ ان میں سے روح بن زنباع، شہر بن حوشبؒ، عبداللہ بن موہبؒ اور عطاء بن یزید لیثیؒ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ صحیح مسلم کی مشہور حدیث الدِّین النَصیحۃُ ''دین نصیحت ہے۔'' حضرت تمیمؓ داری ہی سے مروی ہے۔

قبولِ اسلام سے پہلے حضرت تمیمؓ کا شمار علمائے یہود و نصاریٰ میں ہوتا تھا۔ حافظ ابنِ حجرؒ نے تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ وہ کتابین (عہدِ قدیم و عہدِ جدید) کے ماننے والوں میں سے تھے اس لیے یہود اور نصاریٰ دونوں ان کو اپنے علماء میں شمار کرتے تھے۔ نعمتِ اسلام سے بہرہ یاب ہونے کے بعد انھوں نے اپنی ساری توانائیاں قرآن پڑھنے اور سمجھنے میں صرف کر دیں۔ یہاں تک کہ علومِ قرآنی میں بھی انھیں درجۂ تبحر حاصل ہو گیا۔ حافظ ابن حجرؒ کہتے ہیں کہ حضرت تمیم داریؓ انجیل اور قرآنِ حکیم دونوں کے عالم تھے۔ ان کو قرآنِ حکیم سے بے پناہ شغف تھا۔ اپنی نمازوں میں اس کثرت سے قرآن کی تلاوت کیا کرتے تھے کہ لوگوں کو ان پر رشک آتا تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ کی نگاہِ مردم شناس میں ان کے علم و فضل کی بڑی قدر تھی۔ چناں چہ انھوں نے جب نمازِ تراویح باجماعت قائم کی تو خواتین کی امامت کے لیے حضرت تمیمؓ کو نامزد کیا۔

امام احمد حنبلؒ، حافظ ابنِ حجرؒ، علامہ ابنِ اثیرؒ اور دوسرے اربابِ سیر نے حضرت تمیمؓ کی عبادت و ریاضت کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے۔ وہ اپنے اوقات کا بیشتر حصہ عبادتِ الٰہی میں گزارتے تھے اور اکثر ساری ساری رات نماز پڑھتے رہتے تھے۔ نمازِ تہجد کی سختی سے پابندی کرتے تھے اور خشیتِ الٰہی سے ہر وقت لرزاں و ترساں رہتے تھے۔ بعض اوقات نماز پڑھتے ہوئے ان پر گریہ طاری ہو جاتا تھا۔ حافظ ابنِ حجرؒ نے اصابہ میں لکھا ہے کہ حضرت تمیمؓ ایک شب نماز پڑھ رہے تھے، اثنائے نماز میں جب اس آیت پر پہنچے:

اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ اجْتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَھُمْ کَالَّذِیْنَ

اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحْیَاھُمْ وَ مَمَاتُھُمْ ط سَآءَ مَا یَحْکُمُوْنَ ۝ (الجاثیہ:۲۱)

''کیا جن لوگوں نے برائیوں کا ارتکاب کیا ہے انھوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم ان کو ان لوگوں کے برابر رکھیں گے جو ایمان لائے اور نیک کام کیے۔ ایک سا ان کا جینا اور مرنا وہ کتنا برا فیصلہ کر رہے ہیں۔''

تو زار و قطار رونے لگے اور صبح تک اسی آیت کو دہراتے رہے:

سیدنا حضرت تمیمؓ کو اللہ تعالیٰ نے کمال درجے کی سلامتیِ طبع سے نوازا تھا۔ اگرچہ ان کو سرورِ عالمؐ سے کسبِ فیض کا کچھ زیادہ موقع نہ ملا تاہم دو ڈھائی سال کی مدت ہی میں وہ ایک ایسے مثالی مردِ مومن بن گئے کہ ان کے ہر قول اور فعل میں اسوۂ نبویؐ کی جھلک نمایاں ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ رحمتِ عالمؐ سے ریاکاری کی مذمت سنی، اس کے بعد جب تک جیے حتی الوسع یہی کوشش کرتے تھے کہ ان کی کثرتِ عبادت کا حال لوگوں پر ظاہر نہ ہو۔ حافظ ابن حجرؒ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ کسی شخص نے ان سے پوچھا کہ آپ شب بھر میں نماز کی کتنی رکعات پڑھتے ہیں۔ حضرت تمیمؓ نے اس کے تجسس پر ناراضی کا اظہار کیا اور فرمایا کہ میں رات کی تنہائی میں (لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ رہ کر) ایک رکعت نماز پڑھنا اس سے بہتر سمجھتا ہوں کہ ساری رات نماز پڑھتا رہوں اور صبح کو لوگوں سے بیان کرتا پھروں۔

ایک دفعہ ان کے شاگرد (مشہور تابعی) حضرت روح بن زنباعؒ ان سے ملنے گئے۔ انھوں نے دیکھا کہ حضرت تمیمؓ گھوڑے کے لیے جو صاف کر رہے ہیں اور گھر کے لوگ ان کے پاس بیٹھے ہیں۔ حضرت روحؒ نے متعجب ہو کر کہا ''ابو رقیہ کیا اہل خانہ میں سے کوئی اور یہ کام نہیں کر سکتا؟'' حضرت تمیمؓ نے فرمایا۔ ''بھائی کر تو سکتا ہے لیکن اس صورت میں میرا اجر جاتا رہے گا کیوں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ جب کوئی مسلمان اپنے گھوڑے کے لیے دانہ صاف کرتا ہے اور پھر اس کو کھلاتا ہے تو ہر دانہ کے بدلے اسے نیکی ملتی ہے۔''

حضرت تمیمؓ حقوق اللہ کے ساتھ حقوق العباد کا بھی پورا خیال رکھتے تھے اور ہمیشہ سید المرسلینؐ کے اس ارشادِ مقدس کو اپنے پیشِ نظر رکھتے تھے کہ تم میں سے بہترین انسان وہ ہے جو مخلوقِ خدا کو نفع پہنچائے۔ حافظ ابن حجرؒ کا بیان ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ کے عہدِ خلافت میں ایک

دفعہ حرّہ کے مقام پر ایک جگہ آگ بھڑک اٹھی۔ اس آگ کے پھیل جانے سے کھجور کے باغوں کو نقصان پہنچنے کا خطرہ تھا۔ حضرت عمرؓ حضرت تمیمؓ کے پاس تشریف لے گئے اور ان کو اس واقعہ کی اطلاع دی، حضرت تمیمؓ فوراً حرّہ گئے اور اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر آگ بجھا دی۔

ان کا یہی جذبۂ خیر تھا جس کی بنا پر حضرت عمر فاروقؓ نے ان کو ''خیر اہل المدینہ'' کا خطاب دے رکھا تھا اور وہ لوگوں میں بڑی عزت واحترام کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ انھوں نے مسجد میں روشنی کرنے کے جس کارِ حسنہ کا آغاز کیا وہ ابدالآباد تک ان کی یاد تازہ کرتا رہے گا۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

کتابیات

اس کتاب کی تالیف میں جن کتابوں سے خاص طور پر مدد لی گئی ہے ان کے نام یہ ہیں:

۱- صحیح بخاری

۲- صحیح مسلم

۳- مؤطا امام مالکؒ

۴- مسند احمد بن حنبلؒ

۵- مسند ابوداؤد

۶- جامع ترمذی

۷- المغازی ---------- واقدیؒ

۸- فتوح الشام ---------- واقدیؒ

۹- الطبقات الکبریٰ ---------- ابنِ سعدؒ

۱۰- تاریخ الامم والملوک ---------- طبریؒ

۱۱- الکامل ---------- ابنِ اثیرؒ

۱۲- البدایہ والنہایہ ---------- حافظ ابنِ کثیرؒ

۱۳- السیرۃ النبویہ ---------- ابنِ ہشامؒ

۱۴- اسد الغابہ ---------- ابن اثیرؒ

۱۵- فتوح البلدان ---------- بلاذریؒ

۱۶- انساب الاشراف ---------- بلاذریؒ

۱۷- الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب ---------------------------- حافظ ابن عبد البرؒ
۱۸- الاصابہ فی تمییز الصحابہ ---------------------------- حافظ ابنِ حجر عسقلانیؒ
۱۹- تہذیب التہذیب ---------------------------- حافظ ابنِ حجر عسقلانیؒ
۲۰- اخبار الطّوال ---------------------------- ابو حنیفہ دینوری
۲۱- دائرہ معارف اسلامیہ -----(مختلف جلدیں)------------ پنجاب یونی ورسٹی
۲۲- ترجمان السنہ ---------------------------- مولانا بدرِ عالم میرٹھیؒ
۲۳- حیاۃ الصحابہ ---------------------------- مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ
۲۴- مشکوٰۃ المصابیح ---------- شیخ ولی الدین محمد بن عبد اللہ خطیب عمری
۲۵- سیرتِ کبریٰ ---------------------------- مولانا ابو القاسم رفیق دلاوریؒ
۲۶- المشاہد ---------------------------- حکیم رحمان علی خاں
۲۷- مہاجرین (جلد اوّل و دوم) ------------ شاہ معین الدین احمد ندویؒ
۲۸- سِیَر انصار (جلد اوّل و دوم) ------------ مولانا سعید انصاری مرحوم
۲۹- الفاروق ---------------------------- شبلی نعمانیؒ
۳۰- اہل کتاب صحابہؓ و تابعین ------------ حافظ مجیب اللہ ندوی
۳۱- سِیَر الصحابہؓ (حصہ ہفتم) ------------ شاہ معین الدین احمد ندویؒ
۳۲- اسوۂ صحابہؓ (جلد اوّل و دوم) ------------ مولانا عبد السّلام ندویؒ
۳۳- تاریخِ اسلام ---------------------------- منشی غلام قادر فصیح مرحوم
۳۴- تاریخِ اسلام ---------------------------- شاہ معین الدین احمد ندویؒ
۳۵- رحمۃ للعالمینؐ (جلد دوم) ------------ قاضی محمد سلیمان منصور پوریؒ
